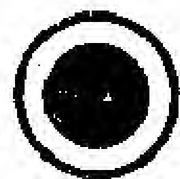
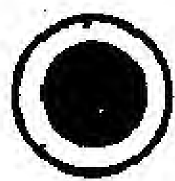
روزانہ درسِ قرآن پاک



تفسیر

سُورۃ النِّسَاءِ (مکمل)

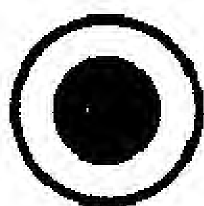


جلد ۵

افادات

حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی مدظلہ

خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ



طبع تیرہ

نام کتاب .... معالم العرفان فی دروس القرآن (سورۃ النساء مکمل)

افادات .... حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ

مرتب .... الحاج لعل دین۔ ایم اے (علوم اسلامیہ) شالامار ٹاؤن لاہور

تعداد طباعت .... پانچ سو (۵۰۰)

سرورق .... سید الخطاطین حضرت شاہ نفیس الحسینی مدظلہ

کتابت .... محمد امان اللہ قادری گوجرانوالہ

ناشر .... مکتبہ دروس القرآن فاروق گنج گوجرانوالہ

قیمت: 210 روپے

مارچ 2008 بمطابق ربیع الاول 1428ھ

ملنے کے پتے

(۱) مکتبہ دروس القرآن، محلہ فاروق گنج گوجرانوالہ

(۲) مکتبہ رحمانیہ اقراء سنٹر اردو بازار لاہور

(۳) مکتبہ قاسمیہ، الفضل مارکیٹ لاہور

(۴) مکتبہ سید احمد شہیدؒ، اردو بازار، لاہور

(۵) کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار راولپنڈی

(۶) کتب خانہ مجیدیہ، بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

(۷) مکتبہ حلیمیہ نزد جامعہ بنوریہ سائٹ نمبر ۶ کراچی

(۸) اسلامیہ کتب خانہ اڈا گامی، ایبٹ آباد

(۹) مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ کوئٹہ

(۱۰) مکتبہ العلم ۱۸ اردو بازار لاہور

فہرست مضامین

معالم العرفان فی دروس القرآن سورۃ نساء (مکمل) جلد ۵

پیش لفظ

از : الحاج لعل دین صاحب ایم۔ اے (علوم اسلامیہ) لاہور

نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

اما بعد

الحمد للہ! مکمل سورۃ نساء پر مشتمل سلسلہ دروس القرآن کی یہ ساتویں جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس سے پیشتر پارہ ۲۹، پارہ ۳۰، سورۃ فاتحہ، سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران شائع ہو کر قارئین سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔ جیسا کہ سابقہ جلد سورۃ آل عمران کے تعارف میں توقع کی گئی تھی، یہ جلد مکمل سورۃ نساء پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ کام کی رفتار تیز ہو کر یہ جلد بہت کم وقت میں تیار ہو گئی ہے۔ بتوفیق ایزدی امید واثق ہے کہ ہر آمدہ جلد کے لیے انتظار کی گھڑیاں مزید کم ہو سکیں گی۔ مکمل سورۃ مائدہ پر مشتمل اگلی جلد کا مسودہ تیار ہو کر طباعت کے مراحل طے کر رہا ہے۔ انشاء اللہ یہ جلد بھی جلد ہی منظرِ عام پر آجائے گی۔ اس وسیع کام کو شروع کرتے وقت اس کی تکمیل کی جو منزل بہت دور نظر آتی تھی اب قریب نظر آنے لگی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ اللہ تعالیٰ زندگی اور صحت کے ساتھ توفیق عطا فرمائے تو یہ عظیم منصوبہ اپنے ہاتھوں پایۂ تکمیل تک پہنچا دیکھیں کیونکہ زندگی کے اس آخری حصے میں یہی تڑپ ہے۔ ؎

تمنا ہے کہ اس دنیا میں کوئی کام کر جائیں
اگر کچھ ہو سکے تو خدمتِ اسلام کر جائیں

سورۃ بقرہ اور آل عمران کی طرح سورۃ نساء بھی سبع طوال سورتوں میں شمار ہوتی ہے قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا زمانہ نزول ۳ھ کے اواخر سے ۴ھ کے اواخر یا ۵ھ کے اوائل تک ہے۔ اس زمانہ میں اہل ایمان کو جس قسم کے احکام کی ضرورت

تھی، وہ سب اس میں آگئے ہیں۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ سورۃ بقرہ میں روئے سخن زیادہ تر یہودیوں کی طرف تھا اور سورۃ آل عمران میں نصاریٰ کی طرف۔ سورۃ نساء میں زیادہ تر اہل عرب کو مخاطب کر کے اُن کے باطل عقائد اور معاشرتی خرابیوں کی نشاندہی کی گئی ہے، اُن کے کفر اور شرک کا رد کیا گیا ہے اور دعوت و تبلیغ کے ضمن میں اہل کتاب اور مشرکین کے غلط مذہبی تصورات اور غلط اخلاق پہ بھرپور تنقید کی گئی ہے۔

ہجرتِ مدینہ کے بعد اسلامی معاشرہ کافی حد تک وسیع ہو چکا تھا، مختلف قبائل کے اسلام میں داخل ہونے کی وجہ سے معاشرتی مسائل پیدا ہو چکے تھے۔ جنگِ اُحد میں مسلمانوں کے جانی نقصان کی وجہ سے یتیموں اور بیواؤں کے مسائل سامنے آئے۔ وراثت کی تقسیم اور نکاح جیسے اہم معاملات پہ احکام کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ مبارکہ میں یتیموں، مسکینوں، بیواؤں، مسافروں، والدین اور اقرباء کے حقوق کو واضح فرمایا ہے۔ عرب معاشرے میں عورت کی حالت ناگفتہ بہ تھی، اللہ نے اُس کے حقوق کا تحفظ فرمایا ہے اور اُسے باعزت مقام دلایا ہے۔ تقسیمِ وراثت جیسے اہم اور مشکل مسئلہ کے متعلق مکمل ضابطہ نازل فرمایا ہے۔ خاندانی معاملات میں مرد و زن کے تعلقات کو بہتر طور پہ منظم فرمایا ہے اور نکاح کے ضمن میں تمام محرمات کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے معاشرتی خرابیوں میں شراب پہ پابندی عاید کی ہے۔ دشمن سے فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے اہل اسلام کو ترغیب دی گئی ہے اور ساتھ ساتھ اُن کی اندرونی تنظیم پہ بھی زور دیا گیا ہے۔ افواہوں کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے اور خاص طور پہ دورانِ جنگ پیدا ہونے والی افواہوں کی قباحت سے آگاہ کیا گیا ہے۔ عبادات کے احکام کا سلسلہ اس سورۃ میں بھی جاری ہے۔ طہارت کے لیے وضو اور تیمم کے مسائل بیان فرمادیے ہیں۔ صلوٰۃ خوف اور صلوٰۃ قصر کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ امورِ سلطنت کو بہتر طور پہ انجام دینے کیلئے احکام سلطانیہ بیان ہوئے ہیں، چنانچہ غیر جانبدار معاہد قبائل کیساتھ سلوک، مدینہ کے یہودیوں اور منافقوں سے برتاؤ اور اُن کی سازشوں سے چوکنا رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ غرضیکہ سابقہ دو طوال سورتوں کی طرح اس سورۃ میں بھی مختلف الانواع مسائل کا وافر ذخیرہ موجود ہے، اللہ تعالیٰ اس سے استفادہ

حاصل کرنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔

آج پوری دنیا سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام ہائے معیشت کے دوراہے پہ کھڑی ہے۔ پوری انسانیت اپنے ہی ہاتھوں معاشرتی اور سیاسی مسائل سے دوچار ہے۔ خالق اور مخلوق کا تعلق کمزور پڑ رہا ہے اور شیطانی افعال پوری قوت کے ساتھ نئی نسل کو اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ ان حالات میں قرآنِ پاک ہی وہ واحد لائحہ عمل ہے جو بھٹکی ہوئی مخلوق کو صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ آیئے! اپنے مسائل کا حل اور سکونِ قلب کی دولت اللہ کے قرآن اور نبی آخر الزمان کے فرمان میں تلاش کریں۔ اس سلسلہ میں دروس القرآن کا یہ منصوبہ حتی المقدور اپنی خدمات پیش کر رہا ہے۔ آیئے ہم اپنی جھولیوں کو اس کی برکات سے معمور کر لیں۔ قارئین کرام سے التماس ہے کہ اس سلسلہ میں دامے، درمے، سخنے حصہ لینے والے تمام کارکنوں کے استقامت اور آخرت میں بہترین اجر کی دعا فرمائیں۔

احقر العباد

(الحاج) لعل دین، ایم اے (علوم اسلامیہ)

شالامار ٹاؤن۔ لاہور

نوٹ

تفسیر معالم العرفان فی دروس القرآن کی بحمد اللہ تعالےٰ رمضان ۱۴۱۶ھ میں مکمل بیس ۲۰ جلدیں طبع ہو چکی ہیں

فیاض

سخنہائے گفتنی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ
عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ خَاتَمِ الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ
وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ

فرقہ وارانہ کشمکش، اسلام کو اپنے غلط مقاصد کے لیے استعمال کرنے، کتاب اللہ کی غلط تفسیریں اور باطل تاویلات، رسومات و بدعات کی فراوانی کے اس دور میں جب کہ ظلم وجہالت کی دبیز چادر پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے، جہاں ہر ہر قدم پہ انسانی حوصلہ پست کرنے والی اور ہمت ہرا دینے والی سینکڑوں بلکہ ہزاروں رکاوٹیں موجود ہیں، جہاں انسان عزم کا استحکام اور ارادے کی استواری بالکل کھو دیتا ہے، دل کی شگفتگی اور دماغ کی تمام بلند خیالیاں معدوم ہو جاتی ہیں۔ دل میں نئی امنگ پیدا ہونے پر کوئی خدا کا بندہ اگر ان حالات پر کچھ کرنے، کہنے یا لکھنے کی کوشش کرتا ہے تو طاغوتی طاقتوں کے بنائے ہوئے مضبوط پھندوں یا حسین جالوں میں پھنس کر رہ جاتا ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

ایسے وقت میں ذاتی مفادات سے بالا ہو کر اسلام کی صحیح ترجمانی اور قرآن و سنت کا صحیح بیان یقیناً اہل حق میں انتہائی باہمت اشخاص کا کام ہے، اور اپنے اس فریضہ کی ادائیگی ہے جس کا حکم رب ذوالجلال نے اپنی مقدس اور آخری کتاب میں فرمایا۔

وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ

اور تم میں ایک گروہ ایسا ضرور ہونا چاہیے جو بھلائی کی طرف لوگوں کو دعوت دے اور

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ — اور نیک کاموں کا حکم کرے اور برے کاموں سے روکے (آل عمران)

الحمد للہ " معالم العرفان فی دروس القرآن " علمائے حق کی ان دیگر تفاسیر اور کتب میں شامل ہے جنہوں نے حالات کی پرواکیے بغیر اپنے فریضہ کو صحیح طور پر ادا کیا ، گو اس میں الفاظ اور عبارت آرائی کی وہ چمک دمک نہیں ہے جو بعض دیگر کتب و تفاسیر میں موجود ہے لیکن قرآن و سنت کی صحیح تعبیر ، علمائے سلف کے مزاج کے مطابق عام فہم انداز میں موجود ہے ، اور اس میں ہر طبقہ عوام کی ابدی بھلائی کے لیے وافر حصہ ہے ۔

اس میں علمائے حق کی مستند تفاسیر میں پھیلے ہوئے اہم مسائل کو ایسے سانچے میں ڈھالا گیا ہے ، جو عہد حاضر کے مسائل کا صحیح حل پیش کرتے ہیں اور ادھر اُدھر سے بے نیاز کر دیتے ہیں ، اس میں غلط افکار کی مکمل بیخ کنی کر کے اتمام حجت کا فریضہ انتہائی احسن انداز میں کر دیا گیا ہے ۔

یہ دروس بیک وقت مختلف محاذوں پر برسرپیکار نظر آتے ہیں ، ان میں تمام باطل مذاہب کا ردّ انتہائی اچھے اور اچھوتے انداز میں کیا گیا ہے ، جس سے صاحب درس کے مطالعے کی وسعت ، نظر کا عمق اور مقاصد کی رفعت عیاں ہے ، غالباً یہ سب کچھ اساتذہ و شیوخ کے آستانہ فیض بخش کا مرہون منت ہے ۔

صاحب درس حضرت صوفی صاحب مدظلہ قافلہ ولی اللّٰہی کے حدی خواں اور اپنے شیخ واستاذ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ سے انتہائی متاثر ہیں ، اللہ تعالیٰ نے حضرت کو صبر و تحمل ، ایثار و قناعت کے ساتھ ساتھ عزیمت و استقامت کا وافر حصہ عطا فرما رکھا ہے ، عہد طفولیت تعلّم میں گذرا اور عہد شباب سے لیکر اس پیرانہ سالی میں بھی قرآن و سنّت اور کتب درسیہ کی تعلیم میں مصروف ہیں ، نصرت ایزدی نے شامل حال ہو کر درس تدریس کے ساتھ ساتھ حضرت کے قلم حق رقم سے بھی مسلمانوں کی خدمت کا کام لیا ۔ حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ کے متعدد رسالوں اور کتب کے تراجم و حواشی اور توضیح ، دیگر انتہائی اہم اور مفید کتب و رسائل کے تراجم و حواشی ، نماز مسنون ذہنوں میں تشنگی پیدا کرنے والے علوم

میں الیاغوجی کی اردو شرح، افکار حضرت سندھیؒ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

خدا تعالیٰ حضرت کی ان کوششوں کو بار آور فرمائیں، رہتی دنیا تک خواص کے ساتھ عامۃ المسلمین کو ان سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائیں۔ حضرت اور آپ کے شیوخ و اساتذہ کے لیے انہیں صدقہ جاریہ بنائیں۔

زیرِ نظر کتاب مکمل سورۃ نساء کے ۷۹ دروس پر مشتمل ہے۔ اس سورۃ میں تدبیر منزل یعنی گھریلو زندگی اور عورتوں کے حقوق کے بارہ میں بہت سے احکام اور ان کی حکمتوں کا بیان ہوا، اسی ضمن میں عورت کی سربراہی کا مسئلہ بھی بیان ہوا، ازدواجی زندگی اور اس سے پیدا ہونے والے مختلف الانواع مسائل کا حل واضح طور پر کر دیا گیا ہے، جس پر عمل پیرا ہونے سے ایک عمدہ سوسائٹی وجود میں آسکتی ہے، اور فساد فی الارض کے سینکڑوں اسباب کا قلع قمع ہو جاتا ہے، عبادات کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ طہارت ظاہرہ کے احکام منجملہ انکے تیمم، جنابت، غسل کے مسائل اور طہارت باطنہ یعنی تقویٰ اور اس کے اہم ترین اصول عدل، احسان، تعظیم شعائر اللہ اور تنظیم شعائر اللہ کا مفصل بیان بھی ہو چکا ہے، سیاست مدینہ یعنی احکام سلطنت کے سلسلہ میں دیگر دروس کے علاوہ درس ۳۴، ۳۵ بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ تاہم ان سب امور میں فلسفہ ولی اللّٰہی کی چھاپ نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔

آخر میں دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دروس کو صاحب درس حضرت صوفی صاحب مدظلہ انجمن محبان اشاعت قرآن کے جملہ اراکین فاضل مرتب جناب حاجی لال دین ———— سرگرم ارکان بلال احمد ناگی الحاج بابو غلام حیدر، استری محمد منیر، شیخ محمد یعقوب، منشی مشتاق احمد الحاج منیر احمد نارو اور اس کی اشاعت میں حصہ لینے والے تمام حضرات کی فوز و فلاح اور بخشش کا ذریعہ بنائے اور ان کی اس سعی جمیل کو قبول فرمائے اور قیامت تک زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو اس سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

فقط محمد اشرف، فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم و وفاق المدارس العربیہ

۱۷ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ بمطابق ۲۶ جنوری ۱۹۸۹ء


سورۃ نساء
(مکمل)



درسِ اوّل ۱ — آیت ۱

سُوْرَةُ النِّسَآءِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّسَبْعٌ وَّسَبْعُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا اَرْبَعَةٌ وَّعِشْرُوْنَ رُكُوْعًا

سورۃ نساء مدنی ہے اور یہ ایک سو ستتر ۱۷۷ آیات اور اسمیں چوبیس ۲۴ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان اور نہایت رحم کرنیوالا ہے

يَآاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ①

ترجمہ :- اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرتے رہو، جس نے تمہیں پیدا کیا ایک ہی نفس سے اور پیدا کیا ہے اُس نے اُسی نفس سے اُس کا جوڑا، اور پھیلا دیا ہے اُن دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو - اور اُس اللہ سے ڈرتے رہو کہ تم سوال کرتے ہو۔ اُس کے واسطے سے، اور قرابتوں سے (خبردار رہو) بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے اُوپر نگہبان ہے ①

نام اور کوائف اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ النساء ہے - یہ سورۃ ہجرت کے بعد مدنی زندگی میں نازل ہوئی۔ سورۃ بقرہ اور آل عمران کی طرح یہ بھی لمبی سورتوں میں شمار ہوتی ہے۔ ترتیب کے لحاظ

سے طویل ترین سورۃ بقرہ ہے، پھر آل عمران اور اس کے بعد سورۃ نساء کا نمبر ہے اس کی ایک صد ستتر ۱۷۷ آیتیں، چوبیس ۲۴ رکوع، تین ہزار نو سو چالیس ۳۹۴۰ کلمات اور اور سولہ ہزار تیس ۱۶۰۳۰ حروف ہیں۔

نساء جمع کا صیغہ ہے اور اس کا واحد اَلْمَرْاَۃُ ہے تثنیہ اَلْمَرْاَتٰنِ ہے یعنی ایک عورت، دو عورتیں اور نساء یا نسوۃ سب عورتوں کے معنیٰ میں آتا ہے اسی طرح مرد کے لیے بھی اَلْمَرْءُ، اَلْمَرْاٰنِ اور رِجَالٌ آتا ہے۔ یعنی ایک مرد، دو مرد اور سب مرد۔

مضامین سورۃ

جیساکہ اس سورۃ مبارکہ کے نام سے ظاہر ہے، اس میں عورتوں کے متعلق بہت سے احکام ہیں۔ تاہم اس سورۃ میں اس کے علاوہ بھی بہت سے احکام اور حکمتیں بیان ہوئی ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کا ذکر گذشتہ سورۃ میں بھی گذر چکا ہے اور اس سورۃ میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ عورتوں کے مسائل اُن کے حقوق ہی کے ضمن میں آتے ہیں۔ عیسائی اور ہندو عورت کو وراثت کا حقدار نہیں مانتے۔ برخلاف اس کے اسلام نے عورت کو وراثت میں حصہ دیا ہے۔ چنانچہ اس سورۃ مبارکہ میں وراثت کے بہت سے احکام بیان ہوئے ہیں۔

سورۃ بقرہ میں گذر چکا ہے کہ مومن مرد یا عورت کا نکاح مشرک عورت یا مرد کے ساتھ جائز نہیں۔ اب اِس سورۃ میں اُن تمام رشتوں کی تفصیل بیان ہوئی ہے، جن کے ساتھ نکاح جائز نہیں۔ پھر حقوق ہی کے ضمن میں ایک مسلمان کے لیے اُس کے اقربا کے حق کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے رشتہ داروں میں والدین، بہن بھائی، اولاد کی تفصیل ہے، پھر یتیموں، مسکینوں مسافروں اور ہمسایوں کے حقوق ہیں۔ خاص طور پر یتیموں کے حقوق کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔

اس سورۃ مبارکہ میں معاشرتی احکام بھی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں عائلی قوانین کا ذکر بھی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کی اصطلاح کے مطابق اس سورۃ

میں تدبیر منزل کے تمام احکام بیان ہوئے ہیں اور اجتماعی احکام میں احکام سلطانیہ یعنی حکومت اور رعیت سے تعلق رکھنے والے احکام بھی آئے ہیں، گویا اللہ تعالے نے نظام حکومت کے احکام بھی نازل فرمائے ہیں۔ اجتماعی احکام کے سلسلے میں جہاد کا تذکرہ ہے اور پھر مسلمانوں کے تین حریف گروہوں یعنی یہود، نصاریٰ اور مشرکین کے ساتھ بحث و تمحیص کا ذکر بھی ہے۔ منافقین کی منافقت کی تفصیلات بھی بیان کر دی گئی ہیں۔ اور ان سے بچاؤ کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں۔ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے عبادات کی تفصیلات بھی بیان فرمائی ہیں چنانچہ مبادیٔ عبادت سے لے کر تیمم، جنابت، غسل، نماز وغیرہ کے مسائل بیان ہوئے ہیں

سورۃ بقرہ میں کلام کا زیادہ تر رُخ تقویٰ کے حصول اور یہود کی اصلاح کی طرف تھا۔ پھر سورۃ آل عمران میں اہل ایمان کے لیے ضروری مسائل بیان ہوئے اور روئے سخن زیادہ تر نصاریٰ کی اصلاح کی طرف رہا۔ تاہم ضمناً یہودیوں کا تذکرہ بھی تھا۔ اور اب اس سورۃ میں اور اگلی سورۃ مائدہ میں اہل عرب کی اصلاح کا پہلو اجاگر ہے۔ اس سے آگے سورۃ انعام میں مجوسیوں کی طرف اشارہ موجود ہے، اور شرک کی مختلف قباحتوں کا تذکرہ ہے۔

خوف خدا

سورۃ کی ابتدا اللہ تعالیٰ نے اجتماعی احکام سے کی ہے۔ اور اجتماعی احکام میں اہم ترین حکم تقویٰ ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے یَاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک ہی نفس سے پیدا کیا۔ تقویٰ کے مسائل سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران کے مختلف مقامات پر بیان ہو چکے ہیں۔ تقویٰ اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور اس کے ساتھ عدل، احسان تعظیم شعائر اللہ اور تنظیم شعائر اللہ بھی آتے ہیں۔ اس کا مفصل بیان سابقہ سورۃ کے آخر میں ہو چکا ہے۔ سورۃ کا اختتام بھی اس پر ہوتا ہے وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ

تُفْلِحُوْنَ" اے اہل ایمان! اللہ سے ڈر جاؤ تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو۔ تقویٰ اختیار کرنے سے تمہارے اندر حقوق کی ادائیگی کا جذبہ پیدا ہو گا۔ اور پھر تم عدل و احسان پہ کاربند ہو جاؤ گے۔ شرعی حدود کی پابندی کرنے لگو گے اور یہ سب کچھ خوفِ خدا کا ثمرہ ہو گا جس کے متعلق فرمایا کہ اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈر جاؤ

تخلیقِ انسانی

فرمایا اُس رب سے ڈر جاؤ جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا۔ ایک جان یا نفس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ تقریباً چار ہزار زبانیں بولنے والے کالے گورے، شرقی غربی، سُرخ، گندمی غرضیکہ اس دُنیا میں جتنے بھی انسان موجود ہیں۔ اُن سب کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی۔ سورۃ حجرات میں بھی آتا۔ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى" ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حکمت اور فلسفے کے مطابق آدم علیہ السلام انسانِ کامل کا مظہر ہیں اور انسان کامل حظیرۃ القدس میں تمام انسانیت کا مجموعہ اور نمونہ ہے۔ اس کو روح اعظم بھی کہا جاتا ہے، انسانِ اکبر اور امام نوع انسانی بھی اُسی کے نام ہیں۔ انسانی روح اسی انسان کامل کا عکس ہوتی ہے اور اسی کے واسطے سے تمام نوعِ انسانی کا تعلق اللہ تعالیٰ کی تجلیٔ اعظم کے ساتھ ہوتا ہے گویا عرش الٰہی کے نیچے امام نوع انسان موجود ہے جس کا نمونہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں آدم علیہ السلام کو مقرر فرمایا۔ چنانچہ پوری نسلِ انسانی میں سے سعادت مند وہی شخص ہو گا جو اس نمونہ کے مطابق ہو گا۔ جو شخص اس نمونہ سے جس قدر ہٹ جائے گا، اُسی قدر وہ شقاوت میں حصے دار بن جائیگا۔

عناصر ارضی

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام روئے زمین کی مٹی سے پیدا کیا۔ فرشتے کو حکم ہوا۔ کہ روئے زمین کی مٹی کو سمیٹ لو۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ پھر اُس سے خمیر بنایا گیا، اُسے گوندھا گیا اور اس سے آدم علیہ السلام کا مجسمہ تیار کیا گیا۔ پھر اُس میں اللہ نے روح پھونکی جس کی تفصیل قرآن پاک میں موجود ہے۔ جس طرح زمین

کے مختلف حصوں کی مٹی مختلف ہے، کوئی سخت، کوئی نرم، کوئی سرخ، کوئی سفید کوئی ریتلی اور کوئی چکنی اسی طرح نسل انسانی کے افراد کے مزاج بھی مختلف ہیں، کوئی نرم مزاج، کوئی سخت مزاج، کوئی طیب اور کوئی خبیث غرضیکہ مٹی کا اثر کسی نہ کسی صورت میں ہر انسان میں ظاہر ہوتا ہے۔

حضرت حواؑ کی پیدائش

فرمایا وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کا جوڑا حضرت حواؑ کو ان کی پسلی سے پیدا کیا۔ آدم علیہ السلام کی ایک پسلی کو ان سے الگ کیا گیا جس کی کیفیت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ کہ حضرت آدم علیہ السلام کی ایک پسلی کم ہو گئی یا ویسی کی ویسی ہی رہی پسلی کا بالکل علیحدہ ہو جانا بھی ضروری نہیں کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے زمین کی مٹی لے کر آدم علیہ السلام کا پتلا بنایا اور زمین میں کوئی چیز کم نہیں ہوئی، اسی طرح ہو سکتا ہے۔ کہ حضرت حوارؓ کو آدم علیہ السلام کی پسلی سے نکالنے کے باوجود اس پسلی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی ہو۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے ایک ہی جان یعنی آدم علیہ السلام سے ان کا جوڑا یعنی صنف نازک کو تیار کر کے ان میں خاوند بیوی کا رشتہ قائم کر دیا۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ انسان کی پسلیاں ٹیڑھی ہوتی ہیں۔ اور خصوصاً بالائی حصے کی پسلیاں زیادہ ٹیڑھی ہوتی ہیں۔ چونکہ حضرت حواؓ پسلی سے نکالی گئیں اس لیے ہر عورت میں ایک قسم کی فطری کجی پائی جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا اس ٹیڑھا پن کو ذہن میں رکھتے ہوئے عورت کے ساتھ نباہ کرو۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ عورت کے اس ٹیڑھا پن کو کسی حد تک برداشت کرو فرمایا کسی ھا طلاوقھا اگر تم اس کے ٹیڑھا پن کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو وہ ٹوٹ جائیگی یعنی تم اسے طلاق دے کر علیحدہ کر دو گے، لہٰذا اس کی کجی کو برداشت کرتے ہوئے اس سے نباہ کرو۔

نسل انسانی

فرمایا اس رب سے ڈرتے رہو، جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا

کیا پھر اسی سے اسی کا جوڑا پیدا کیا وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً[۲]
اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلا دیا۔ آج دنیا کی آبادی کم وبیش پانچ ارب ہے مگر ان کی پوری پوری اقدار سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ اور ان میں سے کتنے مرد اور کتنی عورتیں ہیں، یہ بھی رب ذوالجلال ہی جانتا ہے۔ اور پھر آگے قیامت تک مزید کتنی تعداد میں پیدا ہونے والے ہیں، صرف اللہ ہی کے علم میں ہے۔ وہ خلاق عظیم ہے۔

چونکہ پوری بنی نوع انسان ایک ہی باپ اور ایک ہی ماں کی اولاد ہیں لہٰذا ایک دوسرے کے حقوق کی پہچان بھی ضروری ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ڈرتے رہنے کی تلقین کی تخلیق کا مسئلہ بیان کیا تاکہ باہمی حقوق کا مسئلہ سمجھ میں آجائے۔ سب سے پہلے اللہ کا حق ہے۔ ہم سب کے سب اللہ ہی کی طرف محتاج ہیں کیونکہ خلاق عظیم وہ ہے۔ اس کے بعد چونکہ ہماری سب کی تخلیق ایک جوڑے سے ہوئی ہے اس لیے ایک دوسرے کے حقوق کی پاسداری ضروری ہے۔ قریبی عزیزوں کے حقوق کو اولیت حاصل ہوگی اور پھر درجہ بدرجہ تمام بنی نوع انسان کا حق ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے الناس من جهت التمثال اكفاء ابوهم آدم والام حواء۔ یعنی ہم کفو ہونے کی وجہ سے تمام انسان ایک جیسے ہیں۔ سب آدم اور حوا کی اولاد ہیں اور آدم ہی سب کا ملجا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس ایک ذات سے تمام مردوں اور عورتوں کو پھیلایا ہے۔

صلہ رحمی

فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ اور اس اللہ سے ڈرتے رہو کہ جس کے واسطے سے تم سوال کرتے ہو نیز ارحام یعنی رشتوں اور قرابتوں سے ڈرتے رہو۔ رشتہ داری کا پاس نہایت ضروری ہے۔ بخاری شریف کی روایت[۱] میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا اَلرَّحِمُ شُجۡنَةٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ قرابت داری رحمان کی

[۱] بخاری ص ۸۸۵ ج ۲ (فیاض)

رحمت کی ایک شاخ ہے۔ رشتے نے پیدا ہونے پر رحمان کا پہلو پکڑ لیا اور عرض کیا اے پروردگار یہ تیری پناہ پکڑنے والا مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا مَنْ وَصَلَكِ وَصَلْتُهُ جو تجھے جوڑے گا میں اُسے جوڑوں گا۔ وَمَنْ قَطَعَكِ قَطَعْتُهُ اور جو تجھے توڑے گا میں اُسے توڑوں گا۔

فرمایا مسئلہ انفرادی ہو یا اجتماعی احکام کا ہو، عبادت یا معاشرت کا معاملہ ہو، ہر صورت میں اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا بیشک اللہ تعالیٰ تمہارا نگران ہے۔ وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ کوئی اچھا کام کرو یا برا اُسکی نگرانی ہر حالت میں قائم ہے۔ لہٰذا محتاط رہو۔ حقوق کو ادا کرتے رہو۔ تقویٰ اختیار اور برائی سے بچتے رہو تاکہ آخرت کی ندامت سے بچ جاؤ۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۖ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۚ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝۲

ترجمہ :- اور دے دو یتیموں کو اُن کے مال ۔ اور نہ تبدیل کرو خبیث مال کو طیب مال کے ساتھ اور نہ کھاؤ اُن کے مالوں کو اپنے مالوں کے ساتھ بیشک یہ بڑا گناہ ہے ۝۲

ربط آیات

گذشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا کہ اُس اللہ سے ڈر جاؤ جس کے واسطے سے تم سوال کرتے ہو۔ اُس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، پھر جوڑے جوڑے بنا کر لاتعداد مردوں اور عورتوں کو پھیلا دیا، نیز یہ بھی تاکید فرمائی کہ قرابت داروں کے حقوق سے متعلق ڈر جاؤ۔ انسانی حقوق کی ادائیگی میں رشتہ داروں کے حقوق کو اولیت حاصل ہے۔ انہیں لازم طور پہ ادا کرو غرضیکہ اجتماعی حقوق کے سلسلے میں اللہ نے تقویٰ کو سب سے پہلے بیان فرمایا۔

یتیموں کے حقوق

اب حقوق کی تفصیل بیان ہو رہی ہے، اور حقوق کے سلسلے میں یتیموں کے حقوق کو مقدم رکھا گیا ہے۔ چنانچہ اگلی دس آیتوں تک یتامیٰ کے حقوق کی بات آ رہی ہے۔ یتیم چونکہ بے بس اور کمزور ہوتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے انہی کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ یتیموں کو اُن کے مال دے دو۔ یتامیٰ یتیم کی جمع ہے۔ اور اس کا معنیٰ ہے الگ ہونے والا۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں۔ کہ عربی محاورہ ہے، اصطلاح اور زبان کے مطابق جس کا باپ مر جائے وہ سن بلوغت تک یتیم کہلاتا ہے۔ جب لڑکا، لڑکی بالغ ہو جائیں تو وہ یتیم کی فہرست سے

نکل جاتے ہیں۔ بالغ ہونے پر وہ مکلف یا ذمہ دار ہو جاتے ہیں اور اُن پر قانون کی پابندی لازم آجاتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے لَا یُتْمَ بَعْدَ اِحْتِلَامٍ یعنی احتلام وارد ہونے کے بعد۔ یتیمی وارد نہیں رہتی۔ لَا یُتْمَ بَعْدَ بُلُوْغٍ یہ بھی فرمایا کہ بالغ ہونے پر یتیمی زائل ہو جاتی ہے بہر حال یتیم وہ ہے جس کا باپ اُس کی کم سنی میں فوت ہو جائے۔ البتہ دیگر انواع یعنی حیوانات، پرندوں وغیرہ میں یتیم بچہ وہ سمجھا جاتا ہے جس کی ماں اس کی کم سنی میں فوت ہو جائے۔ عام اصول یہی ہے۔

البتہ جو شخص بالغ ہو جائے وہ بلوغت کے ابتدائی زمانے میں بھی یتیم ہی کہلاتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں مذکور ہے وَاٰتُوا الْیَتٰمٰٓی یتیموں کو دے دو۔ اس سے مراد وہ یتیم ہیں جو نئے نئے سن بلوغت کو پہنچے ہوں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ جب یتیم سن بلوغت کو پہنچ جائیں تو اُن کے مال اُن کے حوالے کر دو۔ اب وہ سمجھ دار ہو گئے ہیں۔ اچھے برے میں تمیز کر سکتے ہیں۔ لہذا اُن کے حقوق اُن کو لوٹا دو۔ اس سورۃ کی چھٹی آیت میں بھی اسی طرح آتا ہے۔ "حَتّٰٓی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ" یعنی جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں، بالغ ہو جائیں تو اُن کے مال اُن کو لوٹا دو۔

جیسا کہ گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے نزول قرآن کے زمانے میں عورتوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہوتی تھی۔ اُن کی حق تلفی ہوتی تھی اسلام نے اُن لوگوں کو سمجھایا کہ قانون کی نگاہ میں مرد و زن یکساں ہیں البتہ مردوں کو ایک درجہ عورتوں پر فوقیت حاصل ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مرد عورتوں کو ذلیل سمجھنے لگیں، اُن کے حقوق ضائع کریں یا اُن پر کسی قسم کی زیادتی کریں۔ عرب لوگ عورتوں کی طرح یتیموں کے ساتھ بھی بڑی زیادتی کرتے تھے۔ یتیم کو وراثت کا جائز حصہ نہیں دیتے تھے۔ بلکہ اُن کا حصہ اُن کے متولی کھا جاتے تھے۔ یتیموں کے سرپرست عام طور پر بھائی

چچا، یا تایا وغیرہ ہوتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں یہ لوگ یتیموں کا مال ہڑپ کر جاتے تھے اور وہ بیچارے در در کی ٹھوکریں کھانے کے لیے رہ جاتے تھے

ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور کے صحابی حضرت سعدؓ جنگ احد میں شریک ہو کر شہید ہوئے اُس کی بچیاں یتیم رہ گئی ہیں۔ مگر مرحوم کے مال پر اس کے بھائی نے قبضہ کر لیا ہے۔ اب اُن بچیوں کی گذر اوقات اور اُن کے نکاح کا بندوبست کیسے ہوگا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ ہذا کی آیت "یُوصِیکُمُ اللّٰہُ فِیٓ أَوْلَادِکُمْ"..... نازل فرمائی۔

چنانچہ یتیموں کی حق رسی کے متعلق سورۃ بقرہ، سورۃ ہذا اور دیگر بہت سے مقامات پر سخت تاکید آئی ہے۔ یہاں پر بھی آپ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے یتیموں کی حفاظت، نگرانی، تربیت، اور اُن کے مال کی حفاظت کے متعلق بڑی سخت تاکید کی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے اَنَا وَکَافِلُ الْیَتِیْمِ کَھَاتَیْنِ یعنی میں اور یتیم کی پرورش کرنے والا قیامت کے دِن اس طرح ہوں گے جس طرح انگشت شہادت اور درمیانی انگلی قریب قریب ہیں۔ ایک عورت نے عرض کیا! حضور! میرا خاوند فوت ہو گیا ہے میں اُس کی تین، یتیم بچیوں کی پرورش کر رہی ہوں۔ آپ نے فرمایا لَقَدْ حَظَرْتِ بِحِظَارٍ شَدِیْدٍ دُوْنَ النَّارِ تو نے دوزخ کی آگ کے سامنے بڑی سخت باڑھ لگا دی ہے، وہ باڑھ تجھے جہنم میں جانے سے روک دے گی۔

بہر حال یتیموں کی پرورش شخصی فرض بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ معاشرے کے کمزور طبقات اسی مد میں آتے ہیں۔ غریبوں، مسکینوں اور کمزوروں کو اُن کا حق ادا کرنا اجتماعی ذمہ داری ہے۔ کسی مزدور یا کسان کا حق غصب کرنا قطعی حرام ہے۔ ہر کارخانے دار اور زمیندار پر لازم ہے۔ کہ وہ اپنے کارندوں کے حقوق کی حفاظت کرے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا

اَعۡطِ كُلَّ ذِیۡ حَقٍّ حَقَّهٗ ہر حقدار کو اُس کا حق ادا کرو۔ یہ ہمارے دین کا اہم اصول ہے۔ آج کل بڑے بڑے ادارے یتیموں اور مسکینوں کے نام پر فنڈ اکٹھا کر کے کھا جاتے ہیں اِلّا ماشاء اللہ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیئے۔ ہر حقدار کو اُس کا حق ملنا چاہیئے، جو رقم جس مقصد کے لیے اکٹھی ہوئی ہے۔ اُسی پر خرچ ہونی چاہیئے۔

حلال میں حرام کی ملاوٹ

آگے فرمایا وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ نہ تبدیل کرو گندے مال کو پاک مال کے ساتھ، یہاں پر خبیث وطیب سے مراد حلال و حرام ہیں۔ یتیم کا مال تمہارے حق میں خبیث ہے اُسے اپنے پاک مال کے ساتھ مت تبدیل کرو۔ یتیم کا مال اپنے مال میں ملا کر کھانے کی کوشش کرو گے تو تمہارے پاک مال میں خباثت کی ملاوٹ ہو جائے گی۔ ایسا نہ کرو۔ سورۃ البقرہ میں اللہ نے عام قانون کے طور پر فرمایا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ۔ فرمایا لَا يَحِلُّ لِامْرِءٍ مُسْلِمٍ اَنْ يَّاْكُلَ مَالَ اَخِيْهِ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسِهٖ کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ کسی دوسرے مسلمان کا مال ناجائز طریقے سے کھائے سوائے خوشی اور رضا کے۔ غرضیکہ تمہارے حق میں یتیم کا مال حرام ہے۔ اسے پاک مال کے ساتھ مت ملاؤ۔ غصب شدہ مال، چوری اور دھوکہ فریب سے حاصل کردہ مال حرام ہے، اس سے بچو۔

حرمت کی حکمت

اس بات کا یقین ہونا چاہیئے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے حرام قرار دی ہے وہ لازماً تمہارے حق میں مضر ہے۔ اسی طرح جس چیز کو خبیث فرمایا ہے۔ وہ بھی انسانی جسم کے لیے مہلک ہو سکتی ہے جیسے نَهٰى عَنِ الدَّوَآءِ الْخَبِيْثِ حضور علیہ السلام نے خبیث دوائی استعمال کرنے سے منع فرمایا۔ زہر خبیث ہے اور یہ لازماً مہلک ہے

لہ احکام القرآن للجصاص جلد ۲ ص ۳۳ (فیاض)

اسی طرح دمِ مسفوح میں خباثت ہے اور اللہ نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ نذر لغیر اللہ میں روحانی خباثت پائی جاتی ہے اس لیے یہ بھی "مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ" کے تحت حرام ہے۔ مردار اسی لیے حرام ہے کہ وہ مُضرِ صحت ہے۔ سور کا گوشت بھی اسی قبیل سے ہے اور حرام ہے۔ غرضیکہ ہر حرام چیز میں کوئی نہ کوئی ظاہری یا باطنی خباثت ہے جسکی بناء پر وہ چیز ممنوع قرار دی گئی ہے۔ چوری، جوئے، رشوت یا غبن کا مال بظاہر تو ویسے ہی ہے جیسا حلال مال ہوتا ہے مگر خبیث ہونے کی بنا پر ناپاک ہے اس کے استعمال سے انسان میں نجاست ہی پیدا ہوگی۔ جو جسمانی اور روحانی ہر دو لحاظ سے مضر ہے۔

اکلِ حرام

آگے فرمایا وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ اور ان کے مالوں کو اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر مت کھاؤ۔ مقصد یہ ہے کہ اگر تم یتیم کے مال کو اپنے مال کے ساتھ اس لیے ملاتے ہو تاکہ مشترکہ کھانے میں یتیم کا حصہ نسبتاً کم آئے گا اور اس طرح اس کا مال محفوظ رہیگا، پھر تو یہ درست ہے کیونکہ تمہاری نیت صحیح ہے۔ تم یتیم کے مال کی زیادہ سے زیادہ حفاظت کرنا چاہتے ہو۔ اسی طرح اگر تم یتیم کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر مشترکہ کاروبار کرتے ہو، کسی صنعت میں لگاتے ہو مشترکہ کھیتی باڑی کرتے ہو تاکہ یتیم کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے تو اسمیں کوئی حرج نہیں بلکہ یہ بہتر ہے۔ برخلاف اس کے اگر تم اپنا مال اور یتیم کا مال اس لیے ملاتے ہو، کہ بدنیتی سے اس کا مال ہضم کیا جائے۔ کھانے میں شامل کر کے اس کے حصے میں زیادہ خرچہ ڈال دیا۔ یا تجارت میں لگایا جائے تو اس کو نفع تھوڑا دیا خود حصہ رسدی سے زیادہ لے لیا جائے تو یہ اشتراک جائز نہیں ہوگا، اسی کے متعلق فرمایا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ بدنیتی سے اس کا مال کھانے کی کوشش نہ کرو۔

اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ مفسد کون ہے اور مصلح کون ہے۔ سورۃ البقرہ میں اسی بات کے متعلق فرمایا کہ اگر تم یتیموں کو اپنے ساتھ ملا لو، تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ بشرطیکہ نیک نیت ہو کیونکہ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ

فرمایا اگر ناجائز طریقے سے یتیموں کا مال کھاؤ گے تو اِنَّہٗ کَانَ حُوْبًا کَبِیْرًا بیشک یہ بہت بڑا گناہ ہے لفظ حَوب اور حُوب دونوں گناہ کے معنی میں آتے ہیں۔ اور یہ الفاظ ظلم کا معنی بھی دیتے ہیں۔ جیسے عربی شاعر نے کہا ہے — حُوب کبیر

انی و ما کلفتمونی من امرکم

لیعلم من امسی واعق واحوبا

یعنی تم نے جو مجھے تکلیف دی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شب گزار جان لے کہ تم نافرمان اور ظالم قوم ہو۔ دعا میں بھی اس قسم کے الفاظ آتے ہیں۔ اللھم اقبل توبتی واغفر حوبتی اے اللہ میری توبہ قبول کر لے اور میرے گناہ معاف فرما دے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کیا اور اس کا تذکرہ حضور علیہ السلام کے سامنے بھی کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان طلاق ام ایوب لحوب ام ایوب کو طلاق دینا بڑے ہی گناہ کی بات ہے یا ظلم کی بات ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ایوب نے اپنا ارادہ پورا نہ کیا بلکہ طلاق دینے سے باز رہے۔

الغرض! فرمایا یتیموں کے مال کو بدنیتی سے کھانا بہت بڑا گناہ ہے تمہارے لیے یہ خبیث مال ہے اور قطعی حرام ہے یتیموں کے مال کی حفاظت کا قانون بیان کرنے کے بعد اگلی آیت میں یتیم لڑکیوں کے نکاح کا تذکرہ آرہا ہے۔ دس آیات تک یتیموں کے مال اور انکے متعلق دیگر مسائل آئیں گے۔

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوا
مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ج
فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ
أَيْمَانُكُمْ ط ذٰلِكَ أَدْنٰى أَلَّا تَعُولُوا ط ﴿۳﴾

ترجمہ:۔ اور اگر تم خوف کھاؤ کہ تم انصاف نہ کر سکو گے یتیم لڑکیوں کے بارے میں تو نکاح کرلو جو پسند ہو تم کو اُن کے علاوہ عورتوں میں سے دو دو ، تین تین ، چار چار ۔ پس اگر تم خوف کھاؤ کہ ان میں انصاف نہ کر سکو گے ، پس ایک عورت ہی کافی ہے یا (ان لونڈیوں سے فائدہ اُٹھاؤ) جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہیں ۔ یہ بات زیادہ قریب ہے کہ تم ایک طرف نہ جھک پڑو گے ﴿۳﴾

ربط آیات

سورۃ کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا ، اور تمام انسانوں کا ایک ہی نفس سے پیدا کرنے کا ذکر فرمایا ۔ پھر اسی ایک نفس سے اُس کا جوڑا پیدا کیا اور پھر تمام نسل انسانی کو پھیلایا ۔ اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اختیار کرنے اور قرابت داروں سے حسن سلوک کی وصیت فرمائی ۔ انسانی حقوق کی ادائیگی کا حکم فرمایا ، اور خاص طور پر یتیموں کے حقوق کی حفاظت کی تلقین کی کہ اُن کے مال حیلے بہانے سے مت کھاؤ بلکہ بالغ ہونے پر اُن کے مال اُن کو واپس کر دو ۔

یتیم لڑکیوں سے نکاح

یتیموں کے مالی حق کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یتیم لڑکیوں کے نکاح کا مسئلہ بیان فرمایا ہے ۔ بخاری ، مسلم ، نسائی ، مستدرک حاکم اور حدیث کی بعض دوسری کتابوں

میں یہ روایت آتی ہے۔ کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضؓ سے ان کے بھانجے عروہؒ بن زبیر رضؓ نے اس آیت وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی کے متعلق دریافت کیا، تو آپ نے فرمایا یا ابن اختی یعنی اے میرے بھانجے! اللہ تعالیٰ نے یہ آیت یتیم لڑکیوں کے بارے میں نازل فرمائی ہے۔ اور اس کے ذریعے اُنکے حقوق کو تحفظ دیا ہے۔ نزول قرآن کے زمانے میں بعض اوقات ایسا ہوتا تھا۔ کہ کوئی لڑکی یتیم ہوگئی ہے، وہ خود بھی صاحب جمال ہے اور ترکے میں مال بھی ملا ہے۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ اُس لڑکی کا سرپرست یا متولی اُس کا قریبی رشتہ دار چچازاد یا تایازاد وغیرہ بن گیا ہے۔ تو ایسی صورت میں سرپرست کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ وہ یتیم لڑکی سے خود ہی نکاح کرلے تاکہ خوبصورت لڑکی بھی حاصل ہوجائے اور اس کا مال بھی قبضے میں رہے۔ وہ لوگ ان چیزوں کو کا لالچ تو کرلیتے تھے مگر نہ تو وہ اُن کی حیثیت کے مطابق مہر دیتے تھے اور نہ اُن سے حسن معاشرت رکھتے تھے۔ اس قباحت کے سدباب کے لیے اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا کہ اگر تم ایسی لڑکیوں کو پورا مہر ادا نہیں کرسکتے۔ اور ان سے بہتر سلوک کے روادار نہیں ہوسکتے تو پھر اُن سے نکاح بھی نہ کرو۔ یہ ناجائز ہے

اس زمانے میں یتیم لڑکیوں سے ایک دوسری زیادتی بھی بسا اوقات کی جاتی تھی۔ لڑکی اگرچہ صاحب مال ہے۔ مگر صاحب جمال نہیں۔ سرپرست خود تو اس سے نکاح کی خواہش نہیں رکھتا۔ مگر دوسری جگہ بھی نکاح کرنے سے پس وپیش کرتا ہے کہ لڑکی کے ساتھ اُسے مال سے بھی محروم ہونا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی قبیح حرکت سے بھی منع فرمایا کیونکہ اس سے یتیم لڑکیوں کی حق تلفی ہوتی تھی۔

چار عورتوں سے نکاح

ارشاد باری تعالیٰ ہے وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی اگر تمہیں اس بات کا خوف ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف کے تقاضے پورے نہیں کرسکو گے۔ یعنی تم اُن کو پورا مہر ادا نہیں کرسکو گے یا

اُن سے حسنِ سلوک نہیں رکھو گے تو پھر اُن سے خود نکاح مت کرو۔ بلکہ دستور کے مطابق ان کے نکاح دوسری جگہ کردو اور اُن کا مال بھی اُنکی تحویل میں دے دو۔ اس میں کسی قسم کی خیانت نہ کرو۔ اور اگر تم خود نکاح کرنا ہی چاہتے ہو تو اُن یتیم لڑکیوں کی بجائے فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ نکاح کرو دیگر ایسی عورتوں سے جو تم کو پسند ہوں۔ اور پھر یہ بھی کہ تمہیں صرف ایک عورت کے لیے پابند نہیں کیا گیا بلکہ تمہیں توفیق ہے تو مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ دو دو، تین تین اور چار چار عورتوں سے بھی بیک وقت نکاح کر سکتے ہو۔ مقصد یہ کہ یتیم لڑکیوں سے زیادتی نہ کرو بلکہ اس کے بدلے میں اگر تم مالی اور جسمانی لحاظ سے مضبوط ہو تو چار عورتوں تک نکاح میں رکھ سکتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اجازت فرمادی ہے۔

فطرت کے اعتبار سے انسان تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ادنیٰ درجے کے لوگ جن کی قوتِ باہ معمولی قسم کی ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ ایک بیوی پر اکتفا کرتے ہیں۔ درمیانی قوت کے مالک لوگ دوسری بیوی کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ اگر وہ دوسرا نکاح نہ کریں تو گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے لہٰذا ایسے لوگوں کو دوسرا نکاح کرنے کی اجازت ہے۔ اور اگر کوئی شخص جسمانی اور مالی اعلیٰ درجے کی طاقت رکھتا ہے۔ حق و انصاف کے تقاضے پورے کر سکتا ہے تو پھر اُسے چار عورتوں تک سے نکاح کی اجازت ہے۔ تاکہ وہ اپنی فطری خواہش کی تکمیل شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے کر سکے۔

نکاح کی شرط

بیک وقت چار عورتوں سے نکاح کی اجازت کو اللہ تعالیٰ نے انصاف کے ساتھ مشروط فرمایا ہے۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا اگر تمہیں اس بات کا ڈر ہو کہ ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی صورت میں تم تمام بیویوں سے انصاف نہ کر سکو گے، فَوَاحِدَةً تو پھر تمہارے لیے ایک بیوی ہی کافی ہے، دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر

نکاح کرنا ہے تو پھر اس کے تمام تقاضے منجملہ انصاف، مہر اور حسن معاشرت وغیرہ پورے کرنا ہوں گے۔ اور ایک بیوی کی صورت میں تم بیوی کے علاوہ اپنی نفسانی خواہش اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اُن لونڈیوں سے بھی پوری کر سکتے ہو جو تمہاری ملکیت میں ہیں۔ لونڈیوں سے نکاح کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری ملکیت ہونا ضروری ہے۔ اگر ایسا ہے تو تم ان سے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہو اور اگر اس کا نکاح دوسری جگہ کر دو تو خود بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ صرف خدمت لینے کے مجاز ہو۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے ایک مسلمان امتی کے لیے بیک وقت چار عورتوں سے نکاح کی اجازت فرمادی بشرطیکہ ایسا شخص بیویوں کے درمیان انصاف کر سکے۔ انصاف کی تفصیل آگے آئے گی اور اس سے مراد مکان، لباس، خوراک، مہر، لین دین، شب باشی وغیرہ میں مساوات کا قیام ضروری ہے۔ البتہ دلی رغبت کسی ایک طرف ہونا، یہ غیر اختیاری چیز ہے اور مباح ہے۔ اور اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ بیویاں رکھ کر ان کے ساتھ انصاف نہیں کریگا۔ تو حضور علیہ السلام نے فرمایا قیامت کے دن ایسے شخص کا آدھا جسم فالج زدہ ہوگا، اور وہ سخت عذاب میں مبتلا ہوگا۔

تحدید نکاح

اسلام نے چار عورتوں سے نکاح کی اجازت دے کر اس اباحت کو چار تک گویا محدود کر دیا ہے۔ کوئی مومن بیک وقت چار سے زیادہ نکاح نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر کوئی بیوی فوت ہوگئی یا طلاق واقع ہوگئی، تو اس کی بجائے اور نکاح کر سکتا ہے مگر بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتا، یہ حرام ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں تو بیویوں کی کوئی حد مقرر نہ تھی، ہر شخص جتنی چاہتا بیاہ لاتا، مگر اسلام نے اس کو چار تک محدود کر دیا۔ قبیلہ ثقیف کا غیلان ثقفی رض جب مسلمان ہوا تو اس کے نکاح میں دس عورتیں تھیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا ان میں سے اپنی پسند کی چار عورتیں رکھ لو اور باقیوں کو آزاد کر دو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اسی طرح قبیلہ اسد کے عمیر اسدی رض اسلام لائے

تو اُن کی آٹھ بیویاں تھیں۔ انہوں نے بھی چار کو فارغ کر دیا اور چار اپنے پاس رکھ لیں۔ اسی طرح ایک اور صحابی کے متعلق آتا ہے کہ ان کے نکاح میں پانچ عورتیں تھیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اِختر اربعاً منھن ان میں سے چار کو اختیار کر لو اور ایک کو چھوڑ دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے۔ کہ چار تک تحدید نکاح صرف امتی مسلمان کے لیے ہے۔ پیغمبر علیہ السلام کی ذات اس تحدید سے مستثنیٰ ہے یہ نبی کی خصوصیت ہے جسے اللہ نے سورۃ احزاب میں واضح فرما دیا ہے۔ نبی ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ بیویاں رکھ سکتا ہے، اس پہ کوئی پابندی نہیں۔ اور یہ اجازت ہر نبی کی شریعت میں موجود رہی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دو بیویاں تھیں۔ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام وغیرہم کی متعدد بیویاں تھیں اور اسی طرح نبی آخر الزمان نے اپنی زندگی میں کل پندرہ نکاح کیے۔ ان میں سے تیرہ بیویوں کے ساتھ آپ کی مقاربت بھی ہوئی اور دو ایسے ہی الگ ہو گئیں۔ تاہم ایک وقت میں آپ کی زیادہ سے زیادہ نو بیویاں تھیں۔ مقصد یہ کہ نبی پہ چار نکاح کی پابندی نہیں ہے۔

اسلام کے خلاف پراپیگنڈا

مفسر قرآن مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں۔ کہ مغربی اقوام نے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف پراپیگنڈا کے ہتھیار کو مؤثر طور پہ استعمال کیا ہے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اسلام کی ترقی کو روکنے کے لیے اور حربہ کارگر ثابت نہیں ہو رہا ہے تو انہوں نے اسلام کے مختلف مسائل کو بہانہ بنا کر اس کے خلاف پراپیگنڈا کی مہم کو تیز تر کر دیا اور دو سو سال تک مسلسل پراپیگنڈا کرنے کے بعد مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اسلام کے مسئلہ تعدد ازواج کو سب سے زیادہ اچھالا۔ اور یہ پراپیگنڈا کیا کہ مسلمان عیاش ہیں، شہوت پرست ہیں ان کا اسلام ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ حالانکہ بات سیدھی سادھی

ہے۔ اسلام نے تعدد ازواج کو کوئی فرض واجب قرار نہیں دیا بلکہ محض اجازت دی ہے اور وہ بھی مشروط یعنی اگر کوئی شخص جسمانی اور مالی لحاظ سے اس قدر مضبوط ہے کہ وہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکتا ہے اور پھر اُن کے درمیان انصاف بھی کر سکتا ہے تو اُسے اجازت ہے، لازم نہیں ہے۔ انگریز، جرمن، اور فرانسیسی اور دنیا بھر کے یہودیوں نے تعدد ازواج کے مسئلہ میں پیغمبر آخر الزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات کو خاص طور پہ اپنے طعن کا نشانہ بنایا۔ اور یہاں تک پراپیگنڈا کیا کہ مسلمانوں کا پیغمبر (نعوذ باللہ) عیاش تھا۔ اس نے اپنے حرم میں بہت سی بیویاں رکھی ہوئی تھیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ تمام سابقہ انبیاء کی شرائع میں تعدد ازواج روا تھا۔ اور ہمارے نبی اکرم کو اللہ تعالیٰ نے خود قرآن پاک میں تحدید نکاح سے مستثنیٰ قرار دیدیا۔ جہاں تک (نعوذ باللہ) عیاشی کا تعلق ہے آپ کی پوری زندگی اس الزام کے خلاف بطور شہادت موجود ہے آپ علیہ السلام کی تمام بیویوں میں سے ایک کے سوا کوئی بھی دوشیزہ نہیں تھی۔ ساری بیویاں معمر اور بیوہ تھیں۔ کسی کا ایک خاوند فوت ہو چکا تھا اور کسی کے دو خاوند۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کا پچیس ۲۵ سے پچاس سالہ دور جو شباب کا دور کہلاتا ہے اپنے سے پندرہ سال بڑی ایک بیوہ عورت کے ساتھ گذار دیا۔ جب تک آپ کی پہلی بیوی حضرت خدیجہؓ زندہ رہیں آپ نے دوسرا نکاح نہیں کیا۔ تو کیا آپ کو بڑھاپے میں زیادہ بیویاں کر کے نفسانی خواہش کی تکمیل مقصود تھی؟ ہرگز نہیں۔ آپ کا تعدد ازواج محض اسلام کی ترویج و ترقی کی خاطر تھا۔ اسلام کو گھر گھر پہنچانا تھا۔ لہٰذا آپ نے مختلف قبائل سے رشتۂ ازواج قائم کر کے تبلیغ اسلام کا اہم فریضہ ادا کیا۔

قرآن پر حملہ

مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں۔ کہ غیر مسلم اقوام نے پراپیگنڈا کے طور پر دوسرا حملہ اللہ کی آخری کتاب قرآن پاک پہ کیا اور یہ مشہور کیا۔ کہ قرآن پاک اپنے ماننے والوں کو غیر مہذب بناتا ہے۔ چنانچہ وزیر اعظم برطانیہ گلیڈسٹون

نے برطانوی پارلیمنٹ میں قرآن ہاتھ میں لے کر کہا تھا۔ کہ جب تک یہ کتاب دنیا میں موجود ہے، انسان مہذب اور شائستہ نہیں بن سکتا۔ فحاشی، عیاشی، زنا، شراب نوشی اُن کے فیشن میں داخل ہے مگر قرآن ان چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے لہذا یہ کتاب دنیا کو تہذیب یافتہ بنانے میں رکاوٹ ہے۔ اُدھر ہندوستان میں یوپی کے انگریز گورنر سر ولیم مور نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات LIFE OF MUHAMMAD لکھی جسے سر سید جیسا جدت پسند بھی پڑھ کر تڑپ اٹھا۔ اس کتاب میں مصنف نے لکھا تھا کہ انسانیت کی دشمن دو چیزیں ہیں اور وہ ہیں محمد کا قرآن اور اسکی تلوار۔

جبری مسلمان

مولانا فرماتے ہیں کہ اسلام کا تیسرا مسئلہ جسے اِن لوگوں نے تختۂ مشق بنایا، وہ یہ تھا۔ کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے اور اس دین میں لوگوں کو جبراً مسلمان بنایا جاتا رہا ہے۔ یہ اتنا بڑا جھوٹ ہے جسے کوئی سلیم الفطرت آدمی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ خود قرآن پاک میں موجود ہے لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ" دین میں کوئی جبر نہیں۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ مسلمانوں نے کبھی کسی کو جبراً مسلمان نہیں بنایا۔ دنیا کے بڑے حصے میں مسلمان ایک عرصہ تک غالب رہے مگر کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی۔ ہمیشہ اسلام کی تعلیمات اور اپنا اخلاق و کردار پیش کر کے اسلام کی دعوت دی گئی ہے۔ مگر کسی کو مجبور نہیں کیا گیا۔ برصغیر میں کابل سے لے کر برما تک مسلمانوں کو آٹھ سو سال تک اقتدار حاصل رہا مگر تاریخ سے ثابت نہیں کیا جا سکتا کوئی ایک شخص بھی جبر و اکراہ کی بنا، پر حلقہ بگوش اسلام ہوا ہو۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک، خلافت راشدہ اور عالم اسلام کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے مسلمانوں کی طرف سے جبر کا شائبہ تک نہیں ملے گا۔ برخلاف اس کے عیسائیوں کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ انہوں نے سپین، روس، چین اور دیگر بہت سے ممالک میں مسلمانوں کو یا تو بالکل ختم کر دیا یا انہیں اپنا

دین چھوڑنے پر مجبور کیا گیا

لونڈی غلام کا مسئلہ

اسلام میں لونڈی غلام کا مسئلہ بھی ہمیشہ سے غیر مسلم اقوام کی طعن و تشنیع کا ہدف رہا ہے۔ اور پراپیگنڈا یہ کیا جاتا ہے۔ کہ اس کو اسلام نے جائز قرار دیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نزولِ قرآن کے دور میں لونڈی غلام پوری دنیا میں موجود تھے۔ یہ ایک بین الاقوامی رواج تھا، جو ساری دنیا میں پایا جاتا تھا، مسلمانوں نے تو اسے ایجاد نہیں کیا۔ جنگ ہوتی، مرد و زن قیدی بنا لیے جاتے، پھر یا تو انہیں قتل کر دیا جاتا یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جاتا یا پھر غلام اور لونڈی بنا لیے جاتے۔ ان سے مشقت لی جاتی اور حسب ضرورت ان کی خرید و فروخت بھی ہوتی۔ اسلام نے لونڈی غلام کو فرض واجب قرار نہیں دیا بلکہ اس کی اجازت جاری رکھی، اگر دنیا بھر کے لوگ اس کاروبار کو ترک کر دیں تو اسلام کو اس پہ کوئی اصرار نہیں۔ چنانچہ آج پوری دنیا میں لونڈی غلام کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ اب اہل اسلام بھی اسے ترک کر چکے ہیں۔
روم اور ایران میں ہزاروں سال تک لونڈی غلام کی خرید و فروخت ہوتی رہی تاہم اسلام نے اس رواج کو ختم کرنے کی مقدور بھر کوشش کی۔ لونڈی غلام کو آزاد کرنے والے کو بہت بڑے اجر و ثواب کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ چنانچہ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ کتنے ہی صحابہ کرامؓ نے کتنی بڑی تعداد میں غلام خرید خرید کر آزاد کیے۔ اس کے علاوہ اسلام نے لونڈی غلام کی آزادی کو تعزیرات میں شامل کر دیا۔ چنانچہ بلا عذر فرض روزہ توڑنے کا کفارہ دوسری تعزیرات کے ساتھ ایک غلام کی آزادی بھی رکھا۔ اسی طرح ظہار کے مسئلہ میں بھی اس کا کفارہ غلام کی آزادی ہے تو بہر حال مقصد یہ کہ اسلام نے تو لونڈی غلام کو دنیا میں ختم کرنے کیلئے عملی قدم اٹھایا، اور آج یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے۔ کہ اس قبیح رواج کے خاتمے کی ابتدا اسلام نے ہی کی۔

بہرحال فرمایا کہ اگر تم زیادہ بیویوں میں انصاف قائم رکھنے کی پوزیشن میں نہ ہو تو ایک بیوی پر اکتفا کرو یا اپنی مملوکہ لونڈیوں سے استفادہ حاصل کرو۔ ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَلَّا تَعُوْلُوْا یہ چیز زیادہ قریب ہے کہ تم ایک طرف نہ جھک پڑو گے بلکہ انصاف پر قائم رہو۔ یتیم لڑکیوں سے یا ایک سے زیادہ نکاح کر کے اُن سے ناانصافی نہ کرو۔ اس سے بہتر ہے کہ ایک بیوی اور اگر میسّر ہے تو لونڈی پر اکتفا کرو۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۚ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓئًا مَّرِيْٓئًا ۝۴

ترجمہ :- اور دے ڈالو عورتوں کو ان کے مہر خوشئ خاطر سے اور اگر وہ خوش کریں تمہارے لیے دِل کو اس میں سے کسی چیز سے، پھر تم اُس کو کھاؤ خوش گوار اور خوش ہضم ۝۴

ربطِ آیات

ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے انسانی حقوق خصوصاً رشتہ داروں کے حقوق کی حفاظت کا حکم دیا۔ پھر یتیموں کے متعلق ارشاد فرمایا کہ اُن کے مال مت کھاؤ۔ یتیم لڑکیوں کے ساتھ ناانصافی سے منع فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا کہ اگر تم یتیم لڑکیوں کے ساتھ نکاح کرنے کی صورت میں اُن سے حق و انصاف نہ کر سکو، تو پھر اُن کی بجائے دوسری عورتوں سے نکاح کرو۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کسی ایک مرد کے لیے نکاح کی چار عورتوں تک تحدید کر دی اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ تم سب بیویوں سے یکساں سلوک کر سکو۔ تعدد ازدواج کی محض اجازت دی ہے اُسے لازم قرار نہیں دیا۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ اگر انصاف کو قائم نہ کر سکو تو پھر صرف ایک نکاح پر اکتفا کرو۔ البتہ لونڈیوں سے بغیر نکاح کے مستفید ہونے کا تذکرہ فرمایا۔

مہر کی اہمیت

آج کی آیت بھی نکاح ہی سے متعلق ایک اہم مسئلہ مہر کے بارے میں ہے اللہ تعالیٰ نے نکاح میں مقرر کردہ مہر کو خوش دلی سے ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور یہ حکم ہر نکاح کے ضمن میں ہے۔ خواہ وہ یتیم لڑکی سے ہوا ہو یا عام عورت سے۔ مہر سے متعلق بعض مسائل سورۃ البقرہ میں بھی بیان ہو چکے ہیں۔ اور کچھ ارشادات سورۃ احزاب میں بھی آئیں گے۔ اس سورۃ میں اس آیت کے علاوہ آگے جہاں محرماتِ نکاح کا ذکر آتا ہے۔ وہاں بھی مہر کا تذکرہ ہے۔ محرمات میں ماؤں، بیٹیوں، بہنوں، پھوپھیوں، خالاؤں، بھتیجیوں، اور

بھانجیوں وغیرہ کا ذکر کرنیکے بعد فرمایا کہ ان کے علاوہ تمہیں دوسری عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت ہے مگر اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ یعنی نکاح میں مال ضرور خرچ کرنا ہوگا اور اس سے مراد خاص طور پر حق مہر کی ادائیگی ہے ایک اور جگہ پر فرمایا قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ "ہم جانتے ہیں وہ چیزیں جو ہم نے مردوں پر فرض قرار دی ہیں۔ اور فرائض میں سے مہر بھی ایک فرض ہے۔

مہر کا نصاب

مہر کے نصاب کے متعلق فقہائے کرام میں تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے امام شافعیؒ اور بعض دیگر ائمہ کرام فرماتے ہیں کہ قلیل تر چیز بھی مہر بن سکتی ہے۔ حتی کہ مٹھی بھر کھجوریں، لوہے کی انگوٹھی، ایک آنہ، دو پیسے وغیرہ بھی مہر مقرر ہو سکتا ہے بشرطیکہ عورت اس پر رضامند ہو۔ تاہم امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مہر کی کم از کم مقدار دس درہم کے برابر ہونی چاہیئے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ مہر کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے مال کا ذکر کیا ہے اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ اور مال میں کچھ تو ہونا چاہیئے۔ کم از کم دس درہم کی چوری ہو تو چور کو قطع ید کی سزا دی جاتی ہے۔ نیز ایک روایت میں صراحتاً بھی آتا ہے لا مهر اقل من عشرة دراهم یعنی دس درہم سے کم مہر نہیں۔ لہٰذا مہر کی کم از کم مقدار دس درہم ہے۔

نکاح میں مہر اگرچہ فرض ہے۔ مگر بوقت نکاح اس کا تذکرہ ضروری نہیں۔ نکاح ایجاب و قبول کا نام ہے، لہٰذا جانبین کی رضامندی سے مہر کے بغیر بھی نکاح ہو جاتا ہے، تاہم اسے یہاں میاں بیوی بعد میں بھی مقرر کر کے لے دے سکتے ہیں۔ مقررہ مہر میں کمی بیشی کی بھی اجازت ہے، اگر زیادہ مقرر کیا ہے تو باہمی رضامندی سے کم بھی کیا جا سکتا۔ یا کم ہے تو اسے زیادہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ تاہم احناف کے مطابق مہر کی کم از کم مقدار دس درہم ہونی چاہیئے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے۔ کہ وزن کے حساب

سے ایک درہم تین ماشہ ایک رتی کے برابر ہوتا ہے اس لحاظ سے دس درہم ساڑھے اکتیس ۳۱½ ماشے بنتے ہیں۔ ایک تولہ بارہ ماشے کا ہے۔ لہٰذا مہر کی کم از کم مقدار دو تولے ساڑھے سات ماشے چاندی کے برابر ہوئی۔ چاندی کے موجودہ بازاری نرخ کے مطابق اتنی چاندی کی قیمت ایک سو ساٹھ پینسٹھ روپے بنتی ہے۔ لہٰذا فقہ حنفی کے مطابق کم از کم مہر کی مقدار یہ ہے۔ البتہ زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں۔ اس زمانے میں بتیس ۳۲ روپے کو شرعی حق مہر سمجھا جاتا ہے جو کہ درست نہیں۔ ہر زمانے میں چاندی کے نرخ میں کمی بیشی سے مہر کا تعین سکہ رائج الوقت کے مطابق کیا جاسکتا ہے۔ جو کہ ساڑھے اکتیس ماشے چاندی کی قیمت کے برابر ہونا چاہیئے۔ اگر کسی نکاح میں اس سے کم مہر مقرر ہوا ہو تو اُسے بعد میں پورا کر لینا چاہیئے۔

صدقہ کا معنیٰ

اس آیت کریمہ میں مہر کے لیے صَدُقٰتِهِنَّ کا لفظ استعمال ہوا ہے صَدُقَات جمع کا صیغہ ہے اور اس کا واحد صَدُقَةٌ ہے، جس کا معنیٰ حق مہر ہے۔ محض اعراب کے فرق سے ایک لفظ صَدَقَةٌ ہے۔ جس کا معنیٰ صدقہ خیرات ہے۔ اس کی جمع صَدَقَات آتی ہے۔ جو شخص صدقہ خیرات کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُسے بُری موت سے بچاتا ہے۔ صدقہ سے اچھی عاقبت کی اُمید ہوتی ہے اگر صَدُقَۃٌ کی دال پر سکون آجائے تو اس کا معنیٰ سختی ہوتا ہے۔ عربی شاعر نے اپنے شعر میں اس لفظ کو یوں استعمال کیا ہے ؎

ولنا قناة من ردينة صدقة
زوراء كذالك حاملها ازور

ہمارے ردینی نیزے بڑے مضبوط اور ٹیڑھے ہیں جو کسی کے قابو میں نہیں آتے۔ ان کے اٹھانے والے بھی بڑے ٹیڑھے لوگ ہیں۔

نحلہ کا معنیٰ

یہاں پر نحلہ کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے جس کا لغوی معنیٰ عطیہ ہے عطیہ چونکہ اپنی خوشی سے دیا جاتا ہے، اس لیے اس آیت میں انہی معنوں

میں استعمال ہوا ہے۔ کہ عورتوں کے مہر خوشی خاطر سے ادا کرو۔ حدیث شریف میں آتا ہے مَا نَحَلَ وَالِدٌ وَلَدَہٗ کسی باپ نے اپنے بیٹے کو اس سے اچھا عطیہ نہیں دیا کہ وہ اُسے اچھا ادب سکھا دے۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت میں آتا ہے کہ بشیرؓ کی دو بیویاں تھیں۔ دونوں سے الگ الگ اولاد تھی۔ ان میں سے نعمان کی ماں نے اپنے خاوند سے فرمائش کی کہ وہ فلاں غلام اس کے بیٹے نعمان کو دے دے۔ اور اس ہبہ کا گواہ حضور علیہ السلام کو بنائے۔ چنانچہ بشیرؓ نے یہ قصہ نبی علیہ السلام کی خدمت میں بیان کیا اور کہا کہ میں نے یہ غلام نعمان کو دے دیا ہے آپ گواہ بن جائیں تاکہ میری بیوی کو اطمینان حاصل ہو جائے۔ آپ نے پوچھا اَکُلَّ وَلَدِكَ نَحَلْتَہٗ مِثْلَ ھٰذَا کیا تو نے باقی اولاد کو بھی ایسا ہی عطیہ دیا ہے۔ جیسا کہ نعمان کو دیا ہے تو اُس نے عرض کیا، حضور! ایسا تو نہیں ہے۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جاؤ کسی اور کو گواہ بناؤ، میں اس ظلم پہ گواہ نہیں بن سکتا۔ آپ نے مزید فرمایا، کیا تم چاہتے ہو کہ تمہاری ساری اولاد نیکی میں برابر ہے، عرض کیا ہاں۔ فرمایا ساری اولاد میں سے صرف ایک بیٹے کو دینا زیادتی ہے، یا تو دونوں بیویوں کی ساری اولاد کو ایسا غلام دو یا اس کو بھی واپس لے لو۔ غرض یہاں پہ نحلہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

مہر کی ادائیگی

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ اور دے ڈالو عورتوں کو ان کے مہر خوشی خاطر سے۔ یعنی جو مہر مقرر ہو گیا ہے اُسے خوش دلی سے ادا کرو، اُسے بوجھ نہ سمجھو۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام نے زکوٰۃ اور قربانی کے متعلق بھی فرمایا کہ ان کو تاوان نہ سمجھو۔ یہ عبادت ہے اور قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے لہٰذا طِیْبُوْا بِهَا نَفْسًا یہ تمہارے ذمہ لازم ہے۔ اسے خوشی سے ادا کیا کرو۔ مہر بھی ایک قسم کا عطیہ ہے جو کسی چیز کا معاوضہ نہیں ہوتا۔ نہ ہی یہ کسی چیز کی بیع ہے بلکہ بیوی کے ساتھ دلجوئی اور احسان

کا معاملہ ہے۔ مہر ادا کرنے سے انسان عورت کے اعضائے مستورہ کا مالک نہیں بن جاتا، البتہ عقد نکاح کی وجہ سے اُسے فائدہ اٹھانے کی اجازت ہوتی ہے۔ بہر حال اللہ نے عورتوں کے حق میں یہ مہر مقرر کیا ہے، اُسے خوش دلی سے ادا کرنا چاہیئے۔ یہ معاشرت کے اعتبار سے بھی ضروری ہے۔

مہر کی ادائیگی کے لیے معجل اور مؤجل دونوں صورتیں روا ہیں۔ یہ فوراً بھی ادا ہوسکتا ہے اور مؤخر بھی کیا جاسکتا ہے۔ مہر کا کچھ حصہ فوری اور کچھ حصہ بعد میں عند الطلب بھی ادا ہوسکتا ہے تاہم بہتر یہی ہے کہ پورا مہر فوراً ادا کر دیا جائے۔ بہت بڑا مہر مقرر کر کے زندگی بھر ادا نہ کرنا بڑی غلط بات ہے۔ یہ حقوق العباد کا مسئلہ ہے اور مقررہ مہر ادا نہ کرنے کی صورت میں قیامت کے دن مؤاخذہ ہوگا۔

مہر مطابق حیثیت

مہر کے تقرر میں مبالغہ آرائی سے منع فرمایا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے لا تغالوا فی الصدقات لوگو! مہر کے معاملہ میں مبالغہ آرائی نہ کرو۔ اگر مہر کی زیادتی عزت کا باعث ہوتی تو اللہ تعالیٰ یقیناً پیغمبر علیہ السلام کو حکم دیتا کہ وہ زیادہ سے زیادہ مہر مقرر کریں۔ مگر صورتحال یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے اپنی بیویوں اور بیٹیوں کا حق مہر پانچ سو درہم سے زیادہ مقرر نہیں کیا، ماسوائے ام المؤمنین ام حبیبہؓ کے کہ اُن کا نکاح حبشہ میں نجاشی نے کرایا تھا اور چار ہزار درہم مہر اپنی طرف سے ادا کیا تھا۔ بہر حال اگرچہ شریعت میں اس کی تحدید نہیں کی گئی، مگر حد سے زیادہ مہر مقرر نہیں کرنا چاہیئے بلکہ یہ جانبین کی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ مہر زیادہ مقرر کر کے ادا نہ کرنا قیامت کو قابل مؤاخذہ ہے۔ مہر بھی ایک قرض ہے لہٰذا اگر کوئی شخص بغیر ادا کیے مرگیا تو اُس کے ترکہ میں سے دیگر قرض کی طرح ادا کیا جائیگا، وصیت پوری کی جائیگی اور پھر باقی مال حصہ داروں میں تقسیم ہوگا۔ مہر عورت کا مالی حق ہے اسی لیے فقہائے کرام فرماتے ہیں، کہ

اگر عورت مہر کی وصولی سے قبل مرد کی قربت سے انکار کر دے، تو اُس کو اختیار ہے۔ بہر حال مہر حیثیت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ دس، بیس یا پچاس ہزار روپے مہر مقرر کرنا جب کہ خاوند کی حیثیت دو ہزار روپے کی بھی نہ ہو، مناسب نہیں۔ اور مرد پر خواہ مخواہ بوجھ ڈالنے والی بات ہے۔ اس سے اعراض کرنا چاہیئے۔

مہر کی معافی

ہاں! اگر عورت خود برضا و رغبت معاف کر دے تو اُس کو اجازت ہے فرمایا فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا یعنی اگر عورتیں تمہیں کسی چیز سے خوش کر دیں۔ اپنی خوشی سے مقرر مہر میں سے آدھا، چوتھائی دو تہائی یا کم و بیش معاف کر دیں، تو یہ تمہارے لیے جائز ہے۔ عورت کو حق حاصل ہے کہ چاہے تو سارے کا سارا مہر بھی خاوند کو ہبہ کر دے اسکو ابراء کہتے ہیں۔ مگر عورت کو معاف کرنے پر مجبور نہیں کیا جائیگا اس طرح آپ دنیوی قانون سے تو بچ سکتے ہیں مگر اللہ کے ہاں معاف نہیں ہو گا اس معاملہ میں عورت پر نہ دباؤ ڈالنا چاہیئے اور نہ اُسے الجھانا چاہیئے، وہ از خود سارا یا کچھ حصہ معاف کر دے تو اس صورت میں فرمایا فَكُلُوْهُ پس اُس کو کھاؤ۔ کھانے سے مراد محض کھانا ہی نہیں بلکہ استعمال کرنا ہے۔ کیونکہ عورت نے جو چیز معاف کی ہے وہ ضروری نہیں کہ کھانیوالی چیز ہی ہو۔ مثلاً، زیور، مکان، زمین یا کارخانہ ہے تو وہ استعمال میں ہی آئیگا۔ اکل کا لفظ اِن معنوں میں بیشتر مقامات پر استعمال ہُوا ہے جیسے لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوا "سود نہ کھاؤ" لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ" آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے مت کھاؤ۔ الغرض فرمایا کہ اگر عورت مہر معاف کر دے تو پھر تم وہ چیز اپنے تصرف میں لا سکتے ہو۔

ہمارے ملک میں بعض احکام شریعت رواج کی نذر ہو جاتے ہیں۔ عام طور پر عورتوں کو مکان یا زمین میں سے وراثت کا حصہ نہیں دیا جاتا۔ اُن سے

رسمی طور پر کہ دیا جاتا ہے۔ کہ اگر وہ باپ کی وراثت کے مکان یا زمین وغیرہ سے حصہ لینا چاہیں تو لے سکتی ہیں۔ وہ بھی رواج کے مطابق کہتی ہیں۔ کہ نہیں، بھائیوں کے پاس رہنے دو۔ مہر کا مسئلہ کچھ ایسا ہی ہے۔ عورت سے کہ دیا لینا ہے یا معاف کرنا ہے، وہ بھی خاندان کے روبرو کہ دیتی ہے کہ معاف کیا، اگرچہ وہ دل سے راضی نہ ہو۔ یہ درست نہیں ہے۔ عورت کا حصہ وراثت سے ہو یا مہر ہو، اُسے پہلے ادا کرنا چاہیئے، اگر کوئی غیر منقولہ جائداد ہے اُس کے نام رجسٹری کرانا چاہیئے۔ وہ اپنی ملکیت میں آنے کے بعد اگر خوشی سے واپس کرنا چاہے تو کر دے۔ مگر بغیر ادا کیے ہی معاف کرا لینا اس پر دباؤ ڈالنے کے مترادف ہے۔

مہر کا تصرف

جب مہر ادا کر دیا جائے تو عورت اُسکی مالک بن جاتی ہے۔ لہذا اُسے اُس مال میں مکمل تصرف حاصل ہوتا ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر اس کے سرپرست بھی تصرف نہیں کر سکتے بعض آئمہ کرام تو یہ فرماتے ہیں کہ کم سن یا دوشیزہ لڑکی کا ولی اس کی ملکیت میں تصرف کر سکتا ہے۔ مگر یہ بات درست نہیں۔ مہر کی مالکہ خواہ باکرہ ہو ثیبہ کم سن ہو یا عمر رسیدہ اُسے مہر پر مکمل تصرف حاصل ہے اور اس کا یہ حق ضائع نہیں ہونا چاہیئے۔ عورت مہر کی رقم کسی دوسرے رشتہ دار کو دے سکتی ہے۔ صدقہ خیرات کر سکتی، اپنی ذات پر استعمال کر سکتی ہے اور اس کا کُل یا جزو معاف بھی کر سکتی ہے۔

خوشگوار خوش ہضم

فرمایا پس کھاؤ هَنِيْٓـًٔا خوشگوار مَّرِيْٓـًٔا خوش ہضم مقصد یہ ہے۔ کہ جو چیز تمہیں معاف کر دی گئی ہے۔ اُسے تم خوب مزے سے کھا سکتے ہو یا بلا جھجک استعمال کر سکتے ہو۔ چونکہ پہلے فَكُلُوْا آیا ہے لہذا اس نسبت سے هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا آیا ہے۔ شاہ عبد القادر دہلویؒ اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔ کھاؤ اس کو رچتا پچتا عربی میں مرء الطعام اُس کھانے کو کہتے ہیں جو ہضم ہو کر جزو بدن بن جائے۔ خوراک بننے اور ہضم ہونے میں

کہ کسی قسم کی دقت نہ ہو۔ الغرض فرمایا کہ معافی کی صورت میں تم مہر کا مال استعمال کر سکتے ہو۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ⑤

ترجمہ:- اور نہ دو بیوقوفوں کو اپنے مال جو کہ اللہ نے تمہارے لیے قیام اور گزران کا ذریعہ بنائے ہیں اور اُن کو کھلاتے رہو اِن مالوں سے اور پہناتے رہو اور کہو ان سے معقول بات ⑤

ربط آیات

انسان کی تخلیق اور اُس کے اجتماعی حقوق کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یتیموں کے مال کھانے سے منع فرمایا، نیز یہ کہ یتیم لڑکیوں کے ساتھ ناانصافی مت کرو اگر تم ان کے حقوق ادا نہیں کر سکتے، مقررہ مہر نہیں دے سکتے اور اُن کیساتھ معاشرتی سلوک بھی نہیں کر پاتے تو پھر اُن کے ساتھ نکاح نہ کرو، بلکہ اُن کی بجائے دوسری عورتوں سے نکاح کرو جو تم کو پسند ہوں۔ اس کے بعد تعدد ازدواج کا مسئلہ بھی بیان فرما دیا اور یہ بھی واضح کر دیا کہ زیادہ عورتوں کی صورت میں اگر تم اُن کے درمیان انصاف نہ کر سکو، تو پھر ایک ہی نکاح کافی ہے، اس سے زیادہ مت کرو۔ البتہ تم اپنی مملوکہ لونڈیوں سے بغیر نکاح کے استفادہ حاصل کر سکتے ہو۔ اگلی آیت میں اللہ نے یہ تلقین فرمائی کہ عورتوں کے مہر خوش دلی سے ادا کرو۔ یہ تمہارے ذمہ اُن کا حق ہے۔ اگر وہ اپنی خوشی سے مہر کا کچھ حصہ یا پورے کا پورا معاف کر دیں یا عطیہ دے دیں یا وصول ہی نہ کریں تو وہ تمہارے لیے حلال طیب ہے۔ اُسے کھا سکتے ہو یا استعمال میں لا سکتے ہو۔ ابتدائے سورۃ سے لے کر دس آیتوں تک یتیموں کے متعلق ہی احکام

آ رہے ہیں - اس کے بعد وراثت کے مسائل بیان ہوں گے ۔

مال کی حفاظت

یتیموں کے اموال اور عورتوں کے مہر کی ادائیگی کے سلسلے میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا یہ رقوم ہر حالت میں متعلقین کی تحویل میں دے دی جائیں خواہ وہ اس کی حفاظت کے اہل ہوں یا نہ ہوں ؟ یتیموں کے مال کی ادائیگی کے وقت کا بیان تو اگلی آیت میں آرہا ہے ، تاہم درمیان میں اللہ تعالیٰ نے مطلقاً مال کے متعلق فرمایا وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمْ بیوقوفوں کو اپنے مال نہ سپرد کرو ۔ سفہا جمع ہے سفیہ کی اور سفیہ بے عقل یا بیوقوف شخص کو کہا جاتا ہے ۔ ایسا انسان جو اپنے نفع نقصان کو نہیں سمجھ سکتا ۔ پہلے پارے کے آخری رکوع میں آتا ہے ۔ "وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهِيمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ" یعنی ملت ابراہیمی سے وہی شخص اعراض کریگا جس نے اپنے آپ کو بیوقوف بنالیا ۔ کوئی دانا اور سمجھدار آدمی ایسی غلط بات نہیں کرسکتا اور اب اس آیت میں ارشاد ہے کہ اپنے مال بے عقلوں یا بے وقوفوں کے سپرد نہ کرو ۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ مفسر قرآن فرماتے ہیں کہ یہاں پر بیوقوفوں سے مراد عورتیں اور بچے ہیں ۔ اور منشائے ایزدی یہ ہے ۔ کہ لوگو ! اپنی موجودگی میں اپنا مال و متاع اپنے بیوی بچوں کے سپرد نہ کر بیٹھو ۔ عورتیں فطرتاً کم عقل ہوتی ہیں اور بچے نادان ہوتے ہیں اگر تم اپنی زندگی میں مال تقسیم کر کے خود فارغ ہو کر بیٹھ جاؤ گے تو یہ تمہارے لیے نقصان کا باعث ہوگا ۔ تم خود مالک تھے ، عورتوں اور بچوں کے کفیل تھے مگر اب مال تقسیم کر کے خود اُن پر بوجھ بن جاؤ گے ۔ اسی لیے وراثت یا مال کی تقسیم زندگی میں کر دینا پسندیدہ فعل نہیں ہے ۔ فقہائے کرام ، محدثین اور علمائے کرام فرماتے ہیں کہ اس قسم کی تقسیم انسان کے مرنے کے بعد ہی ہونی چاہیئے ۔ اور اس کا مفصل ذکر آگے اسی سورۃ میں آرہا ہے ۔

غرضیکہ فرمایا بیوقوفوں کو اپنے مال نہ دو اَلَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ

قِیٰمًا وہ مال جسے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے قیام اور گزران کا ذریعہ بنایا ہے مقصد یہ ہے۔ کہ جو مال تمہارے پاس جائز ذرائع سے پہنچا ہے، وراثت سے حصہ ملا ہے، تجارت کی ہے، مزدوری وغیرہ کی ہے اور تمہارے گزر اوقات کا انحصار اسی پر ہے تو اسے بیوقوفوں کے سپرد کر کے ضائع نہ کر لو۔ وہ اپنی کم عقلی کی وجہ سے اس مال کی حفاظت نہیں کر سکتے جس کا نتیجہ یہ ہو گا۔ کہ تم مال سے محروم ہو کر مشکلات کا شکار ہو جاؤ گے۔

مال کا حسن و قبح

قرآن پاک میں اس بات کا کثرت سے تذکرہ آتا ہے کہ اکثر مالدار لوگ سرکشی کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اللہ کی نافرمانی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور لوگوں کے حقوق ادا نہیں کرتے۔ جب مال کی محبت حد سے بڑھ جاتی ہے تو حلال و حرام کی تمیز اُٹھ جاتی ہے اور پھر انسان "وَجَمَعَ فَاَوْعٰی" کا مصداق بن جاتا ہے۔ وہ ہر وقت مال جمع کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے اور پھر جب بہت سا مال جمع ہو جاتا ہے تو اس پر فخر کرنے لگتا ہے۔ مشرکین اور دیگر نافرمان لوگ یہی کہتے تھے۔ "نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا" ہمارے پاس مال بھی بہت ہے اور ہمارے نوجوان بیٹے بھی ہیں، ہمیں کس بات کی پرواہ ہے۔ اللہ کے باغی یہاں تک کہہ دیتے ہیں "وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ" ہم کچھ بھی کرتے رہیں ہم عذاب میں مبتلا نہیں ہوں گے۔ ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ مقصد یہ کہ مال کی وجہ سے ہی بعض اوقات انسان خدا تعالےٰ کا باغی ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں مال کے ایک دوسرے پہلو کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے "اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ" بیشک تمہارے مال اور اولاد تمہاری آزمائش کا ذریعہ ہیں۔ مال و اولاد کے ذریعے انسان تقربِ الٰہی حاصل نہیں کر سکتا، اُس کے لیے تو ایمان اور عمل صالح

کی ضرورت ہے۔ مگر مال و اولاد کے ذریعہ اللہ تعالیٰ آزمائش کرتا ہے کہ ان نعمتوں کے حاصل ہونے پر وہ اللہ کا مزید شکر گزار بندہ بنتا ہے یا اس کا باغی بن جاتا ہے۔ جائز طریقے سے کمایا ہوا مال تو بلاشبہ نعمتِ الٰہی ہے مگر ناجائز طریقے سے حاصل کردہ یہی مال انسان کے لیے وبالِ جان ہے اگلے جہان میں اُسے اِس کا حساب چکانا ہوگا۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے نعم المال للرجل الصالح مال اچھی چیز ہے۔ لیکن نیک انسان کے لیے۔ اور نیک وہی ہوگا۔ جو خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور قیامت پر ایمان رکھتے ہوئے سب سے پہلے اللہ کا حق ادا کرے اور پھر اس کے عطا کردہ مال میں سے مخلوق کا حق ادا کرے، وہی اچھا ساتھی ہے مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ مال اُس شخص کے لیے اچھا ہے لِمَنْ اَدّٰی حَقَّ اللہ جو اللہ کا حق ادا کرتا ہے اور بندوں کا حق بھی ادا کرتا ہے۔ اگر ایسا نہیں کرتا، تو وہی مال انسان کے لیے سرکشی اور اکڑ کا باعث بنے گا۔ حضرت ابُو ذر غفاری رضؓ کی روایت میں آتا ہے کہ اُن سے کسی نے دریافت کیا کہ انہیں بیت المال سے کچھ وظیفہ ملتا ہے، کیا وہ قبول کرلیں؟ سائل کو شبہ تھا کہ بیت المال کے مال میں ایسا مال نہ ہو کہ کسی کے ساتھ زیادتی کرکے حاصل کیا گیا ہو۔ آپ نے فرمایا کہ یہ مال لے لیا کرو۔ جب کہ یہ تمہارے لیے زندگی میں باعثِ اعانت ہو۔ البتہ یاد رکھو اِذَا کَانَ ثَمَنًا لِدِیْنِكَ جب یہی مال تمہارے دین کی قیمت بن جائے۔ یعنی بیت المال کے عمال اس وظیفے کے بدلے تم سے کوئی خلافِ شرع کام لینا چاہیں فَدَعْهُ پھر اس کو چھوڑ دو۔ یہ حرام ہے۔

ملکیت اور تصرف

حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کا یہ ارشاد ہے کہ عورتیں اور بچے بے سمجھ ہوتے ہیں اس لیے مال ان کے سپرد مت کرو۔ اس کا مطلب یہ نہیں، کہ انہیں مال کی ملکیت حاصل ہونے سے روک رکھو، بلکہ مقصد یہ ہے کہ

مال کے مالک تو وہی ہوں گے مگر انہیں اس میں تصرف سے روکو کہ کہیں غلط تصرف سے مال کو ضائع نہ کر دیں۔ اگر عورتوں کو مال پر مکمل تصرف حاصل ہو گا تو وہ اُسے فیشن اور دیگر فضول کاموں پر خرچ کریں گی۔ اور اگر مال بچوں کے ہاتھ میں آ گیا تو وہ کھیل تماشے پتنگ بازی، آتش بازی وغیرہ میں اڑا دیں گے لہذا انہیں بھی مال پر مکمل کنٹرول نہ دو۔ بعض لوگ قیمتی مال کو رسومات باطلہ پر ضائع کر دیتے ہیں یا پھر بدعات پر خرچ کر ڈالتے ہیں، قبروں کی پختگی، اُن پر گنبدوں کی تعمیر، چادر پوشی، قوالی اور چڑھاوے کی نذر کر دیتے ہیں۔ یہ سب بے سمجھی کی باتیں ہیں۔ شادی اور غمی کی فضول رسومات مال کا خواہ مخواہ ضیاع ہے۔ اور یہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں نہیں آنا چاہیے جو اسراف کے مرتکب ہوں۔ مشکوٰۃ شریف میں حضرت سفیان ثوریؒ کی روایت موجود ہے الحلال لا یحتمل سرفا یعنی حلال مال اسراف کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد بھی ''لَا تُسْرِفُوْا'' فضول خرچی نہ کرو۔ دوسرے مقام پر فرمایا ''اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ'' فضول خرچ شیطان کے بھائی ہیں۔ بلا وجہ تقریبات کا اہتمام، چراغاں، قمقمہ بازی، جھنڈیاں بے تحاشا کھانے، سب فضول خرچی میں داخل ہیں۔ جو کوئی مال کو غلط مقام پر خرچ کریگا قیامت کے دن مواخذے میں آئیگا۔ اسی لیے فرمایا کہ مال کو بیوقوفوں کے حوالے نہ کرو۔ یہ تمہارے لیے ذریعہ گزران ہے، غلط ہاتھوں میں دے کر اُسے ضائع نہ کرو۔

فرمایا مال کو اپنے پاس رکھو، اُس پر اپنا تصرف قائم رکھو مگر کسی کا حق ضائع نہ کرو۔ بیوی بچے تمہاری کفالت میں ہیں تو اُن کی جائز ضروریات پوری کرو وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا اس مال میں سے اُن کی خوراک کا بندوبست کرو۔ وَّاكْسُوْهُمْ انہیں لباس بھی پہناؤ مگر فضول کاموں کے لیے مال مت دو۔ مسلم شریف کی روایت میں حضور علیہ السلام کا فرمان

مبارک ہے نھی عن اضاعۃ المال حضور نے مال کے ضیاع سے منع فرمایا ہے۔ لہٰذا مال کو ضائع نہ کرو بلکہ اس کی حفاظت کرو اور جائز امور پر خرچ کرو۔

دُعا کی نامقبولیت

امام شافعیؒ نے حضرت ابُوموسیٰ اشعریؓ کی روایت بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے تین قسم کے آدمی ایسے ہیں جن کی دُعا قبول نہیں ہوتی۔ فرمایا پہلی قسم کا شخص وہ ہے۔ جس کی عورت بدکار ہے نہ وہ اسے برائی سے روک سکتا ہے اور نہ علیحدہ کرتا ہے۔ ایسے شخص کو چاہیئے۔ کہ ایسی عورت کو اپنے پاس نہ رکھے۔ اگر عورت تائب ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ اُسے طلاق دے۔ فرمایا جو ایسا نہیں کرتا وہ دیوث ہے اور اس کی دعا مستجاب نہیں ہوتی۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا دوسرا شخص جس کی دُعا قبول نہیں ہوتی، وہ ہے جو اپنا مال بیوقوف کے سپرد کر دیتا ہے۔ جو اُسے ضائع کر دیتا ہے۔ یہ شخص گنہگار ہو گا اور اس کی دُعا بھی قبول نہیں ہوگی۔ فرمایا تیسرا آدمی وہ ہے جو قرض دیتا ہے مگر اُس پہ گواہ نہیں بناتا۔ اسی کوتاہی کی وجہ سے اکثر جھگڑے پیدا ہوتے ہیں جن کی نوبت قتل و غارتگری تک پہنچتی ہے۔ مقدمات قائم ہوتے ہیں۔ اور لوگ سخت پریشان ہوتے ہیں۔ فرمایا ایسے شخص کی دُعا بھی مستجاب نہیں ہوتی۔

خوش کلامی

فرمایا عورتوں اور بچوں کو کھلاؤ اور پہناؤ، ان کی ضروریات زندگی پوری کرو، انہیں تنگ نہ کرو۔ ضرورت کے مطابق خرچہ بھی ادا کرو مگر مال اُن کے تصرف میں نہ دو کہ ضائع کر دیں گے، البتہ وَقُولُوا لَهُم قَوْلًا مَّعْرُوفًا انہیں دستور کے مطابق اچھی بات کہو۔ اُن کو سمجھا دو کہ یہ مال تمہارا ہی ہے مگر ہم اس کی حفاظت کریں گے، اُسے ضیاع سے بچائیں گے، تجارت میں لگا کر منافع حاصل کریں گے اور تمہیں اس سے فائدہ ہو گا۔ اگر تم مال کو کھیل تماشے میں ضائع کر دو گے

تو خالی ہاتھ رہ جاؤ گے۔ غرضیکہ اُن سے اچھی بات کہو کہ اُن کی دل شکنی بھی نہ ہو اور مال بھی بچ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے یہی تعلیم دی ہے۔ اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے وہ مدت بیان فرمائی ہے جب یتامیٰ اس عمر کو پہنچ جائیں کہ اُن کا مال اُن کے حوالے کیا جا سکے۔ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَإِنْ آنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوٓا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ۖ وَلَا تَأْكُلُوهَآ إِسْرَافًا وَّبِدَارًا أَنْ يَّكْبَرُوا ۚ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيبًا ﴿۶﴾

ترجمہ :- اور یتیموں کو آزماتے رہو۔ یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں، پس اگر تم اُن سے سمجھ معلوم کرو تو اُن کے مال اُنکو دے دو اور نہ کھاؤ یتیموں کے مالوں کو حد سے بڑھتے ہوئے اور جلدی کرتے ہوئے کہ کہیں وہ بڑے نہ ہو جائیں۔ اور جو شخص غنی ہو اُس کو چاہیئے کہ وہ یتیم کے مال سے بچتا رہے، اور جو شخص فقیر ہو وہ دستور کے مطابق کھائے۔ پس جب تم ان کے مال اُن کو دے دو پس ان پر گواہ بناؤ اور اللہ کافی ہے حساب لینے والا ﴿۶﴾

یتیموں کی تربیت اور امتحان

گذشتہ درس میں یہ بیان تھا کہ بے عقلوں کو مال کی سپرداری مت کرو کہیں وہ ناسمجھی میں نقصان نہ کر بیٹھیں۔ مال کی نگرانی خود کرو، اور انہیں حسب ضرورت کھلاتے پلاتے رہو، اور انہیں سمجھاتے بھی رہو کہ تم اُن کے خیر خواہ ہو اور جو کچھ کر رہے ہو اُن کے بہترین مفاد میں ہے۔ اب آج کی آیت میں اس بات کا تذکرہ ہے۔ کہ ناسمجھوں کو

اپنے ساتھ کاروبار میں شریک کر کے ان کی تربیت کرو، اور گاہے بگاہے ان کا امتحان بھی لیتے رہو، جب وہ اہل ہو جائیں تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى اور یتیموں کو آزماتے رہو۔ اُن کا امتحان لیتے رہو۔ اور امتحان اُسی صورت میں ہوگا جب اُن کی تربیت کی جائیگی۔ تو مقصد یہ ہے کہ جب تک یتیم اپنی جائداد کا انتظام خود چلانے کے قابل نہیں ہو جاتے۔ تم خود متولی کی حیثیت سے کام کرتے رہو اور ساتھ ساتھ اُن کی مناسب تربیت بھی کرو تاکہ وہ اس قابل ہو جائیں کہ اپنا کاروبار خود سنبھال سکیں۔

فرمایا انہیں آزماتے رہو حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ حتیٰ کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں یعنی بالغ ہو جائیں۔ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا اور پھر تم معلوم کر لو کہ اب وہ سمجھ بوجھ سے کام لینے لگے ہیں۔ اُن میں اچھے بُرے اور نفع نقصان کی تمیز پیدا ہو گئی ہے وہ کاروبار چلا سکتے، دکان چلا سکتے ہیں یا کارخانے کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے سکتے ہیں یا کھیتی باڑی کر سکتے ہیں تو فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ اُن کے مال اُن کے سپرد کر دو۔ تاکہ وہ اپنی ذمہ داری محسوس کریں اور اپنا کام آپ سنبھالیں۔

سن بلوغت

اس آیت کریمہ میں سن بلوغت کے لیے "نکاح کی عمر" کے الفاظ آئے ہیں تاہم مراد بلوغت ہی ہے۔ اس ضمن میں فقہائے کرام میں معمولی سا اختلاف ہے کہ سن بلوغت کس عمر میں شروع ہوتا ہے۔ اکثر فقہاء کرام جن میں امام شافعیؒ امام مالکؒ، امام محمدؒ شامل ہیں نیز امام ابو حنیفہؒ کے دونوں شاگرد امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ ان سب کا قول ہے کہ نکاح کی عمر یا سن بلوغت پندرہ سال ہے تاہم حقیقی بلوغ لڑکے کے لیے جب احتلام آجائے اور لڑکی کے لیے جب حیض آجائے ـــ بلوغت کے لیے یہ قطعی علامات ہیں مگر ان میں کمی بیشی ہو سکتی ہے بعض اوقات لڑکے کو عرصہ تک احتلام نہیں آتا یا لڑکی کو حیض

نہیں آتا تو اس صورت میں بلوغ پندرہ سال سے شمار ہو گا۔ اس ضمن میں امام ابو حنیفہؒ کی دو روایات ہیں۔ ایک روایت کے مطابق سنِ بلوغت میں آپ بھی باقی آئمہ کے ساتھ متفق ہیں۔ اور دوسری مشہور روایت کے مطابق آپ لڑکے کا بلوغ اٹھارہ سال سے اور لڑکی کا سترہ سال سے شمار کرتے ہیں۔ بہر حال فرمایا کہ جب وہ سنِ بلوغت کو پہنچ جائیں اور ان میں سمجھ بوجھ پیدا ہو جائے تو انہیں اُن کے مال کی سپرداری دے دو۔ اب انہیں شرعی بالغ سمجھا جائے گا۔

ناجائز تصرف کی ممانعت

یتیموں کے متولیوں کو خاص طور پہ ہدایت فرمائی۔ کہ وہ سپرداری کے مال کو ناجائز طور پہ استعمال نہ کریں۔ فرمایا وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا اور نہ کھاؤ یتیموں کے مال کو اسراف کرتے ہوئے۔ اسراف حد سے بڑھنے کو کہتے ہیں اور یہاں مقصد یہ ہے۔ کہ جس مال کے متولی ہو اُس کو جائز طریقے سے استعمال کرو، ایسے ناجائز طریقے استعمال نہ کرو جن سے یتیم کا مال ضائع ہوتا ہو۔ یہ اسراف ہے وَبِدَارًا اور جلدی کرتے ہوئے بھی مال کو خرچ نہ کرو اس خیال سے أَن يَكْبَرُوا کہ وہ بڑے ہو جائیں گے۔ لہٰذا یتیموں کے سنِ بلوغت سے پہلے پہلے خوب خرچ کر لو، اس کے بعد تو مال اُن کو واپس کرنا ہی ہے اور پھر ہمارا تصرف ختم ہو جائے گا۔ مبادرت جلدی کو کہتے ہیں اور انسان سے جو کام جلدی میں سرزد ہو جاتا ہے اُسے بھی مبادرۃ کہتے ہیں فرمایا اس قسم کا غلط خیال دِل میں لا کر یتیم کے مال کو بے دریغ اڑانا درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِس کی ممانعت فرمائی ہے۔ حضرت شیخ الاسلام بھی یہی فرماتے ہیں کہ یتیم کے مال کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ اور صرف بوقت ضرورت اور بقدر ضرورت ہی خرچ کرنا چاہیئے۔

معاوضہ بمطابق حیثیت و ضرورت

اب سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا یتیم کا متولی اس کے مال میں سے

اپنی ذات کے لیے کچھ لے سکتا ہے یا نہیں۔ جو شخص یتیم کے مال کی حفاظت کرتا ہے، اسے کاروبار میں لگاتا ہے اس کی جائداد کی دیکھ بھال کرتا ہے، اپنا وقت اور استعداد لگاتا ہے، اسے کس حد تک معاوضہ حاصل کرنے کی اجازت ہے۔ اس سوال کے جواب میں اللہ رب العزت نے فرمایا وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ جو کوئی غنی یعنی مالدار ہے، وہ یتیم کے مال سے اجتناب کرے، اپنی پیش کردہ خدمات کا کچھ معاوضہ نہ لے۔ شرعی معیار کے مطابق غنی وہ شخص ہے جو صاحب نصاب ہے اور زکوٰۃ ادا کرتا ہے، قربانی دیتا ہے اور صدقہ فطر بھی ادا کرنے کا پابند ہے۔ مقصد یہ کہ اگر ایسا شخص اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی جائز ضرورت اپنے مال سے پوری کر سکتا ہے تو پھر وہ یتیم کی سرپرستی کا معاوضہ وصول نہ کرے۔ البتہ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا جو کوئی فقیر ہے۔ اس کا ذاتی اثاثہ اتنا نہیں ہے کہ وہ اپنے گھر کے اخراجات برداشت کر سکے اور اسے اپنا وقت اور استعداد یتیم کے مال کے انصرام میں لگانا پڑتا ہے۔ تو اس کو اجازت ہے فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ کہ وہ دستور کے مطابق یتیم کے مال سے اپنا معاوضہ لے سکتا ہے۔ بالمعروف سے مراد یہ ہے۔ کہ وہ اپنی خدمات کا جائز اور بقدر ضرورت معاوضہ لے۔ محض یتیم کا مال سمجھ کر اسے ناجائز طور پر ہضم کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اگر ایسا کرے گا تو عند اللہ ماخوذ ہو گا۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اکابر علماء اور ہمارے اساتذہ میں سے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند میں ہم نے ان سے طحاوی شریف پڑھی تھی اپنے زمانے کے فقیہ تھے، اللہ تعالیٰ نے فقاہت میں وافر حصہ عطا فرمایا تھا آپ نے معارف القرآن کے نام سے قرآن پاک کی تفسیر بھی لکھی جو آجکل بہت متداول ہے۔ یہ تفسیر دراصل حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کی

تفسیر بیان القرآن کو سہل کرنے کی ایک کوشش ہے اور عام اُردو دانوں کے استفادہ کے لیے بڑی مفید ہے۔ صحت کے لحاظ سے بھی یہ تفسیر اعلیٰ درجے کی ہے کیونکہ اس میں غلطیاں بہت شاذ ہیں۔ تو صاحب تفسیر مولانا مفتی صاحبؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس آیت سے یہ عام قانون بھی سمجھ میں آتا ہے۔ کہ یہ حکم صرف یتیم کے مال کے سلسلے میں ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا اطلاق ہر قومی و ملکی ادارے کی خدمات کے سلسلے میں بھی ہوتا ہے۔ اس حکم کے تحت حکومت کے ادارے خصوصاً محکمہ اوقاف، تعلیمی اور انتظامی دفاتر، مساجد اور مدارس آتے ہیں۔ ان اداروں میں کام کرنیوالے لوگوں کو محض جذبہ خدمت کے تحت فرائض انجام دینے چاہئیں۔ جن لوگوں کے پاس اپنا ذاتی اثاثہ موجود ہو، جس سے وہ اپنی اور گھر بار کی جائز ضروریات پوری کر سکتے ہو، انہیں اِن اداروں میں کام کرنے کا کوئی معاوضہ وصول نہیں کرنا چاہیئے۔ البتہ جن کارکنان کی گزر اوقات کا اور کوئی ذریعہ نہ ہو، انہیں بیت المال میں سے مناسب معاوضہ حاصل کرنا جائز ہے اس میں حسب ضرورت کرایہ مکان، سفر خرچ وغیرہ وصول کیا جاسکتا ہے۔ تاہم جائز ضرورت سے زیادہ کھیل تماشے، ریڈیو، ٹیلیویژن، فرنیچر، فرج، قالین وغیرہ فضول خرچی میں شامل ہوں گے۔

اسراف کی ممانعت

اسراف کی ممانعت محض یتیم کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ فضول خرچی پوری قوم اور ملت کے ساتھ خیانت کے مترادف ہے۔ اگر اس کا مواخذہ دنیا میں نہ بھی ہو سکے تو آخرت میں تو لامحالہ اس کا حساب دینا پڑے گا۔ جس طرح گذشتہ آیت میں بے عقلوں کو مال کی سپرداری سے منع فرمایا گیا ہے کہ وہ اس کے اہل نہیں، اسی طرح یہ آیت کسی شخص کو ایسا عہدہ یا منصب دینے کی ممانعت کرتی ہے، جو اس کام کا اہل نہیں نااہل کو کسی اہم عہدے پر فائز کرنا قوم و ملت کے ساتھ خیانت ہو گی۔ کیونکہ ایسے شخص

کی نااہلی کا اثر پورے معاشرے پر پڑیگا۔ اور سارا نظام درہم برہم ہو جائیگا
حضرت مولانا عبید اللہ سندھی ؒ فرماتے ہیں۔ کہ اگر کوئی شخص مال کے ضیاع کا سبب بن رہا ہے تو اُسے فوراً روک دیا جائے۔ صرف حکومت ہی کی ذمہ داری نہیں بلکہ جماعتی یا انفرادی ہر سطح پر یہ ذمہ داری محسوس کی جانی چاہیئے۔ جس کسی کے دائرہ اختیار میں کوئی نقصان ہو رہا ہے، اُس کا فرض ہے۔ کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق اس کا سدباب کرے، وگرنہ وہ بھی اس نقصان کے اسباب میں شمار ہوگا۔ مگر بدقسمتی کی بات یہ ہے۔ کہ خود حکومت کے نمائندے فضول خرچی پر تلے ہوئے ہیں وہ دوسروں کو کیا روکیں گے۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

مدبر کہ قانون بدمی دہد
ترا می برد تا بہ آتش دہد

(بُرا قانون نافذ کرنے والا تجھے سیدھا جہنم کی طرف لے جاتا ہے)

مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ ہے، ہر حکومتی، اجتماعی اور انفرادی سطح پر اسراف و تبذیر کا بے دریغ ارتکاب کیا جارہا ہے۔ قبر پرستی، عُرس گنبد، چڑھاوے، پرتکلف، دعوتیں، بلاضرورت استقبال ایسی چیزیں ہیں جن پر لاکھوں روپیہ ضائع کیا جارہا ہے۔ شادی اور غمی کی رسومات میں کتنا روپیہ اور اناج ضائع کیا جاتا ہے۔ مگر کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ہر شخص دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں ہے۔ وہ نہیں سمجھتا کہ وہ رسم بد جاری کرکے ملک و ملت کا کتنا نقصان کر رہا ہے۔ ہماری ملت جس قدر شدید انحطاط میں اس وقت ہے، قدیم زمانے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

حضرت عمر بن خطابؓ فرمایا کرتے تھے، میں نے اپنے آپ کو بیت المال میں یتیم کے متولی کی طرح اتار رکھا ہے۔ جب میرے پاس ضروریات کے لیے ذاتی اثاثہ ہوتا ہے، تو بیت المال سے کچھ نہیں لیتا۔ اور جب پاس

کچھ نہیں ہوتا بیت المال سے قرض لے لیتا ہوں۔ جب کچھ آجاتا ہے، تو قرض واپس کر دیتا ہوں۔ حضرت عمرؓ کا یہ فعل تو اُن کی شانِ عالی پر دلالت کرتا ہے، وگرنہ ضرورت مند کو اپنی خدمات کا معاوضہ لینا بالکل جائز ہے۔

لین دین پر گواہی

یتیموں کے مال کی واپسی کے بارے میں فرمایا فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ جب تم اُن کے مال واپس کرو فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ تو ان پر گواہ بنالو۔ مقصد یہ ہے کہ لین دین فریقین صرف اپنے طور پر ہی انجام نہ دے لیں بلکہ ایسا کام گواہوں کے روبرو ہونا چاہیئے۔ تاکہ اگر کسی وقت کوئی تنازعہ پیدا ہو جائے تو اس سے نمٹنا آسان ہو۔ یہ معاملہ ہی ایسا ہے۔ کہ اس سے اغماض نہیں برتنا چاہیئے۔ سورۃ بقرہ کے آخر میں جہاں ادھار اور لین دین کے مسائل بیان ہوئے ہیں، وہاں پر بھی گواہ بنانے کی تلقین کی گئی ہے اور یہاں پر بھی فرمایا کہ جب تم یتیموں کو ان کا مال واپس کرو، تو اس پر گواہ قائم کر لو۔ بلکہ یہ اس طرف بھی اشارہ ہے۔ کہ جب یتیموں کے متولی کی حیثیت سے اُن کے مال کو قبضہ میں لو، تو اُس وقت بھی یہ لین دین گواہوں کی موجودگی میں کرو اور پھر اُن کے سن بلوغت کو پہنچنے پر جب واپس کرنے لگو تب گواہوں کے روبرو ایسا کرو۔ تاکہ سب کو علم ہو جائے کہ کسی متولی یا سرپرست نے کس قدر مال حاصل کیا تھا اور اب کتنا واپس کر رہا ہے۔ اس سے واضح ہو جائے گا۔ کہ یتیم کے مال میں کس قدر کمی بیشی ہوئی ہے۔ اور یہی چیز سرپرست کی دیانتداری کی ضمانت ہو گی۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لین دین گواہوں کی موجودگی میں کیا کرو۔

محاسبہ الٰہی

لین دین میں دیانتداری کا قانون بتلانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے توجہ دلائی کہ اگر تم قانون کی پابندی سے گریز کرو گے تو یہ نہ سمجھنا کہ تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ تم کسی نہ کسی طرح دنیا کے قانون کی نظر سے تو بچ سکتے ہو مگر یاد رکھو! وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا تمہارا حساب لینے کے لیے

تمہارا اللہ کافی ہے۔ جب اس کے دربار میں حاضر ہو گئے تو پھر وہاں کوئی حیلہ بہانہ نہیں چل سکے گا۔ وہاں پائی پائی کا حساب دینا ہو گا۔ عام طور پر مال و دولت انسان کی کمزوری ہے۔ اس کی چمک دمک دیکھ کر لوگ جائز و ناجائز کی تمیز کھو بیٹھے ہیں۔ تنخواہ، وظیفہ، بھتہ، الاؤنس وغیرہ کے مختلف ناموں سے روپیہ اکٹھا کیا جاتا ہے۔ معاملہ تعلیم کا ہو یا تبلیغ کا فتویٰ نکاح کا ہو یا طلاق کا، جب انسان کے دل میں دولت کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے تو تقویٰ کی پونجی ختم ہو جاتی ہے۔ پھر ایمان کا جنازہ نکل جاتا ہے، دیانت نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی اور انسان لالچ کا بندہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس وقت انسان بھول جاتا ہے کہ اس کا مواخذہ بھی ہونے والا ہے اور کسی نے اس کا حساب بھی لینا ہے۔ وَکَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیْبًا مگر یاد رکھو! اللہ کافی ہے حساب لینے والا۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ
وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ
مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ⑦

ترجمہ :- مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جسے والدین
اور قرابت داروں نے چھوڑا ہے اور عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے
جسے والدین اور قرابت داروں نے چھوڑا ہے تھوڑا ہو اس سے
یا زیادہ حصہ مقرر کیا ہوا ⑦

ربطِ آیات

گذشتہ آیت میں یتیم لڑکوں کے بالغ ہونے پر اُن کے مال اُن کو واپس لوٹانے کا مسئلہ بیان ہوا۔ گذشتہ سے پیوستہ میں مال کی حفاظت کا قانون تھا اور اس سے پہلے عورتوں کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرنے اور اُن کے مہر خوش دلی سے ادا کرنے کی تلقین تھی، اس سے پہلے یہ مسئلہ بیان ہوا تھا کہ یتیموں کے مال کو ناجائز طریقے سے کھاجانا سخت گناہ ہے۔ اب یہاں سے اللہ تعالیٰ نے وراثت کے قوانین کا آغاز فرمایا ہے۔ آج کی آیت میں تو قانونِ وراثت کا اجمالی تذکرہ ہے اور زمانہ جاہلیت میں عورتوں اور چھوٹے بچوں کے ساتھ وراثت کے معاملہ میں جو زیادتی ہوتی تھی، اُس کا رد کیا گیا ہے تاہم وراثت کے مفصل قوانین آگے آرہے ہیں۔

زمانۂ جاہلیت میں قانون وراثت

زمانہ جاہلیت میں دیگر معاشرتی قوانین کی طرح وراثت کے متعلق بھی کوئی مستقل قانون نہیں تھا، جو طریقہ رائج ہوگیا، اُسی کے مطابق نسل در نسل عمل ہوتا رہتا تھا۔ وراثت کے متعلق مروجہ دستور یہ تھا۔ کہ مرنے والے کے بیوی بچوں میں سے نہ تو بیوہ کو کچھ ملتا تھا اور نہ نابالغ بچوں کو دیا جاتا تھا۔ اگر مرنے والے کا کوئی جوان بیٹا ہوتا تو ساری وراثت کا حقدار

وہی سمجھا جاتا اور باقی بیوی بچے محروم رہ جاتے۔ وہ لوگ باپ کی وراثت کا حقدار اُس بیٹے کو سمجھتے تھے جو لڑائی میں حصہ لینے کے قابل ہو، تیر، تلوار یا نیزہ چلا سکتا ہو دشمن پر حملہ آور ہو سکتا ہو اور اپنا دفاع بھی کر سکتا ہو۔ چھوٹے بچے اس معیار پر پورے نہیں اترتے تھے لہٰذا انہیں ترکے میں سے کچھ نہیں ملتا تھا۔ تقریباً اسی قسم کا قانون ہندوؤں میں بھی پایا جاتا ہے۔ وہ بھی بڑے بیٹے کو ہی وارث بناتے ہیں۔ انگریزوں میں بھی کم و بیش یہی قانون رائج ہے۔ مگر ایسے تمام قوانین غلط اور ظالمانہ ہیں جن میں ساری اولاد کے ساتھ مساویانہ سلوک نہ کیا گیا ہو۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے وراثت کا وہ قانون نازل فرمایا جو حق و انصاف پر مبنی ہے اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔

شانِ نزول

آج کی آیت کریمہ کا شانِ نزول حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے ملتا ہے۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک صحابی اوسؓ بن ثابت فوت ہو گئے، صاحب جائداد تھے، اپنے پیچھے بیوی، دو بیٹیاں اور ایک کمسن بیٹا چھوڑا۔ مروجہ قانونِ وراثت کے مطابق ان میں سے کوئی بھی وراثت کا حقدار نہیں تھا۔ چنانچہ مرنے والے کے بھائیوں سوید اور عرفطہ نے ساری جائداد پر قبضہ کر لیا۔ حقیقی اولاد کے وراثت سے محروم ہونے کی بنا پر بطور عصبہ وہی مالک تھے۔ اس صورتِ حال میں حضرت اوسؓ کی بیوہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا حضور! اوس کے پس ماندگان میں سے ہم چار موجود ہیں مگر وراثت میں سے ہمیں کچھ بھی نہیں ملا اس لیے ہماری گزر اوقات کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔ کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے قانونِ وراثت کی یہ آیت نازل فرمائی۔

وراثت کا اجمالی قانون

وراثت کے تفصیلی احکام تو آگے آ رہے ہیں تاہم یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اجمالی طور پر یہ بات سمجھائی ہے کہ وراثت کا جاہلانہ دستور جس میں وراثت

صرف نوجوان بیٹوں کو ہی ملتی تھی اور عورتیں اور بچے محروم رہ جاتے تھے یہ بالکل غلط تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مرنے کے بعد والدین اور دیگر قرابت دار جو کچھ چھوڑ جائیں اُس میں مردوں کا حصہ ہے۔ اور اسی طرح وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ والدین اور اقربا کے ترکہ میں سے عورتوں کا بھی حصہ ہے۔ جہالت کے قانون کے تحت عورتوں کو محروم رکھنا ہرگز قرین انصاف نہیں، بلکہ اُن کے ساتھ صریحاً ظلم ہے۔ اور پھر اس میں چھوٹے بڑے کا بھی کوئی فرق نہیں۔ بیوی کا حصہ موجود ہے۔ بیٹا خواہ بڑا ہو یا چھوٹا برابر کا حصے دار ہے۔ اسی طرح ہر عمر کی بیٹیاں بھی اپنا حصہ وصول کرنے کی حقدار ہیں۔ عمر میں چھوٹا بڑا ہونے کی بنا پر وراثت کے حصہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ باپ کی وفات کے وقت ایک دن کے بچے کو بھی برابر کا حصہ ملیگا، بلکہ جو بچہ ابھی ماں کے پیٹ میں ہے وہ بھی وراثت میں برابر کا شریک ہے۔ شریعت اسلامیہ نے عورت مرد یا چھوٹے بڑے کی تمام تفریق ختم کر دی ہے۔ ہر وارث اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ حصہ وصول کرنے کا حقدار ہے۔

قانون وراثت میں استثناء

البتہ بعض استثناء ہیں جن میں حقیقی اولاد بھی وراثت سے حصہ نہیں لے سکتی۔ سب سے پہلے پیغمبر علیہ السلام کی ذات گرامی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے نحن معاشر الانبیاء لا نورث ما ترکنا صدقۃ یعنی ہم انبیاء کی جماعت مورث (جن کی وراثت تقسیم کی جائے) نہیں بنا کرتے، یعنی ہماری وراثت کسی کو نہیں ملتی۔ ہم جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں وہ غربا اور مساکین کے لیے صدقہ ہوتا ہے۔ گویا ایک تو پیغمبر کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی۔ ہاں پیغمبر اپنے باپ کی وراثت سے حصہ لے سکتا ہے بشرطیکہ باپ خود پیغمبر نہ ہو۔

وراثت میں دوسرا استثناء یہ ہے کہ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وراثت

تقسیم نہیں ہوتی۔ لَا یَرِثُ الْمُسْلِمُ الْکَافِرَ وَلَا الْکَافِرُ الْمُسْلِمَ یعنی نہ مسلمان کافر کا وارث بن سکتا ہے اور نہ کافر مسلمان کی وراثت میں سے حصہ لے سکتا ہے۔ اگر باپ مسلمان ہے اور بیٹا عیسائی، مرزائی یا کسی طرح مرتد ہو گیا ہے تو وہ باپ کی وراثت سے محروم ہو گیا ہے اسی طرح بیٹا مسلمان ہے اور باپ کافر ہے تو پھر بھی بیٹا کافر باپ کی وراثت نہیں لے سکتا۔ حضرت علیؓ اور حضرت جعفرؓ مسلمان تھے مگر اُن کے دو دوسرے بھائی کافر تھے۔ باپ کی وفات پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ہم کافر باپ کی جائداد سے حصہ لینے کے مجاز نہیں لہذا باپ کا مکان کافر بھائیوں طالب اور عقیل نے لے لیا۔ اگرچہ بعد میں فتح مکہ کے موقع پر عقیل بھی مسلمان ہو گئے تھے تاہم یہ طے شدہ قانون شریعت ہے کہ مومن اور کافر کے درمیان وراثت نہیں چلتی۔ یہ دوسری استثنا ہے۔

فرمایا تیسری استثنا یہ ہے کہ قاتل مقتول کا وارث نہیں بن سکتا۔ بیٹا باپ کو قتل کر دے یا بھتیجا ایسے چچا کو قتل کر دے جس کی وراثت اُس کو پہنچ سکتی تھی، تو اس قتل کی وجہ سے وہ مقتول کی وراثت سے محروم ہو جائے گا اسی طرح آزاد اور غلام کے درمیان بھی وراثت نہیں چلتی۔ باپ بیٹے میں سے کوئی بھی غلام ہے۔ تو اُس کی وراثت آزاد بیٹے یا آزاد باپ کو نہیں ملے گی۔ آزاد آدمی کی وراثت کا حقدار اُس کا آزاد وارث ہی ہو سکتا ہے۔

ارتکاز دولت

اس آیت کریمہ سے یہ بات بھی اخذ ہوتی ہے۔ کہ ترکہ کا مال بہر حال تقسیم ہونا چاہیئے مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ کَثُرَ تھوڑا ہو یا زیادہ، سب کا سب تقسیم ہو جانا چاہیئے۔ ترکہ میں نقدی ہو یا سامان، مکان ہو یا زمین، برتن ہوں یا کپڑے، کسی کمپنی کے حصص (SHARES) ہوں یا کارخانہ ہر چیز ورثا میں بانٹ دینی چاہیئے۔ اگر وراثت تمام وارثان میں بقدر حصہ تقسیم نہیں ہو گی، تو ارتکاز دولت پیدا ہو جائیگی اور یہ چیز اسلام کی روح کے منافی ہے سورۃ حشر میں جہاں مال فے کی تقسیم کا تذکرہ ہے وہاں فرمایا کہ اس

میں فلاں فلاں کا حصہ ہے کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ تاکہ دولت صرف دولتمندوں میں ہی مرتکز ہو کر نہ رہ جائے۔ اُسے غرباء و مساکین سب تک پہنچنا چاہیئے۔ معاشرے میں مال و زر کی مثال ایسے ہی ہے جیسے انسانی جسم میں خون ہے۔ جسم کے جس حصے میں خون کی گردش رُک جائیگی وہ حصہ مردہ ہو جائے گا۔ اسی طرح معاشرے کے جس طبقہ میں مال کی گردش نہیں پہنچتی وہ حصہ بھی ناکارہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ دولت کو پورے معاشرے میں گردش کرنا چاہیئے، کسی حصے میں بھی اِس کی رکاوٹ پسندیدہ نہیں وراثت کی تقسیم بھی گردشِ زر کا ایک ذریعہ ہے لہٰذا وراثت تمام حقداروں میں تقسیم ہونی چاہیئے۔ فرمایا اگر ایک گز کپڑا دس وارثوں میں قابلِ تقسیم ہے تو اُسے تقسیم کرنا چاہیئے۔ ہاں اگر ورثاء آپس میں طے کر لیں تو کوئی بھی ناقابلِ تقسیم چیز کسی ایک کے سپرد کر کے اُس حصہ دار سے اپنے حصہ کے مطابق نقدی وصول کی جاسکتی ہے۔ کارخانہ یا مکان ہے جسے عملی طور پر کئی حصے داروں میں تقسیم کرنے سے نقصان ہونے کا خطرہ ہے تو ایسی صورت میں اُس چیز کی قیمت مقرر کرو۔ پھر وہ چیز کوئی ایک حصہ دار اپنے ذمہ لے کر باقیوں کو بقدر حصہ روپیہ ادا کر دے یا پوری کی پوری جائداد فروخت کر کے تمام حصہ دار اپنا اپنا حصہ نقدی کی صورت میں وصول کر لیں۔ بہرحال فرمایا ارتکازِ دولت (CONCENTRATION OF WEALTH) نہیں ہونی چاہیئے۔ یہاں یہ چیز بھی یاد رہے کہ تقسیم وراثت صرف والدین اور اولاد کے درمیان ہی ضروری نہیں بلکہ شریعت کے مطابق جسے بھی حصہ پہنچتا ہے خواہ وہ چچا ہو یا تایا یا اُس کے بیٹے یا بھائی یا دادا یا پوتا ترکہ کا مال لازماً تقسیم ہونا چاہیئے۔ کسی حصے دار کا حصہ ضائع نہیں ہونا چاہیئے۔

وراثت کے حقدار

وراثت کا مفصل قانون آگے آرہا ہے۔ تاہم اجمالاً یوں کہا جاسکتا ہے۔ میت کا ترکہ اُس شخص کو پہنچے گا جو رشتہ میں باپ کی طرف سے

اُس کے زیادہ قریب ہو گا۔ پھر اُس سے دُور والا اور اُس کے بعد اُس سے دور کے رشتہ دار وراثت کے حقدار ہوتے ہیں قرآن و سنت کی رُو سے تین قسم کے رشتہ دار وراثت کے حقدار ہوتے ہیں یعنی ذوی الفروض، عصبات، اور ذوی الارحام، ذوی الفروض وہ قریبی رشتہ دار ہیں جن کے حصص قرآن پاک نے مقرر فرما دیئے ہیں اور یہ مختلف صورتوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ اِن میں کل وراثت کا آٹھواں، چوتھا، نصف یا کل حصہ قابل تقسیم ہوتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پہ وہ اقربا آتے ہیں جو میت کے زیادہ قریب ہوں، ان میں بیٹا، چچا، تایا اُن کے بیٹے وغیرہ آتے ہیں۔ یہ عصبات کہلاتے ہیں۔ اور تیسرے نمبر کے رشتہ دار ذوی الارحام کہلاتے ہیں۔ جب باپ کی طرف سے میت کا کوئی وارث موجود نہ ہو تو پھر ماں کی طرف سے رشتہ دار بھی وراثت میں شامل ہوتے ہیں جیسے ماموں، بھانجا وغیرہ۔

اس مسئلہ میں فقہائے کرام میں کچھ اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ امام شافعیؒ صرف دو قسم کے اقربا یعنی ذوی الفروض اور عصبات کی وراثت کے قائل ہیں وہ فرماتے ہیں۔ اگر ان دو اقسام میں سے کوئی وارث نہ ہو، تو ترکہ بیت المال میں جمع ہو جائے گا۔ البتہ امام ابو حنیفہؒ ذوی الارحام کو بھی وراثت میں حصہ دیتے ہیں بشرطیکہ پہلی دو اقسام یعنی ذوی الفروض اور عصبات میں سے کوئی موجود نہ ہو۔ حضور علیہ السلام کا اپنا فرمان بھی ہے الخال وارث من لاوارث لہ جب اور کوئی وارث نہ ہو تو ماموں بھی وارث ہے

مقررہ حصص

فرمایا وراثت کا مال تھوڑا ہو یا زیادہ اُس کی تقسیم بہر حال ہونی چاہیئے اور کم سے کم حصے دار کو بھی محروم نہیں کرنا چاہیئے۔ منشائے ایزدی یہی ہے۔ آگے فرمایا نَصِيبًا مَّفْرُوضًا اللہ تعالیٰ نے یہ حصے اپنی حکمت تامہ سے مقرر فرما دیئے ہیں۔ ان میں نہ تو کوئی کمی بیشی ہو سکتی ہے اور نہ کسی کو بالکل محروم کیا جا سکتا ہے۔ آگے صراحتاً یہ بیان آتا ہے۔ کہ وراثت کا قانون کسی انسان یا ادارہ مخلوق کا قانون نہیں بلکہ یہ قانون اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص حکمت سے وضع

فرمایا ہے اس میں ترمیم و تنسیخ کا کسی کو حق نہیں پہنچتا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس وارث کو کتنا حصہ ملنا چاہیئے، نیز یہ کہ تمہارے حق میں کون سی چیز بہتر ہے۔ بہرحال اس آیت میں اللہ نے وراثت کا اجمالی قانون بیان فرما دیا ہے، آگے تفصیلات آ رہی ہیں۔

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ
فَارْزُقُوهُمْ مِنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا ﴿٨﴾
وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً
ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا
قَوْلًا سَدِيدًا ﴿٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ
ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ
ع ۱۰/۱۲ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ﴿١٠﴾

ترجمہ :- اور جب وراثت کی تقسیم کے وقت قرابت دار، یتیم اور مسکین حاضر ہوں، تو اس میں سے ان کو بھی کھلا دو اور اُن کو دستور کے مطابق معقول بات کہو ﴿٨﴾ اور اُن لوگوں کو ڈرنا چاہیئے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑ جاتے، تو اُن کا کتنا خوف کھاتے۔ پس چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈریں اور سیدھی بات کہیں ﴿٩﴾ بیشک وہ لوگ جو یتیموں کا مال زیادتی سے کھاتے ہیں، بیشک وہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ کھاتے ہیں۔ عنقریب وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے ﴿١٠﴾

ربط آیات

سورۃ النساء کے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے زیادہ تر یتیموں کے حقوق بیان فرمائے ہیں۔ یتیموں کے ساتھ حسنِ سلوک، ان کی رہائش کا بندوبست، اُن کے مال کی حفاظت وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف کرنے

کی خاص طور پر تلقین فرمائی ہے۔ گذشتہ درس میں اللہ نے زمانۂ جاہلیت کے اُس دستور کا رد فرمایا جس کے ذریعے وہ لوگ عورتوں اور نابالغ بچوں کو وراثت سے محروم رکھتے تھے۔ اور اسلام کے قانونِ وراثت کا اجمالی تذکرہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ ہر مرد و زن، چھوٹے بڑے، جوان اور بوڑھے کے لیے وراثت میں حصہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ کسی شخص کی موت کے وقت اس کے جو قرابت دار موجود ہوں گے وہ اپنا حصہ حاصل کرنے کے حقدار ہوں گے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ وراثت کی ہر چیز تقسیم ہونی چاہیئے اور کسی حقدار کا حق ضائع نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر میت نے کسی سے قرضہ لینا ہے تو وصولی پر وہ بھی حصہ رسدی تقسیم ہو گا۔ اللہ نے فرمایا کہ یہ اُس کا مقرر کردہ قانونِ وراثت ہے۔

غیر ورثا سے حسن سلوک

آج کے درس میں اللہ جل شانہٗ نے اُن غیر وارث اقربا اور دیگر غربا و مساکین سے حسن سلوک کا حکم دیا ہے جو تقسیم وراثت کے وقت موجود ہوں۔ ارشاد ہوتا ہے وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى تقسیم وراثت کے موقع پر اگر قرابتدار آ جائیں۔ یعنی وہ عزیز و اقارب جو شرعاً اصل وراثت کے حقدار نہیں۔ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ یا کوئی دیگر یتیم مسکین وغیرہ جمع ہو جائیں۔ جیسا کہ ایسے مواقع پر اکثر ہوتا ہے تو فرمایا فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ اُس میں سے یعنی وراثت کے مال میں سے ایسے حاضر آمدہ لوگوں کو بھی کھلا پلا دو۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ یہ حکم مشترک مال میں سے کھلانے پلانے کا نہیں، بلکہ یہ خطاب اُن بالغ اور حاضر وارثوں سے ہے جو وراثت کا مال حاصل کریں۔ اپنا حصہ وصول کرنے کے بعد اُن کے لیے حکم ہے کہ وہ اپنے حصہ میں سے غیر وارث اقربا یا غریب غربا کو بھی کچھ دے دیں۔ یہ حکم نابالغ وارثوں کے لیے نہیں ہے۔ کیونکہ سن بلوغت تک انہیں مال میں تصرف حاصل نہیں اور غیر حاضر وارثان کے حصہ سے کوئی دوسرا حصے دار کوئی چیز ادا نہیں کر سکتا کیونکہ یہ اصل حصے دار کا ہی حق ہے۔ لہٰذا یہ حکم حاضر اور بالغ ورثا ان کے لیے ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں

کہ یہ حکم ابتدا میں اُس وقت تک کے لیے تھا جب تک وراثت کے مفصل احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ جب یہ احکام نازل ہو گئے وراثت کے حصے اللہ نے مقرر کر دیے تو پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا تاہم امام بیضاویؒ اور بعض دیگر مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کی رو سے یہ حکم بطور استحباب، اب بھی موجود ہے اگرچہ فرض واجب نہیں۔ لہٰذا اگر تقسیم وراثت کے وقت ایسے لوگ آجائیں تو انہیں دے دلا دینا مستحب ہو گا۔

نیز فرمایا وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ان سے معقول بات کرو تاکہ ان کی دل شکنی نہ ہو۔ مقصد یہ کہ کچھ تھوڑا بہت دے کر انہیں نرمی سے بات سمجھاؤ کہ بھئی! اس میں دوسروں کا بھی حق ہے اس لیے ہم زیادہ تو نہیں دے سکتے، جو خدمت کر سکتے ہیں اس کو خوش دلی سے قبول کر لو۔ اس قسم کے اُمیدواروں کے ساتھ سخت کلامی سے پیش آنا ہرگز درست نہیں۔ وہ اگرچہ وراثت میں حصے دار نہیں مگر امداد کے مستحق ہیں۔ اللہ نے تمہیں کچھ مال بغیر محنت کے دیا ہے تو اس میں سے غریب مسکین کی مدد بھی کر دو تاکہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے۔

مشترک مال کے مسائل

فقہائے کرام نے مشترک مال کے بہت سے مسائل بیان فرمائے ہیں۔ جس مال کے کئی حصہ دار ہوں وہ مال تمام حصہ داروں کی رضامندی کے بغیر خرچ نہیں کیا جا سکتا۔ کسی حصہ دار کی غیر حاضری میں کسی دوسرے کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ مال کی ادنیٰ سے ادنیٰ مقدار میں بھی تصرف کر سکے۔ اسی لیے فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ مشترک مال میں سے صدقہ خیرات بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح چھوٹے بچے جنہیں اپنے مال پر ابھی تصرف حاصل نہیں، ان کے مال کو کسی کے حوالے کر دینا خواہ صدقہ خیرات ہی ہو جائز نہیں کیونکہ جس طرح یتیم کا مال خود کھانا حرام ہے، کسی دوسرے کو کھلانا بھی حرام ہے۔ لہٰذا صدقہ خیرات کیسے ہو سکتا ہے، فوتیدگی کی رسومات منجملہ قل

اور چالیسواں وغیرہ جو مرنے والے کے مشترکہ مال سے ادا کی جاتی ہیں بالکل جائز نہیں۔ اس میں یتیموں، مسکینوں اور غیر حاضر وارثان کا حصہ ہے لہٰذا کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے کہ تمام حقداران کی اجازت کے بغیر اس میں سے خرچ کرے خواہ وہ ایصال ثواب کے لیے کیوں نہ ہو۔ البتہ بالغ وارثان اپنے حصے کا سارا مال بھی صدقہ خیرات کر دیں تو درست ہو گا۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ میت کا کفن دفن تو اسکے ترکہ سے ہو سکتا ہے۔ مگر میت کی چارپائی کے اوپر ڈالی جانے والی چادر اس مال سے نہیں خریدی جاسکتی کیونکہ یہ کفن کا حصہ نہیں بعض اوقات میت کو غسل دینے کے لیے نئے برتن خریدے جاتے ہیں۔ ترکے کا مال اس پر بھی خرچ نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ترکے کا مال تمام وارثان کا مشترک مال ہے۔ اوّل تو نئے برتن خریدنے ہی نہیں چاہئیں، پرانے برتنوں میں غسل جائز ہے اور اگر ضرور خریدنا ہے تو کوئی وارث اپنے ذاتی مال سے خریدے، مشترک مال استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ میت کے جسم پر جو کپڑے ہیں، اُن کا بھی یہی حکم ہے۔ کسی کو اختیار نہیں کہ وہ ان کپڑوں کو از خود صدقہ کر دے کیونکہ وہ ترکہ کے مشترک مال کا حصہ ہیں۔ جنازے کے لیے سوا گز کپڑے کا جائے نماز بنایا جاتا ہے جو یا تو صدقہ کر دیا جاتا ہے یا امام کو دے دیا جاتا ہے۔ یہ کپڑا بھی زاید ہے امیت کے مال سے نہیں خریدا جاسکتا کیونکہ یہ بھی مشترک مال کے حکم میں آتا ہے۔

بچوں کے ساتھ خیر خواہی

یتیم بچوں کے حقوق کی حفاظت اور اُن کے ساتھ خیر خواہی کے سلسلہ میں ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ذرا غور کرو اگر تمہارے بچے یتیم ہو جائیں تو تم اُن کی خاطر جس قدر فکر مند ہو گے اُسی قدر دیگر یتیم بچوں کے ساتھ حسن سلوک کرو، وہ بھی تمہاری ہمدردی کے مستحق ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا

خَافُوا عَلَيْهِمْ۔ اور چاہیئے کہ وہ لوگ اس بات سے ڈر جائیں کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑ جاتے، تو انہیں کتنا خوف ہوتا۔ وہ فکرمند ہو جاتے کہ اُن کے بعد اُن کے بچوں کے ساتھ لوگ کیسا سلوک کریں گے۔ اللہ تعالےٰ یہ بات سمجھا رہے ہیں کہ جو چیز تم اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ وہی دوسروں کے لیے پسند کرو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے بعد تمہارے چھوٹے بچوں کے ساتھ بہتر سلوک ہو، تو تم خود بھی یتیموں اور ضعیفوں کے ساتھ ہمدردانہ اور خیر خواہانہ سلوک کرو۔ یہ اہلِ اسلام کا اخلاق ہے جس کی تعلیم دی جا رہی ہے۔

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے[1] ان تحب لاخیک ما تحب لنفسک یعنی تم اس وقت تک کامل الایمان نہیں ہو سکتے جب تک تم اپنے بھائی کے لیے بھی وہی چیز پسند نہ کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ اگر تم اپنے لیے آرام و راحت کے خواہشمند ہو، اپنے بچوں کے ساتھ ہمدردی چاہتے ہو تو دوسروں کے ساتھ تم خود ایسا کرکے اپنے ایمان کی تکمیل کرو۔ اگر مسلمان میں یہ چیز پیدا نہیں ہوتی تو وہ اپنے دعویٰ ایمان میں سچا نہیں ہے۔ اگر نظام سرمایہ داری کی طرح لوٹ کھسوٹ ہی کرنا ہے تو دین سے کیا سیکھا۔ وہاں تو امیروں کے بچوں کے لیے تعلیم و تربیت کے اعلیٰ ادارے قائم ہیں مگر غریب کے بچے کو کسی ادنیٰ سکول میں بھی داخلہ نہیں ملتا یہ کہاں کا انصاف ہے۔ اسلام کی تعلیم تو یہ ہے۔ کہ جو اپنے لیے پسند کرتے ہو، وہی اپنے بھائی کے لیے بھی خواہش کرو۔

معیارِ تقویٰ

الغرض! فرمایا اپنے بچوں کی طرف دھیان کرکے دوسرے یتیم اور بیکس بچوں کا خیال کرو۔ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ پس چاہیئے کہ وہ لوگ اللہ سے ڈر جائیں تقویٰ کا معیار ہی یہ ہے خوفِ خدا اور حدودِ شریعت کی پابندی۔ اگر یہ معیار پیدا ہو جائے تو انسان کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرے گا، کسی کا حق نہیں کھائے گا۔ بلکہ دوسروں کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی سے

---

[1] بخاری صـ۶ جـ۱ و مسلم صـ۵۰ جـ۱ و ترمذی صـ۳۶۱ (فیاض)

پیش آئے گا۔

اور اگر تقویٰ کا عنصر ہی موجود نہیں ہے۔ خدا کا خوف نہیں آتا ظلم و جور کر کے پشیمان نہیں ہوتا۔ کفر، شرک اور معاصی کو ترک نہیں کرتا، تو وہ جو چاہے کرتا پھرے، کون پوچھنے والا ہے اُس کا حساب تو قیامت کو رب العزت کی بارگاہ میں ہی ہوگا۔ اسی لیے فرمایا اللہ سے ڈر جاؤ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا اور سیدھی بات کرو۔ زیادتی والی کوئی بات نہ کرو، خاص طور پر ضعیفوں کے ساتھ تند و تیز یا تلخ بات ہرگز نہ کرو، بلکہ معقول بات کرو۔ ان کے ساتھ ہمدردی اور خیر سگالی کی بات کرو، اُن کی حوصلہ افزائی کرو۔ اس سے تمہیں بھی فائدہ ہوگا اور دوسرے مسلمانوں کے لیے بھی دنیا اور عاقبت میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔

اکل حرام کی سزا

آگے اللہ تعالیٰ نے یتیموں کا مال ناجائز طریقے سے کھانے والوں کے لیے سزا کا تذکرہ کیا ہے اِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا بیشک جو لوگ یتیموں کا مال ناجائز طریقے سے کھاتے ہیں۔ اُن کے کم خرچ کو زیادہ ظاہر کرتے ہیں۔ اُن کے کاروبار میں ڈنڈی مارتے ہیں یا اُن کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر ہیرا پھیری کرتے ہیں ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا اِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وہ اپنے پیٹوں میں دوزخ کی آگ ڈال رہے ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے، حضور علیہ السلام نے فرمایا قیامت کے دن بعض لوگ قبروں سے اس حالت میں نکلیں گے، کہ اُن کے منہ سے آگ کے شعلے اُٹھ رہے ہوں گے۔ آپ نے یہ بیان کرنے کے بعد فرمایا کیا تم نے قرآنِ پاک میں یہ نہیں پڑھا اِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا۔ یہ لوگ دنیا میں لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے کھا کر اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے رہے، اب وہ ظاہر ہو رہی ہے۔

ملی نقصان

اس آیت سے مفسرین کرام یہ بھی اخذ کرتے ہیں کہ یتیموں کے

ساتھ ظلم و زیادتی، اُن کے حقوق کا ضیاع اور اُن کی حفاظت و سرپرستی سے دست کشی اُن کے لیے تو تکلیف دہ ضرور ہے مگر ایسا کرنا قومی اور ملی نقصان بھی ہے۔ اگر قوم کے یتیم بچوں کی حفاظت کا انتظام نہیں ہوگا تو لوگ اس خوف سے جہاد میں شریک نہیں ہوں گے کہ شہادت کی صورت میں اُن کے بچے یتیم ہو کر در بدر کی ٹھوکریں کھاتے پھریں گے اور اُن کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوگا۔ جب جذبہ جہاد ختم ہو جائیگا تو قوم غیروں کی مغلوب ہو جائیگی۔ اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہیگی۔ اس طرح قوم کے نوجوان لوگ بزدلی کا شکار ہو جائیں گے۔ جو کہ ایک بہت بڑا قومی نقصان ہوگا۔

جہنم میں داخلہ

فرمایا جو لوگ یتیموں کا مال ناجائز طریقے سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ ڈال رہے ہیں۔ آج تو خوب مزے سے لے لے کر کھاتے ہیں۔ مگر قیامت کے دن یہی مال آگ کی صورت میں ان کے پیٹوں سے برآمد ہوگا۔ اور پھر وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا وہ لوگ جہنم میں داخل ہو جائیں۔ انہیں اُس وقت معلوم ہوگا۔ کہ دنیا کی چند روزہ زندگی میں آرام کی خاطر انہوں نے یتیم کا حق غضب کیا۔ اور اب ہمیشہ کے لیے جہنم رسید ہو کر دائمی سزا میں مبتلا ہو رہے ہیں۔

پہلی دس آیات میں یتیموں سے حسن سلوک کا تذکرہ کرنے کے بعد آگے وراثت کے تفصیلی قوانین آرہے ہیں۔

یُوصِیکُمُ اللّٰہُ فِیۡ اَوۡلَادِکُمۡ لِلذَّکَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَیَیۡنِ ۚ فَاِنۡ کُنَّ نِسَآءً فَوۡقَ اثۡنَتَیۡنِ فَلَہُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَکَ ۚ وَاِنۡ کَانَتۡ وَاحِدَۃً فَلَہَا النِّصۡفُ ؕ

ترجمہ :- اللہ تم کو تمہاری اولادوں کے بارے میں حکم دیتا ہے۔ مرد کے لیے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے اور اگر وہ عورتیں ہوں دو یا دو سے زیادہ، پس ان کے لیے دو تہائی ہے۔ اور اگر ایک ہی ہو تو اس کے لیے آدھا حصہ ہے

ربط آیات

گذشتہ سے پیوستہ درس میں اللہ تعالیٰ نے وراثت کا قانون اجمالی طور پر بیان فرمایا تھا۔ اس کی تشریح میں عرض کیا گیا تھا۔ کہ زمانۂ جاہلیت میں وراثت کے معاملہ میں عورتوں اور چھوٹے بچوں کو محروم رکھا جاتا تھا اور وراثت کا حقدار صرف ان جوان مردوں کو سمجھا جاتا تھا جو دشمن کا مقابلہ کر سکیں یعنی ہر وقت لڑائی بھڑائی کے لیے تیار رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس غلط تقسیم کی تردید فرمائی اور یہ واضح فرما دیا کہ مرنے والا جو کچھ چھوڑ جائے، اس میں سے ہر چھوٹی بڑی، منقولہ، غیر منقولہ چیز تقسیم ہونی چاہیئے۔ اور وراثت میں مردوں اور عورتوں، بچوں جوانوں اور بوڑھوں سب کا حصہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حصے ہیں۔ ان میں ردوبدل کرنے کا کسی انسان کو حق نہیں پہنچتا۔ اب آج کے درس سے قانون وراثت کی تفصیلات شروع ہو رہی ہیں۔

وراثت دور جاہلیت میں

دور جاہلیت میں وراثت کی بنیاد تین چیزیں تھیں۔ ایک تو نسب تھا جس کی بنا پر وہ صرف جوان بیٹے کو باپ کی وراثت کا حقدار سمجھتے تھے، اور باقی عورتیں اور بچے محروم ہو جاتے تھے۔ ان کے نزدیک وراثت کا دوسرا سبب تبنّی تھا، وہ لوگ جس

کسی کو منہ بولا بیٹا بنا لیتے تھے اُسے وراثت میں سے حصہ دیتے تھے۔ اُس زمانے میں وراثت کی تیسری بنیاد ولاء تھی۔ ولاء کا معنی آپس میں پختہ دوستی کر لینا ہے۔ جو دو شخص آپس میں حلفیہ قسم کی پختہ دوستی کر لیتے تھے وہ بھی ایک دوسرے کی وراثت کے مستحق ہوتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں وراثت ان بنیادوں پر تقسیم ہوتی تھی

ابتدائے اسلام میں وراثت

جب پیغمبر آخر الزماں علیہ السلام کی بعثت ہوئی، قرآن پاک کا نزول شروع ہوا اور اسلام آیا، تو اس کے ابتدائی دور میں زمانہ جاہلیت کی بعض چیزوں کو بھی برداشت کیا گیا۔ چنانچہ ابتدائی دور اسلام میں وراثت کے لیے ولاء کو روا رکھا گیا۔ اس کے علاوہ ہجرت کو بھی وراثت کا سبب قبول کیا گیا۔ ہجرت مدینہ کے بعد بعض مہاجرین اور انصار رشتۂ مواخات میں منسلک ہوئے۔ حضور علیہ السلام نے ایک مہاجر کو ایک انصاری کا بھائی بھائی بنا دیا۔ چنانچہ ابتدائی دور میں یہ بھائی بھائی ایک دوسرے کی وراثت کے حقدار ہوتے تھے۔ بخاری شریف میں روایت موجود ہے۔ یرث المهاجری الانصاری ویرث الانصاری المهاجری یعنی مہاجر انصاری کا وارث ہے اور انصاری مہاجر کی وراثت میں حقدار ہے۔ ابتدائے اسلام میں ایسا بھی ہوتا رہا۔

مستقل قانون وراثت

اس کے بعد جب وراثت کے مستقل قوانین نازل ہو گئے تو اللہ تعالے نے ہجرت کے سبب کو وراثت سے خارج کر دیا۔ اور سورۃ انفال میں واضح فرما دیا وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ کہ وراثت کے معاملہ میں اللہ کا قانون یہ ہے کہ قرابت کے رشتہ کو ہی اولیت حاصل ہے۔ چنانچہ وراثت کا سب سے پہلا سبب نسب ہی قرار پایا۔ اس طرح گویا خدائی قانون کے مطابق ولاء، مواخات اور تبنّی کے ذرائع وراثت کو ختم کر دیا گیا، اب دوستوں، اسلامی بھائیوں اور متبنٰی وغیرہ کے ساتھ حسن سلوک تو کیا جا سکتا ہے۔ اُن کے حق میں مقررہ حد تک وصیت کی جا سکتی ہے۔ مگر وراثت میں حصہ نہیں دیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ

لیے لیے ختم کر دیا۔ اب اسلام میں وراثت کا انحصار تین چیزوں پر ہے۔
پہلا نسب، دوسرا نکاح اور تیسرا ولاء جو کہ ولاء کی پہلی قسم سے مختلف ہے
نسب کا قانون یہ ہے کہ جو رشتہ دار میت کے زیادہ قریب ہوگا،
وراثت پر اُس کا حق فائق ہوگا۔ قریبی عزیز کی موجودگی میں دور کے رشتہ دار
کو حصہ نہیں ملتا۔ مثلاً اگر مرنے والے کا باپ موجود ہے تو وراثت کا حق دار وہ
ہوگا، دادا نہیں ہوگا۔ اگر باپ فوت ہو چکا ہے اور دادا زندہ ہو تو اس صورت
میں دادا حقدار ہوگا۔ اسی طرح اگر میت کا بیٹا موجود ہے تو پوتے کو وراثت
نہیں پہنچتی ہے۔ بیٹے کی غیر موجودگی میں پوتا وارث ہوگا۔

وراثت کا دوسرا سبب نکاح ہے، جب ایک مرد اور ایک عورت
رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جاتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کی وراثت کے حقدار
بن جاتے ہیں تاوقتیکہ طلاق کے ذریعے علیحدگی اختیار نہ کر لیں۔ اگر خاوند
فوت ہو جائے تو بیوی کو حصہ ملتا ہے اور اگر بیوی فوت ہو جائے تو خاوند
وراثت میں حق رکھتا ہے۔ گویا وراثت کا مدار نکاح پر بھی ہے۔

وراثت کا تیسرا سبب ولاء ہے اور یہ دو قسم سے ہے۔ پہلی قسم ولاء اعتاق
ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے غلام کو آزاد کر دے۔ اور غلام کی وفات کے وقت
اس کا کوئی حقیقی رشتہ دار موجود نہ ہو تو غلام کی وراثت اُس آزاد کرنے والے
شخص کو پہنچتی ہے۔ مسلم اور ترمذی شریف میں روایت موجود ہے اَلْوَلَاءُ لِمَنْ
اَعْتَقَ وراثت اُس شخص کے لیے ہے جس نے اُسے آزاد کیا یعنی جو اُسکی
آزادی کا ولی نعمت اور مولیٰ بنا، وہی وراثت کا حقدار ہے۔ اسی طرح اگر آزاد
کرنے والا شخص خود مر گیا اور اُس کا کوئی حقیقی رشتہ دار موجود نہیں ہے تو اس
کی وراثت آزاد کردہ غلام کو ملے گی۔ یہ ولاءِ اعتاق ہے۔ آزاد کرنے والا
اور آزاد ہونے والا ایک دوسرے کے مولیٰ بن گئے ہیں۔

ولاء کی دوسری قسم ولاءِ موالات ہے جو کہ امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک ولاءِ موالات

درست ہے۔ اس کا ذکر بھی حدیث شریف میں موجود ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں جب کوئی شخص کسی مسلمان کے ہاتھ پر اسلام قبول کر کے اُس کے ساتھ دوستانہ قائم کر لیتا تھا تو وہ آپس میں موالی بن جاتے تھے، اور اس خصوصی تعلق کو موالات کہا جاتا ہے۔ ابتداء میں لوگ دور دور سے گھر بار، رشتے دار، جائداد وغیرہ چھوڑ چھاڑ کر دارالاسلام میں آجاتے تھے اور اسلام قبول کر لیتے تھے اور اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ موالات بھی قائم کر لیتے تھے۔ خراسان سے اکثر لوگ عرب پہنچے اور اسلام قبول کیا۔ ایسے لوگوں کے حقیقی رشتہ دار نامعلوم ہوتے تھے یا غیر مسلم، ایسی حالت میں اگر نومسلم فوت ہو جاتا تو اس کی وراثت اس کے موالی کے حق میں چلی جاتی تھی۔ یہ ولاءِ موالات کہلاتی ہے۔ یہ صورت آج بھی رہا ہے اگر کوئی شخص افریقہ یا کسی دیگر دور دراز علاقے سے پاکستان میں آکر کسی مسلمان کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیتا ہے۔ اُس سے ولاء یعنی دوستانہ قائم کر لیتا ہے اُس کے حقیقی رشتہ داروں کا علم نہیں یا معلوم ہے کہ وہ غیر مسلم ہیں اور انہیں وراثت نہیں مل سکتی تو پھر ایسے شخص کی موت پر اس کی جائداد کا وارث اس کا مولیٰ ہوگا، یعنی وہ شخص ہوگا جس کے ہاتھ پر اُس نے مسلمان ہو کر ولاءِ موالات قائم کیا۔

موجودہ زمانے میں ولاء کی دو صورتوں میں سے ولاء اعتاق تو ختم ہو چکی ہے۔ اب نہ کوئی غلام ہے اور نہ اس کی آزادی کی نوبت آتی ہے لہٰذا یہ سبب اب بالکل بند ہو چکا ہے البتہ دوسری قسم ولاءِ موالات کی اب بھی گنجائش ہے۔ اگر کوئی ایسی صورت پیش آجائے کہ کوئی غیر مسلم کسی مسلمان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرے اور اس کا مولیٰ بن جائے۔ پھر اس کی وفات کے وقت اُس کا کوئی حقیقی مسلمان رشتہ دار موجود نہ ہو تو اس کی وراثت اس کے مولی کو ملے گی۔ گویا اس وقت وراثت کے تین سبب نسب

نکاح اور موالات ہیں۔

اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے وراثت کے احکام کو اس ترتیب سے بیان فرمایا ہے کہ سب سے پہلے اولاد کا تذکرہ ہے کیونکہ اس کا تعلق وراثت کے پہلے سبب نسب کے ساتھ ہے۔ اس کے بعد نسب ہی کے سبب کے تحت ماں باپ کی وراثت کا ذکر ہے اور پھر مرنے والے کے بھائیوں کا نمبر ہے۔ ترتیب کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے چوتھے نمبر پر نکاح کے سبب کے تحت خاوند اور بیوی کی وراثت کا ذکر فرمایا ہے۔

شانِ نزول

ان آیات کی شانِ نزول کے متعلق حضرت جابرؓ کی روایت موجود ہے۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں بیمار ہو گیا۔ میرا گھر حضور علیہ السلام کے گھر سے کم و بیش دو میل دور تھا۔ آپ علیہ السلام میری بیمار پرسی کے لیے میرے گھر تشریف لائے۔ آپ کے پاس سواری بھی نہ تھی، پیدل ہی آئے۔ آپ پر گرد و غبار کے آثار نمایاں تھے۔ جب آپ تشریف لائے تو مجھ پر بیہوشی طاری ہو گئی۔ آپ نے وضو کیا اور وضو کا باقی ماندہ پانی مجھے پلایا اور مجھ پر چھینٹے دیے۔ اتنے میں مجھے ہوش آ گیا۔ کہتے ہیں کہ چونکہ میں اولاد سے محروم تھا اس لیے مجھے اپنی وراثت کے متعلق تشویش تھی۔ اپنی اولاد تو نہ تھی البتہ نو بہنیں تھیں جن میں تین شادی شدہ اور باقی غیر شادی شدہ تھیں۔ ان کے علاوہ ایک بھائی بھی تھا۔ حضرت جابرؓ کے باپ حضرت عبداللہ انصاریؓ غزوہ احد میں شہید ہو گئے تھے۔ اونچے درجے کے شہدا میں سے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بڑی تعریف فرمائی ہے۔ بہرحال روایت میں آتا ہے کہ حضرت جابرؓ نے حضور سے دریافت کیا کہ میرے بعد میری وراثت کس طرح تقسیم ہو گی، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں

اس سلسلہ میں حضرت جابرؓ ہی سے ایک دوسری روایت بھی ترمذی شریف میں موجود ہے۔ حضرت سعد بن ربیعؓ جنگ احد میں شہید ہو گئے اور اپنے پیچھے

کرنے والا شخص خود مر گیا اور اس کا کوئی حقیقی رشتہ دار موجود نہیں ہے تو اس کی وراثت آزاد کردہ غلام کو ملے گی۔ یہ ولاءِ اعتاق ہے۔ آزاد کرنے والا اور آزاد ہونے والا ایک دوسرے کے مولیٰ بن گئے ہیں۔

ولاءِ موالات

ولا کی دوسری قسم ولاءِ موالات ہے جو کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک

دو لڑکیاں چھوڑ گئے۔ ان کی بیوی حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا، حضور! میرا خاوند آپ کے ساتھ جہاد میں شریک ہو کر شہید ہو گیا ہے اور پرانے دستور کے مطابق اس کے مال پر اُس کے بھائیوں نے قبضہ کر لیا ہے اب یہ دو بچیاں ہیں ولا تنکحان الا ولھما مال مال کے بغیر تو اُن کے نکاح بھی نہیں ہو سکتے۔ اب کیا صورت ہو۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا، تم صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ اس بارے میں ضرور کوئی فیصلہ فرمائے گا۔

روایت میں آتا ہے کہ جب وہ عورت دوبارہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی تو وراثت کی یہ آیات نازل ہوئیں۔ نبی علیہ السلام نے اُس عورت کو اور سعدؓ کے بھائیوں کو بلایا اور اُن کو سمجھایا کہ دیکھو بھائی! سعدؓ کے جس مال پر تم نے قبضہ کر لیا ہے۔ اس میں سے آٹھواں حصہ اس کی بیوہ کا ہے اور دو تہائی اِن بچیوں کو دے دو۔ باقی جو بچ جائے وہ عصبہ کی حیثیت سے تم لے لو۔

قبل از تقسیم وراثت

بعض چیزیں ایسی ہیں جو کسی کی وراثت تقسیم کرنے سے قبل کرنا ضروری ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں قانون یہ ہے کہ سب سے پہلے مرنے والے کے مال میں سے اُس کے کفن دفن کا انتظام کیا جائے۔ اس کام پر اخراجات اعتدال کے ساتھ ہونے چاہئیں۔ میت کا مال سمجھ کر فضول خرچی نہیں کرنی چاہیئے۔ کفن کے لیے مناسب کپڑا اور دوسری اشیائے ضرورت خریدی جائیں۔ قبر کھودنے کا انتظام ہو جس کی مزدوری میت کے مال سے ادا کی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا کہ اگر مرنے والے کے ذمے کوئی قرض ہے تو ادا کیا جائے۔ تیسرے نمبر پہ اگر میت نے کوئی وصیت کی ہے تو اُسے پورا کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے ہر مسلمان کو کل مال کے ایک تہائی کے برابر وصیت کرنے کی اجازت دی ہے، اس سے زیادہ نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی وصیت کی گئی ہے تو اُسے پورا کیا جائے گا۔ اور اس کے بعد باقی ماندہ مالِ وراثت حصہ رسدی حقداران میں تقسیم کیا جائے گا۔

ایک مرد مساوی دو عورتیں

ارشاد باری تعالیٰ ہے یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے تمہاری اولادوں کے متعلق۔ یہاں پہ ایصا کا لفظ استعمال ہوا ہے جس میں تاکید پائی جاتی ہے، اس لحاظ سے وصیت تاکیدی حکم کو کہتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے قانونِ وراثت کے آغاز میں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ یہ احکام تاکیدی ہیں اور ان میں اپنی مرضی سے نہ کسی کو ردوبدل کرنے کی اجازت ہے اور نہ ہی ٹالے جا سکتے ہیں بلکہ ان پر عمل درآمد لازمی ہے۔ اس قانون کا پہلا حکم یہ ہے لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک عورت کو ایک مرد کی نسبت آدھا حصہ ملیگا۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ اگر کسی مرنے والے کے پس ماندگان میں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں ہیں۔ تو کل مال آدھا آدھا کر کے ایک حصہ لڑکے کو مل جائے گا اور باقی آدھا دو لڑکیوں میں برابر بانٹ دیا جائیگا۔ بعض لوگ اس قسم پر اعتراض کرتے ہیں اُن کا مقولہ یہ ہے کہ عورت چونکہ مرد کی نسبت کمزور واقع ہوئی ہے۔ لہذا عورت کو زیادہ حصہ ملنا چاہیئے تھا جب کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو دگنا حصہ دلایا ہے۔ اس سلسلہ میں یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ انسان ناقص العقل ہے اس کی سوچ غلط بھی ہو سکتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ حکیم ہے، اس کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قانونِ وراثت بھی فطرت کے عین مطابق ہے، اس میں کسی فریق کے ساتھ زیادتی نہیں۔ غور فرمائیں کہ لڑکی بالآخر بیاہی جائیگی اور اس کا نان نفقہ اور رہائش وغیرہ اس کے خاوند کے ذمہ ہوگا۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک بھی موجود ہے۔ کہ بیوی کا مکان، خوراک، لباس اور دیگر ضروریاتِ زندگی مرد کے ذمہ ہیں وہ اپنی مالی حیثیت کے مطابق عورت کی ضروریات بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔ چنانچہ اسی نسبت سے عورت کی ذمہ داریاں کم ہیں، لہذا اللہ تعالیٰ نے وراثت میں مرد کا حصہ زیادہ رکھا ہے اور عورت کا کم۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کا حصہ اس کے خاوند کی وراثت میں بھی رکھا ہے۔ اس طرح عورت ماں باپ اور خاوند دونوں طرف سے وراثت کی حقدار ہے۔ برخلاف اس کے مرد کو صرف باپ کی وراثت ملتی ہے۔ بالعموم مرد کو بیوی کی وراثت عملی طور پر نہیں پہنچتی، کیونکہ بسا اوقات عورت کی جائداد ہوتی ہی نہیں، اور اگر بالفرض کوئی شخص عمر بھر نکاح ہی نہیں کرتا تو نہ اس کی بیوی ہوتی ہے اور نہ اس کی طرف سے کسی وراثت کی امید۔ مقصد یہ ہے۔ کہ اللہ کے مقرر کردہ قانون پہ اعتراض محض بے سمجھی کی وجہ سے ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کا قانون کمال حکمت پہ مبنی ہے اور انصاف کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے۔

صرف لڑکیوں کی صورت میں وراثت

آگے فرمایا کہ اگر کسی مرنے والے نے کوئی بیٹا نہ چھوڑا ہو بلکہ صرف بیٹیاں ہوں۔ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ اور وہ دو یا دو سے زیادہ ہوں فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ تو اُن سب کو کل ترکہ کا دو تہائی ملے گا باقی ایک تہائی دوسرے رشتہ داروں میں تقسیم ہو جائے گا۔ اور اگر کوئی دوسرا رشتہ دار موجود نہ ہو تو پھر بقایا ایک تہائی بھی ان لڑکیوں کی طرف ہی لوٹ آئے گا فرمایا وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً اور اگر پسماندگان میں صرف ایک لڑکی ہو یعنی نہ کوئی لڑکا ہو اور نہ دوسری لڑکی تو ایسی صورت میں فَلَهَا النِّصْفُ اُس لڑکی کو کل مال میں سے نصف مِل جائے گا۔ اور باقی نصف باپ، بھائی، چچا، چچازاد اگر کوئی ہوں تو اُن کو ملیگا۔ اگر بالکل کوئی رشتہ دار نہیں ہے تو بقیہ نصف مال بھی لڑکی ہی کو مِل جائیگا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نسب کی بنیاد پہ سب سے پہلے اولاد کے حق کا ذکر فرمایا ہے۔ اب آگے دوسرے نمبر پہ ماں باپ کے حقوق کا ذکر آ رہا ہے۔

وَلِأَبَوَيۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا ٱلسُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ
إِن كَانَ لَهُۥ وَلَدٌۚ فَإِن لَّمۡ يَكُن لَّهُۥ وَلَدٌ وَوَرِثَهُۥٓ
أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ ٱلثُّلُثُۚ فَإِن كَانَ لَهُۥٓ إِخۡوَةٌ فَلِأُمِّهِ
ٱلسُّدُسُۚ مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَآ أَوۡ دَيۡنٍۗ
ءَابَآؤُكُمۡ وَأَبۡنَآؤُكُمۡ لَا تَدۡرُونَ أَيُّهُمۡ أَقۡرَبُ
لَكُمۡ نَفۡعًاۚ فَرِيضَةً مِّنَ ٱللَّهِۗ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ
عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١١﴾ ۞وَلَكُمۡ نِصۡفُ مَا تَرَكَ أَزۡوَٰجُكُمۡ إِن لَّمۡ يَكُن
لَّهُنَّ وَلَدٌۚ فَإِن كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ ٱلرُّبُعُ
مِمَّا تَرَكۡنَۚ مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَآ
أَوۡ دَيۡنٍۚ وَلَهُنَّ ٱلرُّبُعُ مِمَّا تَرَكۡتُمۡ إِن لَّمۡ
يَكُن لَّكُمۡ وَلَدٌۚ فَإِن كَانَ لَكُمۡ وَلَدٌ
فَلَهُنَّ ٱلثُّمُنُ مِمَّا تَرَكۡتُمۚ مِّنۢ بَعۡدِ
وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَآ أَوۡ دَيۡنٍۗ

ترجمہ :- اور مرنے والے کے ماں باپ میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے اس میں سے جو اُس نے چھوڑا ہے، اگر اُس کی اولاد ہے۔ پس اگر

کے ذمہ ہیں وہ اپنی مالی حیثیت کے مطابق عورت کی ضروریات بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔ چنانچہ اسی نسبت سے عورت کی ذمہ داریاں کم ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے وراثت میں مرد کا حصہ زیادہ رکھا ہے اور عورت کا کم۔

اُسکی اولاد نہیں ہے اور اُسکے وارث ماں باپ ہیں، تو اُسکی ماں کے لیے ایک تہائی ہے پس اگر اُسکے بھائی ہیں تو اُسکی ماں کیلئے چھٹا حصہ ہے بعد وصیت کے جو وہ کرتا ہے یا قرضہ ادا کرنے کے بعد۔ تمہارے باپ اور بیٹے تم نہیں جانتے کہ کون زیادہ قریب ہے تمہارے لیے نفع پہنچانے کے اعتبار سے یہ اللہ کی جانب سے مقرر کیا ہوا فریضہ ہے، بیشک اللہ تعالیٰ علیم ہے اور حکیم ہے (۱۱) اور تمہارے لیے آدھا ہے جو چھوڑا تمہاری بیویوں نے اگر ان کی اولاد نہیں ہے، پس اگر اُن کی اولاد ہے تو تمہارے لیے چوتھا حصّہ ہے اس میں سے جو انہوں نے چھوڑا وصیّت کے بعد جو وہ کرتی ہیں یا قرضہ ادا کرنے کے بعد اور اُن عورتوں کے لیے چوتھا حصّہ ہے جو تم نے چھوڑا اگر تمہاری اولاد نہیں ہے۔ پس اگر تمہاری اولاد ہے تو اُن عورتوں کے لیے آٹھواں حصّہ ہے جو تم نے چھوڑا وصیت کے بعد کہ تم وصیت کرتے ہو یا قرضہ ادا کرنے کے بعد

والدین کا حصہ

کل کے درس میں وراثت سے متعلق مرد و زن کے حصّوں کا ذکر تھا کہ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ نیز یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ اگر میت نے صرف ایک لڑکی چھوڑی ہے تو وہ کل مال کے نصف کی وارث ہوتی ہے اور اگر دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو انہیں کل وراثت کا دو تہائی ملتا ہے۔ وراثت کی یہ تقسیم تو نسب کے اعتبار سے تھی۔ اب آج کی آیت میں نسب ہی کے اعتبار سے والدین کا حصہ اور پھر وراثت کے دوسرے سبب نکاح کے اعتبار سے بیوی اور خاوند کے حصص کا تذکرہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَلِاَبَوَیۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ یعنی ماں باپ میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصّہ ہے مِمَّا تَرَكَ جو کچھ مرنے والے نے چھوڑا ہے۔ اِس صورت میں کہ اِنۡ كَانَ

لَهٗ وَلَدٌ مرنے والے کی اولاد بھی موجود ہو۔ اولاد میں خواہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں ایک ہو یا زیادہ، اگر والدین زندہ ہیں اور مرنے والی کی اولاد بھی ہے، تو اس کے باپ کو بھی چھٹا حصہ ملیگا اور ماں کو بھی چھٹا حصہ وراثت ملیگی۔ اسکے برخلاف اگر دوسری صورت ہو یعنی مرنے والے کی اولاد نہ ہو فَاِنْ لَّمْ یَکُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ اور اس کے وارث صرف والدین ہوں، تو فرمایا فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ماں کو تیسرا حصہ ملے گا۔ گویا اولاد کی غیر موجودگی میں میت کی ماں کا حصہ چھٹے سے بڑھ کر تیسرا یعنی دگنا ہو گیا۔ اس صورت میں وراثت کا باقی دو تہائی حصہ مرنے والے کے باپ کو مل جائے گا۔ یہاں پر بھی وہی قانون ہے کہ ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملتا ہے۔ جب ماں کو ایک تہائی ملا تو باپ دو تہائی کا مستحق ٹھہرا۔ اس آیت میں بھی مِمَّا تَرَكَ کا لفظ آیا جس کا مطلب یہ ہے کہ مرنے والے نے جو کچھ بھی چھوڑا ہے نقدی، سونا، چاندی، مکان، زمین، اوزار غرضیکہ منقولہ اور غیر منقولہ ہر چیز میں ورثاء کے مقررہ حصے ان کو پہنچنے چاہئیں۔

بھائیوں کی موجودگی میں

اب ایک تیسری صورت کا ذکر ہے۔ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ یعنی مرنے والے کی اولاد تو نہیں ہے مگر اس کے بھائی زندہ ہیں بھائیوں میں حقیقی (ماں باپ کی طرف سے) علاتی (صرف باپ کی طرف سے) اور اخیافی (صرف ماں کی طرف سے) سب شامل ہیں۔ اگر میت کے کوئی بھی بھائی ہوں، ایک ہو یا زیادہ، اس حالت میں فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ میت کی ماں کا پھر چھٹا حصہ رہ جائیگا۔ گویا بھائیوں نے ماں کو تیسرے حصے سے نکال کر چھٹے حصے میں شامل کر دیا مگر یہ مسئلہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس طرح ماں کے حصے سے جو چھٹا حصہ بچ گیا وہ ان بھائیوں کو نہیں ملیگا جن کی وجہ سے ماں کا حصہ کم ہوا، بلکہ یہ چھٹا حصہ بھی باپ ہی کو مل جائیگا کیونکہ باپ بھائیوں کی نسبت زیادہ قریبی ہے اور یہ وراثت کا بنیادی قانون

ہے کہ قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں بعید رشتہ دار کو وراثت نہیں پہنچتی۔ مذکورہ صورت میں گویا باپ کو اپنے دو تہائی کے علاوہ ماں کا کم کیا جانے والا چھٹا حصہ مزید مل جائے گا۔ جمہور علما، فقہاء اور آئمہ دین کا یہی مسلک ہے۔ البتہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا اختلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ کہ بھائیوں کی موجودگی کی وجہ سے ماں کے حصہ سے بچ جانے والا چھٹا حصہ اُن بھائیوں کو ملیگا، جن کی وجہ سے ماں کا حصہ کم ہوا۔

وصیت اور قرض

فرمایا یہ مقرر کردہ حصے قابل تقسیم ہیں مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِىۡ بِهَاۤ اُس وصیت کے بعد جو مرنے والا کر گیا ہے۔ اَوۡ دَيۡنٍ یا اُس قرضے کی ادائیگی کے بعد جس کا مرنے والا مقروض ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر مرنے والا کوئی وصیت کر گیا ہے یا اُس نے کوئی قرض دینا ہے، تو پہلے اِن چیزوں کی ادائیگی ہوگی، اس کے بعد باقی ماندہ مال کو ورثا میں حصہ رسدی تقسیم کیا جائے گا۔

یہاں پہ وصیت اور قرض کے تقدم اور تاخر کو سمجھ لینا چاہیے' اس آیت میں اور اگلی آیات میں بھی وصیت کا ذکر پہلے ہے اور قرضہ کا بعد میں۔ اس لحاظ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ میت کے کفن دفن کے بعد پہلے وصیت پوری کی جائے اور پھر اُس کا قرضہ چکایا جائے اور اس کے بعد باقی مال تقسیم ہو۔ مگر فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ تمام فقہائے کرام اس بات پر متفق ہیں کہ وصیت اور قرض کے معاملہ میں قرض کو اولیت حاصل ہے۔ پہلے قرضہ ادا ہوگا اور اس کے بعد وصیت پوری کی جائیگی۔

حضرت علیؓ نے فرمایا، لوگو! غلط فہمی میں مبتلا نہ رہنا، مرنے والے کے قرض کی ادائیگی وصیت سے پہلے ہونی چاہیئے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ قرض بندوں کا حق ہے اور اس کا مطالبہ کرنے والے موجود ہوں گے جو قرضہ طلب کر کے اپنے حق کی حفاظت کریں گے۔ برخلاف اس کے

وصیت اللہ کا حق ہے اور اس کا مطالبہ کرنے والا بظاہر کوئی موجود نہیں ہوتا۔ تو اس خیال سے کہ کہیں لوگ اللہ کا حق بھول نہ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے وصیت کا پہلے تذکرہ کیا۔ وگرنہ وراثت کا صحیح تعین ہی اس وقت ہوتا ہے جب اس کے ذمہ واجب الادا قرضہ ادا کر دیا جائے۔ لہذا قرضہ کی ادائیگی، وصیت کی تکمیل سے پہلے ہوگی۔

وصیت کے حقدار

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ مبارک ہے۔ کہ لوگو! اللہ نے تم پر مہربانی فرما کر تمہیں ایک تہائی مال کے تصدق کی اجازت دے دی ہے تاکہ تمہیں آخرت میں بہتری نصیب ہو سکے۔ اور بہتری جبھی حاصل ہوگی جب مال کو کسی کارِ خیر کے لیے وقف کیا جائے گا۔ کسی مدرسہ یا مسجد کے لیے وصیت کر دی جائے۔ کسی یتیم، مسکین یا بیوہ کے حق میں یا کسی اور رفاہِ عامہ کے لیے مخصوص کیا جا سکتا ہے، تاہم اس کی مقدار کل مال کے ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے۔

ہاں ضروری بات یہ ہے۔ کہ کسی ایسے شخص کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی جس کو وراثت میں حصہ ملتا ہو۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ وارث کے لیے وصیت کرنے کی اجازت نہیں کیونکہ اللہ نے وراثت میں اس کا حصہ مقرر کر دیا ہے اور اس میں کمی بیشی کرنا اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی ہوگی۔ البتہ ایسا وارث جس کو وراثت میں حصہ نہیں ملتا، اس کے حق میں وصیت کی جا سکتی ہے جیسے یتیم پوتا ہو، کوئی بیوہ بہن ہو، کوئی نادار بھائی ہو، وغیرہ وغیرہ مگر جو شخص وراثت کا حقدار ہے، وہ وصیّت کا حقدار نہیں ہو سکتا۔

تقررِ حصص کی حکمت

آگے اللہ تعالیٰ نے مختلف حصے مقرر کرنے کی حکمت بیان فرمائی ہے انسان اپنی ناقص عقل کی بنا پر کہہ سکتا ہے کہ فلاں حصہ کم ہے۔ اسے زیادہ ہونا چاہیئے تھا یا فلاں کو زیادہ دے دیا گیا، وہ کم ہونا چاہیئے مگر اللہ تعالیٰ

نے ارشاد فرمایا ہے اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ تم نہیں جانتے کہ تمہارے حق میں تمہارے والدین نفع بخش ہیں یا تمہاری اولاد۔ یہ علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے کہ تمہارے لیے کون سود مند ہے۔ تم اپنی دانست کے مطابق سمجھتے ہو کہ فلاں رشتہ دار میری خدمت کریگا اور اُسے زیادہ دینے کی کوشش کرتے ہو مگر حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ عین ضرورت کے وقت تمہارے کام وہ شخص آجائے جس سے تمہیں کوئی امید نہ ہو۔ لہٰذا ہر چیز کی حکمت وہ مالک الملک ہی جانتا ہے جو خالق ہے اور جو علیم کل بھی ہے اور حکیم بھی۔ اُسی نے یہ حصے اپنی حکمتِ تامہ کے ساتھ مقرر کیے ہیں یعنی یہ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ہیں اور ان کو مقرر کرنے والا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا بیشک ہر چیز سے واقف ہے اور ہر چیز میں اسکی حکمت پوشیدہ ہے جسے تم نہیں جانتے۔

زوجین کا حصہ

نسب کے اعتبار سے وراثت کے حصص بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے وراثت کے دوسرے سبب نکاح کا تذکرہ فرمایا ہے اور اس اعتبار سے بیوی اور خاوند کے حصے مقرر فرمائے ہیں۔ زوجین میں تقسیم وراثت کے لیے دو صورتیں پیدا ہوسکتی ہیں۔ میاں بیوی میں سے کسی ایک کی وفات کے وقت یا تو مرنے والے کے زوج کے علاوہ اسکی کوئی اولاد نہ ہوگی یا اولاد بھی ہوگی۔ دونوں صورتوں میں ایک دوسرے کے حصے کی مقدار مختلف ہوگی ارشاد ہے وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ اگر تمہاری بیوی کی وفات کے وقت اُس کی اولاد نہیں ہے تو اس نے جو کچھ چھوڑا ہے اس میں سے تمہارا نصف حصہ ہے۔ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ اور اگر بیوی اولاد بھی چھوڑ گئی ہے۔ یہ اولاد خواہ موجودہ

خاوند سے ہو یا کسی دوسرے خاوند سے اُسے وراثت میں حصہ ملے گا۔
لہٰذا فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ تمہارا حصہ نصف کی بجائے
چوتھا ہوگا ہر اُس چیز سے جو انہوں نے چھوڑی۔ اور یہ حصے بجز
کب ہوں؟ بس بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ
اس وصیت کو پورا کرنے کے بعد جو میت نے کی ہے! اور قرضہ کی ادائیگی
کے بعد جو میت کے ذمہ واجب الادا ہے۔ کفن دفن کے اخراجات،
قرضہ کی ادائیگی اور وصیت کو پورا کرنے کے بعد جو کچھ بچے گا، اسمیں سے
تمہارے لیے نصف یا چوتھا حصہ ہے۔ باقی جائداد دوسرے قریبی رشتہ داروں
کو ملیگی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر خاوند فوت ہو جائے وَلَهُنَّ
الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ
اگر بوقت وفات پس ماندگان میں صرف تمہاری بیویاں ہیں،
اولاد نہیں ہے تو انہیں تمہاری جائداد میں سے چوتھا حصہ ملیگا۔ اگر ایک
بیوی ہے تو چوتھے حصے کی واحد مالکہ ہوگی اور اگر ایک سے زیادہ بیویاں
ہیں تو کل جائداد کا چوتھا حصہ سب میں برابر برابر تقسیم ہو جائے گا۔ ہاں!
فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ اگر تم اپنے پیچھے بیوی یا بیویوں کے
علاوہ اولاد بھی چھوڑ گئے ہو، تو تمہاری جائداد میں اُن کا بھی حق ہے۔
ایسی صورت میں فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ بیویوں
کا حصہ چوتھے سے کم ہو کر آٹھواں ہو جائے گا۔ اگر ایک ہی بیوی ہے
تو آٹھویں حصے کی واحد مالکہ ہوگی اور زیادہ بیویاں ہونے کی صورت
میں یہ آٹھواں حصہ سب میں برابر برابر تقسیم ہو جائے گا۔ مِنْۢ بَعْدِ
وَصِيَّةٍ تُوصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ بنیادی اصول وہی رہیگا
کہ کل جائداد میں سے پہلے قرض ادا کیا جائے اگر کوئی ہے۔ اور وصیت

پوری کی جائیگی اگر مرنے والے نے کی ہے اور اس کے بعد باقی مال حصہ رسدی تقسیم ہو گا۔ ہر حصہ کے تقرر کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ بار بار تاکید فرمائی ہے۔ کہ میّت کا قرضہ لازماً ادا کیا جائے اور اس کی وصیت بھی پوری کی جائے۔ ان دونوں چیزوں کو تقسیم وراثت پر اولیت حاصل ہے۔

وَإِن كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَٰلَةً أَوِ ٱمْرَأَةٌ وَلَهُۥٓ أَخٌ أَوْ
أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَٰحِدٍ مِّنْهُمَا ٱلسُّدُسُ ۚ فَإِن
كَانُوٓا۟ أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِى ٱلثُّلُثِ ۚ
مِنۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ
وَصِيَّةً مِّنَ ٱللَّهِ ۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿۱۲﴾ تِلْكَ
حُدُودُ ٱللَّهِ ۚ وَمَن يُطِعِ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ يُدْخِلْهُ جَنَّٰتٍ
تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ
ٱلْفَوْزُ ٱلْعَظِيمُ ﴿۱۳﴾ وَمَن يَعْصِ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَتَعَدَّ
حُدُودَهُۥ يُدْخِلْهُ نَارًا خَٰلِدًا فِيهَا وَلَهُۥ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿۱۴﴾ ع ۲/۱۳

ترجمہ: اور اگر مرنے والے مرد کی وراثت کلالہ کی شکل میں ہے
یا وہ عورت ہے، اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہے، تو
ان دونوں میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہو گا۔ اور اگر بہن بھائی
اس سے زیادہ ہوں تو وہ سب ایک تہائی میں شریک ہوں گے
اُس وصیت کے بعد جو کی گئی یا قرضہ کے بعد، اس حال میں کہ
وہ نقصان پہنچانے والا نہ ہو یہ اللہ کی جانب سے وصیت ہے
اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور بردبار ہے ﴿۱۲﴾ یہ اللہ کی
حدیں ہیں اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریگا اور اس کے رسول

کی، اللہ تعالیٰ اُس کو جنتوں میں داخل کریگا جن کے سامنے نہریں بہتی ہوں گی اُن میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے (۱۳)

اور جو شخص نافرمانی کریگا اللہ اور اس کے رسول کی اور اس کی باندھی ہوئی حدوں سے تجاوز کریگا اس کو اللہ تعالیٰ آگ میں داخل کرے گا اس میں ہمیشہ رہنے والا ہو گا اور اس کے لیے ذلّت ناک عذاب ہو گا (۱۴)

کلالہ کی وراثت

اِس رکوع میں وراثت کے مسائل بیان ہوئے ہیں۔ اولاً اولاد کے حصص کا ذکر ہُوا پھر والدین کا اور اس کے بعد زوجین کے حصوں کے احکام بیان ہو چکے ہیں۔ اب کلالہ کی وراثت کا مسئلہ آرہا ہے۔ کلالہ اس شخص (مرد یا عورت) کو کہتے ہیں جس کے اصول اور فروع نہ ہوں۔ یعنی نہ تو اوپر کی طرف یعنی باپ دادا میں سے کوئی رشتہ دار موجود ہو اور نہ ہی نیچے کی طرف یعنی بیٹے اور پوتے میں سے کوئی وارث ہو۔ کلالہ کل سے ماخوذ ہے اور اس کا معنیٰ عاجزی یا درماندگی ہوتا ہے۔ چونکہ مذکورہ شخص کے اُوپر اور نیچے کی طرف کوئی حقیقی رشتہ دار نہیں ہوتا۔ اور اس لحاظ سے وہ عاجز و درماندہ ہوتا ہے، اِس لیے اُسے کلالہ کہتے ہیں۔ بہر حال آیت کریمہ میں کلالہ کی وراثت کی تقسیم کا قانون بتایا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اور اگر کوئی ایسا آدمی کہ اُس کی وراثت کلالہ کی شکل میں حاصل کی گئی ہے أَوِ امْرَأَةٌ یا وہ عورت ہے۔ جو کلالہ کی صورت میں ہے وَلَهٗٓ أَخٌ اور ایسے کلالہ مرد یا عورت کا ایک بھائی ہے أَوْ أُخْتٌ یا ایک بہن ہے۔ ظاہر ہے کہ مرنے والے کے والدین یا اولاد میں سے تو کوئی باقی نہیں البتہ اُس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہے۔ اس بات پر مفسرین کا مکمل اتفاق ہے کہ یہاں پر بھائی بہن سے مراد میّت کے اخیافی بھائی بہن ہیں جو صرف اس کی ماں کی طرف سے ہیں۔ گویا نہ تو وہ حقیقی ہیں کہ ماں اور باپ دونوں کے مشترکہ ہوں اور نہ صرف باپ

کی طرف سے ہیں جنہیں علاتی کہا جاتا ہے بلکہ ایسے بھائی بہن مراد ہیں جو صرف ماں کی طرف سے سگے ہوں۔ فرمایا ایک اخیافی بھائی یا ایک اخیافی بہن کی صورت میں فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ان میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے۔ فَإِن كَانُوا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ اور اگر وہ بھائی یا بہن ایک سے زیادہ ہوں۔ یعنی دو بھائی یا دو بہنیں یا ایک بھائی اور ایک بہن یا اس سے زیادہ ہوں تو پھر فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ وہ سب تیسرے حصہ میں شریک ہوں گے۔ یعنی ایک سے زیادہ بھائی بہن ہونے کی صورت میں مرنے والے کا ایک تہائی مال سب میں برابر تقسیم ہوگا اور مرد و زن کے حصص میں کوئی تفاوت نہیں ہوگا۔ البتہ اگر کلالہ کے پسماندگان میں اس کے حقیقی بھائی بہن یا علاتی بھائی بہن ہوں تو ان کے درمیان حصص اسی طرح تقسیم ہوں گے جس طرح اولاد کے درمیان ہوتے ہیں یعنی لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہوگا۔ یہ احکام اسی سورۃ مبارکہ میں آئیں گے۔

واضح ہو کہ اس آیت مبارکہ میں بھائی اور بہن کے اخیافی مراد لینے کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ حقیقی بھائیوں اور بہنوں کا تذکرہ سورۃ ہذا کی آخری آیت میں موجود ہے جس کے احکام اس آیت سے مختلف ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی روایت میں مِنَ الْأُمِّ کا لفظ بھی قرأت میں آتا ہے۔ وہاں پر پورا جملہ یوں قرأت میں آتا ہے وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ مِّنَ الْأُمِّ یعنی میت کا بھائی یا بہن ماں کی طرف سے ہو۔ بہرحال یہاں پہ بھائی بہن سے اخیافی بہن بھائی مراد ہیں۔ اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

آگے فرمایا مذکورہ حصص کی تقسیم مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ہوگی۔ وصیت اور قرضہ کا قانون کلالہ کے معاملہ میں بھی ویسا ہی ہے

جیسے دوسرے مرنے والوں کے متعلق کہ وراثت کی تقسیم سے پہلے مرنے والے کا کفن دفن کا انتظام کیا جائیگا، پھر قرضہ کی ادائیگی ہوگی، اگر کوئی واجب الادا ہے۔ اس کے بعد وصیت پوری کی جائیگی اگر مرنے والے نے کی ہے اور اس کے بعد وراثت حاضر وارثوں میں حصہ رسدی تقسیم ہوگی۔

وصیت کی دو اقسام

وصیّت دو قسم سے ہے یعنی فرض اور مستحب۔ اگر کسی شخص کے ذمہ قرض واجب الادا ہے یا کوئی اور لین دین کا معاملہ ہے تو اس پر فرض ہے کہ وہ وصیت کر جائے کہ اس کا قرضہ اس کے مال سے ادا کیا جائے۔ اسی طرح اگر کسی کی نمازیں رہ گئیں ہیں۔ زکوٰۃ بقایا ہے، کچھ روزے رہ گئے ہیں تو اس پر بھی لازم ہے۔ کہ وہ وصیّت کرے کہ اُس کے مال میں سے زکوٰۃ ادا کی جائے یا نمازوں کا فدیہ دے دیا جائے۔ ایسی صورت میں وصیت کرنا فرض ہوتا ہے۔ اگر نہیں کریگا تو عنداللہ ماخوذ ہوگا۔

وصیت کی دوسری قسم مستحب ہے، جو کہ مرنے والا اپنے کل مال کے زیادہ سے زیادہ ایک تہائی کے برابر کر سکتا ہے۔ اس کے متعلق حدیث گذشتہ درس میں بھی بیان ہو چکی ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرما کر تمہیں اجازت دی ہے کہ تم اپنی آخرت کی بہتری کے لیے امور خیر میں ایک تہائی مال تک وصیّت کر سکتے ہو۔ اس سے زیادہ نہیں کہ وہ ورثا کا حق ہے۔ اگر کوئی شخص وارثان کی رضامندی کے بغیر ایک تہائی سے زیادہ کی وصیّت کریگا تو وہ نافذ العمل نہیں ہوگی۔ بلکہ عدالت کے ذریعے اُسے منسوخ کرایا جا سکتا ہے۔ اس آیت پاک میں بھی وصیت اور قرضہ کی تاکید میں وصیت کو مقدم رکھا گیا ہے۔ اس تقدم و تاخر کے متعلق بھی گذشتہ درس میں حدیث بیان ہو چکی ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا لوگو! دھوکا نہ کھانا، قرض پہلے ہے اور وصیت بعد میں۔ اللہ تعالیٰ نے وصیت کو اس لیے مقدم فرمایا ہے کہ یہ اللہ کا حق ہے اور بظاہر اس کا طالب

کوئی نہیں ہوتا۔ اس کو تاکیداً پہلے بیان کیا گیا ہے تاکہ لوگ اس کی اہمیت کو پہچان سکیں۔

ضرر رساں وصیّت

تاہم وصیّت کے متعلق فرمایا کہ یہ ایسی ہونی چاہیئے جو غَيْرَ مُضَآرٍّ ہو یعنی اس کے ذریعے کسی وارث کو تکلیف پہنچانا مقصود نہ ہو۔ کوئی ایسی وصیّت نہ کی جائے جس سے کسی دوسرے شخص کا حق ضائع ہو۔ مثلاً اس قسم کی وصیّت کی جائے کہ اس کا مال دور کے رشتہ داروں کو نہ پہنچنے پائے تو یہ وصیت ضرار ہوگی، ایسا کرنے والا گنہگار ہوگا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص ساٹھ یا ستر سال تک اللہ کی عبادت کرتا ہے مگر وصیت میں ضرار کرتا ہے، ورثا کو نقصان پہنچاتا ہے تو وہ جہنم کا مستحق بن جاتا ہے ورثا کے نقصان کی صورت یہ ہے کہ ایک تہائی سے زیادہ کی وصیّت کرتا ہے۔ ہاں اگر تمام ورثا کی رضامندی سے ایسا کرے تو اجازت ہے بغیر اجازت ایسا کرنا خود کو جہنم کے سپرد کرنا ہے۔ فرمایا یہ احکام وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وصیّت ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق سخت تاکید فرمائی ہے۔ اس پر سختی سے عمل ہونا چاہیئے۔ اور یاد رکھو! وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے۔ وہ تمہاری نیت تک کو جانتا ہے کہ تم اس کے حکم میں کس طرح کوتاہی کر رہے ہو یا کسی خوش دلی سے تعمیل کر رہے ہو۔ نیز وہ حلیم یعنی بردبار بھی ہے۔ لہٰذا اوقات وہ جلد گرفت نہیں کرتا بلکہ مہلت دیتا ہے تاکہ گنہگار اب بھی توبہ کر لیں۔ اور بالآخر وہ اپنے وقت پر مجرمین کو پکڑ لیتا ہے۔ اور اسکی گرفت سے کوئی بچ نہیں سکتا۔

حدود اللہ کی پابندی

وراثت کے احکام بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔ مثلاً وراثت ہی کے متعلق اللہ نے یہ حدیں مقرر کی ہیں۔ کہ مرنے والے کے بعض اقربا ذوی الفروض

کہلاتے ہیں۔ اور وہ ایسے رشتہ دار ہیں جن کے حصے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں جیسے آٹھواں، چھٹا، چوتھا، دو تہائی، ایک تہائی وغیرہ ان کا ذکر مختلف آیات میں آگیا ہے اس کے علاوہ دوسرے رشتہ دار ایسے ہوتے ہیں جو عصبہ کہلاتے ہیں ان میں بیٹا، پوتا یا باپ دادا وغیرہ جن کا تعلق میت کے باپ کی طرف ہو۔ چچا یا اس کی اولاد بھی اسی میں آتے ہیں۔ ذوی الفروض کے بعد جو مال بچتا ہے وہ عصبہ میں تقسیم ہوتا ہے

اور اگر عصبہ موجود نہ ہوں تو بقیہ مال ذوی الارحام کو مل جاتا ہے جو میت کی ماں کی طرف سے رشتہ دار ہوں جیسے ماموں یا اس کی اولاد وغیرہ۔ امام ابوحنیفہ رح کا یہی مسلک ہے۔ حدیث شریف میں بھی آتا ہے الخال وارث من لا وارث لہ جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا وارث ماموں ہے۔ تاہم امام شافعی رح کے مطابق اگر ذوی الفروض اور عصبہ موجود نہ ہوں تو ترکہ بیت المال میں جمع ہو جاتا ہے۔ وراثت کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے حلال و حرام نکاح طلاق وغیرہ میں بھی حدیں مقرر کی ہیں اسی لیے فرمایا کہ یہ اللہ کی حدیں ہیں۔

حقیقی فلاح

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گا۔ اللہ کی مقرر کی گئی حدوں کی حفاظت کرے گا يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اللہ اسے ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے سامنے نہریں بہتی ہیں۔ ان کا جنتوں میں داخلہ کسی خاص مدت کے لیے نہیں ہو گا بلکہ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ان میں ہمیشہ رہنا ہو گا، جو ایک دفعہ جنت میں داخل ہو گیا پھر اس کی نعمتوں سے کبھی محروم نہیں ہو گا۔ فرمایا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ جسے یہ مقام حاصل ہو گیا وہ خدا تعالیٰ کی رحمت کے مقام میں چلا گیا۔ سورۃ آل عمران

کے آخر میں گزر چکا ہے "مَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ" جو دوزخ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا، وہ کامیاب ہو گیا۔ یہ سب سے بڑی اور حقیقی کامیابی ہے۔ کہ انسان حظیرۃ القدس، علیین اور بہشت کا ممبر بن جائے۔ اس کے علاوہ جو بھی کامیابی ہے وہ عارضی ہے۔ حقیقی کامیابی یہی ہے کہ انسان جنت میں داخل ہو جائے۔

نافرمانی کی سزا

برخلاف اس کے فرمایا وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وَیَتَعَدَّ حُدُوْدَہٗ اور اس کی مقررہ حدوں سے تجاوز کیا۔ یُدْخِلْہُ نَارًا اللہ تعالیٰ اس کو جہنم میں داخل کریگا۔ اور وہاں کی زندگی عارضی نہیں ہو گی بلکہ خَالِدًا فِیْھَا اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہو گا۔ وَلَہٗ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ اور ایسے شخص کے لیے ذلت ناک عذاب ہو گا۔ طرح طرح کی پریشانیاں ہوں گی۔

امام ترمذیؒ نے ترمذی شریف میں بیان کیا ہے۔ کہ تمام صحابہ کرامؓ ائمہ دین اور اہل حق کا اتفاق ہے کہ جس شخص کے دل میں نورِ ایمان اور نورِ توحید ہو گا اُس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں نہیں رکھا جائے گا ایسے شخص کو فاسق، گنہگار یا عملی منافق کہہ سکتے ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے اس کی قائم کردہ حدود کو تسلیم کرتا ہے مگر ان کا حق ادا نہیں کرتا۔ وہ شخص اپنے گناہوں کی سزا پا کر جنت میں داخل ہو جائے گا۔ جہنم میں ابدی طور پر وہ لوگ جائیں گے جو کافر، مشرک یا منافق ہوں گے، نورِ ایمان اور نورِ توحید سے خالی لوگ دائمی طور پر دوزخ میں رہیں گے۔ ایسے لوگ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی۔ صوبہ سرحد کے ایک شخص کا واقعہ ہے کہ وہ پانچ چھ مربع میل زمین کا مالک اور بڑا سردار تھا۔ اُس نے لڑکیوں کو وراثت سے محروم کرنے کے لیے اپنی ساری جائداد لڑکوں کے نام لگوا دی۔

وہ شخص دنیا میں ہی سزا کا مستحق ہوا۔ لوگوں نے دیکھا کہ وہ خود لقوے کی بیماری کا شکار ہو گیا۔ ایک لڑکے نے خودکشی کر لی اور دوسرا گولی لگنے سے شدید زخمی ہو گیا۔ اللہ نے دنیا میں ہی اسے پریشانی میں مبتلا کر دیا۔
تاہم ضروری نہیں کہ ہر نافرمان کو دنیا میں ہی سزا ملے مگر کہیں کہیں نمونے نظر آ جاتے ہیں۔ نافرمان لوگ دوسروں کو دیکھ کر بھی عبرت حاصل نہیں کرتے۔ اللہ ان کی رسی دراز کرتا ہے۔ اور پھر وہ وقت بھی آ جائے گا جب ان کی رسی کھینچ لی جائیگی اور وہ ذلت ناک عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا
عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ
فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ
لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ
فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا
رَّحِیْمًا ﴿۱۶﴾

ترجمہ :- اور وہ عورتیں جو بے حیائی کا کام کرتی ہیں تمہاری عورتوں میں سے پس چار گواہ لاؤ اُن پر تم میں سے پس اگر وہ گواہی دیں تو اُن عورتوں کو روک رکھو گھروں میں یہاں تک کہ وفات دے دے اُن کو موت یا بنائے اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی اور راستہ ﴿۱۵﴾ اور وہ دو مرد جو بے حیائی کا کام کرتے ہیں تم میں سے پس ان کو ایذا پہنچاؤ پس اگر وہ توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں تو اعراض کرو اُن سے بیشک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے ﴿۱۶﴾

ربطِ آیات

سورۃ کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے حقوق کا ذکر فرمایا۔ ان کے ساتھ جو زیادتی زمانہ جاہلیت میں روا رکھی جاتی تھی اُس کے متعلق قانون تبلایا، یتیم بچیوں پر ظلم کیا جاتا تھا۔ یتیموں کے ساتھ ناانصافی ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں بھی احکام صادر فرمائے۔ پھر وراثت کا قانون سکھایا۔ اس میں بھی عورتوں اور چھوٹے بچوں کے ساتھ زیادتی کی جاتی تھی، اللہ تعالیٰ نے وراثت کا مکمل قانون اور ضابطہ عطا کیا۔ وراثت میں تمام

اقربا کے حصے مقرر فرمائے۔ اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کی کچھ ذمہ داریوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اُن کو حقوق تو حاصل ہو گئے اب اُن کی تادیب کی جارہی ہے اور خلاف ورزی کی صورت میں تعزیر لگانے کا بیان ہے۔

انسانی سوسائٹی کی بنیاد

انسانی سوسائٹی کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ ایک چیز مال ہے اور دوسری ربط۔ مال کے متعلق بہت سے احکام پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ ایک دوسرے کا مال ناحق کھانے کے متعلق وعید آچکی ہے۔ وراثت کا مسئلہ بھی مال ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے قوانین بھی بالتفصیل بیان ہو چکے ہیں کسی کا مال غصب کرنے سے یا کسی کی وراثت کو ناجائز طریقے سے حاصل کرنے کی وجہ سے انسانی سوسائٹی تباہ ہو جاتی ہے۔

انسانی سوسائٹی کی دوسری بنیاد ربط ہے۔ معاشرہ اسی ربط سے ہی قائم ہوتا ہے اور سوسائٹی کا اولین ربط ارتباط بین الرجال والنساء ہے۔ مردوں اور عورتوں کے درمیان — ربط ہی معاشرے کی بنیاد بنتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس ابتدائی ربط کو قانون کا پابند فرما دیا ہے۔ اگر مرد و زن کا یہ ربط قانون کے تابع عقد نکاح کے ذریعے قائم ہو گا تو آگے نسل بھی ٹھیک ہو گی، انسانی اخلاق درست ہو گا، انسانی سوسائٹی پاکیزہ ہو گی اور سوسائٹی کے تمام افراد اپنی ذمہ داریاں پوری کریں گے۔ اور اگر یہ اولین ربط ہی لاقانونیت کا شکار ہو گیا۔ ربط کی ابتدا نکاح کی بجائے فحاشی سے شروع ہوئی، تو پھر انسانی سوسائٹی تباہ و برباد ہو جائیگی، نسل بگڑ جائیگی، انسان کا اخلاق تباہ ہو جائے گا، دنیا میں ذلت کا منہ دیکھنا پڑے گا اور آخرت میں سخت رسوائی ہو گی۔

چنانچہ اس ربط کو خراب کرنے والا عمل قابل تعزیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سوسائٹی سے عیاشی اور زنا جیسے قبیح فعل کے خاتمے کے لیے ابتدائی طور پر یہ تعزیر لگائی جو آج کے درس کا موضوع ہے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اللہ تعالیٰ نے سورۃ نور کی آیات کے ذریعہ اس معاشرتی اور اخلاقی

برائی کے متعلق مستقل تعزیہ کا اعلان فرمایا۔ مرد و زن کے اس جائز ربط کی حفاظت کے لیے قانون سازی ضروری تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس ربط کو قضائے شہوت اور نسل انسانی کی بقا کے لیے نکاح کی صورت دی ہے۔ مگر اس کے برعکس مَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ جو کوئی اس کے علاوہ دوسرا راستہ اختیار کریگا تو وہی زیادتی کرنے والا ہوگا۔ ایسا شخص انسانی سوسائٹی کا برباد کنندہ اور دشمن ہوگا۔

بے حیائی کی تعزیہ

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَالّٰتِيْ وہ عورتیں يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ جو بے حیائی کا ارتکاب کرتی ہیں مِنْ نِّسَآئِكُمْ تمہاری عورتوں میں سے۔ اس مقام پر فحش سے مراد زنا ہے۔ قرآن پاک میں فحش کا اطلاق زنا لواطت، بخل اور عریانی وغیرہ پر ہوتا ہے۔ تاہم یہاں پر زنا ہی مراد ہے اور تمہاری عورتوں سے مراد منکوحہ عورتیں ہیں مطلب یہ ہے کہ اگر شادی شدہ عورتیں زنا جیسے فعل شنیع کا ارتکاب کریں فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ تو اپنے میں سے اُن پر چار گواہ لاؤ۔ گویا فعل زنا کے ثبوت کے لیے چار عینی گواہوں کی ضرورت ہے اس سے کم درجہ کی شہادت سزا کے لیے ناکافی ہے۔ جرم زنا کی نوعیت کے اعتبار سے اسکی سزا بھی سخت ہے۔ اس لیے شریعت نے عاقل، بالغ ایسے چار مرد گواہوں کی شہادت کو لازمی قرار دیا ہے جنہوں نے اس فعل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ عینی گواہ کیسے مہیا ہو سکتے ہیں جب کہ کسی دوسرے شخص کو بے پردگی میں دیکھنا ویسے ہی گناہ ہے۔ تو اس معاملے میں شریعت نے گواہی کی خاطر اس فعل کا مشاہدہ کرنے کی اجازت دی ہے۔ لہذا اس فعل کے ارتکاب کا مشاہدہ کرنے والوں پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ ملزم پر تعزیہ عاید کرنے کا دارومدار اس گواہی پر ہوگا۔

فرمایا فَاِنْ شَہِدُوْا پس اگر چار مرد فعل زنا کے ارتکاب کی گواہی دے دیں فَاَمْسِکُوْھُنَّ فِی الْبُیُوْتِ تو اُن عورتوں کو جن کے خلاف شرعی شہادت مل گئی ہے اپنے گھروں میں قید کر دو۔ انہیں باہر جانے کی اجازت نہیں ہو گی۔ ابتدائی زمانہ اسلام میں بدکار عورتوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہی تعزیر مقرر کی تھی کہ فعل زنا ثابت ہونے پر انہیں گھروں میں نظر بند کر دو اور اُس وقت تک قید رکھو حَتّٰی یَتَوَفّٰھُنَّ الْمَوْتُ یہاں تک کہ انہیں موت آجائے۔ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَھُنَّ سَبِیْلًا یا اللہ تعالیٰ اُن کے لیے کوئی اور راستہ بنا دے۔ بہر حال عمر قید کی سزا کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ اشارہ بھی فرما دیا کہ اس سزا کے علاوہ کوئی دوسری سزا بھی آمدہ دور میں مقرر کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں بعد میں سورۃ نور کی یہ آیت نازل ہوئی۔ اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ یعنی زانی عورت اور زانی مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔ قرآن پاک میں یہ سزا غیر شادی شدہ مرد و زن کے لیے ہے۔ محصن یعنی شادی شدہ مرد اور عورت کی سزا سنت کے مطابق رجم ہے۔ مجرم کو پتھر مار مار کر ختم کر دیا جائیگا۔ البتہ غیر شادی شدہ کے لیے سو کوڑوں کے علاوہ اگر حاکم مجاز مناسب سمجھے تو ایک سال کے لیے شہر بدر بھی کر سکتا۔ یہ امام ابو حنیفہؒ کا مسلک ہے امام شافعیؒ شہر بدری کی سزا کو سو کوڑوں کے ساتھ لازم قرار دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ فعل زنا کے متعلق اگر چار عینی گواہ نہ مل سکیں تو ملزم کے اقرار پر بھی مقررہ سزا دی جا سکتی ہے۔ اس قسم کی مثال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اپنے زمانہ مبارک میں ملتی ہے۔ ماعز بن مالک اسلمیؓ نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے جرم زنا کا چار دفعہ اقرار کیا تو آپ نے اُسے رجم کی سزا دی۔ قبیلہ غامدیہ کی ایک عورت نے بھی اعتراف جرم کیا تو اس کو بھی رجم کیا گیا۔

ہم جنسی اور اس کی سزا

پہلی آیت میں جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا تھا اور یہ صرف عورتوں کی سزا کے متعلق تھی۔ اب اگلی آیت میں فرمایا وَالَّذٰنِ یہ تثنیہ کا صیغہ ہے اور مراد ہے دو مرد۔ یَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ جو تم میں سے بے حیائی کا کام کرتے ہیں یعنی زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہاں پر تثنیہ کا صیغہ استعمال ہوا ہے مگر یہ واحد اور جمع پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور مراد ہر صورت میں زنا ہی ہے۔ گذشتہ آیت میں ایسی عورتوں کی سزا تازلیست قید مقرر کی اب مردوں کے متعلق فرمایا فَاٰذُوْهُمَا اُن دونوں کو ایذا پہنچاؤ، مارو پیٹو، توہین و تذلیل کرو۔ عورتوں کی سزا کی طرح یہ مردوں کی سزا بھی ابتدائے زمانہ میں تھی، بعد میں سورۃ نور میں مذکورہ سزا نازل فرمائی جس سے یہ محض ایذا رسانی کی سزا موقوف ہو گئی۔

بعض فرماتے ہیں۔ کہ تثنیہ مذکر کا صیغہ استعمال کرنے سے مراد دو مردوں کی آپس میں ہم جنسی یعنی لواطت ہے جس کی سزا مار پیٹ وغیرہ مقرر کی گئی اور جسے بعد میں منسوخ کر دیا گیا۔ البتہ فقہائے کرام کا ہم جنسی کی سزا کے متعلق اختلاف ہے۔ اکثر آئمہ کرام امام مالکؒ، امام شافعیؒ کی ایک روایت امام احمدؒ امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ وغیرہم فرماتے ہیں کہ دو مردوں پر بھی وہی حد جاری ہونی چاہیئے جو ایک مرد اور ایک عورت کی صورت میں جاری کی جاتی ہے۔ اگر وہ شادی شدہ نہیں تو انہیں سو سو کوڑے لگائے جائیں اور سال بھر کے لیے جلا وطن بھی کیا جائے۔ اور اگر شادی شدہ ہیں تو انہیں سنگسار کر دیا جائے۔ امام شافعیؒ کی ایک دوسری رائے یہ ہے کہ ایسے مردوں کو ہر حالت میں رجم کر دیا جائے۔ البتہ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں۔ کہ ہم جنسی کے جرم پر زنا کی حد نہیں لگے گی بلکہ ان کے لیے قاضی کی صوابدید کے مطابق تعزیر ہو گی۔ فرماتے ہیں۔ کہ ہم جنسی کو زنا کا مصداق نہیں بنایا جا سکتا، کیونکہ زنا ایسا فعل ہے جو کسی مقام پر جا کر رک جاتا ہے۔ مثلاً

اگر زانی مرد اور زانیہ عورت اس فعل کے ارتکاب کے بعد آپس میں یا کسی دوسری جگہ نکاح کر لیں تو یہ فعل رک جائے گا مگر لواطت ایسا فعل ہے جس کی حرمت ہمیشہ قائم رہتی ہے اس لیے ہم جنسی زنا سے زیادہ شدید جرم ہے اور اس پر سخت تعزیر ہونی چاہیئے۔ اگر کوئی عادی مجرم ہے۔ تو اُسے کسی اونچے مینار سے گرا کر ہلاک کر دیا جائے یا اُس کا سر قلم کر دیا جائے۔ جرم کی نوعیت کے اعتبار سے اُسے قید میں ڈالا جاسکتا ہے یا کوڑے لگائے جا سکتے ہیں۔ بہر حال یہ حاکم وقت کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ کیا سزا تجویز کرتا ہے۔

ہم جنسی کی لعنت سب سے پہلے قوم لوط میں آئی۔ اس سے پہلے یہ قباحت کسی سوسائٹی میں نہیں پائی جاتی تھی۔ مگر اس زمانے میں صورت حال یہ ہے کہ شیطان کا یہ جال پوری دنیا میں پھیل چکا ہے۔ اور کوئی ملک اس بیماری سے محفوظ نہیں رہا۔ سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ انگریزوں نے ہم جنسی کو قانونی تحفظ فراہم کر دیا ہے اُن کی اسمبلی میں پاس ہو چکا ہے کہ اگر دو مرد باہمی رضامندی سے اس فعل کا ارتکاب کریں تو قابل گرفت نہیں ہیں۔ یہ نہایت ہی قابلِ مذمت بات ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے قانون کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ بہر حال قرآن پاک اس فعل شنیع کو کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کرتا خواہ باہمی رضامندی کے ساتھ یا زبردستی کیا گیا ہو۔ یہ فعل سوسائٹی کے ربط اور اجتماعیت کو باطل کرنے والا ہے۔

توبہ کا دروازہ

اس فعل بد کے مرتکب دو افراد کے متعلق فرمایا کہ انہیں ایذا پہنچاؤ فَاِنْ تَابَا پس اگر وہ دونوں توبہ کر لیں وَاَصْلَحَا اور اصلاح کر لیں، یعنی اس غلط کام کی قباحت کو سمجھ کر اپنے فعل پر نادم ہوں اور پھر آئندہ کے لیے اس فعل سے تائب ہو کر اپنی اصلاح کر لیں۔ تو فرمایا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا تو اُن سے اعراض کرو، درگزر کرو اور آئندہ انہیں کوئی ایذا نہ دو۔ جب کوئی شخص برے کام سے باز آجائے تو پھر اس کو یاد کرا کے عار نہیں دلانا

چاہیئے اور نہ آئندہ ایسی بات کا تذکرہ ہونا چاہیئے جس کی وجہ سے اُسے کوفت ہو۔ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا بیشک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنیوالا اور بے حد مہربان ہے۔ جب انسان سے کوئی کوتاہی یا لغزش ہو جاتی ہے اور وہ سچے دل سے تائب ہو جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی اُس کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دیتا ہے اور اُس سے درگزر کرتا ہے اس کے بعد توبہ کا قانون بیان ہو رہا ہے۔

درسِ سیزدہم ۱۳ — آیت ۱۷ تا ۱۸

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ
ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ
وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٧﴾ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ
لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ
الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ
وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٨﴾

ترجمہ :- بیشک توبہ کی قبولیت اللہ کے ذمے اُن لوگوں کے لیے ہے جو بُرائی نادانی کی وجہ سے کرتے ہیں، پھر توبہ کر لیتے ہیں جلدی، یہی لوگ ہیں جن کے اُوپر اللہ تعالےٰ (مہربانی) سے رجوع فرماتا ہے اور بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا اور حکمت والا ہے ﴿۱۷﴾ اور اُن لوگوں کے لیے توبہ نہیں ہے جو برائیاں کرتے ہیں یہاں تک کہ جب اُن میں سے کسی کے سامنے موت آجاتی ہے، تو کہتا ہے کہ بیشک میں اب توبہ کرتا ہوں اور نہ اُن لوگوں کے لیے توبہ ہوتی ہے جو اس حالت میں مر جاتے ہیں کہ وہ کفر کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنکے لیے ہم نے درد ناک عذاب تیار کیا ہے ﴿۱۸﴾

ربطِ آیات

پہلے وراثت کے مسائل بیان ہوئے۔ اس کے بعد معاشرے کی درستگی اور اسکی پاکیزگی کے احکام کا تذکرہ ہوا۔ اور زنا اور لواطت جیسی قبیح بیماری کی مذمت کی گئی۔ اور

بدکار عورتوں کو تازیست محبوس رکھنے اور مردوں کو اذیت پہنچانے کا حکم دیا گیا۔ البتہ اگر ایسے لوگ توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیں، تو فرمایا کہ پھر انہیں ایذا نہ پہنچاؤ۔ اس مقام پہ اللہ تعالیٰ کی صفات بیان ہوئیں کہ وہ توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔ اب یہاں درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پہ توبہ کی شرائط کا ذکر آگیا ہے اور اس بات کی وضاحت فرما دی گئی ہے۔ کہ زنا اور لواطت جیسے کبیرہ گناہ سے بھی توبہ کر لی جائے، انسان سچے دل سے نادم ہو جائے تو اس کیلئے بھی قبولیت کا موقع موجود ہوتا ہے۔ معافی مل سکتی ہے مگر بعض شرائط کے ساتھ اس کے بعد پھر وہی معاشرتی احکام آ رہے ہیں۔ نکاح اور عورتوں کے حقوق کا تذکرہ آئیگا۔ اور جیسا کہ یہ سلسلہ پیچھے سے چلا آ رہا ہے، بعض دیگر معاشرتی مسائل بھی بیان ہوں گے۔

گناہ بالجہالت

ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّ التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ بیشک توبہ قبول کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمے اُن لوگوں کے لیے ہے لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ جو برائی جہالت اور نادانی کی وجہ سے کرتے ہیں۔ آیت کے ظاہری الفاظ سے محسوس ہوتا ہے کہ صرف اسی گناہ کی توبہ قابلِ قبول ہے جو بے سمجھی کی وجہ سے سرزد ہو، جس کا مطلب یہ ہے کہ جو برائی جان بوجھ کر عمداً کی جائے اس کے لیے معافی کی کوئی گنجائش نہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ ایسا نہیں ہے بلکہ ہر گناہ خواہ وہ عمداً سرزد ہوا ہو یا خطأً ہر حالت میں قابلِ معافی ہے۔ کیونکہ یہاں پر جہالت سے مراد حماقت اور بیوقوفی ہے۔ اور گناہ جب بھی کیا جائے وہ حماقت ہی کا نتیجہ ہوتا ہے اور حماقت اس لیے کہ گناہ کرنے والے کی نظر گناہ کے انجام تک نہیں پہنچتی جس کی وجہ سے وہ گناہ کا اقدام کرتا ہے۔ اگر گناہ کا انجام اس کے سامنے ہو تو کبھی گناہ پہ اقدام نہ کرے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب بھی کوئی شخص برائی کا ارتکاب کرتا ہے اس پر غفلت کے پردے پڑے ہوتے ہیں۔ بہرحال جہالت سے مراد یہ ہے۔ کہ گناہ

کرتے وقت انسان کے ذہن و فہم پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ گناہ عمداً ہو یا بھول کر انسان اُس کے انجام سے غافل ہوتا ہے اسی لیے فرمایا کہ توبہ اُن لوگوں کے لیے ہے جو جہالت کی وجہ سے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔

اقدام گناہ کے درجات

امام غزالیؒ اپنی کتاب احیاء العلوم میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ گناہ پر اقدام کا پہلا درجہ معصومین کا ہے۔ اور یہ گروہ ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ جو گناہ پر اقدام کرتے ہی نہیں۔ انبیاء بڑے اعلیٰ مرتبے کے لوگ ہوتے ہیں ان سے جو معمولی سے معمولی لغزش بھی ہو جاتی ہے وہ اگرچہ عام لوگوں کے لیے گناہ بھی شمار نہیں ہوتا مگر انبیاء کے لیے قابل مؤاخذہ ہوتی ہے درحقیقت گناہ کا اقدام نہ ملائکہ سے سرزد ہوتا ہے۔ اور نہ انبیاء کرام سے۔

گناہ کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ کسی انسان سے گناہ سرزد ہو جائے تو اس کے بعد اس کے دل میں ندامت بھی پیدا نہ ہو بلکہ وہ اس پر اصرار کرتا ہے۔ یہ شیاطین کا درجہ ہے۔ دنیا میں ایسے انسان موجود ہیں جو اس روش پر چل رہے ہیں۔ گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں اور پھر کرتے چلے جاتے ہیں۔ اُن کے قلب و ذہن میں کبھی ندامت پیدا نہیں ہوتی۔ گناہ کا تیسرا درجہ یہ ہے۔ کہ بنی آدم گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ مگر جلدی ہی اس پر نادم ہو جاتے ہیں اور گناہ کو ترک کر دیتے ہیں یہ انسانوں کا درجہ ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا کہ وہ جہالت کی وجہ سے گناہ کرتے ہیں جب ان کی جہالت دُور ہوتی ہے، وہ نادم ہو کر گناہ ترک کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے معافی کے خواستگار ہوتے ہیں تو پھر ایسے لوگوں کی توبہ اللہ تعالیٰ قبول بھی فرما لیتے ہیں۔

توبہ کا دروازہ

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے اَلتَّائِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ یعنی گناہ سے صحیح طور پر توبہ کرنے والا اللہ کا محبوب ہوتا ہے۔ آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا[1] اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ گناہ

---

[1] ابن ماجہ ص۳۱۳ (فیاض)

ہے توبہ کرنے والا ایسا ہے گویا اُس نے گناہ کیا ہی نہیں۔ اور توبہ کس وقت تک قبول ہوتی ہے فرمایا مَا لَمْ يُغَرْغِرْ جب تک انسان پر غرغرہ واقع نہ ہو جائے۔ جب اُس پر حالت نزع طاری ہو جاتی ہے، پردہ اُٹھ جاتا ہے اور فرشتے نظر آنے لگتے ہیں اس وقت توبہ قبول نہیں ہوتی۔ جب تک انسان کے ہوش و حواس قائم رہتے ہیں توبہ کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ دوسری حدیث میں آتا ہے کہ انسانوں کی توبہ قبول ہوتی رہے گی۔ حتیٰ کہ قیامت آ جائے یعنی پورے عالم پر حالت نزع طاری ہو جائے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ مغرب کی جانب ایک بڑا دروازہ ہے۔ جب وہ دروازہ بند ہو گیا تو پھر کسی شخص کی توبہ قبول نہیں ہو گی۔ مسند احمد شریف کی روایت میں یوں آتا ہے کہ انسان کی توبہ اُس وقت تک قبول ہوتی رہتی ہے مَا لَمْ يَقَعِ الْحِجَابُ جب تک کہ حجاب نہ واقع ہو جائے۔ اور حجاب کی تفسیر آپ نے یہ فرمائی کہ انسان کی جان اس حالت میں نکل جائے کہ وہ شرک میں مبتلا ہو۔ ایسے شخص پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حجاب پڑ گیا۔ ایسی ہی حالت کے متعلق فرمایا "إِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ لَمَحْجُوبُوْنَ" اُن پر اُن کے اللہ کی طرف سے حجاب پڑ چکا ہے۔

گناہ کے بعد توبہ کر کے انسان بلند مقام حاصل کر لیتا ہے۔ سورۃ توبہ میں اللہ تعالیٰ نے دوسرے لوگوں کے ساتھ اَلتَّآئِبُوْنَ[1] یعنی توبہ کرنے والوں کو بھی خوشخبری سنائی ہے۔ سورۃ نور میں فرمایا وَتُوْبُوْا إِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ اے ایمان والو! تم سارے کے سارے اللہ سے توبہ کرو تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔ غرضیکہ قرآن میں توبہ کی فضیلت کثرت سے آئی ہے۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ انسان کا ہر گناہ نادانی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اُس پر غفلت کا پردہ ہوتا ہے اور وہ گناہ کے انجام سے

[1] ترمذی صلاہ (فیاض)

ناواقف ہوتا ہے۔ آگے فرمایا ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ گناہ کے سرزد ہونے کے بعد جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ کتنی جلدی؟ اسکی تفصیل بھی احادیث میں موجود ہے۔ بعض روایات میں موت سے ایک سال پہلے یا ایک مہینہ یا ایک ہفتہ یا ایک دن یا ایک گھڑی بھر پہلے بھی انسان توبہ کر لے تو وہ قابل قبول ہوتی ہے یہاں تک کہ جب غرغرہ کی حالت طاری ہو جاتی تو توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے چونکہ انسان کی زندگی بالکل قلیل مدت کے لیے ہے اس لیے مذکورہ تمام حالتوں پر قریب ہی کا اطلاق ہوتا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ زندگی میں بقائمی ہوش وحواس تائب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ توبہ قبول فرمالیتا ہے۔ تائب اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اس کا معنیٰ رجوع کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر مہربانی سے رجوع فرماتا ہے اور بندہ گناہ ترک کر کے خدا کی طرف انابت کے ساتھ رجوع کرتا ہے "اَنِيبُوٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَ اَسْلِمُوا لَهٗ" میں اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ اپنے رب کی طرف فرمانبرداری، اطاعت اور انابت کے ساتھ رجوع کرو۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا فَاُولٰٓئِكَ يَتُوبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ اللہ تعالیٰ ان پر رحمت کے ساتھ رجوع فرماتا اور ان کی توبہ قبول کر لیتا ہے وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا اور بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا اور حکمت والا ہے وہ ہر انسان کی ہر بات کو جانتا ہے۔ اور اس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں۔ وہ اپنے بندوں کے حال سے خوب واقف ہے اور وہ انہیں معاف کر دینا چاہتا ہے ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ انسان اس کی طرف رجوع کرے۔

توبہ کی عدم قبولیت

آگے اُن لوگوں کا ذکر فرمایا جن کی توبہ قبول نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ اور ان لوگوں کے لیے توبہ نہیں ہے۔ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ جو برائیاں کرتے رہتے ہیں۔

حَتّٰٓی اِذَا حَضَرَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ یہاں تک کہ جب اُن پر موت حاضر ہوجاتی ہے۔ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْئٰنَ تو کہتے ہیں کہ میں نے اَب توبہ کی۔ مگر اُس وقت توبہ کی قبولیت کا دروازہ بند ہوچکا ہوتا ہے۔ فرعون نے بھی غرق ہوتے وقت یہی کہا تھا "قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِہٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ" یعنی میں بھی اُسی اللہ پر ایمان لایا جس پر بنی اسرائیل ایمان رکھتے ہیں وہاں یہ لفظ ہے آلْئٰنَ تواب ایمان لاتا ہے مگر توبہ کا وقت گزر چکا تھا۔ اللہ نے فرمایا تو بڑا غنڈا تھا۔ مفسد تھا، زمین میں فساد پھیلا رکھا تھا۔ اب تو اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ بہرحال نزع کی حالت سے پہلے پہلے توبہ قبول ہوسکتی ہے اس کے بعد اس کا دروازہ بند ہوجاتا ہے۔

توبہ کی تین شرائط

مفسرین نے توبہ کی تین شرائط کا ذکر فرمایا ہے۔ پہلی شرط یہ ہے۔ کہ گناہ میں آلودہ ہونے کے بعد انسان ندامت محسوس کرے کہ اُس نے یہ بُرا کام کیا ہے۔ ایک حدیث میں اَلتَّوْبَۃُ النَّدَمُ کے الفاظ آتے ہیں یعنی توبہ ندامت ہی کو کہا جاتا ہے۔ جب انسان کسی بُرے فعل پر شرمندگی محسوس کرے تو توبہ کی پہلی شرط پوری ہوتی ہے اور دوسری شرط یہ ہے کہ جو غلط کام ایک دفعہ یا بار بار کیا جا رہا ہے اس کو ترک کر دے۔ اگر توبہ بھی کرتا ہے اور گناہ پر اصرار بھی جاری رکھے تو ایسی توبہ کا کچھ اعتبار نہیں جیسا کہ غالب نے کہا ہے ۔

مے بھی پیتے جاتے ہیں، توبہ بھی کرتے جاتے ہیں

یہ بھی جاری، وہ بھی جاری۔ ایسی توبہ کا کوئی فائدہ نہیں اور توبہ کی تیسری شرط یہ ہے کہ جو غلط کام کیا ہے اس کی تلافی بھی کرے۔ کسی کا حق غصب کیا ہے اس کو ادا کرے یا اس سے معافی چاہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا کوئی حق ضائع کیا ہے، نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ میں کوتاہی ہوئی ہے اُس کو پورا کرے۔

نماز و روزہ کی قضا دے۔ اگر معذور ہو گیا ہے تو اس کے بدلے فدیہ ادا کرے۔ قرآن پاک میں موجود ہے "اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا" یہاں پر اصلاح کا لفظ تلافی ہی کے معنی میں آیا ہے۔ بہر حال توبہ کی تین شرائط ہیں۔ پہلی ندامت، دوسری ترک گناہ اور تیسری "تلافی" جب ان شرائط کے ساتھ توبہ کی جائیگی تو اللہ تعالےٰ قبول فرمائیں گے۔

کفار کی توبہ نہیں

فرمایا ایک تو نزع کی حالت کے وقت توبہ قبول نہیں ہوتی اور دوسرے وَلَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ وَھُمْ کُفَّارٌ ایسے لوگوں کی توبہ بھی نامقبول ہے جو کفر کی حالت میں ہی مر جائیں۔ ان پر حجاب پڑ گیا۔ کفر کی حالت میں ہی خاتمہ ہو گیا۔ وہ ابدی طور پر توبہ سے محروم ہو گئے ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا اُولٰٓئِکَ اَعْتَدْنَا لَھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا۔ ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ وہ ہماری گرفت سے بچ نہیں سکتے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُوا۟ ٱلنِّسَآءَ
كَرْهًا ۖ وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا۟ بِبَعْضِ مَآ
ءَاتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّآ أَن يَأْتِينَ بِفَٰحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ
وَعَاشِرُوهُنَّ بِٱلْمَعْرُوفِ ۚ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰٓ
أَن تَكْرَهُوا۟ شَيْـًٔا وَيَجْعَلَ ٱللَّهُ فِيهِ خَيْرًا
كَثِيرًا ۱۹ وَإِنْ أَرَدتُّمُ ٱسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ
زَوْجٍ وَءَاتَيْتُمْ إِحْدَىٰهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا۟ مِنْهُ
شَيْـًٔا ۚ أَتَأْخُذُونَهُۥ بُهْتَٰنًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ۲۰
وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُۥ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ
وَأَخَذْنَ مِنكُم مِّيثَٰقًا غَلِيظًا ۲۱

ترجمہ :- اے ایمان والو ! تمہارے لیے حلال نہیں ہے کہ تم وارث بن جاؤ عورتوں کے زبردستی اور نہ روکو اُن کو تاکہ تم بعض وہ چیزیں لے جاؤ جو تم نے اُن کو دی ہیں سوائے اس کے کہ وہ بےحیائی کی کھُلی بات کریں اور اُن عورتوں سے میل جول رکھو دستور کے مطابق۔ پس اگر تم اُن کو ناپسند کرو اور شاید کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ اس میں بہت سی بہتری بنا دے ۱۹ اور اگر تم تبدیل کرنا چاہتے ہو

ایک عورت کی جگہ دوسری عورت کو اور تم نے اُن میں سے ایک کو ڈھیر مال دیا ہے تو اس میں سے کوئی چیز بھی نہ لو کیا تم لیتے ہو اُس کو بہتان اور صریح گناہ کی شکل میں (۲۰) اور تم اُس کو کیسے لو گے حالانکہ پہنچ چکے ہیں تمہارے بعض بعض کی طرف اور لیا ہے اُن عورتوں نے تم سے پختہ عہد (۲۱)

ربطِ آیات

گذشتہ سے پیوستہ درس میں مردوں اور عورتوں کی اخلاقی بے حیائی کا ذکر تھا، اور اس کی سزا کا تعین بھی تھا۔ پھر درمیان میں اللہ تعالیٰ نے توبہ کی قبولیت اور اپنی صفات تواب اور رحیم کا تذکرہ فرمایا۔ توبہ کی شرائط کا بیان آیا۔ نیز یہ بھی کہ توبہ کی قبولیت کا وقت نزع کی حالت شروع ہونے سے پہلے پہلے ہے۔ جب دوسرے جہان کی چیزیں نظر آنے لگیں۔ انسان قریب المرگ ہو جائے تو اس وقت کی توبہ قابلِ قبول نہیں، اسی طرح جو لوگ کفر کی حالت پر ہی مر جائیں اُن کی توبہ بھی قبول نہیں۔ البتہ اِن حالات سے پہلے پہلے جو شخص سچے دِل سے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرما لیتے ہیں مسند احمد کی روایت میں آتا ہے۔ کہ ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کہا تھا۔ کہ اے پروردگار! میں انسانوں کو اُس وقت تک گمراہ کرتا رہوں گا، جب تک اُن کے جسموں میں جان باقی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ جب تک میرے بندے مجھ سے بخشش طلب کرتے رہیں گے۔ میں اُن کو معاف کرتا رہوں گا۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے توبہ کو بندے کے لیے آخری وقت تک ذریعہ نجات بنا دیا ہے۔

اب اگلی آیات میں پھر عورتوں کے مسائل آرہے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں عورتوں کے ساتھ جو بدسلوکی اور ناانصافی ہوتی تھی، اُس کا دوبارہ تذکرہ آرہا ہے۔ یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے نزولِ قرآن کے وقت مروجہ رسم و رواج کی تردید فرمائی ہے اور صحیح راستے کی طرف راہنمائی فرمائی ہے۔ اُس کے بعد نکاح کے ضمن میں اُن عورتوں کا ذکر ہے جو محرمات نکاح میں شمار ہوتی ہیں اور جن کے ساتھ کسی شخص کا نکاح جائز نہیں ہوتا۔

شانِ نزول

صحیح احادیث میں آتا ہے۔ کہ زمانۂ جاہلیت میں فوت شدہ شخص کے پیچھے اگر اُس کا سوتیلا بیٹا ہوتا تھا تو وہ اپنے باپ کی بیوہ یعنی سوتیلی ماں پر قبضہ کر لیتا تھا۔ بیوہ عورت کو بھی مرنے والے کا ترکہ سمجھ کر اُس کے ساتھ وراثت جیسا سلوک ہی کیا جاتا تھا۔ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ اُس زمانے میں وراثت کا کلی حقدار مرنے والے کا بڑا بیٹا یا بھائی یا بھتیجا وغیرہ ہوتے تھے۔ چھوٹے بچوں اور عورتوں کو وراثت سے محروم رکھا جاتا تھا۔ چونکہ بیوہ کو بھی وراثت ہی کا ایک حصہ تصور کیا جاتا تھا۔ لہٰذا مرنے والے کا وارث یا تو اُس عورت سے خود نکاح کر لیتا تھا یا مہر اور مال وغیرہ حاصل کر کے اُس کا نکاح کسی دوسری جگہ کر دیتا تھا۔ اور اس کی بدترین صورت یہ تھی۔ کہ اگر وارث مرنے والے کا دوسری بیوی سے سوتیلا بیٹا ہے تو وہ خود اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کر لیتا تھا۔ ایسی عورتوں کے ساتھ ایک اور بدترین سلوک یہ کیا جاتا تھا۔ کہ بعض اوقات اگر بوجوہ وارث اُس عورت کے ساتھ نکاح نہیں کرنا چاہتا تھا، تو اُسے دوسری جگہ نکاح کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ اگر عورت نے دوسرا نکاح کر لیا تو وہ اپنے ساتھ اپنا مال بھی لے جائیگی اور مرنے والے کا وارث اُس عورت کے علاوہ اُس کے مال سے بھی محروم ہو جائیگا۔

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ مبارک میں ایک ایسا واقعہ بھی پیش آیا کہ ایک عورت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا حضور! میرا خاوند مر چکا ہے۔ اور دوسری بیوی سے اُس کا جو بیٹا ہے اُس نے مجھے گھر میں ڈال رکھا ہے۔ نہ وہ مجھ سے اچھا سلوک کرتا ہے اور نہ مجھے آزاد کرتا ہے کہ دوسری جگہ نکاح کر لوں۔ ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ اِس کے جواب میں نبی علیہ السلام نے فرمایا۔ تم گھر میں بیٹھو اللہ تعالیٰ تمہارے بارے میں یقیناً کوئی حکم نازل فرمائیں گے۔ مفسّرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ آیات اسی ضمن میں نازل ہوئیں۔

عورت بطور مال وراثت

ارشاد خداوندی ہے۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے ایمان والو۔ لَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا تمہارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ تم عورتوں کے زبردستی وارث بن بیٹھو۔ جس بیچاری کا خاوند فوت ہوگیا ہے تم اُس کو بھی مال وراثت کا حصہ سمجھ کر اُس پر قبضہ کر لو۔ اور ان سے من مانا سلوک کرو۔ یہ بھی فرمایا وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اور نہ روک رکھو اُن عورتوں کو لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ محض اس لیے کہ تم نے انہیں جو چیزیں بطور مال یا عطیہ دی تھیں اُن میں سے کچھ چیزیں واپس لے سکو۔ فرمایا یہ بھی تمہارے لیے روا نہیں۔ کہ محض اس وجہ سے انہیں دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہ دو کہ اُن کے ساتھ اُن کا مال بھی جائے گا۔ فرمایا یہ بیوہ عورتوں کے ساتھ سخت ناانصافی ہے۔ ایسا مت کرو۔

بیحیائی کی صورت میں

ہاں اُن کو روک رکھنے کی صرف اس صورت میں اجازت ہے اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ کہ وہ کسی صریح بیحیائی کا ارتکاب کر بیٹھیں۔ اس کے متعلق گذشتہ دروس میں ذکر آچکا ہے۔ کہ اگر کوئی عورت زنا کا ارتکاب کرتی ہے تو اُس کی سزا یہ ہے کہ اُسے گھر میں تازیست قید کر دو۔ یہ ابتدائی حکم تھا، بعد میں اللہ تعالیٰ نے سو کوڑوں اور رجم کی سزائیں نافذ کر کے قید و بند والا حکم منسوخ فرما دیا، تو فرمایا ایسی صورت تم عورتوں کو روک سکتے ہو۔ وگرنہ عدت کے بعد عورت آزاد ہے وہ جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے۔ سورۃ بقرہ میں بھی یہ احکام گذر چکے ہیں کہ ایسی عورتیں اپنے متعلق بہتر رائے قائم کرنے کی مجاز ہیں۔ اگر وہ نکاح کرنا چاہیں تو اُن پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ غرضیکہ فرمایا بیوہ عورتوں پر کسی قسم کا جبر نہیں ہونا چاہیئے۔

ہاں ایسی عورتوں سے گلو خلاصی کا ایک دوسرا طریقہ یہ ہے۔ کہ ان کے لیے خلع کا موقع پیدا کر دو۔ اگر کوئی عورت بیحیائی کا ارتکاب

کرتی ہے تو ایک نیک اور متدین آدمی کے لیے اس سے نباہ مشکل ہو جاتا ہے۔ تو ایسی صورت میں عورت کو خلع کے ذریعہ علیحدہ کیا جاسکتا ہے۔ خلع کے لیے تم اُن کو ادا کردہ مہر و مال یا اُس سے زیادہ کا مطالبہ بھی کر سکتے ہو کیونکہ قصور عورت کا ہے۔ البتہ یاد رکھو! وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ اُن عورتوں کے ساتھ دستور کے مطابق گزران کرو۔ اُن سے بہتر طریقہ پر میل جول رکھو۔ کسی قسم کی زیادتی نہ کرو۔ اُن کے حقوق اُن کو ادا کرو۔ اُن کی کسی بھی صورت میں حق تلفی نہیں ہونی چاہیئے۔

پسند اور ناپسند

فرمایا فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ اگر تم اُن عورتوں کو ناپسند کرتے ہو فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا پس ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا اور اللہ تعالیٰ اُس (ناپسندیدہ چیز) میں بہت سی بہتری رکھ دے۔ ظاہر ہے کہ انسان خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہے۔ اگر کسی عورت میں کوئی خامی ہے جس کی وجہ سے تم اُسے ناپسند کرتے ہو تو ہو سکتا ہے کہ اس میں بعض خوبیاں بھی ہوں۔ اگر عورت شکل وصورت کے لحاظ سے اچھی نہیں ہے تو ہو سکتا ہے اس کا اخلاق بہت اچھا ہو یا وہ ہنر مند اور سلیقہ شعار ہو۔ بعض اوقات عورتیں خود تو بظاہر کسی خوبی کی مالک نہیں ہوتیں مگر اُن سے پیدا ہونے والی اولاد اعلیٰ اقدار کی حامل ہوتی ہے جو مرد کے لیے بیش قیمت سرمایہ بن جاتی ہے۔ بعض عورتیں صابرہ وشاکرہ اور دین دار ہوتی ہیں اور بعض خوبصورت مگر جھگڑالو قسم کی ہوتی ہیں اس لیے فرمایا کہ عورتوں کے بارے میں کوئی فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کرو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرتے ہو مگر اللہ نے اُسی میں تمہارے لیے خیر کثیر کا پہلو رکھا ہو ایک شاعر نے خوب کہا ہے ؎

نِعَمُ الْإِلٰهِ عَلَى الْعِبَادِ كَثِيْرَةٌ ۔۔۔ وَأَجَلُّهُنَّ نَجَابَةُ الْأَوْلَادِ

اللہ تعالیٰ کی بیشمار نعمتیں اُس کے بندوں پر ہیں مگر اُس کے لیے سب سے اعلیٰ النعمت یہ ہے کہ اُسے اچھی اولاد میسر آجائے۔ بدشکل عورت سے خوبصورت اولاد کا پیدا ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ اَن پڑھ اور بے سلیقہ عورت سے سلیقہ شعار اور ہنر مند اولاد بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ بہر حال فرمایا کہ عورت میں اگر کوئی خامی ہے تو اس میں کوئی دوسری خوبی بھی موجود ہو گی۔ لہٰذا پسند اور ناپسند کا فیصلہ اُس کے تمام قبائح اور محاسن کو سامنے رکھ کر کرو۔

عورت کی تبدیلی

اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے حقوق کے متعلق یہ بھی فرمایا وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ اگر تم ایک عورت کی جگہ پہ دوسری عورت تبدیل کرنا چاہتے ہو۔ یعنی تمہارا پہلی بیوی کے ساتھ بطریق احسن نباہ نہیں ہو سکتا۔ اور تم اُسے طلاق دینا چاہتے ہو۔ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا اور تم اُسے ڈھیر مال بطور مہر یا عطیہ ادا کر چکے ہو۔ یعنی مہر کی رقم ہی بہت زیادہ تھی یا اس کے علاوہ کوئی عطیہ دے چکے ہو اور اس کے بعد علیحدگی کی صورت پیدا ہو گئی ہے تو فرمایا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا اس اداشدہ مال میں سے کچھ بھی واپس نہ لو خواہ وہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو قنطار بہت سے مال کو کہتے ہیں۔ اُس زمانہ میں دس ہزار درہم یا دینار کو ڈھیر مال تصور کیا جاتا تھا۔ قنطار کا لفظ سورۃ آل عمران میں بھی گزر چکا ہے انسان کی مرغوب چیزوں کی فہرست میں "الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ" کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی سونے چاندی پر مشتمل ڈھیروں مال انسان کی مرغوب و مقصود اشیاء میں سے ہے۔ تو یہاں بھی فرمایا کہ اگر تم اپنی عورتوں کو بہت زیادہ مال بھی دے چکے ہو تو بوقت طلاق اُن سے کوئی چیز واپس نہ لو۔ یہ اخلاقی لحاظ سے نہایت بُری بات ہے۔

طلاق کے مسائل سورۃ بقرہ میں بیان ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ

بعض مسائل سورۃ احزاب اور سورۃ طلاق میں بھی آئیں گے۔ حضور علیہ السلام نے طلاق[1] کو ابغض المباحاتِ الی اللہ فرمایا ہے یعنی جائز چیزوں میں اللہ کے ہاں سب سے ناپسندیدہ چیز ہے۔ لہٰذا اس سے حتی الامکان بچنا چاہیئے اور نباہ کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اور اگر ایسی کوئی صورت باقی نہ رہے تو پھر علیحدگی کی بھی اجازت ہے۔ ہندوازم اور عیسائیت میں ایسی کوئی گنجائش نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کے لیے یہ صورت بھی پیدا فرما دی۔ کہ ساری عمر گھٹن کی زندگی بسر کرنے کی بجائے میاں بیوی میں علیحدگی کی ضرورت ہو تو اس کے لیے طلاق کی گنجائش بھی ہے جس کے اپنے احکام اور شرائط ہیں جنہیں پورا کرنا ضروری ہے۔

الغرض! فرمایا کہ طلاق دینے کی صورت میں عورتوں کو ادا کردہ مال واپس مت لو۔ آگے تاکیداً فرمایا اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا کیا تم یہ مال اُن پہ بہتان لگا کر اور صریح گناہ کی شکل میں لینا چاہتے ہو۔ فرمایا محض حیلے بہانے سے اُن کو ادا کردہ مال واپس لینے کی اجازت نہیں ہے یہ سخت گناہ کی بات ہے۔ مال کی واپسی کی ایک ہی جائز صورت خلع ہے اگر میاں بیوی میں نباہ نہیں ہو سکتا اور خاوند طلاق بھی نہیں دینا چاہتا تو ایسی صورت میں عورت خلع کا مطالبہ کر سکتی ہے اور اس کے لیے وہ خاوند کے مطالبہ پر مہر یا دیگر مال واپس کر سکتی ہے جو دونوں کے درمیان طے پا جائے اس کے علاوہ عورت پر جھوٹا الزام لگا کر اُس سے مال کا مطالبہ کرنا بہت بری بات ہے اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

مہر اور خلوتِ صحیحہ

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مہر کی ادائیگی سے متعلق ایک ضروری قانون بتایا ہے۔ اور وہ یہ کہ زوجین کی خلوت صحیحہ کے بعد پورے کا پورا مہر ادا کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ فرمایا وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ اور تم اُسے کیسے واپس لے سکتے ہو وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ جب تم میں

---

[1] جامع صغیر ص ۱۴۳ ج ۲ و مستدرک ص ۱۹۶ ج ۲ (فیاض)

سے بعض بعض کے ساتھ مل چکے ہیں۔ یعنی میاں بیوی مباشرت کر چکے ہیں۔ وَاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا اور عورتیں تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔ مقصد یہ کہ جب ایجاب و قبول کے ذریعے تمہارا نکاح ہو چکا ہے، مہر مقرر ہوا ہے۔ تم نے ایک دوسرے سے فائدہ بھی اٹھا لیا ہے یعنی ہم بستری کر لی ہے تو اب مہر کو روکنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔ یہ تمہیں پورے کا پورا ادا کرنا ہوگا اب اگر تم بیوی کو طلاق دینا چاہو تو پورا مہر ادا کرو۔ کسی حیلے بہانے سے اسے مکمل طور پر روکنے یا اس میں کمی کرنے کی کوشش نہ کرو۔

اکثر آئمہ کرام فرماتے ہیں کہ مہر کی مکمل ادائیگی کے لیے میاں بیوی کے درمیان ہم بستری ضروری ہے۔ مگر امام ابوحنیفہ رح فرماتے ہیں۔ کہ ہم بستری ضروری نہیں۔ اگر زوجین کو خلوتِ صحیحہ حاصل ہو گئی ہے تو مہر کی ادائیگی لازم ہو جاتی ہے۔ اور خلوتِ صحیحہ سے مراد یہ ہے کہ میاں بیوی کسی ایسی جگہ اکٹھے ہو جائیں کہ ان کے درمیان کوئی چیز ہمبستری میں مانع نہ رہے، اگرچہ فی الحقیقت ہم بستری واقع نہ ہوئی ہو۔ میثاقِ غلیظ کے متعلق حضور علیہ السلام نے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا تھا وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوْجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللّٰهِ یعنی اللہ کے حکم اور قانون سے عورتیں تم پر حلال ہوئی ہیں۔ تمہارے ساتھ اُن کا عقد نکاح ہوا ہے لہٰذا تم عورتوں کے حقوق سے متعلق اللہ سے ڈرتے رہو اور اُن کے ساتھ زیادتی نہ کرو۔ اُن پر بہتان لگا کر اُن کی حق تلفی نہ کرو جب وہ تمہارے عقد میں آچکیں اور تم نے اُن سے پورا فائدہ اٹھا لیا تو اب اُن کے مہر اُن کو لوٹا دو۔ اس میں کسی قسم کی کمی نہ کرو کسی شاعر نے بھی اسے یوں بیان کیا ہے ؎

بتنا وما بيني وبينك ثالث
كزوج حمام او كغصنين هكذا

دہم آپس میں اکٹھے رہ چکے ہیں۔ جب کہ درمیان میں کوئی چیز باعث رکاوٹ نہ تھی۔ ہمارے درمیان ایسی محبت تھی جیسے کبوتر اور کبوتری کے درمیان ہوتی ہے) عرب شعراء کے نزدیک کبوتر کے جوڑے کی محبت ضرب المثل کے طور پر مشہور ہے جس کا ذکر ان کے اشعار میں اکثر ملتا ہے۔ متنبی نے اس محبت کو درخت کی دو ٹہنیوں سے بھی تشبیہ دی ہے جو آپس میں ملی ہوئی ہوتی ہیں وہ کہتا ہے ؎

یجد الحمام ولو کوجدی
شجی الاراك مع الحمام تنوح

(میرا غم اتنا بڑھا ہوا ہے کہ اگر کبوتر بھی میرے جتنا غم کرنے لگے جس درخت پر وہ بیٹھا ہے کبوتر کے ساتھ وہ درخت بھی رونے لگے) پھر کہتا ہے ؎

فمن بعد هذا الوصل والود کله
اکان جمیلا منك تجرُ هکذا

(اس محبت اور میل ملاقات کے بعد تمہارے لیے یہ کس طرح روا ہو گا کہ تم اس طریقے سے قطع تعلق کر لو جس میں ظلم اور زیادتی ہو اور دیا ہوا مال چھین لو) یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے یہی بات فرمائی ہے کہ کَیْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ تم اسے کیسے واپس لو گے جب کہ تم ایک دوسرے کے ساتھ خلوت صحیحہ میں مل چکے ہو۔ ایک دوسرے سے واقف ہو چکے ہو اور پختہ عہد یعنی ایجاب و قبول بھی ہو چکا ہے تم ایک دوسرے کے حقوق کو تسلیم کر چکے ہو، اب کسی قسم کی زیادتی نہیں ہونی چاہیئے۔

مقدار مہر

مہر کا مسئلہ اس سورۃ کی ابتداء میں بھی تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ اس آیت میں آمدہ لفظ قنطاراً سے مفسرین نے یہ بات اخذ کی ہے کہ عورت کے مہر کی زیادہ سے زیادہ مقدار پر کوئی پابندی نہیں۔ البتہ مہر

کی کم از کم مقدار میں ائمہ کرام کا اختلاف رہا ہے امام شافعیؒ لوہے کی ایک انگوٹھی یا مٹھی بھر کھجوروں کو بھی مہر تسلیم کرتے ہیں جب کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک دس درہم سے کم مہر نہیں ہوتا امام صاحب کا استدلال حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت علیؓ کی روایت سے ہے لَا مَھْرَ اَقَلَّ مِنْ عَشْرَۃِ دَرَاھِمَ دس درہم اڑھائی تولہ یا کچھ زیادہ چاندی کے برابر ہوتے ہیں اور موجودہ زمانے میں اتنی چاندی کی قیمت ڈیڑھ پونے دو سو روپے بنتی ہے۔ لہٰذا اس رقم سے کم مہر نہیں ہونا چاہیئے۔ لوگ پرانے اور سستے زمانے کی چاندی کے حساب سے ۳۲ روپے مہر مقرر کرتے ہیں جو درست نہیں۔ البتہ زیادہ سے زیادہ مہر کی کوئی حد مقرر نہیں ہزاروں اور لاکھوں روپے نقد یا جائداد کی صورت میں مہر مقرر ہو سکتا ہے۔ البتہ مہر میں مبالغہ کرنا ناپسندیدہ نہیں۔ یعنی بہت زیادہ مہر لکھ کر پھر ادا نہ کرنا۔ یہ درست نہیں۔ مہر ہمیشہ حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے۔ حضور علیہ السلام کی اکثر بنات اور ازواج کا مہر پانچ سو درہم سے زیادہ نہیں تھا۔ البتہ ام حبیبہؓ کا مہر چار ہزار درہم تھا جو نجاشی بادشاہ حبشہ نے ادا کیا تھا حضرت خدیجہؓ کا مہر بھی اسی مقدار کا تھا، باقی سب بیویوں اور بیٹیوں کے مہر ۵۰۰ درہم تھے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔ کہ لوگو! مہر میں مبالغہ نہ کیا کرو، اگر یہ پسندیدہ فعل ہوتا تو اللہ کا نبی ایسا کرتا مگر آپ نے نہیں کیا مہر جتنا کم رکھو گے ادائیگی میں اتنی ہی آسانی ہوگی۔ بہرحال اگر علیحدگی تک نوبت پہنچ جائے تو علیحدگی خوش اسلوبی سے انجام دو۔ دیا ہوا مال واپس نہ لو۔ اگلی آیات میں محرمات کا تذکرہ ہے۔ سوتیلی ماں کے علاوہ باقی محرمات کا بیان بھی آ رہا ہے۔

وَلَا تَنكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُم مِّنَ النِّسَآءِ إِلَّا مَا قَدْ
سَلَفَ ؕ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيلًا ع ﴿۲۲﴾ ۳ ع ۸ ۱۴
حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَأَخَوٰتُكُمْ
وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْأَخِ وَبَنٰتُ الْأُخْتِ

ترجمہ: اور نہ نکاح میں لاؤ اُن عورتوں کو جن کے ساتھ نکاح کیا ہے تمہارے باپوں نے مگر وہ بات جو پہلے ہو چکی۔ بیشک یہ بات بے حیائی اور غضب کی ہے۔ اور بُرا راستہ ہے ﴿۲۲﴾ حرام قرار دی گئی ہیں تم پر تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور بھائی کی بیٹیاں اور بہن کی بیٹیاں

ربطِ آیات

گذشتہ دروس میں عورتوں کے ساتھ اس ناانصافی کا تذکرہ ہو چکا ہے جو زمانۂ جاہلیت میں اُن سے روا رکھی جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس قبیح رسم ورواج کی اصلاح کا قانون بیان فرمایا، اور حکم دیا کہ عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ اور جبراً اُن کو وراثت کا حصہ نہ بنالو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ علیحدگی کی صورت میں عورتوں کے مقررہ مہر ہر حالت میں ادا کرو خواہ کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں اور حیلے بہانے سے انہیں واپس لینے کی کوشش مت کرو۔ اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے نکاح ہی کے متعلق بعض دیگر قباحات کا تذکرہ فرمایا ہے، جو نزولِ قرآن کے زمانہ میں عربوں میں اکثر پائی جاتی تھیں۔

محرماتِ نکاح

قبل از اسلام عرب معاشرے میں ایک بڑی خرابی یہ پائی جاتی تھی کہ جن عورتوں سے

نکاح حلال نہیں، وہ لوگ اکثر اُن سے نکاح کر لیتے تھے اور جو عورتیں اُن کے لیے حلال تھیں اُن میں سے بعض پر انہوں نے از خود پابندی لگا رکھی تھی۔ جیسے لے پالک بیٹے کی مطلقہ۔ مثال کے طور پر جب کوئی شخص فوت ہو جاتا تو اُس کا بڑا بیٹا دیگر مال وراثت کے ساتھ اپنی سوتیلی ماں پر بھی قابض ہو جاتا اور اس سے نکاح بھی کر لیتا۔ چنانچہ آج کے درس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اسی مسئلہ کو واضح کیا ہے۔ اور اس کے بعد دیگر محرمات نکاح کا ذکر ہے اور بالوضاحت فرما دیا ہے۔ کہ کسی مسلمان کے لیے کون کونسی عورتوں کے ساتھ نکاح جائز نہیں۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے تین قسم کے رشتوں کا ذکر کیا ہے جو مانع نکاح ہیں۔ ان میں سے پہلا رشتہ نسبی ہے۔ یعنی اُن رشتوں کا ذکر ہے جو کہ نسب کے لحاظ سے نکاح میں رکاوٹ ہیں دوسری قسم رضاعی رشتوں کی ہے جو ایک ماں کا دودھ پینے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور تیسری قسم کے مانع نکاح رشتے مصاہرت کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔

سوتیلی ماں

سب سے پہلے سوتیلی ماں کے ساتھ نکاح کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَنۡكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ اُن عورتوں کو نکاح میں مت لاؤ جن کے ساتھ تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں۔ ایسی عورتیں تمہارے لیے ہمیشہ کے لیے حرام ہو چکی ہیں۔ مفسرین کرام اور محدثین کرام فرماتے ہیں کہ اس آیت میں مطلقاً نکاح کا ذکر ہے جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ سوتیلی ماں کے حرام ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ باپ نے اُس عورت کے ساتھ نکاح کیا تھا۔ حرمت نکاح کے لیے باپ کی طرف سے مباشرت ضروری نہیں۔ جب کسی شخص کے باپ نے کسی عورت سے نکاح کر لیا۔ تو وہ عورت اُس شخص کے بیٹے کے لیے ابدی حرام ہو گئی۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب شامی میں یہ مسئلہ بالوضاحت موجود ہے۔ کہ یہ حرمت اصول اور فروع دونوں طرف

یکساں طور پہ نافذ ہے۔ یعنی جس عورت سے باپ نے نکاح کیا ہے وہ بیٹے کے لیے حرام ہے اور جس عورت سے بیٹے نے نکاح کیا ہے وہ باپ کے لیے قطعی حرام ہے۔ اور پھر مجامعت بھی ضروری نہیں۔ فقط نکاح ہی حرمت کے لیے کافی ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ کہ آیت کریمہ میں اٰبَاءُ کُمْ یعنی باپ کا ذکر ہے۔ مگر باپ سے مراد اوپر تک پوری نسل ہے۔ یعنی نہ صرف باپ کی منکوحہ حرام ہے بلکہ دادا اور پردادا کی منکوحہ بھی اگر ہو تو اس کے ساتھ بھی نکاح حرام ہے۔ اسی طرح نیچے کی طرف بیٹے کے حکم میں پوتا اور پڑپوتا بھی شامل ہیں۔ جو عورت بیٹے کے لیے حرام ہے وہ پوتے اور پڑپوتے کے لیے بھی ویسے ہی حرام ہے۔ یاد رہے کہ سوتیلی ماں حقیقی ماں کی ہی طرح محرم ہے۔ بیٹا اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ خلوت میں بیٹھ سکتا ہے، اُس کے ساتھ سفر کر سکتا ہے اور ماں کو اُس سے پردہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ وہ حقیقی ماں ہی کی قائم مقام ہوتی ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اپنے باپ کی منکوحہ کے ساتھ نکاح نہیں کر سکتے۔ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ البتہ جو کچھ پہلے ہو چکا وہ جہالت اور نادانی کی وجہ سے تھا، اب آئندہ کے لیے ایسی عورتیں تم پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرام ہو گئی ہیں۔

تین خرابیاں

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس فعل کی وہ تین خرابیاں بیان فرمائی ہیں جن کی وجہ سے یہ ابدی حرمت قائم کی گئی ہے۔ فرمایا اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً یعنی سوتیلی ماں کے ساتھ نکاح سخت بے حیائی کی بات ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی مشہور زمانہ کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں۔ کہ اگر انسان کی فطرت سلیم ہو تو نہ تو وہ اپنی بہن کی طرف رغبت کریگا اور نہ ماں کی طرف۔ فرماتے ہیں اس چیز کا شعور تو جانوروں

میں بھی پایا جاتا ہے چہ جائیکہ اشرف المخلوقات انسان اس امر سے لاپرواہ ہو جائے موجودہ زمانے میں یورپ کی بے حیائی اسی قبیل سے ہے۔ جرمنی والوں نے تو ایوانِ فطرت تک بنا رکھی ہیں۔ ان کلبوں میں ممبران صرف برہنہ شکل میں ہی شرکت کر سکتے ہیں۔ وہاں مرد و زن کی کوئی تخصیص نہیں سب برہنہ ہوتے ہیں۔ مگر جس شخص کی فطرت سلیم ہو گی وہ کبھی برہنگی کو پسند نہیں کریگا۔ قرآن پاک میں موجود ہے۔ کہ جب ایک لغزش کی وجہ سے حضرت آدم اور حوا کا لباس جنت میں اتر گیا تو وہ درخت کے پتے توڑ توڑ کر اپنے ستر کو ڈھانپنے لگے، کیونکہ برہنگی اُن کی فطرت سلیمہ کے خلاف تھی۔ البتہ جو لوگ انسلاخ میں آجائیں یعنی فطرت سے باہر نکل آئیں برائیاں کرتے کرتے ہو جائیں اُن کی الگ بات ہے۔ OUT OF NATURE وہ ہر قسم کی اخلاقی اور قانونی پابندیوں سے آزاد جو چاہیں کرتے پھریں۔ مگر فطرت سلیمہ کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی بہن، بیٹی یا ماں کے ساتھ بیحیائی کرنے پر تیار نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اس قبیح فعل کی دوسری برائی کے متعلق فرمایا وَمَقْتًا کہ بے حیائی کے علاوہ یہ فعل ذریعہ غضب بھی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی مول لینے کے مترادف ہے۔ شرائع الٰہیہ یعنی خدا تعالیٰ کی شریعت بھی اس کو برا کہتی ہے مقت کے لفظ سے یہ چیز واضح ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ انسانی عقل بھی اس کام کو تسلیم نہیں کرتی کہ کوئی شخص اپنے باپ کی منکوحہ کے ساتھ شادی کر لے۔ یہ فحش بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تیسری خرابی کے متعلق فرمایا وَسَاءَ سَبِيلًا یہ بہت برا راستہ ہے۔ انسانی سوسائٹی بھی اس کو اچھا نہیں سمجھتی۔ انسانوں کا عرف اور رواج بھی اس کے خلاف ہے گویا عقل، شریعت اور رواج ہر لحاظ سے یہ فعل ناقابل قبول ہے۔

نسبی محرمات

آگے اللہ تعالیٰ نے ان رشتوں کا ذکر کیا ہے جو نسبی طور پر کسی شخص کے لیے حرام ہیں۔ فرمایا حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ تم پر تمہاری

مائیں حرام کی گئی ہیں۔ ماں سگی ہو یا سوتیلی ہر حالت میں حرام ہے اور جو ماں کا حکم ہے وہی دادی اور پڑدادی کا حکم ہے۔ اس کے علاوہ نانی اور پڑنانی بھی اسی حکم میں آتی ہیں۔ لہٰذا ان سب کے ساتھ نکاح حرام ہے آگے فرمایا وَبَنٰتُکُمْ تم پر تمہاری بیٹیاں بھی حرام ہیں۔ بیٹی میں آگے پوتی، دوہتی وغیرہ سب آجاتی ہیں۔ پھر فرمایا وَاَخَوٰتُکُمْ تمہاری بہنیں تم پر حرام ہیں۔ بہن میں حقیقی، اخیافی (ماں کی طرف سے) اور علاتی (باپ کی طرف سے) تمام بہنیں شامل ہیں۔ ان میں سے کسی کے ساتھ عقد نکاح نہیں ہو سکتا پھر فرمایا وَعَمّٰتُکُمْ تمہاری پھوپھیاں یعنی باپ کی بہنیں بھی تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔ اس میں بھی وہی قانون ہے۔ باپ کی بہن حرام ہے خواہ وہ حقیقی بہن ہو۔ اخیافی یا علاتی ہو۔ آگے فرمایا وَخٰلٰتُکُمْ تمہاری خالائیں یعنی ماں کی بہنیں بھی تم پر حرام ہیں۔ ماں کے ساتھ ان کا تعلق حقیقی ہو یا صرف مادری یا صرف پدری، ہر حالت میں حرام ہیں وَبَنٰتُ الْاَخِ بھائی کی بیٹیاں بھی حرام ہیں۔ ان کے ساتھ بھی نکاح نہیں ہو سکتا۔ بھائی حقیقی ہو یا پدری یا مادری ہر حالت میں بھتیجیوں کے ساتھ نکاح حرام ہے۔ اسی طرح وَبَنٰتُ الْاُخْتِ بہن کی بیٹیوں یعنی بھانجیوں سے بھی نکاح نہیں ہو سکتا۔ یہاں بھی بہن سے مراد ہر سہ اقسام کی بہنیں ہیں یعنی خواہ وہ حقیقی ہو، صرف ماں کی طرف سے ہو یا صرف باپ کی طرف سے، اُن کی بیٹیوں کے ساتھ نکاح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرام ہے

اس کے بعد رضاعت اور مصاہرت کی بنا پر حرام ہونے والے رشتوں کا تذکرہ اگلے درس میں آئے گا انشاء اللہ۔

وَأُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیٓ أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوٰتُكُم مِّنَ الرَّضٰعَةِ
وَأُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبٰٓئِبُكُمُ الّٰتِی فِی حُجُورِكُم
مِّن نِّسَآئِكُمُ الّٰتِی دَخَلْتُم بِهِنَّ فَإِن لَّمْ تَكُونُوا
دَخَلْتُم بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلٰٓئِلُ أَبْنَآئِكُمُ
الَّذِينَ مِنْ أَصْلٰبِكُمْ وَأَن تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ
إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿۲۳﴾

ترجمہ: اور حرام قرار دی گئی ہیں تم پر تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہے اور تمہاری دودھ کی بہنیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری وہ پروردہ بچیاں جو تمہاری پرورش میں ہیں تمہاری عورتوں میں سے جن کے ساتھ تم نے صحبت کی ہے اگر تم نے اُن سے صحبت نہیں کی تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے (کہ تم اُن کی لڑکیوں سے نکاح کرو) اور (تم پر حرام قرار دی گئی ہیں) تمہارے ان بیٹوں کی عورتیں جو تمہاری پشت سے ہیں۔ اور (تم پر حرام قرار دی گئی ہے یہ بات) کہ تم اکٹھا کرو دو بہنوں کو (بیک وقت) مگر وہ جو پہلے بات ہو چکی ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشش کرنیوالا اور مہربان ہے ﴿۲۳﴾

حرمت بوجہ رضاعت

نسب کے لحاظ سے حرام عورتوں کا ذکر گذشتہ درس میں ہو چکا ہے۔ اب آج کے درس میں رضاعت اور مصاہرت کی بناء پر حرام ہونے والی عورتوں کا تذکرہ آئیگا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَأُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیٓ أَرْضَعْنَكُمْ اور تمہاری

وہ مائیں تم پر حرام قرار دی گئی ہیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے وَاَخَوٰتُکُمْ مِّنَ الرَّضَاعَۃِ اور تمہاری دودھ شریک بہنیں بھی تم پر حرام ہیں۔ آیت کریمہ میں رضاعت کے اعتبار سے صرف دو رشتوں یعنی ماں اور بہن کا ذکر کیا گیا ہے۔ تاہم حضور نبی کریم علیہ السلام نے اس کی وضاحت میں فرمایا یحرم من الرضاعۃ ما یحرم من النسب یعنی جو رشتے نسب کی وجہ سے حرام ہیں وہ رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہیں بخاری شریف کی روایت میں ہے۔ کہ جس بچے نے جس عورت کا دودھ پیا وہ عورت بچے کی رضاعی ماں بن گئی۔ اس عورت کی بیٹیاں اس کی بہنیں ہوگئیں اور عورت کے بیٹے اس بچے کے رضاعی بھائی بن گئے۔ اسی طرح عورت کا خاوند دودھ پینے والے بچے کا رضاعی باپ ٹھہرا۔ اور اس رضاعی باپ کا بھائی بچے کا رضاعی چچا ہوا۔ لہٰذا جس طرح رضاعی ماں اور رضاعی بہن کے ساتھ نکاح حرام ہے اسی طرح رضاعی بھتیجی، رضاعی بھانجی، رضاعی پھوپھی اور رضاعی خالہ کے ساتھ بھی نکاح حرام ہوگیا۔ غرضیکہ جو رشتے نسب کے اعتبار سے حرام ہیں، وہ رضاعت کے اعتبار سے بھی حرام ہیں۔ اور جب ماں حرام ہوگئی تو نانی، پڑنانی وغیرہ بھی حرام ٹھہریں۔

مدت رضاعت

رضاعت کی مدت کے تعیین کے سلسلے میں فقہائے کرام کے دو گروہ ہیں۔ امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ، امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں۔ کہ رضاعت کی مدت زیادہ سے زیادہ دو سال ہے۔ اگر کسی بچے نے دو سال کے دوران کسی عورت کا دودھ پیا ہے تو وہ عورت اس کی رضاعی ماں بن گئی اور اس لحاظ سے باقی تمام رضاعی رشتے بھی وجود میں آئے۔ اور ان رشتوں پر وہ تمام احکام نافذ ہوں گے جو حقیقی ماں کے رشتہ داروں پر عائد ہوتے ہیں۔ البتہ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں۔ کہ رضاعت کی مدت اڑھائی سال ہے۔ اڑھائی سال کے اندر اندر دودھ پینے سے

رضاعت کے تمام احکام نافذ العمل ہوں گے۔ مدت رضاعت کے بعد اگر کسی بچے یا بڑے نے کسی عورت کا دودھ پیا تو اس کی رضاعت ثابت نہیں ہوگی، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے انما الرضاعۃ من المجاعۃ یعنی رضاعت کا اعتبار اس مدت تک کے لیے ہے جب تک بچے کو بھوک لگتی ہے مگر وہ کھانا نہیں کھا سکتا اور صرف دودھ ہی اس کی خوراک ہوتا ہے

رضاعت کے دیگر مسائل

رضاعی ماں حقیقی ماں کی مانند ہی ہوتی ہے۔ اس سے پردہ نہیں ہوتا انسان اس کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ سکتا ہے۔ البتہ بعض احکام حقیقی ماں سے مختلف بھی ہوتے ہیں مثلاً حقیقی ماں اگر محتاج ہے تو اس کا خرچہ بیٹے کے ذمہ ہے مگر رضاعی ماں کے لیے یہ ضروری نہیں ہے۔ حقیقی ماں کی وراثت بیٹے کو اور بیٹے کی ماں کو پہنچتی ہے مگر رضاعی ماں بیٹے کے درمیان وراثت نہیں چلتی۔

رضاعت ثابت ہونے کے لیے دودھ کی مقدار کے سلسلہ میں فقہائے کرام کے درمیان اختلاف ہے۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ بچہ کم از کم تین گھونٹ دودھ پیئے تو رضاعت ثابت ہوتی ہے۔ امام شافعیؒ پانچ گھونٹ کے قائل ہیں۔ البتہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر بچہ اتنی مقدار میں دودھ پی لے جس سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے تو رضاعت ثابت ہو جاتی ہے۔ اور روزہ ٹوٹنے کے لیے ایک قطرہ کی مقدار بھی کافی ہے اگر حلق سے نیچے اتر گیا تو روزہ فاسد ہو گیا۔ اس لحاظ سے رضاعت ثابت ہونے کے لیے ایک قطرہ دودھ پی لینا بھی کافی ہے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ رضاعت کے ثبوت کے لیے ضروری ہے کہ دودھ حلق یا ناک کے ذریعے سے جسم میں داخل ہوا ہو۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی دیگر ذرائع مثلاً انجکشن وغیرہ کے ذریعہ دودھ داخل

ہوا تو رضاعت ثابت نہیں ہو گی۔

یہ مسئلہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ رضاعت صرف عورت کا دودھ پینے سے بنتی ہے۔ اگر دو بچے کسی ایک بکری یا گائے یا بھینس کا دودھ پی لیں تو وہ رضاعی بہن بھائی نہیں بنتے۔ البتہ اگر جانور کا دودھ ملا کر پیا جائے تو مرکب میں جس دودھ کا غلبہ ہوگا اس کے مطابق حکم نافذ ہوگا۔ اگر عورت کا دودھ دو چھٹانک ہے اور بکری وغیرہ کا ایک چھٹانک تو رضاعت ثابت ہو جائے گی کیونکہ غلبہ عورت کے دودھ کو حاصل ہے اس کے برخلاف اگر گائے کا دودھ دو چھٹانک اور عورت کا ایک چھٹانک تو رضاعت قائم نہیں ہو گی۔ فقہائے کرام نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کسی بیماری وغیرہ کی وجہ سے مرد کو دودھ اُترتا اور کوئی بچہ وہ دودھ پی لے تو اس سے بھی رضاعت ثابت نہیں ہو گی، کیونکہ رضاعت صرف عورت کا دودھ پینے سے بنتی ہے۔

رضاعت کے متعلق گواہی کا ایک قانونی مسئلہ بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر دو مرد اس بات کی گواہی دیں کہ فلاں فلاں نے فلاں عورت کا دودھ پیا تو رضاعت ثابت ہو گی۔ بعض اوقات نکاح ہو جاتا ہے مگر بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ میاں بیوی دودھ شریک ہیں تو ایسی صورت میں کم از کم دو مردوں کی گواہی ہونی چاہیئے۔ البتہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اگر ایک مرد اور ایک عورت بھی گواہی دے دیں تو مرد کو چاہیئے کہ بیوی کو علیحدہ کر دے۔ بہر حال قانونی لحاظ سے شہادت کی تکمیل لازم ہے بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ ایک جوڑے کا نکاح ہو گیا۔ بعد میں ایک عورت نے انکشاف کیا کہ اُس نے اُن دونوں میاں بیوی کو دودھ پلایا تھا جب حضور علیہ السلام کے سامنے مسئلہ پیش ہوا تو آپ نے فرمایا کہ جب یہ بات کہہ دی گئی ہے۔ تو بہتر ہے کہ ان میں تفریق کر دو۔

فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ رضائی بھائی یا رضاعی بہن کی نسبی ماں سے نکاح جائز ہے۔ اسی طرح حقیقی بہن کی رضائی ماں سے بھی نکاح ہو سکتا ہے۔ رضاعی بہن کی نسبی بہن کے ساتھ بھی نکاح درست ہے۔ یہ بعض استثناء ہیں اس کے علاوہ رضائی بھتیجی یا بھانجی یا خالہ یا پھوپھی وغیرہ سے نکاح نہیں ہو سکتا۔ وہ حقیقی رشتوں کی طرح ہی حرام ہیں۔ اسی طرح رضاعی چچا حقیقی چچا کی طرح ہی ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی نکاح نہیں ہو سکتا۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ ______________ اور حضرت حفصہ رضؓ کی روایت میں موجود ہے۔ کہ ان کے رضاعی چچا ملنے کے لیے آئے تو ام المؤمنین نے اندر آنے کی اجازت نہ دی۔ جب حضور علیہ السلام سے مسئلہ دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا وہ تمہارے حقیقی چچا کی طرح ہے اس سے کوئی پردہ نہیں۔

رضاعت کی حکمت

رضاعت کی بنا پر حرمت پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی مصلحت رکھی ہے۔ اور اس میں شریعت کی بہت بڑی حکمت ہے۔ یورپ اور دہریہ ممالک میں نامعلوم عورتیں نوزائیدہ بچوں کو دودھ پلا دیتی ہیں مگر بعد میں ان کی کوئی شناخت نہیں رہتی۔ بعض اوقات ہسپتالوں میں پیدا ہونے والے بچوں کو نرسیں دودھ پلا دیتی ہیں مگر کون جانتا ہے کہ اسے کس نے دودھ پلایا تھا اور کون کون اس کا رضاعی بھائی یا رضاعی بہن ہے۔ خود دودھ پلانے والی عورت نہ ماں بنتی ہے اور نہ دودھ پینے والا اس کا بیٹا بنتا ہے۔ یہ نہایت ہی قبیح چیز ہے۔ دودھ میں شرکت کی وجہ سے رضاعی بہن بھائیوں کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے اور پینے اور پلانے والی کی حیثیت بیٹے اور ماں کی ہوتی ہے اور یہ ان کے درمیان نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلام نے رضاعت کا ایسا اصول قائم کر دیا ہے جس سے انسانی

سوسائٹی میں اتفاق و اتحاد کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ ایک امیر کبیر آدمی حتیٰ کہ بادشاہ کا بیٹا بھی اگر کسی غریب عورت کا دودھ پیتا ہے۔ تو اس عورت کے بچے بڑے آدمی کے بیٹے کے بھائی بہن بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ قانون نافذ کر کے کتنی بڑی مہربانی فرمائی ہے۔ اس طرح سوسائٹی میں محبت اور احترام پیدا ہوگا، اور بہت حد تک مساوات قائم ہوگی۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جس عورت کا دودھ پیا تھا وہ عورت خود یا اسکی بیٹی غزوہ حنین کے موقع پر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہے۔ تو حضور علیہ السلام نے اس کے لیے اپنی چادر مبارک اتار کر بچھا دی۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ کون عورت ہے جس کو اتنا بڑا اعزاز حاصل ہوا ہے تو تبلایا کہ یہ حضور کی رضاعی والدہ یا رضاعی بہن ہے۔

دودھ پلانے والی ماں کے ساتھ حسن سلوک کا بھی حکم ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام سے دریافت کیا گیا۔ کہ جس عورت کا دودھ پیا ہے اس کے ساتھ کیا احسان کیا جائے۔ فرمایا اس کے ساتھ کافی احسان کیا جائے کہ یہ دودھ پینے والے کی ذمہ داری ہے۔ اپنی رضاعی ماں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ حسن سلوک کر کے ہی بیٹا اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکتا ہے۔ بہرحال رضاعت میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکمت رکھی ہے کہ اس کی وجہ سے جذبہ احسان و مروت پیدا ہوتا ہے اور آپس میں اخوت کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔

حرمت بوجہ مصاہرت

نسب کی بنا پر حرام ہونے والی عورتوں کے تذکرے کے بعد اللہ تعالیٰ نے مصاہرت کی وجہ سے حرام ہونے والی عورتوں کے متعلق فرمایا وَأُمَّهَٰتُ نِسَآئِكُمْ اور تمہاری عورتوں کی مائیں بھی تم پر حرام قرار دی گئی ہیں۔ گویا ساس کے ساتھ نکاح بھی ہمیشہ کے لیے حرام ہو گیا۔ اس کے علاوہ فرمایا وَرَبَٰٓئِبُكُمُ ٱلَّٰتِى فِى

حُجُوْرِکُمْ مِّنْ نِّسَآئِکُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِھِنَّ اور تمہاری وہ پرورده بچیاں جو تمہاری پرورش میں ہیں اور تمہاری اُن عورتوں سے ہیں جن سے تم صحبت کر چکے ہو، وہ بھی تمہارے لیے حرام قرار دی گئی ہیں۔ فَاِنْ لَّمْ تَکُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِھِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ البتہ اگر تم نے اپنی منکوحہ عورتوں سے صحبت نہیں کی تو ایسی صورت میں اسکی بیٹی کے ساتھ نکاح ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں مثلاً کسی شخص کی بیوی فوت ہو گئی یا اُس کو طلاق دے دی گئی تو اب اگر اس عورت سے ہم بستری نہیں ہوئی تو اُس کی لڑکی سے نکاح درست ہے۔ اور اگر اُس سے صحبت ہو چکی ہے۔ تو پھر اس کی لڑکی ہمیشہ کے لیے حرام ہو گئی۔ یاد رہے کہ صحبت کی شرط کسی عورت کی بیٹی کے ساتھ نکاح کے لیے ہے، البتہ اُس عورت کی ماں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہے خواہ اُس عورت کے ساتھ صحبت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔

آگے فرمایا وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِکُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِکُمْ اور تمہارے صلبی بیٹوں کی بیویاں بھی تمہارے لیے حرام ہیں۔ یعنی حقیقی بیٹے کی بیوی اپنے سسر کے نکاح میں نہیں آسکتی یہ نکاح بھی ہمیشہ کے لیے حرام قرار دیا گیا ہے۔ البتہ لے پالک یا منہ بولا بیٹا اس قانون کی زد میں نہیں آتا۔ اس سلسلہ میں حضور علیہ السلام کا اپنا عمل موجود ہے۔ آپ کے منہ بولے بیٹے زیدؓ نے جب اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو خود حضور علیہ السلام نے اُس سے نکاح کر لیا منافقوں نے اس سلسلے میں بڑا شور وغل کیا اور معاملے کو اچھالنے کی کوشش کی مگر اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے ذریعے معاملے کی وضاحت فرما دی۔ "فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْھَا وَطَرًا زَوَّجْنٰکَھَا

لِكَيْلَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ یعنی جب زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے اُسے آپ کے نکاح میں دے دیا تاکہ مومنوں پر اُن کے لے پالک بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی تنگی نہ رہے۔

دو بہنوں کا اجتماع

اس کے بعد فرمایا وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ اور اور تم پر یہ چیز بھی حرام قرار دی گئی ہے۔ کہ دو بہنوں کو بیک وقت اکٹھا کرو یعنی ان سے نکاح کرو۔ ایک وقت میں ایک ہی بہن سے نکاح ہو سکتا ہے۔ البتہ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ جو اس سے پہلے ہو چکا وہ جہالت اور نادانی کی وجہ سے تھا۔ اُس پر کچھ مؤاخذہ نہیں۔ اور اگر اس حکم کے نزول کے وقت کسی کے نکاح میں دو سگی بہنیں موجود تھیں تو اُن میں سے ایک کو الگ کر دیا گیا۔ جیسا کہ حضرت ضحاکؓ ابن فیروز صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ ہے۔ آپ دیلم کے رہنے والے تھے اس لیے فیروز دیلمیؓ کہلاتے تھے۔ جب وہ مسلمان ہوئے تو اُن کے نکاح میں دو سگی بہنیں تھیں آپ نے فرمایا کہ ایک کو طلاق دے دو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اسی طرح غیلانؓ بن سلمہ ثقفی کے نکاح میں دس عورتیں تھیں۔ حضور علیہ السلام نے حکم دیا کہ اُن میں سے چار کو رکھ لو باقیوں کو الگ کر دو۔

اس مقام پر یہ مسئلہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے۔ کہ جس طرح دو بہنوں کے ساتھ بیک وقت نکاح نہیں ہو سکتا، اسی طرح ایک عورت اور اُسکی پھوپھی یا اُس کی خالہ یا اُسکی بھتیجی یا اُس کی بھانجی بھی ایک وقت میں نہیں رکھی جا سکتیں۔ ہاں اِن میں سے کوئی ایک فوت ہو جائے یا طلاق واقع ہو جائے تو دوسری کے ساتھ نکاح ہو سکتا ہے۔ اسی لیے یہ حرمت ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ ایک کے بعد دوسری کے ساتھ نکاح درست ہے فرمایا پیچھے جو کچھ ہو چکا، سو ہو چکا، اُس کی باز پرس نہیں، کیونکہ

متعلق فرمایا وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ اور تمہاری عورتوں کی مائیں بھی تم پر حرام قرار دی گئی ہیں۔ گویا ساس کے ساتھ نکاح بھی ہمیشہ کے لیے حرام ہو گیا۔ اس کے علاوہ فرمایا وَرَبَائِبُكُمُ اللَّاتِي فِي

إِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا خدا تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے اُس نے نادانی کی بنا پر ہونے والی خطا کو معاف فرما دیا ہے۔ اب آئندہ اُسکی اجازت نہیں۔ کل کے درس میں مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ آیا تھا۔ یعنی تم پر تمہاری سوتیلی مائیں حرام ہیں وہاں پر بھی اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ کے الفاظ آئے کہ جو کچھ پہلے ہو چکا، اُس سے درگزر کیا گیا ہے، اب آئندہ اس فعل کا اعادہ نہیں ہونا چاہیئے۔ مسند احمد کی روایت میں آتا ہے۔ کہ ایک شخص نے اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کر لیا تھا۔ اس کو سمجھایا گیا مگر وہ باز نہ آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو جھنڈا باندھ کر دیا اور فرمایا کہ فلاں شخص کا سر قلم کر دو یعنی اس کو تعزیراً قتل کر دو کہ اس نے اپنی ماں کے ساتھ نکاح کر رکھا ہے اور کہنے سے بھی باز نہیں آتا۔ یہ شخص انسانیت کا دشمن ہے۔ اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔

محرمات کا تذکرہ ہو چکا۔ اب اگلی آیت میں کسی دوسرے شخص کی منکوحہ عورت سے نکاح کی حرمت کا بیان آئے گا۔

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةًؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾

ترجمہ :- اور (حرام قرار دی گئی ہیں تم پر) خاوند والی عورتیں عورتوں میں سے مگر وہ کہ جن کے مالک ہوں تمہارے داہنے ہاتھ ۔ یہ تم پر اللہ کی طرف سے حکم ہے اور حلال قرار دی گئی ہیں تمہارے لیے اِن سب عورتوں کے علاوہ یہ کہ تلاش کرو تم اپنے مالوں کے ساتھ ، قید میں لانے والے ہو ، نہ شہوت رانی کرنے والے پس تم نے اُن میں سے جس سے فائدہ اٹھایا تو دے دو اُن کو اُن کے مہر جو مقرر ہیں اور تم پر اس چیز میں کوئی گناہ نہیں کہ تم آپس میں راضی ہو جاؤ مقررہ مہر کے بعد بیشک اللہ تعالیٰ علم والا اور حکمت والا ہے ﴿۲۴﴾

منکوحہ عورتیں

گذشتہ دروس میں تین قسم کے محرماتِ نکاح کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ محرمات کی پہلی قسم نسبی اعتبار سے ہے جیسے ماں ، بیٹی ، بہن وغیرہ دوسری قسم رضاعی ہے اور اس میں وہ رشتے آتے ہیں جو دودھ میں شرکت کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں۔ تیسری

قسم مصاہرت کی ہے یعنی وہ رشتے جو دامادی اور سسرالی کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں آج کے درس میں محرمات کی چوتھی اور آخری قسم کا بیان ہے اور اس میں منکوحہ عورتیں آتی ہیں۔ ارشاد ہے وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اور خاوند والی یعنی منکوحہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جو عورت کسی شخص کے نکاح میں ہے اُس کے ساتھ کوئی دوسرا شخص نکاح نہیں کر سکتا۔ نکاح ثانی کے لیے پہلے نکاح کا فسخ ہونا ضروری ہے اور اس کی دو صورتیں ہیں۔ یا اُس منکوحہ عورت کا خاوند خود طلاق دے دے یا وہ فوت ہو جائے تو عدت گزارنے کے بعد وہ عورت کسی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح کر سکتی ہے۔ ان دو صورتوں کے علاوہ تیسری کوئی صورت نہیں جس کی رُو سے کسی ایسی عورت سے نکاح کیا جا سکے جس کا نکاح پہلے کسی کے ساتھ ہو چکا ہے۔

محصنہ کا ایک معنیٰ تو خاوند والی عورت ہے۔ اور اس کا دوسرا معنیٰ پاکدامنہ بھی ہوتا ہے۔ گویا محصنہ عفت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ نور میں موجود ہے "وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ" جو پاکدامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں۔ اور پھر اُس پر چار گواہ پیش نہیں کر سکتے انہیں اسی کوڑے لگانے کا حکم ہے حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں۔ وہ اکبر الکبائر یعنی سات بڑے گناہوں میں سے ایک میں شامل ہوتے ہیں۔

بہر حال یہاں پر محصنہ کا معنیٰ منکوحہ یعنی خاوند والی عورت ہے اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ یہ عورت بھی اپنے خاوند کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے حرام ہے۔ تاہم یہ قسم وقتی محرمات میں سے ہے، ابدی نہیں۔ کوئی منکوحہ عورت طلاق یا بیوگی کے بعد دوسرے شخص کے نکاح میں جا سکتی ہے، اب تک جتنی عورتوں کا ذکر آیا ہے۔ یہ "حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ"

ملک یمین
یعنی لونڈی

پر عطف آرہا ہے یعنی فلاں عورت تم پر حرام ہے۔ اب آگے استثناء کے طور پر فرمایا اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ سوائے اُن عورتوں کے کہ جن کے مالک ہوجائیں تمہارے ہاتھ۔ یعنی جو عورتیں لونڈی بن کر تمہاری ملکیت میں آجائیں وہ تمہارے لیے حلال ہیں اگرچہ وہ پہلے سے منکوحہ ہوں۔ جب کوئی عورت جنگی قیدی بن کر لونڈی میں تبدیل ہوجائے تو اُس کا پہلا نکاح ختم ہوجاتا ہے۔ اور وہ مسلمان مرد کے لیے حلال ہوجاتی ہے۔

جنگی قیدیوں کی مختلف صورتیں قرآن پاک میں بیان کی گئی ہیں۔ فریقین جنگ کی رضامندی سے یا تو قیدیوں کا آپس میں تبادلہ کرلیا جاتا ہے۔ یا کسی مصلحت کے تحت ویسے ہی انہیں چھوڑ دیا جاتا ہے یا فدیہ وصول کر کے آزاد کر دیا جاتا ہے یا قیدیوں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی صورت بھی مناسب نہ سمجھی جاتی تو پھر انہیں گذشتہ زمانے میں غلام اور لونڈی بنالیا جاتا۔ اس آخری صورت پر بھی عمل درآمد حکومت ہی کی ذمہ داری ہے کہ وہ قیدیوں کو غلام اور لونڈی میں تبدیل کرے اور پھر انہیں مسلمانوں میں تقسیم بھی کرے۔ یہ کسی فردِ واحد کے اختیار میں نہیں ہے کہ از خود کسی کو لونڈی یا غلام بنالے بلکہ جس عورت کو حاکم وقت لونڈی بنائے گا وہی لونڈی سمجھی جائیگی اور جس آدمی کے سپرد کریگا وہی اس سے فائدہ اٹھانے کا مجاز ہوگا۔

غلام اور لونڈی بنانے کا ذکر بیشک قرآن پاک میں موجود ہے مگر اس کی حیثیت محض اباحت کی ہے، یہ نہ فرض ہے، نہ واجب اور نہ سنت بلکہ جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک کا ایک ذریعہ ہے جس پر پرانے زمانہ میں ساری دُنیا میں عمل ہوتا رہا ہے۔ اسلام نے بھی اسے کسی حد تک قبول کیا، مگر اس نظام کی بُرائی قرآن میں جگہ جگہ مذکور ہے، اسی لیے قرآن پاک نے غلاموں کی آزادی کی بار بار ترغیب دی ہے۔ اور بعض جنایات میں غلام کی آزادی

بطورِ تعزیر نافذ کی ہے۔

لونڈی سے فائدہ اٹھانے سے پہلے عدت گزارنا بھی ضروری ہے۔ اسے عدت استبراء کہتے ہیں اور یہ ایک حیض پر مشتمل ہے۔ اگر کوئی منکوحہ عورت قیدی ہو کر لونڈی بن جائے تو لازم ہے کہ وہ اپنے مالک کے ساتھ مباشرت سے پہلے کم از کم ایک حیض کا توقف کرے۔ اس کے بعد اس کا مالک اس سے فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ البتہ اس میں نکاح کی ضرورت نہیں ہوتی۔ عورت کا ملکیت میں آجانا ہی نکاح کا قائم مقام ہوتا ہے اگر ملکیت میں آنے کے وقت لونڈی حاملہ ہو تو پھر اُسے وضع حمل تک عدت پوری کرنا ہوگی، اُس کے بعد وہ صنفی تعلقات قائم کر سکتی ہے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں نے حرج محسوس کیا کہ جن عورتوں کے پہلے خاوند موجود ہیں وہ کیسے مباح ہو سکتی ہیں تو اللہ نے فرمایا اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ تمہاری ملکیت میں آنے کے بعد ان کے سابقہ نکاح ختم ہو چکے ہیں۔ اَب اللہ نے انہیں تمہارے لیے مباح کر دیا ہے۔ البتہ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ مشرک لونڈی کے ساتھ صنفی تعلقات قائم نہیں کرنے چاہیئں۔ یا تو وہ مسلمان ہو جائیں یا پھر کتابی ہوں تو اُن کے ساتھ یہ تعلق قائم کیا جائے۔

غلامی کا بین الاقوامی رواج

زمانہ قدیم میں غلامی کا رواج پوری دنیا میں موجود تھا جو اب ختم ہو چکا ہے۔ ایک زمانے سے مسلمانوں میں بھی انحطاط پیدا ہو گیا ہے۔ دوسری اقوامِ عالم نے بھی غلامی کی لعنت کو ترک کر دیا ہے۔ اَب اسلام میں بھی اس کا کوئی نشان باقی نہیں۔ نزول قرآن کے زمانے میں غلاموں اور لونڈیوں کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا جاتا تھا۔ حضور علیہ السلام نے اُن کے حقوق بیان فرما کر اُن کو رعائتیں دیں۔ البتہ اس رواج کو یکدم ختم نہ کیا کیونکہ یہ ساری دنیا میں پھیلا ہُوا تھا۔ اب بھی اصول یہی ہے کہ اگر ساری دنیا اس رواج کو برداشت کرتی ہے تو اسلام بھی کریگا اور اگر دنیا اس کو ترک کر دے تو اسلام پر کوئی حرف نہیں آتا۔ خود قرآن پاک اشارتاً بتاتا ہے۔ کہ غلامی ایک غیر فطری چیز ہے جو انسانوں پر سزا کے طور پر مسلط ہوتی ہے۔ یہ اچھی چیز نہیں ہے تو بہر حال

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ عورتیں تم پر حلال ہیں کِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ یہ اللہ کا نوشتہ اور قانون ہے جو اُس نے تم پر مقرر کیا ہے لہٰذا اس کے مطابق عمل کرو۔

شرائط حلّت

حرمت نکاح کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد فرمایا وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اِن کے علاوہ باقی تمام عورتیں تم پر حلال ہیں یعنی چار قسم کی محرمات کو چھوڑ کر تم باقی عورتوں سے نکاح کر سکتے ہو، تاہم اس کے لیے کچھ شرائط بھی ہیں۔ اُن میں سے پہلی شرط یہ ہے اَنْ تَبْتَغُوْا کہ تم تلاش کرو۔ یہ مرد کا فرض ہے کہ وہ اپنے لیے عورت تلاش کرے، طلب یا PROPOSE کرے۔ اور دوسری شرط یہ ہے بِاَمْوَالِكُمْ اپنے مالوں کے ساتھ طلب کرو یعنی اس کے لیے مال بھی خرچ کرنا پڑے گا، عورت کو مہر بھی ادا کرنا ہو گا۔

امام ابو حنیفہؒ اسی لفظ مال سے استدلال کرتے ہیں۔ کہ مہر میں مال کا ہونا لازم ہے یا مہر میں ایسی چیز مقرر کی جائے جو مال کا معاوضہ بن سکتی ہے حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ سے منقول روایت مسلک حنفی کی دلیل ہے، کہ لا مهرا قل من عشر دراهم دس درہم سے کم مہر نہیں ہوتا۔ مال کی کم از کم مقدار دس درہم ہو تو وہ مال کی تعریف میں آتا ہے اسی لیے ہاتھ کاٹنے کی سزا کے لیے کم از کم دس درہم چوری ضروری ہے ورنہ قطع ید نہیں ہو گا۔ حدیث میں تین درہم اور پانچ درہم کا جو ذکر آتا ہے وہ تعزیری ہے مگر قطع ید کی حد جاری کرنے کے لیے دس درہم کے برابر ہونا چاہیئے۔

یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیئے کہ چونکہ نکاح کے لیے مہر ضروری ہے اس لیے اگر کوئی شخص مہر کی ادائیگی سے انکار کرے تو امام مالکؒ کے نزدیک ایسا نکاح ہی نہیں ہوتا۔ البتہ امام اعظمؒ کے نزدیک نکاح تو ہو جائیگا البتہ مہر کی عدم ادائیگی کی شرط باطل سمجھی جائیگی اور مہر مثلی دینا پڑے گا۔ مہر مثلی

کی مقدار وہ تصور ہوتی ہے جو اس کے خاندان کی اکثر عورتوں مثلاً پھوپھیوں یا بہنوں وغیرہ کا مہر مقرر ہوتا ہے۔ اسی طرح وٹے سٹے کے نکاح کے متعلق بھی امام صاحب فرماتے ہیں۔ کہ نکاح تو ہو جائیگا مگر وٹے سٹے کی شرط باطل ہو گی۔ بہرحال نکاح کے لیے مال خرچ کرنا نکاح کی دوسری شرط ہے۔

نکاح کی تیسری شرط کے متعلق فرمایا مُحۡصِنِيۡنَ غَيۡرَ مُسٰفِحِيۡنَ عورتوں کو عقد نکاح میں لانا مقصود ہو، محض شہوت رانی پیش نظر نہ ہو۔ احصان کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو قید نکاح میں لاکر بیحیائی سے بچایا جائے تاکہ صنفی تقاضے صحیح طور پہ پورے ہو سکیں۔ نکاح کی چوتھی شرط آگے آرہی ہے "وَلَا مُتَّخِذِیۡۤ اَخۡدَانٍ" یہ الفاظ سورۃ مائدہ میں بھی آئیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ مرد وزن کا ایجاب وقبول کھلے علی الاعلان ہو، نہ کہ چوری چھپے، اسی لیے فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ بغیر گواہوں کے نکاح درست نہیں۔ نکاح عورت اور مرد کے درمیان ایک نہایت اہم نوعیت کا معاہدہ (AGREEMENT) ہوتا ہے، جسے عام مجلس میں گواہوں کے روبرو طے پانا چاہیئے۔ گویا عورت کے حلال ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ چار شرائط مقرر فرمائی ہیں۔

ادائیگی مہر

مہر کی اہمیت اور اس کی ادائیگی کے متعلق پہلے بھی بیان ہو چکا ہے۔ اس مقام پر بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عقد نکاح کے بعد فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهٖ مِنۡهُنَّ پس جو تم نے اُن عورتوں سے فائدہ اٹھالیا فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ فَرِيۡضَةً پس اُن کا مقرر کیا ہوا مہر اُن کو دے دو۔ میاں بیوی کے درمیان خلوت صحیحہ ہونے یا ہم بستری ہونے کے بعد مہر مؤکد ہو جاتا ہے اور پورا مہر ادا کرنا لازم ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا اگر کوئی شخص بغیر مہر ادا کیے فوت ہو گیا، تو مہر کی ادائیگی بطور واجب الادا قرضہ متوفی کے ترکہ سے کیا جائیگا، ہاں! اگر نکاح کے بعد خلوتِ صحیحہ نہیں ہوئی اور عورت کو طلاق دیدی تو اس صورت میں نصف مہر ادا کرنا ہو گا۔

متعہ حرام ہے

یہ بات قابل ذکر ہے کہ بعض لوگوں نے اسی لفظ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ سے متعہ کا جواز نکالا ہے حالانکہ متعہ ہماری شریعت میں ہرگز جائز نہیں۔ ابتدائے اسلام کے زمانہ میں بعض ضرورتوں اور مجبوریوں کی وجہ سے اس کو روا رکھا گیا تھا، پھر جب مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو گیا اور وہ مجبوریاں رفع ہو گئیں تو متعہ یعنی وقتی نکاح کو ہمیشہ کے لیے حرام قرار دیدیا گیا۔ ظاہر ہے کہ کسی خاص مدت کے لیے نکاح کرنے سے نہ تو حقوق کما حقہٗ ثابت ہوتے ہیں اور نہ ہی اولادِ صحیح ثابت ہوتی ہے۔ زوجین کے دیگر حقوق کا بھی تعین نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دو چار ماہ یا جو بھی مدت مقرر ہوئی، اس کے ختم ہونے پہ نکاح خود بخود ختم ہو گیا، لہٰذا اس قسم کا نکاح جائز نہیں ہے مسلم شریف اور احادیث کی دیگر کُتب میں خود حضرت علیؓ سے حدیث منقول ہے جس کی رُو سے متعہ کو ابدی طور پہ حرام قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا عورتوں سے استفادہ حاصل کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو باقاعدہ عقد نکاح ہو یا پھر لونڈی ہو۔ اس کے علاوہ تیسری کوئی صورت نہیں۔ اگر کوئی ایسی صورت پیدا کریگا تو وہ باطل ہو گی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بارے میں بھی ترمذی شریف میں منقول ہے۔ کہ پہلے وہ متعہ کے قائل تھے مگر بعد میں انہوں نے رجوع کر لیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بھی یہی قول ہے کہ نکاح اور لونڈی کے علاوہ كُلُّ فَرْجٍ سِوَاهُمَا حَرَامٌ ہر ذریعہ شہوت رانی حرام ہے۔

مہر میں کمی بیشی

مقررہ مہر کی ادائیگی کو لازم قرار دینے کے بعد فرمایا کہ صرف ایک صورت میں مہر کی کلی یا جزوی ادائیگی سے بچت ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَاضَيْتُم بِهِ مِن بَعْدِ الْفَرِيضَةِ تم میاں بیوی آپس میں راضی ہو جاؤ مہر مقرر ہونے کے بعد۔ آپس کی رضامندی سے اگر عورت مہر کلی یا جزوی طور پہ معاف کر دیتی ہے۔ تو تم پہ کچھ گناہ نہیں اس کے مطابق عمل کر سکتے ہو۔ پھر پورا مہر ادا کرنا لازم نہیں رہیگا۔ اسی

طرح اگر مرد رضامندی سے مقررہ مہر سے زیادہ ادا کرے تو بھی اس میں کوئی حرج نہیں۔ بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے۔ کہ نکاح کے وقت مالی حالت اچھی نہ تھی، بعد میں بہتر ہو گئی۔ اب اگر خاوند مقررہ مہر سے زیادہ ادا کرنا چاہے تو اُسے اجازت ہے۔ اور اگر نکاح کے وقت مہر بالکل مقرر ہی نہ کیا گیا ہو تو مہر کی ادائیگی پھر بھی لازم ہے اور اسکی مقدار وہ ہوگی جو میاں بیوی بعد میں طے کرلیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے بعض صورتوں میں مہر مثلی بھی ادا کرنا پڑتا ہے بہرحال فرمایا کہ جس عورت سے فائدہ اٹھایا ہے اس کا مقررہ مہر ادا کرنا ضروری ہے۔ اللہ نے جو بھی احکام نازل فرمائے ہیں ان میں ہر لحاظ سے بہتری ہے اور جن عورتوں سے نکاح حرام ٹھہرایا ہے اس میں بھی مصلحت ہے۔ جائز نکاح کے ساتھ جو شرائط اور پابندیاں عاید کی ہیں اُن میں بھی حکمت پوشیدہ ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین پر صدق دل سے یقین رکھے اور ان پر عمل پیرا رہے۔ کیوں؟ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز حتیٰ کہ ہر ضعف، کمزوری حاجت اور پریشانی کو جانتا ہے اور اس کی ہر بات اور ہر حکم حکمت پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم میں حکمت پوشیدہ ہے۔ لہذا انسان کے لیے لازم ہے کہ اسکی تعمیل کرے۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا أَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِكُمْ ۭ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ وَاٰتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ أَخْدَانٍ ۚ فَإِذَآ أُحْصِنَّ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۭ وَأَنْ تَصْبِرُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۲۵﴾ ع ۱۳/۴

ترجمہ :- اور جو شخص تم میں سے طاقت نہیں رکھتا کہ وہ نکاح کرے مومن آزاد عورتوں کے ساتھ ، پس اُن سے نکاح کر لے جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہیں تمہاری نوجوان مومنہ لونڈیوں میں سے اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے تمہارے ایمانوں کو۔ بعض تم میں سے بعض سے ہیں۔ پس اُن سے نکاح کرو اُن کے مالکوں کی اجازت سے اور اُن کو مہر ادا کرو دستور کے مطابق۔ وہ قید نکاح میں آنیوالی ہوں ، نہ محض شہوت رانی کرنیوالی اور نہ پوشیدہ طور پر دوستی اختیار کرنیوالی پس جب وہ قید نکاح میں لائی جائیں اگر وہ کوئی بے حیائی کا کام کریں ، پس اُن پر نصف ہے وہ سزا جو آزاد

عورتوں پر ہے۔ یہ (لونڈیوں کے ساتھ نکاح کی اجازت) اُس شخص کے لیے ہے جو تم میں سے مشقت میں پڑنے سے ڈرتا ہے اور یہ کہ تم صبر کرو، تمہارے لیے بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے ﴿۲۵﴾

لونڈیوں کے ساتھ نکاح

محرمات نکاح کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ باقی سب عورتوں کے ساتھ نکاح جائز ہے۔ پھر مہر کی ادائیگی کی بھی تاکید فرمائی۔ اب آج کی آیت میں لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنے کا بیان ہے اور یہ مسئلہ بیان ہوا ہے۔ کہ لونڈیوں اور آزاد عورتوں کے احکام مختلف ہیں۔ اگر کوئی لونڈی بے حیائی کا ارتکاب کرے تو وہ آزاد عورت کی نسبت نصف سزا کی مستحق ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اور جو شخص تم میں سے طاقت نہیں رکھتا۔ طَوْلًا کا معنیٰ طاقت، قدرت، مقدرت وغیرہ ہے، اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ یہ کہ نکاح کرے پاکدامن مؤمن عورتوں سے۔ یعنی اگر کوئی شخص مالی لحاظ سے اتنا کمزور ہے۔ کہ وہ آزاد عورت کے ساتھ نکاح کرنے کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ ایسی عورتوں کے حقوق زیادہ ہوتے ہیں۔ انہیں مہر بھی زیادہ ادا کرنا پڑتا ہے اور ان کے نان نفقہ کے اخراجات بھی زیادہ ہوتے ہیں، تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ اپنی مومنہ نوجوان لونڈیوں کے ساتھ نکاح کر لو۔ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کا لغوی معنیٰ دائیں ہاتھ کی ملکیت ہے، مگر مراد لونڈیاں ہیں۔ لونڈی سے نکاح کرنے کی صورت یہ ہے۔ کہ اُس لونڈی کا مالک اُسے دوسرے شخص سے نکاح کرنے کی اجازت دے۔ ایسا کرنے سے لونڈی بیوی تو دوسرے شخص کی بن جاتی ہے مگر ملکیت مالک ہی کی ہوتی ہے، مالک اس سے حسب منشا، خدمت تو لے سکتا ہے مگر نکاح کر دینے کے بعد اُس سے مجامعت نہیں کر سکتا۔ تو فرمایا۔ کہ اگر آزاد عورت کو نکاح میں لانے کی استطاعت

نہ ہو تو پھر اگر لونڈی مل جائے تو اُس کے ساتھ ہی نکاح کر لو۔

لونڈی اور آزاد عورت میں تقابل

آزاد عورت جب کسی شخص کے نکاح میں چلی جاتی ہے۔ تو پھر اُس کے حقوق و فرائض خاوند کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں اور میکے کے ساتھ اُس کا تعلق محض باہمی رضامندی تک ہی محدود ہوتا ہے۔ جب کہ لونڈی اگر نکاح میں بھی دے دی جائے تو مالک کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اُس سے خدمت لے سکے اور اُسے اپنے گھر میں رکھے۔ ایسی حالت میں لونڈی کا نان نفقہ بھی مالک کے ذمہ ہوگا اور اگر وہ لونڈی اس کے شوہر کو سونپ دے تو پھر اس کے اخراجات بھی خاوند کے ذمہ ہوں گے، البتہ آزاد عورت اپنے خاوند کے گھر میں رہنے کی پابند ہوتی ہے۔ اور اُس کے اخراجات کی ذمہ داری بھی خاوند پر ہی ہوتی ہے۔ عام طور پر لونڈیوں کے حقوق آزاد عورتوں کے برابر نہیں تسلیم کیے جاتے۔ اُن کے حقوق بھی کم ہوتے ہیں مہر بھی نسبتاً کم مقرر ہوتا ہے۔ اور نان و نفقہ کے اخراجات بھی کم ہوتے ہیں، مہر بھی معمولی ہوتے ہیں، لہٰذا لونڈی کے ساتھ نکاح کرنے میں یہ سہولت ہے۔ برخلاف اس کے لونڈی سے نکاح کرنے میں یہ قباحت بھی ہے۔ کہ وہ اپنے اصل مالک کی ملکیت میں رہے گی اور اس سے پیدا ہونے والی اولاد بھی غلام اور لونڈیاں تصور ہوں گے۔ خاوند لونڈی کے مالک کی مرضی کے خلاف اس سے خدمت نہیں لے سکتا، کیونکہ وہ مالک کی خدمت کرنے کی پابند ہے۔ پھر یہ بھی ہے۔ کہ لونڈی پردے کی پابند نہیں۔ اگر اس کا مالک اُسے سودا لینے کے لیے بازار بھیجے تو وہ بے پردہ کھلے سر جائے گی جو کہ ایک غیرت مند خاوند کے لیے روح فرسا معاملہ ہوگا۔ آزاد عورت کے حق میں برہنہ سر ہونا موت کے مترادف ہے، حتیٰ کہ آزاد عورت ننگے سر تنہائی میں بھی نماز ادا نہیں کر سکتی وہ اپنے ہاتھ پاؤں اور چہرے کے علاوہ جسم کا تمام حصہ ڈھانپنے کی پابند ہے مگر لونڈی پر یہ پابندی عاید نہیں

ہوتی۔ تو بہرحال لونڈی کے ساتھ نکاح کرنے میں بعض سہولتیں ہیں اور اس کے ساتھ بعض پریشانیاں بھی ہیں۔

ایمان کی شرط

لونڈی کے ساتھ ایمان کی شرط عائد کی گئی ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک یہ شرط لازمی ہے اس کے بغیر یعنی غیر مسلمہ لونڈی سے نکاح کی اجازت نہیں البتہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک لونڈی کا مسلمان ہونا بہتر ہے، لازم نہیں۔ اُن کے نزدیک کتابیہ یعنی یہودی یا نصرانی لونڈی کے ساتھ نکاح بھی درست ہے بہرحال یہ فطری چیز معلوم ہوتی ہے۔ کہ مدارِ فخر ایمان ہے۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ کوئی مومنہ لونڈی ایمان کی وجہ سے آزاد عورت کی نسبت اللہ کے نزدیک بہتر ہو۔ اور ایمان کی حقیقت کے متعلق فرمایا وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِکُمْ اللہ تعالیٰ تمہارے ایمانوں کو خوب جانتا ہے۔ اُسے علم ہے کہ ایمان کی کسوٹی پہ کون پورا اُترتا ہے۔ یعنی کسی عورت یا مرد میں کس درجہ کا ایمان ہے اور اس کی قوت یا ضعف اللہ ہی کے علم میں ہے لہٰذا مومنہ لونڈی سے نکاح کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہونی چاہیئے۔

آگے فرمایا بَعْضُکُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ تمہارے بعض بعض میں سے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ لونڈیاں بھی تمہاری ہی جنس سے ہیں۔ وہ بھی آخر انسان ہیں مگر جنگی قیدی بن کر غلامی کی زنجیروں میں جکڑی گئی ہیں۔ لہٰذا انہیں حقیر نہ سمجھو اور نہ اُن کی تذلیل کرو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ نازل فرما کر آزاد اور غلام کے درمیان نفرت کو کم کرنے کا حکم دیا ہے۔

مالک کی رضامندی

آگے فرمایا فَانْکِحُوْھُنَّ بِاِذْنِ اَھْلِھِنَّ مومنہ لونڈیوں سے اُن کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کرو کیونکہ اس کے بغیر تو نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ حدیث شریف میں آتا ہے اَیُّمَا عبد نکح بغیر اذن موالیہ فَھُوَ عَاھِرٌ یعنی جو غلام اپنے آقا کی رضامندی کے بغیر نکاح کرے وہ بدکار ہے۔ لونڈیوں کے متعلق بھی یہی حکم ہے

اسی لیے فرمایا کہ لونڈیوں کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کرو۔ اور ساتھ یہ بھی حکم دیا وَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ ان کے مہر بھی ان کو ادا کرو بِالۡمَعۡرُوۡفِ دستور کے مطابق۔ یعنی جو مہر مقرر ہوا ہے اُسے حیلے بہانے سے رد کرنے کی کوشش نہ کرو، بلکہ دے دو۔ البتہ اُس مہر کا مالک لونڈی کا مالک ہو گا، کیونکہ لونڈی خود کسی چیز کی مالکہ نہیں ہوتی۔ بایں ہمہ مہر کا ادا کرنا ضروری ہے۔

آگے فرمایا کہ جن لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنا چاہو اُن میں یہ شرائط ہونی چاہئیں کہ وہ مُحۡصَنٰتٍ قیدِ نکاح میں آنے والی ہوں غَيۡرَ مُسٰفِحٰتٍ محض شہوت رانی کے لیے نہیں بلکہ عزت و ناموس کی حفاظت کی خاطر نکاح پر آمادہ ہوں وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخۡدَانٍ اور نہ وہ پوشیدہ طور پر دوستی کی خواہشمند ہوں مطلب یہ ہے کہ نکاح کا انعقاد علی الاعلان ہو۔ اور اس امر کا چرچا ہو جانا چاہیئے کہ فلاں لونڈی فلاں شخص کے نکاح میں آگئی ہے۔ اور عقد نکاح کے لیے شرعی گواہوں کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ کوئی عنصر پوشیدہ نہ ہے کیونکہ ایسا کام چوری چھپے کرنا بداخلاقی تصور ہو گا۔

بے حیائی کی سزا

فرمایا فَاِذَاۤ اُحۡصِنَّ پس جب وہ قید نکاح میں لائی جائیں یعنی جب کوئی لونڈی کسی شخص کی بیوی بن جائے اور اُس کے تمام متعلقہ حقوق ثابت ہو جائیں۔ اس کے بعد فَاِنۡ اَتَيۡنَ بِفَاحِشَةٍ وہ بے حیائی کا ارتکاب کر بیٹھیں فَعَلَيۡهِنَّ نِصۡفُ مَا عَلَى الۡمُحۡصَنٰتِ مِنَ الۡعَذَابِ تو پھر اُن پر آزاد عورتوں کی نسبت آدھی سزا ہو گی۔ جس طرح غلام اور لونڈی کے حقوق آزاد کی نسبت کم ہیں، اسی طرح کسی گناہ کے ارتکاب پر اُن کی سزا بھی نصف ہے۔ بدکاری کی صورت میں غلام یا لونڈی کو رجم کی سزا تو دی نہیں جا سکتی کیونکہ اس کا نصف ممکن نہیں۔ البتہ غیر شادی شدہ کے لیے سو کوڑوں کی بجائے پچاس کوڑے سزا ہو گی اور ایک سال کی جلاوطنی کی جگہ صرف چھ ماہ کی شہر بدری کافی ہو گی۔ ترمذی شریف

کی روایت میں آتا ہے کہ اگر کسی کی لونڈی برائی کا ارتکاب کرے بیٹھے تو اس پر حد جاری کرو اور اس کو ملامت نہ کرو۔ البتہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک چھ ماہ کی جلاوطنی حد کا جزو نہیں جبکہ امام شافعیؒ اسے حد ہی کا ایک حصہ قرار دیتے ہیں۔ اور کوڑوں کی سزا کے ساتھ جلاوطنی بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ حد جاری کرنے کے لیے لونڈی کا مومنہ ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ مَنْ اَشْرَكَ بِاللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُحْصِنٍ جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا وہ محصن نہیں ہو سکتا۔ بہرحال سزا دینے کے راستے میں اس قدر پابندیاں ہیں۔ اور جب یہ تمام شرائط پوری ہو جائیں تو پھر غلام اور لونڈی کے لیے آزاد کی نسبت آدھی سزا ہے

مشروط اجازت

فرمایا لونڈی کے ساتھ نکاح کی اجازت صرف اُس شخص کے لیے ہے ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ جو تم میں سے مشقت میں پڑنے سے ڈرتا ہے۔ مقصد یہ کہ جو شخص مجبور ہو گیا۔ مالی حالت آزاد عورت کے ساتھ نکاح کی اجازت نہیں دیتی اور نفسانی خواہش برائی پر آمادہ کرتی ہے۔ اُسے خوف ہے کہ کہیں گناہ میں ملوث نہ ہو جائے۔ تو ایسی صورت میں لونڈی کے ساتھ نکاح کی اجازت ہے فرمایا وَاَنْ تَصْبِرُوْا اگر تم سخت ضرورت کے باوجود صبر کرو خَيْرٌ لَّكُمْ تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ کیونکہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے لونڈی کے ساتھ نکاح کرنے میں کئی طرح کی پریشانیاں بھی لاحق ہونگی لہٰذا صبر بہتر ہے وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ اگر کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ اور انسان اس پر اصرار نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے۔ وہ بڑا مہربان ہے۔

يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ
عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۲۶﴾ وَاللّٰهُ يُرِيدُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْكُمْ
وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوٰتِ أَنْ تَمِيلُوا مَيْلًا
عَظِيمًا ﴿۲۷﴾ يُرِيدُ اللّٰهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ
الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا ﴿۲۸﴾

ترجمہ :- اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارے لیے بیان کرے اور تمہاری اُن لوگوں کے راستوں کی طرف راہنمائی کرے جو تم سے پہلے گزرے ہیں اور تم پر (مہربانی سے) رجوع فرمائے اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے ﴿۲۶﴾ اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ تم پر رجوع فرمائے۔ اور وہ لوگ چاہتے ہیں جو خواہشات کے پیچھے لگتے ہیں کہ تم پھر جاؤ، پھر جانا بہت بڑا ﴿۲۷﴾ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم سے تخفیف کر دے اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے ﴿۲۸﴾

ربطِ آیات

گذشتہ دروس میں محرمات نکاح کا ذکر ہوا، پھر اللہ تعالیٰ نے لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی اور اس کی حکمت بھی بیان فرما دی۔ اس کے بعد اللہ نے مخلوق پر اپنے احسان کا ذکر فرمایا، اور حلال وحرام سے متعلقہ احکام کی حکمت بیان فرمائی ہے۔

مکمل وضاحت

ارشاد ہوتا ہے یُرِیْدُ اللّٰہُ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے لِیُبَیِّنَ لَکُمْ تاکہ بیان

کر دے تمہارے لیے وہ چیزیں جو تمہارے لیے حلال ہیں اور جو حرام ہیں اللہ تعالیٰ تمہیں وہ باتیں بھی بتانا چاہتا ہے جو تمہارے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں اور جن میں تمہارا فائدہ ہے۔ اور وہ باتیں بھی جن سے بچنا بھی تمہارے لیے ضروری ہے یہ اللہ تعالیٰ کا خاص احسان اور اس کی مہربانی ہے۔ کہ وہ ہمارے فائدے کی باتیں بیان کرتا ہے تاکہ ہم انہیں اختیار کر لیں اور نقصان دہ امور سے بچ جائیں۔

مفسر قرآن امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے کہ بیان دو قسم کا ہوتا ہے۔ بیان کی پہلی قسم نص ہے اور اس سے مراد وہ احکام و فرامین ہیں جو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بالکل صراحت کے ساتھ بیان کر دیے ہیں ان میں حلال و حرام بالکل واضح الفاظ میں بتلا دیے ہیں۔ یا دوسری صورت یہ ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک سے صریح الفاظ میں وضاحت فرما دی گئی ہے، یہ بھی نص ہے۔

بیان کی دوسری قسم وہ ہے جو دلالت کے ساتھ اخذ ہو۔ یہ احکام صراحتاً تو بیان نہیں کیے گئے مگر ایسے اشارات پائے جاتے ہیں جن سے اہل علم، مفکر، مجتہدین اور علماء غور و فکر کر کے ایسے احکام کو اخذ کرتے ہیں۔ امام صاحب فرماتے ہیں۔ کہ دنیا میں جو چھوٹا بڑا حادثہ ہوتا ہے یا کوئی نئی چیز پیدا ہوتی ہے اس میں اللہ کا حکم ضرور ہوتا ہے۔ اور یہ حکم صراحتاً ہو گا یا دلالتاً۔ ایسے حکم کو معلوم کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّکْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" اگر تم کسی بات کو نہیں سمجھ پائے تو اسے اس کے جاننے والوں، یاد رکھنے والوں سے دریافت کر لو۔ وہ تم کو بتائیں گے کہ اس مسئلہ کا حل کیا ہے۔ بیان کی دوسری قسم یہی ہے۔

فرمایا پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے ہر چیز کو بیان کرنا چاہتا ہے۔

خصوصی راہنمائی

اور دوسری بات یہ ہے کہ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ تمہاری راہنمائی کرنا چاہتا ہے۔ ان لوگوں کے راستوں کی طرف جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔ ان

پہلے لوگوں سے مراد اللہ کے وہ نبی ہیں اور وہ نیک لوگ ہیں جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ مقصد یہ ہے ہم بھی اُن صالحین کے نقش قدم پر چل کر منزل مقصود کو پالیں۔ انبیاء میں سے حضرات ابراہیم علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام، ہود علیہ السلام نوح علیہ السلام وغیرہم کے راستے مقصود ہیں جن کو ہم اختیار کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ صالحین، مقربین اور کامل الایمان لوگوں کے راستے بھی بتلائے مردوں کا ذکر بھی کیا اور عورتوں کا بھی۔ اللہ تعالیٰ نے بعض ایسے صالحین کا تذکرہ بھی فرمایا جو دُنیا میں صاحب اقتدار بھی تھے۔ ذوالقرنین ایک بڑا بادشاہ تھا۔ زمین کا بیشتر حصہ اُس کے زیر نگیں تھا، مگر وہ ایماندار اور عادل بادشاہ تھا، ہمارے لیے اُس کا راستہ بھی قابلِ اتباع ہے۔ پھر لقمان جیسے عقلمند اور حکیم کا تذکرہ فرمایا تاکہ دُنیا کے اہل دانش اور سمجھدار لوگ اُن کی پیروی کر سکیں۔ مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے کس اعلیٰ طریقے سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی تعلیم دی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی بطور نمونہ ذکر کیا ہے۔ اور پھر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور صالحین کے ساتھ ساتھ سرکش، نافرمان، ظالم، مشرک، کافر، متکبر لوگوں کا تذکرہ بھی فرمایا تاکہ ایسے لوگوں کے غلط طریقے سے بچا جا سکے۔ وہ ایسے لوگ تھے اَلَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ جنہوں نے زمین کو شر و فساد سے بھر دیا۔ اُن کا حال بیان کر کے اللہ نے ہمیں تعلیم دی کہ ایسے نافرمان اور باغی لوگوں کا راستہ اختیار نہیں کرنا۔

انبیائے سابقین سے مطابقت

یہاں اصول فقہ کا یہ مسئلہ سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے سابقہ انبیائے کرام کا تذکرہ قرآن پاک میں کیا ہے اور پھر اگر اُن سے منسوب احکام کی تردید نہیں فرمائی تو ایسے احکام امت آخر الزمان کے لیے بھی دستور العمل ہوں گے۔ گویا ایسے حکم کو اللہ نے ہمارے لیے بھی مقرر فرما دیا ہے اور وہ ہمارے واسطے قابل عمل ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔ کہ سابقہ ادوار میں نکاح کی چار صورتیں رائج تھیں۔ حضور علیہ السلام

نے اُن چار میں سے موجودہ صورت کو برقرار رکھا اور باقی تین کو منسوخ فرما دیا لہٰذا اب یہی صورت ہمارے لیے قابلِ عمل ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ مدینہ طیبہ میں کچھ لوگ بیع سلم کیا کرتے تھے یعنی رقم پیشگی ادا کر دیتے تھے اور جنس اس کے بکنے پر وصول کرتے تھے اس میں کچھ باطل شرطیں بھی موجود تھیں جنہیں اللہ کے نبی نے منسوخ کر دیا اور جائز طریقہ کو جاری رکھا۔ اسی طرح اگر سابقہ کتب آسمانی تورات یا انجیل وغیرہ میں کوئی ایسے احکام موجود ہوں جن کی تردید نہیں کی گئی تو وہ بھی ہمارے لیے قابلِ قبول ہوں گے۔

رجوع من اللہ

فرمایا اللہ تعالیٰ تمہارے لیے سابقہ لوگوں کے راستوں کی نشاندھی فرماتا ہے اور اس کے ساتھ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ تمہاری طرف رجوع فرماتا ہے۔ توبہ کا معنیٰ رجوع ہے۔ جیسا کہ کسی گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے بندے کا رجوع یہ ہے کہ وہ معاصی کو ترک کر کے اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرے۔ اور اگر یہ رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو تو وہ تواب ہے، وہ اپنے بندے پر مہربانی اور شفقت کے ساتھ رجوع کرتا ہے، جب بندہ اس سے معافی مانگتا ہے، تو وہ اس کو قبول کرتا ہے۔ اسی کو فرمایا وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ وہ تمہاری طرف مہربانی اور شفقت سے رجوع کرتا ہے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے "فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ" اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ایسا مہربان ہوتا ہے کہ معافی مانگنے والوں کو معاف کرنے کے علاوہ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ اُن کی برائیاں نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔ بندے کی توبہ جس قدر خلوصِ نیت کے ساتھ ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اُس کا صلہ بھی اُسی قدر بہتر عطا کرتا ہے بندے کے نامۂ اعمال سے غلطیاں کوتاہیاں وغیرہ دور کر کے اُن کی جگہ

نیکیاں لکھ دیتا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ تم پر رجوع فرماتا ہے معاف کرنے اور بخشش کرنے کے ساتھ۔

فرمایا وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے اور اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ اُس نے حلال حرام نکاح، طلاق، وغیرہ کے متعلق جو بھی احکام دیے ہیں، ان میں ضرور کوئی نہ کوئی حکمت ہے اور اُس کے تمام اوامر و نواہی ہماری ہی بہتری کے لیے ہیں۔ جن عورتوں سے نکاح کو حرام قرار دیا گیا ہے اُس میں لازماً ہماری مصلحت اور انسانیت کا بھلا ہے۔ انسان کا علم ناقص اور محدود ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی تمام حکمتوں کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی علیم یعنی ہر چیز کو جاننے والی ہے۔ اور وہ حکیم ہے کہ اُس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں۔

خواہشات پرست لوگ

اللہ تعالیٰ نے دوبارہ تاکید کے طور پر فرمایا وَاللّٰہُ یُرِیْدُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْکُمْ اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ قبول کرنا چاہتا ہے اور اپنی بخشش اور مہربانی سے تم پر رجوع کرنا چاہتا ہے۔ برخلاف اس کے وَیُرِیْدُ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الشَّھَوٰتِ وہ لوگ جو خواہشات کی پیروی کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں اَنْ تَمِیْلُوْا مَیْلًا عَظِیْمًا کہ تم کو راہِ راست سے ہٹا کر پھر گمراہی کی طرف پھیر دیں۔

اس ضمن میں مجوسیوں کا حال دیکھ لیں کہ وہ اپنی غلیظ خواہشات کے پیشِ نظر اپنی حقیقی ماں اور بہن سے بھی نکاح کے لیے تیار ہو جاتے ہیں یہ کس قدر بےحیائی کی بات اور شہوت پرستی ہے۔ اس سلسلہ میں یہودیوں کا حال بھی ایسا ہی ہے۔ وہ بھی باطل پرست ٹولہ ہے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ اُن کے ہاں پھوپھی اور ماموں کی بیٹی سے نکاح تو جائز ہے مگر بھتیجی اور بھانجی سے کیوں جائز نہیں۔ یہ لوگ مسلمانوں میں شبہات ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہنود کا مذہب بھی

باطل ہے۔ اُن کے ہاں چچا کی بیٹی سے نکاح درست نہیں اور نہ وہ ماموں کی بیٹی سے نکاح کرتے ہیں حالانکہ اسلام نے چچا، ماموں، پھوپھی اور خالہ کی بیٹی سے نکاح کو بالکل جائز قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس میں اجنبیت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس کے علاوہ بھانجی اور بھتیجی سے نکاح حرام ہے کیونکہ اس میں بے حیائی پیدا ہوتی ہے۔

۱۹۴۰ء کا واقعہ ہے۔ کہ سیالکوٹ کے ایک وکیل کا گریجوایٹ بیٹا گوری شنکر اپنی پھوپھی یا ماموں کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہتا تھا مگر ہندو مذہب اسکی اجازت نہیں دیتا تھا۔ لڑکی بھی رضامند تھی مگر باطل مذہب ان کے راستے میں رکاوٹ تھا۔ معاملے نے بڑا طول پکڑا، آخر لڑکی کی شادی کسی دوسری جگہ کر دی گئی وہ بیماری کی حالت میں گھل گھل کر مر گئی۔ اُدھر لڑکے پہ بھی دیوانگی کے دورے پڑنے لگے۔ اُس پہ مجذوبوں جیسی کیفیت طاری ہوگئی۔ تاہم الحمدللہ اُسے ایمان کی دولت نصیب ہوگئی، محمد غوری نام رکھا تقسیم ہند کے وقت ہندو خاندان تو ترک وطن کر گیا مگر وہ لڑکا پاکستان میں ہی رُک گیا، ابھی دس بارہ سال پہلے فوت ہوا ہے۔ اُس کے اسلام لانیکی وجہ یہ بنی کہ وہ اس نتیجے پہ پہنچا کہ جس مذہب میں اس قسم کے غلط احکام ہوں۔ وہ مذہب صحیح نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اُس نے ہندو ازم کو ترک کر دیا۔

پرانے زمانے میں ایران کے رہنے والے مزدک اور مانی لوگوں کا مذہب یہ ہے کہ عورت ایک مشترکہ متاع ہے لہٰذا ہر عورت کو ہر شخص استعمال کر سکتا ہے، اس میں نکاح کی حدود و قیود کی ضرورت نہیں۔ ان میں ماں بہن بیٹی وغیرہ کا بھی کوئی امتیاز نہیں، عورت صرف عورت ہے اور ہر آدمی کی شہوت رانی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ دورِ جدید میں اشتراکیت بھی انہی راستوں پہ چل رہی ہے۔ اشتراکیت کے غلط نظریات سے متاثرہ لوگ بھی عورت کے متعلق اسی قسم کے خیالات اپنانے لگے ہیں۔ ماڈرن قسم کے لوگ

بھی عورت کو مشترکہ کھاتے میں رکھنے کے خواہشمند ہیں اور چاہتے ہیں، کہ نکاح کی بندشوں کو توڑ دیا جائے۔

یورپ اور فرانس میں گذشتہ تیس چالیس سال سے ادیب اسی قسم کا پراپیگنڈا کر رہے ہیں جس سے نکاح کا بندھن ختم ہو جائے اور حلال و حرام کی تمیز اُٹھ جائے تاکہ کوئی کسی کو حلالی یا حرامی کہنے کی پوزیشن میں نہ رہے۔ اس قسم کا پراپیگنڈا فرانس کی ادبی کتابوں میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کی توجہ اسی بے حیائی، عیاشی اور فحاشی کی طرف دلانا چاہتا ہے۔ کہ دیکھو! اس قسم کے خواہشات کے پرستار لوگ تمہیں تمہارے رستے سے پھیر دینا چاہتے ہیں تم اُن کی طرف توجہ نہ کرو بلکہ اللہ احکم الحاکمین کی طرف آؤ جو تم پر اپنی بخشش اور مہربانی سے رجوع کرنا چاہتا ہے۔

ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں نے بعض رسومات باطلہ یہاں کے قدیم ہندؤوں سے اخذ کی ہیں۔ ہندو کسی شخص کے مرنے کے بعد اس کی لاش کو جلا دیتے ہیں۔ پھر تیسرے دن بقیہ ہڈیوں کو اکٹھا کرتے ہیں اور اُن پر پھول چڑھاتے ہیں۔ اُن کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے قبروں پر پھول اور چادریں چڑھانا شروع کر دیں اور اسے بڑا نیکی کا کام سمجھنے لگے۔ حالانکہ اسلام میں اسکی کوئی حیثیت نہیں۔ مٹی کے ڈھیر پر پھول ڈالنے یا چادر چڑھانے کا کیا فائدہ۔ اگر ایصالِ ثواب ہی مقصود ہے تو یہ پیسے کسی محتاج کو دے دو اس کے کام بھی آئیں گے اور مرنے والے کا بھی فائدہ ہوگا۔ الغرض! اس قسم کی رسومات باطلہ مسلمانوں میں کچھ یہود کے راستے سے آئی ہیں اور کچھ ہنود کے راستے سے کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ تمہیں صراطِ مستقیم سے ہٹا کر باطل راستوں پر ڈال دیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس مذموم ارادے کی نشاندہی فرما کر اہل اسلام کو آگاہ کر دیا ہے اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اللہ کی طرف جانا چاہتے ہیں یا خواہشات

پرستوں کے پیچھے۔

جہنم اور جنت کی باڑھ

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک[1] ہے کہ لوگوں کی خواہشات کی طرف بڑی رغبت ہوتی ہے اور فرمایا حُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ جہنم کی باڑھ خواہشات ہی سے لگائی ہے۔ نفسانی خواہشات سے مراد آجکل کی آزادی، فحاشی، عریانی، زنا، جوا، شراب نوشی، بدمعاشی، راگ رنگ اور ناچ گانے ہیں۔ ہر ناقص الایمان آدمی کی خواہش انہی چیزوں میں جاکر اٹکتی ہے۔ لوگ بڑی رغبت کے ساتھ اس طرف جاتے ہیں مگر جب خواہشات کی اس باڑھ کو عبور کرتے ہیں تو آگے جہنم ہے جس میں جاگرتے ہیں۔ اسی لیے حضور نے فرمایا کہ خواہشات جہنم کی باڑھ ہیں۔ دوسری طرف جنت کی باڑھ عبادت، تقویٰ، نیکی، ایمان، تزکیہ، قوانین کی پابندی، حلال وحرام کی تمیز اور اوامر ونواہی کی پابندی سے موسوم ہے۔ جو شخص جنت میں جانے کا خواہشمند ہے اُسے یہ مشکل گھاٹیاں عبور کرنا ہونگی۔ جب وہ اس معیار پہ پورا اترے گا تو آگے جنت اُس کا استقبال کریگی، وہ کامیاب وکامران ہوگا۔

راہِ اعتدال

فرمایا اگرچہ خواہشات کے پیروکار تمہیں راہِ راست سے دور ہٹانا چاہتے ہیں۔ مگر یاد رکھو اُيُرِيدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ اللہ تعالیٰ تم سے تخفیف کرنا چاہتا ہے۔ وہ تمہاری خواہشات کو مکمل طور پہ دبانا نہیں چاہتا بلکہ انہیں جائز حد تک پورا کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اگر خواہشات کو بالکل ہٹا دیا جائے تو انسلاخ ہو جائے گا، رہبانیت پیدا ہوگی۔ جوگی پنا ہوگا، جو فطرتِ انسانی کے خلاف ہے۔ اللہ نے نکاح کی اجازت دیکر تم پہ بعض پابندیاں عاید کر دیں کہ اُن کے اندر رہ کر خواہشات کو پورا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کا طریقہ کار اختیار کرنے کی ترغیب دی جس کے ذریعے بہیمیت کی اصلاح کی جا سکے اور انسان

[1] ترمذی ص۳۶۷ ومسلم ص۳۷۸ ج۲ و بخاری ص۹۶۱ ج۲ (فیاض)

میں اعتدال پیدا ہو۔

تو اللہ نے فرمایا کہ تم پہ صرف تخفیف کی گئی ہے۔ خواہشات کو مکمل طور پر مٹانا مقصود نہیں۔ جائز طریقے سے اُنہیں بھی پورا کرو۔ حلال حرام کی پابندی کرو۔ اس سے انسان ترقی کرتا ہے۔ انار کی ہمیشہ انسانی تنزل کا باعث ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کے احکام کے تابع رہ کر اپنی ضروریات کی تکمیل کرو۔

فرمایا وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا جسمانی طور پہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ اسکی کمزوری کو ملحوظ رکھ کر اُسے خواہشات سے مکمل دست برداری کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ اُس کے لیے جائز صورتیں وضع کر دی گئی ہیں تاکہ وہ اپنے طبعی تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اس دُنیا میں بھی خوش وخرم زندگی بسر کرے اور آخرت میں بھی کامیاب ہو جائے۔ بہرحال اللہ نے نکاح کی حلت وحرمت کے بعد اسی حکمت کی طرف بھی اشارہ فرما دیا ہے۔

والمحصنٰت ۵ | النسآء ۴
درس بستم ۲۰ | آیت ۲۹ تا ۳۰

يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ
بِالْبَاطِلِ إِلَّآ أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ قف
وَلَا تَقْتُلُوٓا أَنْفُسَكُمْ ط إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ﴿۲۹﴾
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيهِ
نَارًا ط وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرًا ﴿۳۰﴾

ترجمہ :- اے ایمان والو ! ایک دوسرے کے مال آپس میں باطل طریقے سے مت کھاؤ، سوائے اس کے کہ آپس میں رضامندی سے تجارت ہو۔ اور نہ قتل کرو ایک دوسرے کو، بیشک اللہ تعالےٰ تمہارے ساتھ مہربان ہے ﴿۲۹﴾ اور جو شخص یہ کام کرے گا تعدی کرتے ہوئے اور ظلم سے پس عنقریب ہم اُس کو آگ میں داخل کریں گے ، اور یہ بات اللہ پر آسان ہے ﴿۳۰﴾

ربط آیات

گذشتہ دروس میں محرمات نکاح اور ان محرمات کی حکمت کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے پرانے لوگوں کے حالات اور دستور کی طرف بھی اشارہ کیا، تاکہ ہمیں موجودہ شرائع الٰہیہ سے تقابل اور ترجیح کا موقع مل سکے اور معاملے کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ خداوند قدوس نے اس معاملہ میں انسان کی طبعی خواہشات کو ملحوظِ خاطر رکھ کر اُس کے لیے آسانی پیدا فرما دی ہے۔ اور انہیں پورا کرنے کا بہتر طریقہ بھی سمجھا دیا ہے۔ چونکہ انسان فطرتاً کمزور پیدا کیا گیا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُس کے لیے تخفیف فرما دی ہے۔

محرمات نکاح کے مسئلہ میں غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی نفس میں ناحق طریقے سے تصرف کرنا حلال نہیں ہے، لہٰذا جن عورتوں کے ساتھ نکاح حرام ہے اُن میں تصرف باطل ہے۔ تو جس طرح کسی جان میں ناحق تصرف جائز نہیں اسی طرح مال میں بھی شرعی احکام کے خلاف تصرف روا نہیں۔ اس سورۃ کی ابتداء میں بھی جانی اور مالی حقوق کا تذکرہ آچکا ہے۔ تخلیق انسانی کے بیان کے بعد اللہ تعالیٰ نے یتیموں کے حق میں ناانصافی کرنے سے منع فرمایا۔ پھر عورتوں کے مہر کا ذکر کیا۔ وراثت کے احکام بیان ہوئے کہ یہ بھی مالی احکام ہیں۔ اب آج کے درس میں بھی اللہ تعالیٰ نے مالی اور جانی حقوق کا ذکر کیا ہے اور واضح فرمایا ہے کہ شرعی حکم کے بغیر نہ مال میں تصرف روا ہے اور نہ جان میں۔

مال میں ناجائز تصرف

ارشاد ہوتا ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے ایمان والو! یہ خطاب خاص طور پر اہل ایمان کے لیے ہے لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ نہ کھاؤ اپنے مالوں کو اپنے درمیان بِالْبَاطِلِ باطل طریقے سے، اور اس سے مراد ناجائز اور حرام راستے ہیں۔ ہر وہ ذریعہ آمدنی جو شریعت نے حرام قرار دیا ہے، وہ باطل میں شمار ہوگا۔ اس میں چوری، ڈکیتی، خیانت، سود رشوت، دھوکہ وغیرہ سب آجاتے ہیں۔ بیوع فاسدہ یعنی وہ خرید و فروخت جس سے شریعت نے منع فرمایا وہ بھی باطل میں شامل ہوگی۔ جن اشیاء کی تجارت مثلاً شراب، مردار، تصاویر، مجسمے وغیرہ کی ممانعت آئی ہے اُن کے ذریعے مال کا حصول بھی باطل ہے۔ اس کے علاوہ بعض پیشے ایسے ہیں جن کو اختیار کرنے سے اللہ اور اس کے رسول نے منع فرمایا ہے جیسے گانا بجانا، آلات لہو ولعب، جوا وغیرہ سب امور باطلہ کی فہرست میں آتے ہیں۔ تو اللہ نے فرمایا کہ ایک دوسرے کا مال باطل ذرائع سے مت کھاؤ۔ بعض اوقات کسی کا وراثت کا حق غصب

لیا جاتا ہے۔ شراکتی کاروبار میں ایک دوسرے کے حق میں خیانت ہو جاتی ہے فرمایا اٰتِ کُلَّ ذِی حَقٍّ حَقَّہٗ ہر حقدار کو اس کا حق ادا کرو۔ اگر کسی طریقے سے دوسرے کے مال میں ناجائز تصرف ہوگا، تو وہ حرام ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے صریح الفاظ میں منع فرمایا ہے۔ کہ اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے مت کھاؤ۔

مفسر قرآن امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں۔ کہ جس طرح دوسرے کا مال ناجائز طور پر کھانا یا استعمال کرنا روا نہیں، اسی طرح اپنا مال بھی ناجائز اور باطل طریقے سے استعمال کرنا حرام ہے۔ اگر اپنا مال بھی کھیل تماشے میں لگا دیا یا رسومات باطلہ کی نذر کر دیا، اسراف و تبذیر میں اڑا دیا تو یہ بھی ناجائز ہے۔

تجارتی منافع

البتہ ایک صورت ایسی ہے جس میں ایک دوسرے کا مال کھایا جا سکتا ہے۔ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً اور وہ ہے ذریعہ تجارت۔ تجارت کے ذریعے سے ایک فریق کو دوسرے فریق سے جو منافع حاصل ہوتا ہے اس کا استعمال جائز ہے اور پھر تجارت بھی ایسی عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ جو باہمی رضامندی سے کی جائے۔ اور جو صحیح تجارت ہے وہ رضامندی سے ہی ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی فریق تجارتی لین دین میں راضی نہ ہو تو وہ تجارت نہیں بلکہ زبردستی ہوگی جو کہ ناجائز ہے۔ تجارت کا مطلب ہی یہ ہے مبادلة المال بالمال بالتراضی یعنی مال کا بدلہ مال سے باہمی رضامندی کے ساتھ کیا جائے۔ اس میں یقیناً منافع حاصل ہوگا اور وہ مومن کے لیے شرعاً حلال ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ باہمی رضامندی بھی اسی صورت میں روا ہے جب کہ تجارت شرعی حدود کے اندر ہو۔ اگر کوئی شخص سود یا رشوت کی رقم دوسرے فریق کی رضامندی سے دیتا ہے یا لیتا ہے، تو وہ لین دین

جائز نہیں ہوگا۔ کیونکہ ان اشیاء کو تو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ ایسی رضامندی کا کچھ اعتبار نہیں۔ البتہ تجارت میں منافع لینا جائز ہے، اور اس کی کوئی تحدید نہیں۔ منافع کبھی زیادہ بھی ہو سکتا ہے اور کبھی کم۔ کبھی برابر سرابر تجارت کرنا پڑتی ہے اور کبھی نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے، بہر حال تجارت میں نفع کمانا جائز ہے۔ اس کے علاوہ کسی کا مال استعمال کرنا جائز نہیں۔ ابوداؤد شریف میں حضور علیہ السلام کا فرمان موجود ہے لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِءٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسِهٖ کسی مسلمان کا مال اس وقت تک حلال نہیں جب تک وہ خوشی خاطر سے خود اسکی اجازت نہ دے

غیر تجارتی ذرائع مال

یہ امر قابل ذکر ہے۔ کہ تجارت کے علاوہ بعض دیگر ذرائع بھی موجود ہیں جن سے کوئی مسلمان مال حاصل کر سکتا ہے۔ ان میں وراثت میں وصول ہونے والا مال ہے۔ اگر کوئی شخص دوسرے کو کوئی مال ہبہ کر دے تو اس کے لیے حلال ہو جاتا ہے۔ یا کوئی کسی کو عطیہ دے دے یا صدقہ دے تو وہ مال بھی دوسرے کے تصرف میں آسکتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ آیت زیر درس میں صرف تجارت کا ذکر آیا ہے، باقی ذرائع مال کی کیا حیثیت ہوگی۔ اس کے جواب میں مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اگرچہ تجارت کے علاوہ حصول مال کے دیگر ذرائع بھی موجود ہیں مگر یہاں پر تجارت کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ سب سے بڑا ذریعہ مال تجارت ہی ہے ایک اندازے کے مطابق پوری دنیا میں کل مال تصرف کا اسی فیصد حصہ تجارت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اور باقی بیس ۲۰ فیصد دیگر ذرائع سے۔ تجارت کو دنیا میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انسانی تمدن میں یہ سب سے بڑا ذریعہ مبادلہ ہے۔ تجارتی لین دین مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک ہوتا رہتا ہے ایک ملک دوسرے سے تجارت کرتا ہے۔ ایک شہر کا مال دوسرے شہر میں جاتا ہے، حتیٰ کہ ایک محلے اور علاقے کا سامان دوسرے مقام پر تجارت کے

لہ ابوداؤد ص۔ واحکام القرآن للجصاص ص۳۳۶ ج ۲ (فیاض)

ذریعے پہنچتا ہے۔ غرضیکہ پوری دنیا کی ضروریات زندگی ایک خطے سے دوسرے خطے میں منتقل ہوتی رہتی ہیں، یہی تجارت ہے اور یہی سب سے بڑا ذریعہ حصولِ مال ہے اسی لیے فرمایا کہ باہمی رضامندی کی تجارت کے علاوہ آپس میں باطل طریقے سے مال نہ کھاؤ۔

یہاں پر اکل کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا معنیٰ کھانے کا ہوتا ہے، یعنی باطل طریقے سے مال نہ کھاؤ۔ مگر مال صرف کھایا ہی نہیں جاتا بلکہ یہ دیگر ضروریات یعنی پہننے، رہائش، سواری وغیرہ میں بھی استعمال ہوتا ہے، تو کیا کھانے کے علاوہ دیگر امور میں باطل طریقے سے مال استعمال کیا جاسکتا ہے؟ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ ضروریات زندگی میں انسان کے لیے کھانا سب سے اہم ضرورت ہے۔ باقی ضروریات کو کسی مدت تک ملتوی کیا جاسکتا ہے مگر کھانا ایک ایسی چیز ہے جس پہ انسانی زندگی کا انحصار ہے شیخ سعدیؒ بھی گلستان میں کہتے ہیں۔ کہ انسان تکیے کے بغیر سو سکتا ہے، بیوی کے بغیر گزارہ کر سکتا ہے، پھول اور خوشبو کے بغیر بھی گزر اوقات ہو سکتی ہے، لیکن پیٹ ایسا ظالم ہے کہ جب تک اس میں کوئی چیز داخل نہ کریں، گزارہ نہیں ہوتا، اسی لیے کہتے ہیں کہ دنیا پیٹ پہ چلتی ہے۔ پیٹ ہی کی خاطر انسان طرح طرح کے دھندے کرتا ہے۔ لہٰذا یہاں پر کھانے کا ذکر زندگی کی اہم ترین ضرورت ہونے کی وجہ سے کیا گیا ہے اسی طرح سود کو حرام کرتے وقت بھی فرمایا "لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا" یعنی سود مت کھاؤ۔ حالانکہ سود کی رقم دیگر کاموں میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ مقصد یہی ہے کہ کھانے میں استعمال کی ہر چیز شامل ہے۔

گہوارۂ امن

ایک دوسرے کے مال میں عدم تصرف کا اللہ تعالیٰ نے ایسا پاکیزہ اصول بیان کر دیا ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو پوری دنیا گہوارۂ امن بن جائے۔ کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ ناجائز تصرف سے شر و فساد

کا دروازہ کھلتا ہے۔ حرص، لالچ، طمع، خود غرضی، نفس پرستی، اور تعیش وغیرہ
سب ناجائز تصرف کا ثمرہ ہیں۔ اگر مسلمان خاص طور پہ اللہ تعالےٰ کے
احکام پہ عمل کرتے ہوئے ناجائز تصرف سے باز آجائیں تو پوری سوسائٹی میں
امن وامان قائم ہوجائے بہر حال فرمایا کہ ناجائز طریقوں سے مال اکٹھا نہ کرو
بلکہ اس کے لیے جائز اور پسندیدہ ذرائع تلاش کرو۔ اللہ نے فرمایا
وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوٰ یعنی اللہ تعالیٰ نے تجارت کو
حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام۔ لہٰذا انسان کو لازم ہے کہ وہ معیشت
کے لیے حلال ذرائع اختیار کرے اور حرام راستوں سے بچ جائے۔ فتح مکہ
کے موقع پر بھی حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اعلان کروایا تھا اِنَّ اللّٰہَ
وَرَسُوْلَہٗ حَرَّمَ بَیْعَ الْخَمْرِ وَالْمَیْتَۃِ وَالْخِنْزِیْرِ وَالْاَصْنَامِ یعنی اللہ تعالےٰ
نے مردار، خنزیر، شراب اور مجسموں کی خرید و فروخت کو حرام قرار دیا ہے۔ لہٰذا
تجارت بھی ایسی کرنی چاہیے جس میں حرمت کا پہلو نہ پایا جائے۔

قتل نفس

جسطرح مال میں ناجائز تصرف حرام ہے، اسی طرح جان میں بھی ناجائز
تصرف حرام ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ
اور نہ قتل کرو اپنی جانوں کو۔ یعنی ایک دوسرے کے قتل کے درپے مت
ہوکر یہ بھی حرام ہے اور کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ اور پھر اَنْفُسَکُمْ
سے یہ بھی مراد ہے کہ کوئی شخص خود اپنی جان کو بھی تلف نہ کرے، گویا خودکشی
بھی حرام ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے جو شخص جس آلے کے ساتھ
خودکشی کرے گا، اسی آلے کے ذریعے اس کو جہنم میں سزا دی جائے گی۔
اگر کسی چھری یا دیگر تیز دھار آلے سے اپنے آپ کو ہلاک کیا ہے، تو
دوزخ میں اسی سے ہلاک ہوتا ہے گا۔ اگر زہر کھایا ہے تو وہی زہر اس
کو کھانے کو ملے گا، اگر کوئی شخص اونچے مینار یا دیوار سے چھلانگ لگا
کر خودکشی کا مرتکب ہوتا ہے تو دوزخ میں اسے اونچی جگہ سے گرایا جائے

گا غرضیکہ وہاں پر جزا جنسِ عمل سے ملیگی مقصد یہ ہے کہ خودکشی بھی حرام ہے۔
اور کسی دوسرے آدمی کی جان لینا بھی قطعی حرام ہے۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے
کہ اہلِ اسلام بھی مال وجان میں تصرف کی پروا نہیں کرتے۔ صدر ایوب کے
زمانے میں اسمبلی میں رپورٹ پیش کی گئی جس کے مطابق صرف ایک صوبے
میں تین سال کے عرصہ میں سولہ ہزار قتل ہوئے اور ایک ضلع میں ایک سال میں
ایک ہزار قتل ہوئے، حالانکہ کسی ایک مسلمان کی جان کا اتلاف دنیا بھر کے
نقصان سے بڑھ کر ہے۔ ابن ماجہ شریف کی روایت[1] میں آتا ہے۔
زوال الدنیا اھون علی اللہ من قتل رجل مسلم
یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مسلمان کا قتل پوری دنیا کے زوال سے
بھاری ہے۔ مگر آج دنیا میں کیا ہو رہا ہے معمولی معمولی باتوں پر قتل روزمرہ کا
معمول بن چکے ہیں۔ علاوہ ازیں خودکشی کے واقعات بھی عام ہو چکے ہیں
یہ جہالت اور نادانی کی انتہا ہے کہ انسان اپنی ہی جان کے درپے ہو جاتا ہے
بمبئی میں میٹرک کے نتیجے کے موقع پر ساحلِ سمندر پر فوج متعین کر دی جاتی
ہے تاکہ فیل ہونے والے طلبا کو خودکشی سے روکا جا سکے۔ جیسا کہ پہلے بیان
ہو چکا ہے، خودکشی کرنے والا آدمی آخرت میں سزا کا مستحق ہو جاتا ہے
اسی لیے فرمایا ایک دوسرے کو ناحق قتل نہ کرو، اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ
مہربان ہے اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُمْ رَحِیْمًا اللہ تعالیٰ نے تمہیں
جان و مال کی حفاظت کے قوانین بتلائے ہیں، ان پر عمل کرنے سے تمہارا اپنا ہی
فائدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان تمام امور سے آگاہ کر دیا ہے جو تمہارے لیے
دین، دنیا، برزخ اور آخرت کے لیے مفید ہیں اور وہ چیزیں بھی بتا دیں جو
تمہارے لیے مضر ہیں۔ اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم ان میں سے کون
سی چیز کو اختیار کرتے ہو۔

ناجائز تصرف کی سزا

فرمایا وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ جو شخص ایسا کام کرے گا مال وجان میں

[1] ابن ماجہ صفحہ ۲۰۰ و ترمذی صفحہ ۳۶ (فیاض)

ناجائز تصرف کرے گا عُدْوَانًا تعدی کرتے ہوئے وَظُلْمًا اور زیادتی کرتے ہوئے۔ واضح رہے کہ قتل نفس عدوان میں آتا ہے۔ یہ شرک کے ساتھ اکبر الکبائر میں شمار ہوتا ہے اور مال میں ناجائز تصرف ظلم کہلاتا ہے تو فرمایا کہ جو شخص تعدی اور ظلم سے ناحق مال کھائے گا یا کسی کی جان لیگا۔ فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا تو عنقریب ہم اس کو جہنم کی آگ میں داخل کریں گے۔ اگر وہ اس دنیا میں کسی نہ کسی طرح سزا سے بچ بھی گیا، تو جہنم میں اُس کے لیے ———— ابدی سزا بہر حال اس کے انتظار میں ہے۔ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا اور دوزخ میں سزا دینا اللہ تعالیٰ کے لیے آسان ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ ہم مسلمان ہیں اور سزا سے بچ جائیں گے بلکہ جرم کی سزا ضرور ملیگی۔ بلکہ اگر کسی شخص سے غلطی سے بھی قتل ہو جائے تو اس کے لیے بھی کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔ توبہ کرنی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے خون بہا کا حکم دیا ہے۔ لہذا زیادتی کر کے پھر بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے جس نے تمہیں دین حق دیا۔ مغرور ہو کر اس کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ ہمیشہ اس کی اطاعت کرنی چاہیئے۔

إِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾

ترجمہ :- اگر تم بچتے رہو گے اُن بڑے گناہوں سے جن سے تم کو روکا گیا ہے تو ہم معاف کر دیں گے تم کو تمہارے چھوٹے گناہ، اور ہم داخل کریں گے تم کو بڑی عزت کے مقام میں ﴿۳۱﴾

گذشتہ درس میں محرماتِ نکاح کا بیان ہو چکا ہے اس کے بعد اموال اور نفوس کے متعلق ارشاد ہوا کہ ایک دوسرے کے مال میں ناجائز تصرف مت کرو اور نہ ہی کسی کی جان تلف کرو۔ یہ بھی حرام ہے۔ جو شخص تعدی اور ظلم کا ارتکاب کریگا، اللہ تعالیٰ اُسے جہنم میں داخل کریگا۔ ایسا شخص مجرم تصور ہو کر سزا کا مستحق ٹھہریگا۔ اِن دونوں چیزوں یعنی مال و جان میں ناجائز تصرف کبیرہ گناہ میں شمار ہوتا ہے۔ اسی نسبت سے اللہ تعالیٰ نے آج کے درس کی آیت میں بڑے بڑے گناہوں کا تذکرہ فرمایا ہے کہ جو شخص بڑے گناہوں سے بچتا رہے گا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے گناہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے خود ہی معاف فرماتا رہے گا اور جنت کے باعزت مقام میں داخل کرے گا۔

کبائر اور صغائر

کبائر اور صغائر کی اصطلاح قرآن وسنت میں کثرت سے استعمال ہوئی ہے کبائر سے مراد وہ بڑے بڑے گناہ ہیں جو بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے۔ اور صغائر وہ چھوٹی چھوٹی لغزشیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ از خود ہی معاف فرما دیتے ہیں۔ بشرطیکہ انسان بڑے گناہوں سے بچتا رہے اور اعمال صالحہ انجام دیتا رہے۔ آج کی آیت کریمہ میں اللہ نے یہی قانون سمجھایا ہے ارشاد ہوتا ہے إِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ اگر تم اُن کبائر سے اجتناب کرتے رہو گے، جن سے منع کیا گیا ہے نُكَفِّرْ عَنْكُمْ

سَيِّاٰتِكُمْ ہم معاف کر دیں گے تمہاری چھوٹی موٹی خطائیں۔ البتہ یہ ہے
کہ اگر کوئی شخص کبیرہ گناہوں سے باز نہ آئے تو پھر نہ صرف کبائر کی وجہ سے
گنہگار ہوگا بلکہ چھوٹے گناہوں پر بھی مؤخذہ ہوگا۔ چھوٹی موٹی خطائیں اور لغزشیں
تو انسان سے ہر آن صادر ہوتی رہتی ہیں تاہم اگر کبیرہ گناہ سے بچ گیا تو انشاء اللہ
اس کی کامیابی کی اُمید ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہے کہ اُس نے
چھوٹے گناہوں کو ازخود معاف کر دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ بشرطیکہ انسان
کبائر سے اجتناب کی شرط کو پورا کرے۔ اس ضمن میں حضور علیہ السلام کی بہت
سی حدیثیں منقول ہیں۔ جیسا کہ آپ نے فرمایا اَلْجُمُعَةُ اِلَى الْجُمُعَةِ
كَفَّارَةٌ لِّمَا بَيْنَهُمَا[۱] ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک اگر انسان
کبائر سے بچتا رہے تو دوسرے چھوٹے چھوٹے گناہ ان کی وجہ سے معاف
ہوتے رہتے ہیں۔ نبی علیہ السلام نے ایسے ہی الفاظ ایک نماز سے دوسری
نماز تک کے درمیانی عرصہ کے متعلق فرمائے کہ اللہ تعالیٰ دو نمازوں کے درمیان
معمولی لغزشیں اِن نمازوں کی برکت سے معاف فرما دیتا ہے سورۃ ہود میں
بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ط
ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ" بیشک نیکیاں برائیوں کو مٹاتی رہتی ہیں۔ یہ ایک
یاددہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو خدا تعالیٰ کو یاد کرنے والے ہیں۔
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے مَنْ تَوَضَّأَ فَاَحْسَنَ
الْوُضُوْءَ[۲] جس نے اچھی طرح وضو کیا یعنی فرائض، سنن اور مستحبات
کی رعایت کرتے ہوئے اور تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے اعلیٰ
درجہ کا وضو کیا، فرمایا خَرَجَتْ خَطَايَاهُ مِنْ جَسَدِهٖ اسکے
تمام صغیرے گناہ اُس کے جسم سے نکل جاتے ہیں یعنی اُس کے ہاتھوں
کے یا آنکھوں کے یا منہ کے چھوٹے چھوٹے گناہ خود بخود وضو کی برکت
سے دھل جاتے ہیں۔ نیز آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر بندہ نفلی نماز پڑھتا ہے

تو اس کے لیے جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

سات کبائر حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے[1] کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اِجۡتَنِبُوا سَبۡعَ الۡمُوۡبِقَاتِ اے لوگو! سات مہلک گناہوں سے بچنے کی کوشش کرو۔ ان میں سب سے پہلا گناہ اشراک باللہ ہے یعنی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک بنانا۔ یہ سب سے زیادہ مہلک گناہ ہے کفر اور شرک انسان کو تباہ کر دیتے ہیں۔ فرمایا دوسرا بڑا گناہ قتل نفس ہے۔ کسی کی جان کو ناحق تلف کرنا۔ اس کے بعد سحر یا جادو کرنا، یتیم کا مال کھانا، لڑائی کے دن دشمن سے بھاگ جانا جب کہ دشمن کی تعداد مسلمانوں سے دگنی سے زیادہ نہ ہو۔ اگر دشمن کی تعداد دگنے سے زیادہ ہے تو پھر پیچھے ہٹ جانے سے انسان گنہگار نہیں ہوتا۔ اس کے بعد فرمایا بڑا گناہ قذف المحصنٰت یعنی پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانا ہے۔ عورتوں یا مردوں پر بدکاری کی تہمت لگانا اور ساتواں گناہ شہادت الزور یعنی جھوٹی گواہی دینا ہے یہ سب اکبر الکبائر میں شمار ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک یا زیادہ گناہوں کے مرتکب کے لیے معافی نہیں جب تک وہ جیتے جی توبہ نہ کرے۔ اور توبہ کی شرائط گذشتہ دروس میں گذر چکی ہیں۔

کبائر کا اصول امام غزالیؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔ کہ کبیرے گناہوں کی تعداد تو بہت زیادہ ہے تاہم اصولی طور پر یہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ کبیرہ گناہ وہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں یا حضور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبانِ مبارک نے جہنم کی وعید فرمائی ہے۔ گویا ایسا ہر جرم کبیرہ گناہ میں شامل ہو گا، جس پر جہنم میں جانے کی وعید آئی ہے۔ فرمایا ہر ایسا گناہ بھی کبیرہ شمار ہوتا ہے جس کے ارتکاب پر اللہ تعالیٰ نے اپنے غضب کا اظہار فرمایا ہے۔ کہ ایسا کرنے والے پر اللہ کا غضب اور ناراضگی ہو یا "سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ" کے الفاظ آتے ہوں۔ اس کا معنیٰ بھی اللہ تعالیٰ کی سخت ناراضگی ہے فرماتے

[1] مسلم ص ۶۴ ج ۱ (فیاض)

ہیں۔ کہ ہر وہ گناہ بھی کبیرہ ہے۔ جس کے مرتکب پہ حد جاری کرنے کا حکم ہو جیسے چوری۔ زنا۔ قذف، شراب نوشی وغیرہ۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ ہر ایسا گناہ جس پر ایسی خرابی مرتب ہو جو کبیرہ گناہ پر مرتب ہوتی ہے، تو وہ بھی کبیرہ گناہ شمار ہوگا۔ اگرچہ اس کا ذکر قرآن پاک میں موجود نہ ہو۔

کبائر کے تین گروہ

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے ہمعصر اور ان کے شاگرد ہیں۔ بڑے پائے کے عالم، نیک اور صالح آدمی تھے۔ آپ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ سے بیعت تھے جو کہ عالمگیرؒ کے خالہ زاد بھائی اور بہت بڑے ولی اللہ تھے۔ قاضی صاحب نے دس جلدوں پر محیط تفسیر مظہری آپ ہی کے نام سے منسوب کی تھی۔ عربی زبان کی یہ نہایت معتبر تفسیر ہے۔ فارسی زبان میں فقہ کی معتبر کتاب مالا بد منہ بھی آپ ہی کی تصنیف ہے جو کہ درس نظامی میں پڑھائی جاتی ہے۔ آپ زمانے کے بیہقی مشہور تھے۔ جس طرح چوتھی صدی ہجری کے امام بیہقی بڑے محدث ہوئے ہیں، سنن کبریٰ جیسی عظیم کتاب لکھی ہے۔ اسی طرح پانی پتیؒ بھی بہت بڑے محدث اور فقیہہ تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ کبائر کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ کبائر کا پہلا گروہ وہ ہے جس میں فکری خرابی پائی جاتی ہے اور انسان کا عقیدہ فاسد ہو جاتا ہے۔ اس گروہ میں کفر، شرک، نفاق، الحاد اور ارتداد وغیرہ جیسے بڑے گناہ شامل ہیں۔ قرآن پاک یا حضور علیہ السلام کے کسی ثابت شدہ فرمان کو غلط معنی پہنانے والا شخص بھی اسی زمرہ میں آتا ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی اسی قبیل سے ہے جس نے نبوت کا دعویٰ کیا، اور قرآن پاک کے معانی الٹ پلٹ کیے۔ مولوی عبداللہ چکڑالوی نے حدیث کا انکار کیا۔ سرسید اہلحدیث کہلانے کے باوجود الیا بگڑا کہ قرآن حکیم کی غلط تفسیر کی اور بدعقیدگی پھیلائی۔ یہی حال موجودہ زمانے کے پرویز کا ہے نیاز محمد فتح پوری بنیادی طور پر ادیب تھا مگر عقیدہ اس کا بھی فاسد ہوگیا۔

عنایت اللہ مشرقی کی تنظیم خاکسار تو درست تھی۔ وہ مسلمانوں کے عہد رفتہ کو واپس لانا چاہتے تھے۔ مگر عقیدہ صحیح نہیں تھا، سات سو علماء نے اس کی گمراہی کا فتویٰ دیا۔ اس نے تذکرہ لکھا جس میں غلط مسائل بیان کیے، ایمان کو کفر اور کفر کو ایمان کا درجہ دیدیا۔ اس قسم کے تمام لوگ کبیرے گناہوں کے پہلے گروہ سے متعلق ہیں جس میں فکری خرابی پائی جاتی ہے۔

کبائر کا دوسرا گروہ ظلم و تعدی سے تعلق رکھتا ہے۔ کسی کی جان تلف کر دی، کسی کی بے عزتی کی، اُس کے مال کو ناحق ضائع کیا یا اُس پہ قبضہ کر لیا، یہ کبائر کے مرتکبین کا دوسرا گروہ ہے۔ اسی طرح تیسرے گروہ میں وہ کبائر آتے ہیں جن کا تعلق بندے اور خدا دونوں سے ہے۔ اِن جرائم میں قتل نفس، زنا، چوری، شراب نوشی ترک نماز و دیگر فرائض شامل ہیں۔ اِن گناہوں کا مرتکب انسان بیک وقت اُس بندے کا بھی مجرم ہوتا ہے جس کے ساتھ اُس نے زیادتی کی اور اللہ تعالیٰ کا بھی جبکہ اُس نے صریح حکم میں نافرمانی کی۔

اعتقادی کبائر

اس کے علاوہ بعض اعتقادی کبائر بھی ہیں مثلاً کوئی شخص خدا تعالےٰ کی رحمت سے بالکل مایوس ہو جائے۔ اس کو اَلْیَأْسُ مِنَ الرَّحْمَۃِ کہتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا بیان قرآن کریم میں موجود ہے۔

وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ آپ نے اپنے بیٹوں کو فرمایا کہ حضرت یوسف علیہ السلام اور اُس کے بھائی کو تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا کیونکہ اللہ کی رحمت سے کافر ہی مایوس ہوتے ہیں۔ اسی طرح امن کو بھی کفر سے تعبیر کیا گیا ہے کوئی شخص ایسا لاپروا ہو جائے کہ اُسے آخرت کی فکر باقی نہ رہے اور وہ یہ سمجھنے لگ جائے کہ خدا مجھے کوئی سزا نہیں دیگا، وہ جو چاہے کرتا پھرے۔ یہ نظریہ بھی کفر ہے اور اس کا حامل کبیرہ گناہ کا مرتکب ہے۔

بہر حال مفسرین نے کبائر کی بہت سی اقسام گنوائی ہیں حضور علیہ السلام نے ان گناہوں کی بڑی تشریح فرمائی ہے۔ ان سے بچنا ضروری ہے۔ اگر انسان کبائر سے بچتا ہے تو چھوٹی موٹی خطائیں خود بخود معاف ہوتی رہتی ہیں۔ زنا کبیرہ گناہ ہے مگر غیر محرم عورت کی طرف دانستہ نظر اٹھانا صغیرہ گناہ ہے۔ کبیرہ گناہ میں فساد اور خرابی زیادہ واقع ہوتی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ ان کی وجہ سے اخلاق میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی حاصل ہوتی ہے ارتفاقات یعنی لوگوں کے معاشی طور طریقے سب بگڑ جاتے ہیں کبائر میں بہت زیادہ مفسدہ پایا جاتا ہے۔

یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ بعض کبائر مثلاً کفر اور شرک ایسے ہیں کہ اگر زندگی میں توبہ نہیں کرے گا، تو یہ معاف نہیں ہوں گے۔ ان کے علاوہ جو باقی کبائر ہیں، اُن کا قانون یہ ہے کہ اگر توبہ کر لے گا تو معاف ہو جائیں گے اور اگر ان کا مرتکب توبہ نہیں کرتا مگر دل میں ایمان موجود ہے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے وہ چاہے تو اپنی مہربانی سے معاف کر دے یا کسی نبی یا ولی کی سفارش قبول کر کے معافی دے دے۔ البتہ عقیدے کے فساد کے متعلق اُس کا واضح اعلان ہے "اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَكَ بِهٖ وَیَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ یَّشَآءُ" اللہ تعالیٰ شرک جیسے بڑے گناہ کو معاف نہیں کرے گا اس کے علاوہ جس گناہ کو چاہے معاف فرما دے، یہ اسکی مشیت پر موقوف ہے۔

انسانی اعضا کے گناہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ نیک اور صالح لوگ وہ ہیں "اَلَّذِیۡنَ یَجۡتَنِبُوۡنَ کَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَالۡفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ" (سورۃ نجم) یعنی نیک اور صالح لوگ وہ ہیں جو کبیرے گناہوں سے بچتے ہیں مگر لمم (یعنی کچھ آلودگی) لمم کا لفظ حدیث شریف میں بھی آیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا "اِنَّ

اللہ کَتَبَ عَلٰی اِبْنِ اٰدَمَ حَظَّہٗ مِنَ الزِّنَا یعنی اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کے لیے زنا میں سے اس کا حصہ لکھ دیا ہے۔ اور زنا کی بھی مختلف اقسام ہیں۔ فرمایا فَزِنَا العَیْنِ النَّظْر یعنی آنکھ کا زنا یہ ہے کہ وہ غیر محرم کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے۔ مرد ہو یا عورت اجنبی کی طرف نظر اٹھانے کی اجازت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ نور میں فرمایا ہے کہ مومنوں سے کہہ دو یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ وہ اپنی نگاہوں کو نیچے رکھیں اور عورتوں کے متعلق بھی یہی حکم ہے یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِھِنَّ کہ وہ بھی اپنی نظریں پست رکھیں۔ ترمذی شریف کی روایت[1] میں آتا ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا یَا عَلِیُّ لَا تُتْبِعِ النَّظْرَۃَ النَّظْرَۃَ اے علی! پہلی نظر کے بعد دوسری نظر اٹھا کر نہ دیکھو فَاِنَّ لَکَ الْاُوْلٰی وَلَیْسَتْ لَکَ الْاٰخِرَۃَ کیونکہ پہلی نظر تو معاف ہوگی، دوسری معاف نہیں ہوگی۔ پہلی نظر اچانک ہوتی ہے مگر دوسری اختیار اور ارادے سے پڑتی ہے اس لیے اس کی معافی نہیں۔ اس کا مواخذہ ہوگا۔

الغرض! آنکھ کا زنا بری نظر سے دیکھنا ہے اور زبان کا زنا اس ضمن میں گفتگو کرنا ہے۔ نفس انسان کا زنا یہ ہے۔ کہ وہ اس کی تمنا کرتا ہے اور پھر اعضائے مستورہ کے ذریعے یا اس کی تصدیق کر دیتا ہے یا تکذیب اگر زنا سے بچ گیا تو تکذیب ہوگئی ورنہ حقیقی زنا کا مرتکب ہوگیا۔ حالانکہ اللہ نے فرمایا ہے "لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی" زنا کے قریب نہ جاؤ۔ چوری نہ کرو کسی کو ناحق قتل نہ کرو۔ کسی پر بہتان نہ باندھو۔ ان سب گناہوں کی تفصیل اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بیان فرما دی ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے سِبَابُ الْمُؤْمِنِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُہٗ کُفْرٌ یعنی ایک مومن کو گالی دینا نافرمانی اور کبیرہ گناہ ہے اور مسلمان کو ناحق قتل کرنا کفر ہے۔ مسلمان تو ایک دوسرے کی جان کے محافظ ہوتے ہیں۔ البتہ کافر مسلمان کی جان کے درپے

---

[1] ترمذی ص ۔ واحکام القرآن للجصاص ص۳۱۵ ج ۳ و فتح القدیر ص ۲۵/۴ (فیاض)

ہوتے ہیں یہ سب کبائر میں شامل ہیں۔ کل مثال گذر چکی ہے وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ایک دوسرے کا مال ناحق طریقے سے مت کھاؤ۔ چوری، خیانت، سود، رشوت، فواحش، کا ارتکاب اور فرائض نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، قربانی وغیرہ کی عدم ادائیگی سب کبائر میں شامل ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر کبائر سے بچتے رہو گے تو چھوٹے چھوٹے گناہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے خود ہی معاف فرماتے رہیں گے۔

عزت کا مقام

ایسے مصلحین کے متعلق فرمایا وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيمًا ۝ ہم تمہیں عزت کے مقام میں داخل کریں گے یعنی پورے اعزاز کے ساتھ بڑے اعلیٰ مقام میں داخل کریں گے اور وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کا بہشت ہی ہوسکتا ہے۔ دوسرے مقام پر مُحْضَرُوْنَ کا لفظ آیا ہے یعنی تمہاری بڑی آؤ بھگت ہوگی، جو جنت میں پہنچ جائے گا اس کو ابدی فلاح حاصل ہو جائے گی عزت کے اس مقام میں جسمانی اور روحانی ہر قسم کی سہولتیں حاصل ہونگی، جو شخص وہاں پہنچ گیا، اُس پاک خطے کا ممبر بن گیا اس کو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوگئی جس کی تفصیلات قرآن پاک میں موجود ہیں۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے کبائر کا حکم بیان کر دیا ہے کہ یہ بڑے مضر ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے انسان کی سوسائٹی اور روحانیت خراب ہو جاتی ہے۔ خدا کا غضب نازل ہوتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر ان بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہو گے تو ہم چھوٹی چھوٹی خطائیں خود بخود معاف کر دیں گے اور تمہیں عزت کے مقام میں داخل کریں گے۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى
بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ
نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا
مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ
عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۳۳﴾ ع ۵ / ۸ / ۲

ترجمہ: اور اس چیز کی تمنا نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ فضیلت بخشی ہے تم میں سے بعض کو بعض پر۔ مردوں کے لیے اُس چیز میں سے حصّہ ہے جو انہوں نے کمایا اور عورتوں کے لیے حصّہ ہے اُس میں سے جو انہوں نے کمایا اور اللہ تعالیٰ سے اُس کے فضل میں سے مانگو بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے ﴿۳۲﴾ اور ہر ایک کے ترکے کے لیے ہم نے وارث مقرر کیے ہیں اُس مال میں سے جس کو چھوڑا ہے والدین اور قرابت داروں نے اور وہ جن کے ساتھ تمہاری قسمیں پختہ ہوئی ہیں پس اُن کو اُن کا حصّہ دو۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ ہے ﴿۳۳﴾

ربط آیات

سورۃ کی ابتداء سے اللہ تعالیٰ نے انسانی حقوق کا ذکر فرمایا، اس ضمن میں یتیموں کے حقوق کا خصوصی تذکرہ ہے جن کے حقوق اکثر غصب کر لیے جاتے تھے۔ عورتوں

کے حقوق بھی بیان ہو چکے ہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں وراثت کا مسئلہ بڑا الجھا ہوا تھا۔ عورتوں ضعیفوں اور بچوں کو وراثت سے بالکل محروم کر دیا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے وراثت کا مکمل قانون نازل فرما کر تمام حقداروں کو ان کے حصے دلوائے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے سوسائٹی کی طہارت کا قانون دیا برائی اور فحاشی کے سدباب کے لیے تعزیرات نافذ کیں۔ پھر محرمات نکاح کی تفصیلات بیان فرمائیں اور ان محرمات کی حکمتیں بھی واضح کیں مالی قانون نازل فرماتے ہوئے حکم دیا کہ ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے مت کھاؤ حفاظت مال کے بعد حفاظت جان کا قانون بھی دیا اور متنبہ کیا کہ کسی فرد کے لیے جائز نہیں کہ وہ دوسرے کی جان کو ناحق تلف کرے، حتیٰ کہ خود اپنی جان کو مارنے کی بھی اجازت نہیں بلکہ یہ بھی بہت بڑا جرم ہے جس کا مرتکب سخت سزا کا مستحق ہو جاتا ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے صغائر اور کبائر گناہوں کا تذکرہ فرمایا اور واضح کیا کہ اگر تم بڑے گناہوں سے بچتے رہو گے تو چھوٹی چھوٹی خطائیں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور تمہاری نیکیوں کی برکت سے خود بخود معاف کرتا رہیگا۔ اس کے بعد آمدہ دروس میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں اور مردوں سے متعلق بہت سے معاشرتی مسائل بیان فرمائے ہیں اور ان دونوں کے مقامات کا تعین کیا ہے۔

شانِ نزول

آج کی آیت کے شان نزول کے متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ بعض عورتوں بلکہ ام المؤمنین ام سلمہؓ کی طرف یہ بات منسوب ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ مرد ہم سے اجر میں بڑھ جاتے ہیں۔ وہ جہاد میں شریک ہو کر اجر و ثواب کے علاوہ مال غنیمت بھی حاصل کرتے ہیں اس کے علاوہ انہیں وراثت میں بھی عورتوں کی نسبت دگنا حصہ ملتا ہے۔ کاش کہ ہم بھی مرد ہوتیں، تو دنیا اور آخرت میں وافر حصہ پاتیں۔ عورتوں کے اس خیال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اس قسم کے خیالات کے اظہار سے

منع فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس فرد کو جس جنس میں پیدا کیا اُسکی حکمت کے مطابق وہی اُس کے لیے بہتر ہے۔

تفریقِ جنس

ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَتَمَنَّوْا اور نہ تمنا کرو، نہ خواہش کرو مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ اس چیز کی جس کے ساتھ اللہ تعالےٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مرد کو عورت پر جو فضیلت بخشی ہے اور جس کا ذکر آگے تفصیلاً آرہا ہے، اُس کے متعلق ایسی خواہش کا اظہار نہ کرو کہ عورتیں بھی مرد ہوتیں۔ بلکہ یہ تفریقِ جنس اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے پیدا کی ہے۔ اور اس میں انسان کا اپنا کوئی اختیار نہیں۔ سورۃ کی ابتدا میں یہ اصول بیان کیا جاچکا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام نسل انسانی کو ایک جان سے پیدا کیا اور پھر اُس سے اُس کا جوڑا پیدا کیا "وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً" اور پھر اُس جوڑے سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔ کسی کو مرد بنا دینا اور کسی کو عورت پیدا کرنا یہ اللہ تعالیٰ کے کلی اختیار میں ہے۔ سورۃ شوریٰ میں فرمایا يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ "اللہ تعالیٰ جسے چاہے بیٹیاں دے اور جسے چاہتا ہے بیٹے عطا کرتا ہے۔ یہ چیز اس کی کمال حکمت پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کو قوی الجسم بنایا ہے۔ لہٰذا مشقت کے کام منجملہ جہاد وغیرہ اُس کے فرائض میں شامل ہیں۔ اسی طرح وراثت میں اللہ نے مرد کو دُگنا حصہ دیا ہے "لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ" قانون شہادت بھی سورۃ بقرہ میں بیان ہو چکا ہے کہ ایک مرد کی گواہی دو عورتوں کے برابر ہے اگر دو مرد گواہ میسر نہ ہوں "فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ" تو پھر ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت ضروری ہے۔ گویا دو عورتیں ایک مرد کے برابر ٹھہریں۔ یہ تفریق اللہ تعالیٰ نے مرد و زن کی استعداد اور دائرہ کار کے مطابق متعین کی ہے۔ لہٰذا اسمیں کسی کو کلام کرنیکی گنجائش نہیں۔ یہ غیر اختیاری فضیلت ہے اس کی تمنا

نہیں کرنی چاہئیے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ العیاذ باللہ عورتیں ذلیل یا حقیر ہیں۔

میدانِ عمل

البتہ جو چیزیں انسان کے اپنے اختیار میں ہیں مدار فوز و فلاح انہی پر ہے۔ اس معاملہ میں مرد و زن برابر ہیں۔ ہر کوئی اپنے اختیار کے مطابق زیادہ سے زیادہ محنت کر کے فضیلت حاصل کر سکتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ نیکی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لو۔ اس میں مرد اور عورت کی کوئی تفریق نہیں۔ ہر کوئی زیادہ سے زیادہ نیکی حاصل کر سکتا ہے اور نجات کا مدار اسی چیز پر ہے۔ اس آیت میں یہی بات بیان کی گئی ہے لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا مردوں کے لیے اُس چیز میں حصہ ہے جو انہوں نے کمایا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ اور عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جو انہوں نے کمایا۔ گویا اس معاملہ میں عورت اور مرد یکساں ہیں۔ جو کوئی جتنی زیادہ نیکی کرے گا اُسی کے مطابق اُسے فضیلت اور اجر و ثواب حاصل ہوگا۔ اسی مضمون کو دوسرے مقام پر اس طرح فرمایا وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا یعنی ہر مرد و زن کو اپنے اعمال کی نسبت سے درجہ حاصل ہوگا۔ لہٰذا اعمال کا میدان مرد اور عورت ہر ایک کے لیے کھلا ہے۔ جو اس میدان میں جتنا زیادہ عمل کرے گا اتنا ہی خدا تعالیٰ کے ہاں برگزیدہ ہوگا۔

دائرہ کار

اللہ تعالیٰ نے مرد و زن کے لیے علیحدہ علیحدہ دائرہ کار مقرر فرمایا ہے اور اسی کے مطابق اُس سے باز پرس ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کو فطرتاً قوی الجسم بنایا ہے تاکہ مشقت کے کام انجام دے سکے مرد یہ کام اپنی ودیعت شدہ طبیعت کے مطابق کرتا ہے۔ دن بھر کی محنت، مزدوری کھیتی باڑی، جنگ و جدال وغیرہ مرد کے ذمہ ہیں۔ برخلاف اس کے عورت صنفِ نازک ہے۔ وہ محنت و مشقت کے کام انجام نہیں دے سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کی جسمانی ساخت ایسی بنائی ہے کہ وہ نسبتاً کم محنت طلب

کام ہی کر سکتی ہے اس کے علاوہ اللہ نے اُسے بچوں کی پیدائش کا ذریعہ بنایا ہے اور پھر بچوں کی محبت، اُن کی دیکھ بھال، پرورش اور جذبہ خدمت عورت کی فطرت میں داخل کر دیا ہے۔ لہذا وہ یہ امور انجام دے کر اپنی فطرت کے تقاضے پورے کرتی ہے اور اس میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتی۔ اس طرح گویا اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے لیے علیحدہ علیحدہ دائرہ کار متعین کر دیا ہے جس کے اندر رہ کر وہ اپنی زندگی گذارتے ہیں۔ اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر فضیلت بخشی ہے۔

موجودہ زمانے میں اللہ تعالیٰ کی اس تقسیم کار کے برخلاف عورتوں اور مردوں کو برابری کی سطح پر لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مردوں کے میدانِ عمل میں عورتوں کو گھسیٹا جا رہا ہے اور یہ عام پراپیگنڈہ ہو رہا ہے کہ مرد و زن ایک ہی گاڑی کے دو برابر پہیئے ہیں لہذا انہیں ہر معاملہ میں برابری حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ آج عورت کو دفتروں، کارخانوں، ہسپتالوں اور فوج میں لایا جا رہا ہے۔ یہی چیز عورت کی فطرت کے خلاف ہے: عورتیں خود بھی مردوں کے شانہ بشانہ چلنے اور دوش بدوش کام کرنے کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ جس کی وجہ سے طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ اگر اضطراری حالت میں عورتوں کو بعض کام تفویض کر دیے جائیں تو روا ہے وگرنہ عام حالات میں اُن کا مردوں کے ساتھ کھلے عام میل ملاپ معاشرتی برائیوں کو جنم دیتا ہے۔

عورت کو گھر سے باہر فرائض انجام دینے میں بعض مالی نقصانات بھی ہیں۔ کسی کارخانے یا دفتر میں ملازمت کی صورت میں اُسے حمل اور زچگی کے دوران رخصت دینا پڑے گی اور اس کے ساتھ تنخواہ اور دیگر واجبات بھی ادا کرنے ہوں گے۔ اس طرح عورت ہر بار تین چار ماہ کے لیے معطل ہو کر رہ جائیگی جب کہ اُسکی تنخواہ وغیرہ کا بار متعلقہ ادارے کے سر پر موجود

رہے گا اور اس طرح عورت کی ملازمت مرد کی نسبت مہنگی پڑیگی۔ بہرحال فطرت نے مرد و زن کے لیے دائرہ کار مقرر کیا ہے۔ اُس کے اندر رہ کر ہی چین وسکون کی زندگی بسر کی جاسکتی ہے۔ یورپی ممالک نے عورت کی مساوات کا سب سے پہلے تجربہ کیا ہے چنانچہ وہاں کے بڑے بڑے مدبّر اور فلاسفر اسی نتیجہ پہ پہنچے ہیں کہ اس نظام میں بہت زیادہ خرابیاں پائی جاتی ہیں۔

کبھی وہ زمانہ تھا جب علیسائیت اپنے غلط تاثر کی بنا پر عورت کو انسان ہی نہیں سمجھتی تھی اور اب یہ حالت ہے کہ عورت کو مردوں سے بھی آگے بڑھا دیا ہے مردوں کے تمام اُمور عورتوں کے سپرد کر دیے گئے ہیں۔ اس کے اثرات اخلاق نسل اور معاشرت پر پڑ رہے ہیں جسکی وجہ سے ہر جگہ خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ غیر معمولی (ABNORMAL) حالات میں تو ایسا ہو سکتا ہے۔ ناگزیر حالات میں حضور علیہ السلام عورتوں کو جنگ میں بھی ساتھ لے جاتے تھے مگر معمولی (NORMAL) حالات میں عورتوں کے متعلق حکم یہی ہے "وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ" کہ وہ اپنے گھروں میں رہ کر امور خانہ داری انجام دیں اور زمانہ جاہلیت کی طرح اظہار زینت نہ کریں۔ اگر مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کی کوشش کریگی تو یہ خلاف فطرت ہوگا اور غیر فطری امور کو جنم دیگا۔

فضل کی طلب

فرمایا وَاسْأَلُوا اللَّهَ مِن فَضْلِهِ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے اُس کا فضل طلب کرتے رہنا چاہیئے۔ کہ وہ نیک کاموں کی توفیق عطا فرمائے اور جو اچھے کام انجام دیے ہیں اُن کے ثمرات بڑھا دے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ" اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے مخصوص کر لیتا ہے۔ اس کی رحمت بڑی وسیع ہے۔ "وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ" اور اللہ تعالیٰ کا فضل بڑا عظیم ہے لہٰذا اُس سے اُس کا فضل طلب کرتے رہنا چاہیئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نہ مانگنے سے ناراض ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے مَن لَّمْ يَسْأَلِ اللَّهَ

يَغۡضَبُ عَلَيۡهِ انسان کو اپنی عاجزی پر ہمیشہ نظر رکھنی چاہیئے اور اس کے عجز و انکسار کا تقاضا یہ ہے۔ کہ بندہ ہر وقت اپنے رب کے فضل کا طلبگار رہے

فرمایا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيۡمًا بیشک اللہ تعالےٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ اُس نے مرد کو مرد اور عورت کو عورت بنایا۔ وہ اُن دلوں کی صلاحیتوں کو بھی جانتا ہے اور اُن کی استعداد بھی اُس کے علم میں ہے۔ اُس مالک الملک نے مرد اور عورت کے لیے علیحدہ علیحدہ دائرہ ہائے کار مقرر کر دیے ہیں، انسانوں کا فرض ہے کہ اپنے اپنے دائرہ کار میں رہ کر زندگی بسر کریں اور اسی دائرہ میں محنت و لگن کے ساتھ کمال حاصل کریں۔ نیک اعمال میں ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اور ایک دوسرے کے دائرہ کار میں مداخلت سے باز رہیں جو کہ فطرتِ انسانی کے خلاف ہے۔

موالات کا قانون

وراثت کے مفصل قوانین اسی سورۃ کے ابتدائی حصہ میں بیان ہو چکے ہیں۔ جاہلیت کے زمانہ میں یہ ایک رسم تھی۔ کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے ساتھ دوستی یا بھائی چارہ کر لیتا تھا تو وہ آپس میں نفع نقصان میں مشترک سمجھے جاتے تھے ایک شخص کے مرنے پہ دوسرا آدمی اُس کی وراثت کا بھی حقدار ہوتا تھا۔ ابتدائے اسلام کے زمانہ میں اس رواج کو اسلام نے بھی روا رکھا چنانچہ ہجرت مدینہ کے بعد حضور علیہ السلام نے ایک ایک مہاجر اور ایک ایک انصاری کو آپس میں رشتہ اخوت میں منسلک کر دیا۔ چنانچہ یہ بھائی بھائی ایک دوسرے کی وراثت میں بھی حصّے دار ہوتے تھے۔ اس کے بعد جب اسلام کو تقویت حاصل ہو گئی اور مسلمانوں کی مشکلات کم ہو گئیں تو یہ قانون اٹھا دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے سورۃ احزاب کی یہ آیت نازل فرمائی "وَاُولُوا الۡاَرۡحَامِ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلٰى بِبَعۡضٍ فِىۡ كِتٰبِ اللّٰهِ" یعنی رشتہ دار اور قرابت دار ہی وراثت کے حقدار ہیں۔ چنانچہ پہلا سلسلہ

ختم کر دیا گیا۔

ولاء کی ایک یہ صورت بھی اسلام میں روا رکھی گئی۔ اگر کوئی شخص اپنے عزیز و اقارب کو دُور دراز علاقے میں چھوڑ کر مسلمانوں کے پاس آجاتا تھا اور اسلام قبول کر لیتا تھا۔ تو جس شخص کے ہاتھ پہ وہ مسلمان ہوتا وہ آدمی اُس کا بھائی بند بن جاتا۔ چونکہ یہ وراثت کا عام قانون ہے لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم یعنی مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں بنتا، لہٰذا مذکورہ بالا بھائی چارے میں شامل دو مسلمان ایک دوسرے کی وراثت کے حقدار ہوتے تھے۔ یہ قانون اب بھی جاری ہے۔ کہ اگر کوئی ایسا شخص موجود ہو جس کا کوئی مسلمان رشتہ دار موجود نہ ہو تو اُس کی وراثت کا مال امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اُس شخص کو جائیگا جس کے ہاتھ پہ وہ مسلمان ہو کر اُس کا بھائی بن گیا۔ البتہ امام شافعیؒ کے نزدیک جس شخص کا کوئی حقیقی مسلمان وارث موجود نہ ہو اُس کا ترکہ بیت المال میں جمع ہو گا۔

تقرر حصص وراثت

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ اور ہر شخص کے لیے ہم نے وارث مقرر کیے ہیں مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ اُس ترکے کے لیے جو والدین اور قرابتداروں نے چھوڑا ہے جیسا کہ وراثت کے قانون میں بیان ہو چکا ہے ورثا میں سے پہلا نمبر ذوی الفروض کا ہے۔ اس سے مراد وہ رشتہ دار ہیں جن کے حصے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں مقرر فرما دیے ہیں۔ دوسرے نمبر پہ عصبات یعنی وہ قرابتدار ہیں جن کے حصے تو مقرر نہیں، مگر ذوی الفروض سے بچ جانے والا مال اِن کو مل جاتا ہے۔ اور پھر تیسرے نمبر پہ ذوی الارحام ہیں جو دور کے رشتہ دار ہوتے ہیں اگر مال پہلے دو قسم کے عزیزوں سے بچ جائے یعنی وہ دونوں قسم کے وارث موجود نہ ہوں تو تیسرے نمبر والوں کو مل جاتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ ہم نے وارث مقرر کر دیے ہیں اس مال کے لیے جو والدین یا رشتہ دار

چھوڑ کر فوت ہو جائیں۔

وصیت کا قانون

فرمایا وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ جن کے ساتھ تمہاری قسمیں پختہ ہو چکی ہیں، یعنی موالات اور بھائی چارے کا عہد و پیمان ہو چکا ہے فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ انہیں اُن کا حصہ دے دو۔ مطلب یہ ہے۔ کہ اب وراثت میں تو اُن کا حصہ نہیں ہے، البتہ وصیت کے طور پر انکی حوصلہ افزائی کر دو۔ وراثت کا یہ قانون ہے۔ کہ کوئی شخص کسی غیر وارث کے لیے کل مال کے زیادہ سے زیادہ تیسرے حصے کی وصیت کر سکتا ہے۔ اب اگر دو شخصوں کے درمیان بھائی بندی کا پختہ عہد ہو چکا ہے۔ تو وہ ایک دوسرے کے لیے کچھ مال کی وصیت کر سکتے ہیں کہ مرنے کے بعد دوسرے کو کل ترکہ سے اتنا حصہ ادا کر دیا جائے۔ اور ایسا کرنا بالکل جائز ہو گا، کیونکہ وراثت کی تقسیم قرضہ (اگر کوئی ہو) کی ادائیگی اور وصیت (اگر کوئی ہو) کو پورا کرنے کے بعد ہوتی ہے۔

فرمایا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگران اور محافظ ہے۔ تمام چیزیں اس کے سامنے ہیں اس لیے وہ سب پر گواہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون کس استعداد کا حامل ہے اور کس کو کس مقام پر رکھنا ہے لہٰذا وہ اپنی حکمت اور مشیت کے مطابق ہر ایک کا دائرہ کار مقرر کرتا ہے۔ اس لیے اہل ایمان کا فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کریں اور غیر فطری امور سے گریز کریں۔ حتی الامکان نیکی کریں تاکہ انہیں فلاح حاصل ہو سکے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾

ترجمہ :- مرد نگران ہیں عورتوں پر اس واسطے کہ اللہ نے فضیلت بخشی ہے اُن میں سے بعض (مردوں) کو بعض (عورتوں) پر، اور اس واسطے کہ وہ اپنے مالوں میں سے خرچ کرتے ہیں پس نیک عورتیں اطاعت کرنیوالی ہوتی ہیں اور پس پشت حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں اس چیز کی کہ اللہ نے اس کی حفاظت کا حکم دیا ہے (مال و ابرو) اور وہ عورتیں کہ تم اُن کی نافرمانی کا خوف کھاتے ہو اُن کو نصیحت کرو اور جُدا کردو اُن کو خواب گاہوں میں اور اُن کو مارو پس اگر وہ تمہاری اطاعت کریں پس نہ تلاش کرو اُن پر کوئی راستہ بیشک اللہ تعالیٰ بلند اور بڑا ہے ﴿۳۴﴾

ربط آیات

گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو منع فرمایا تھا۔ کہ وہ اس قسم کی خواہش نہ کریں کہ وہ مرد ہوتیں تو وہ بھی بڑے بڑے کام انجام دیتیں، فرمایا ایسی تمنّا کرنا غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بعض انسانوں کو بعض دوسروں پر فطری طور پر فضیلت بخشی ہے۔

یہ اُس مالک الملک کی حکمت اور منشاء کے مطابق ہے۔ لہٰذا کسی انسان کے لیے لائق نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کو توڑ کر دوسری طرف جانے کی کوشش کرے۔ یہ اللہ کے ہاں ناپسندیدہ فعل ہے۔ اگر کوئی ایسا کرے گا تو نقصان اٹھائیگا۔ اب آج کے درس کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے مردوں کی فضیلت کی وجوہات اور بعض دوسرے معاشرتی مسائل بیان فرمائے ہیں۔

مرد بطور حاکم

فرمایا اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ مرد عورتوں پہ حاکم ہیں قوام اور قیام کا معنیٰ نگران، محافظ یا کسی کام کو انجام دینے والے کا ہوتا ہے بعض مفسرین نے جن میں مولانا شیخ الہندؒ بھی ہیں اس لفظ کا ترجمہ حاکم کیا ہے دراصل حاکم بھی نگران اور محافظ ہی ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہُوا کہ مرد عورتوں پر نگران یا محافظ ہیں۔ یا اُن کے حاکم ہیں۔ مردوں کو یہ فضیلت خود اللہ تعالےٰ نے عطا فرمائی ہے۔ جہاں انسانی سوسائٹی ہوگی وہاں رئیس اور مرؤس کا معاملہ تو ضرور ہوگا، ایک حاکم ہوگا، دوسرا محکوم، ایک نگران ہوگا۔ دوسرا ماتحت، تو ان میں سے اعلیٰ حیثیت اللہ تعالیٰ نے مرد کو عطا کی ہے گویا مرد حاکم ہے اور عورت محکوم۔ سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں دونوں کے حقوق کا تذکرہ کیا ہے وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ یعنی جس طرح مردوں کے حقوق ہیں اُسی طرح عورتوں کے بھی حقوق ہیں۔ مگر مردوں کو عورتوں پہ ایک خاص فضیلت اور درجہ حاصل ہے۔

فطری فضیلت

مردوں کو عورتوں پر فضیلت عطا کرنے کی اللہ تعالیٰ نے دو وجوہات بیان فرمائی ہیں۔ ایک وجہ فطری ہے اور دوسری اختیاری۔ تو فرمایا کہ مردوں کو عورتوں کا نگران بنایا گیا ہے، اس وجہ سے بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ کہ اللہ تعالیٰ نے اُن میں سے بعض یعنی

مردوں کو بعض یعنی عورتوں پر فضیلت بخشی ہے۔ یہ فطری برتری کئی وجوہ سے ہے۔ مثلاً عقل کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے مرد کو وافر حصہ عطا فرمایا ہے۔ اسی طرح دین کے معاملہ میں بھی مردوں کو زیادہ سمجھ عطا کی ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلہ میں ناقصات عقل اور ناقصات دین ہیں۔ ایک سمجھدار عورت نے حضور نبی کریم علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا۔ حضور! ہماری عقلوں میں نقصان کی کیا وجہ ہے فرمایا، عورتوں میں نسیان کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے۔ دیکھتی نہیں، اللہ نے دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر ٹھرائی ہے۔ کیا یہ عقل کا نقصان نہیں؟ پھر اس عورت نے عرض کیا حضور! ہمارے دین میں نقصان کی کیا وجہ ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ دیکھو عورت ہر ماہ کتنے دن بیٹھی رہتی ہے نہ وہ نماز پڑھ سکتی ہے، نہ روزہ رکھ سکتی ہے، نہ قرآنِ پاک کو چھو سکتی ہے اگرچہ یہ چیز اس کے لیے غیر اختیاری ہے مگر دین کا نقصان تو ہے۔ اسی طرح زچگی کے دوران بھی عورت نماز اور روزہ سے محروم رہ جاتی ہے۔ مردوں کے مقابلے میں ان کا یہ نقصان ہی تو ہے۔

شرعی گواہی کے معاملہ میں جہاں بعض معاملات میں عورتوں کا نصاب ایک مرد کے مقابلے میں دو سے رکھا گیا ہے وہاں حدود اور قصاص کے معاملہ میں عورت کی گواہی قابلِ قبول ہی نہیں ـــــ عاقل اور بالغ مرد مسلمان گواہی دیں گے تو حد جاری ہوگی، ورنہ نہیں۔ اس کے علاوہ جماعت اور جمعہ کا قیام عورتوں کے ذمہ نہیں ہے۔ یہ صرف مرد ہی قائم کر سکتے ہیں۔ اس سورۃ کی ابتداء میں گزر چکا ہے۔ کہ مرد بیک وقت چار عورتوں سے شادی کر سکتا ہے مگر کوئی عورت ایک وقت میں ایک سے زیادہ نکاح نہیں کر سکتی۔ اس معاملہ میں بھی مردوں کو قدرتی فضیلت حاصل ہے۔ طلاق کا حق بھی مرد کو ہی ہے، عورت کو یہ حق اللہ نے نہیں

دیا۔ سورۃ بقرہ میں گزر چکا ہے "بِیَدِہٖ عُقْدَۃُ النِّکَاحِ" نکاح کی گرہ کھولنا مرد کے ہاتھ میں ہے۔ عورت کو طلاق کا حق تفویض نہیں کیا گیا۔

وراثت کے حصص کے متعلق اسی سورۃ کی ابتداء میں گزر چکا ہے۔ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ" ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ مردوں کو اس لحاظ سے بھی فضیلت حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے منصب نبوت مردوں کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے۔ سورۃ انبیاء میں موجود ہے۔ "وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْھِمْ" اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام سے پہلے جتنے بھی نبی مبعوث فرمائے سب مرد تھے کسی عورت کو کبھی نبی نہیں بنایا گیا۔ اسی طرح ولایت، تولیت یا سرپرستی بھی مردوں تک محدود ہے، عورت کو تولیت نہیں ملتی۔ جب تک کسی کا باپ، بیٹا یا بھائی موجود ہے، وہی ولی ہوں گے۔ ہاں! اگر مردوں میں سے کوئی بھی باقی نہ ہو تو تولیت عورت کی طرف منتقل ہوتی ہے۔ اس معاملہ میں بھی مردوں کو فوقیت حاصل ہے۔

اس کے علاوہ تمام اعمال شاقہ یا اجتماعی امور اللہ تعالیٰ نے مردوں کے سپرد کیے ہیں۔ نظام حکومت و خلافت بڑا محنت طلب اور ذمہ داری کا کام ہے۔ یہ عورتوں کے بس کا روگ نہیں۔ جب ایرانیوں نے کسریٰ کی بیٹی بوران کو بادشاہ بنا دیا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا لَنْ یُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَھُمْ امْرَاَۃً وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جس نے اپنے اجتماعی معاملات عورت کے ہاتھ میں دے دیے۔ کوئی عورت زبردستی حاکم بن جائے تو علیحدہ بات ہے ورنہ وہ اس کے لائق نہیں ہے۔ بعض فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ عورت قاضی بھی نہیں بن سکتی کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کسی مقدمہ کا فیصلہ کرتے وقت اُسکی حالت درست نہ ہو اور وہ غلطی کر جائے۔ تاہم امام ابوحنیفہؒ اور ابن حزمؒ وغیرہ کہتے ہیں

کہ عورت بعض معاملات میں قاضی بن سکتی ہے۔ یہ تمام باتیں قدرتی (NATURAL) ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کے مقابلہ میں مرد کو برتر بنایا ہے

اختیاری فضیلت

اب مرد کی فوقیت کی دوسری اور اختیاری فضیلت اس وجہ سے ہے وَبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ کہ مرد عورتوں پہ اپنا مال خرچ کرتے ہیں، عورت کا نان نفقہ، رہائش، لباس وغیرہ مرد کے ذمہ ہے اور وہ اپنی حیثیت کے مطابق ضروریات زندگی مہیا کرنے کا پابند ہے جیسے فرمایا عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ یعنی خوشحال آدمی اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے اور تنگ دست اپنی مالی حالت کے مطابق۔ اس کے علاوہ نکاح کا مہر بھی مرد کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ مرد کماتا ہے اور عورت پہ خرچ کرتا ہے، لہٰذا قدرتی طور پہ اُسے برتری حاصل ہو جاتی ہے عام حالات میں عورت کے ذمہ لازم نہیں کہ وہ محنت مزدوری کرے، البتہ مرد کے ساتھ بعض معاملات میں تعاون کر سکتی ہے۔ ہاں اگر کوئی غیر معمولی حالات پیدا ہو جائیں، تو اضطراری صورت میں بعض ناجائز چیزیں بھی مباح ہو جاتی ہیں وگرنہ نارمل حالات میں عورت گھر کی چار دیواری میں رہ کر گھر کا نظم و نسق چلانے اور بچوں کی پرورش کی ذمہ دار ہے۔

نیک عورت کے اوصاف

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اچھی اور نیک عورتوں کی تعریف بھی فرمائی ہے فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ نیک عورتیں وہ ہیں جو اطاعت گزار ہیں۔ اطاعت سے مراد پہلے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت، پھر اپنے خاوند کی اطاعت ہے۔ مسند امام احمدؒ کی روایت میں موجود ہے جسے امام اصفہانیؒ نے بھی نقل کیا ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے اَلْمَرْأَةُ اِذَا صَلَّتْ خَمْسَهَا وَصَامَتْ شَهْرَهَا وَاَحْصَنَتْ فَرْجَهَا وَاَطَاعَتْ بَعْلَهَا فَلْتَدْخُلْ مِنْ اَیِّ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ شَاءَتْ جو عورت پانچ نمازیں پڑھے۔ رمضان کے روزے رکھے

اپنے ناموس کی حفاظت کرے ـــــــــــــــــــ اور اپنے خاوند کی اطاعت کرے، فرمایا جنت کے آٹھ دروازوں میں سے جس میں چاہے داخل ہو جائے خاوند کی اطاعت کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا لَوْ كُنْتُ اٰمِرُ اَحَدًا اَنْ يَّسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْءَةَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا اگر میں کسی مخلوق کو کسی مخلوق کے لیے سجدے کا حکم دیتا، تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ مگر سجدہ خدا تعالےٰ کے سوا کسی کو روا نہیں۔ عورت کے ذمہ خاوند کی اطاعت ہی بڑی ذمہ داری اور ایک اچھی صفت ہے۔

فرمایا اچھی عورت کی دوسری صفت یہ ہے حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ خاوند کی غیر موجودگی میں اس کے مال اور اپنی ناموس کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں۔ خاوند کا مال فضول اڑا دینا بری صفت ہے بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ اس واسطے کہ اللہ نے حفاظت کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس لحاظ سے عورت راعی اور محافظ بن جاتی ہے۔ خاوند کی خون پسینے کی کمائی کفایت شعاری کے ساتھ جائز امور پر صرف کرتی ہے۔ یہ تھے نیک عورتوں کے اوصاف۔

نافرمان عورتیں

آگے نافرمان عورتوں کے متعلق فرمایا وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ اور وہ عورتیں جنکی نافرمانی کا تمہیں خوف ہے۔ یعنی اگر تمہاری عورتیں اطاعت سے گریز کرتی ہیں اور اپنی من مانی کرتی ہیں تو ان کی اصلاح کے متعلق فرمایا فَعِظُوْهُنَّ ایسی عورتوں کو نصیحت کرو، زبانی تنبیہ یا فہمائش کرو۔ اسے سمجھانے کی کوشش کرو۔ اگر سلیم الفطرت ہوگی تو راہِ راست پر آجائیگی۔ اگر نہ سمجھے وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ تو انہیں خواب گاہوں سے علیحدہ کردو۔ اپنے ساتھ مت سونے دو۔ ہوسکتا ہے۔ کہ ایسا کرنے سے ہی عورت سمجھ جائے کہ خاوند ناراض ہے اسے اپنی اصلاح کرنی چاہیئے اگر پھر بھی نافرمانی سے باز نہیں آتی ہے تو تیسری صورت یہ ہے۔

وَاضْرِبُوْهُنَّ انہیں مارو۔ معمولی دھپڑ وغیرہ مارو، یہ سزا ادب اور تنبیہ کے لیئے ہے، نہ کہ انتقام کے طور پہ۔ لہذا بہت زیادہ نہ مارو، ہو سکتا ہے کہ عورت اس سرزنش سے اطاعت پہ آمادہ ہو جائے۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ بعض لوگوں نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں اپنی عورتوں کے متعلق شکایت کی کہ وہ ہماری اطاعت نہیں کرتیں۔ آپ نے فرمایا، اُن کی پٹائی کرو۔ اس اجازت پہ لوگوں نے نافرمان عورتوں کو بے تحاشا مارنا شروع کر دیا، سرزنش کی حدود کو قائم نہ رکھ سکے۔ اسپر عورتوں نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں شکایت کی کہ اُن کے خاوند انہیں بہت زیادہ سزا دیتے ہیں۔ حدیث شریف کے الفاظ ہیں۔ لَقَدْ طَافَ بِاٰلِ مُحَمَّدٍ سَبْعُوْنَ اِمْرَءَةً یعنی ہمارے گھر میں ستر عورتوں نے آکر شکایت کی ہے اس پہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، یہ درست نہیں ہے۔ مارنے کی اجازت محض تنبیہ کے لیئے دی گئی تھی۔ بہت زیادہ مارنا مقصود نہیں تھا۔ حضور علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا کہ اگر مارنے کی نوبت ہی آجائے وَاضْرِبُوْهُنَّ غَیْرَ مُبَرِّحٍ تو ایسی مار نہ مارو کہ کوئی ہڈی پسلی ٹوٹ جائے۔ یہ زیادتی ہے۔

حجۃ الوداع والی حدیث میں عورتوں کے متعلق آتا ہے۔ کہ دیکھو! تمہارے اور تمہاری عورتوں کے ایک دوسرے پہ حق ہیں۔ اگر وہ کوئی ایسا کام کریں۔ تو انہیں معمولی جسمانی سزا دو۔ عورتوں سے بہتر سلوک کرو۔ کہ وہ تمہارے پاس قیدیوں کی مانند ہیں۔ تمہارے ماتحت ہیں۔ ان کو کھلاؤ پلاؤ، کپڑا پہناؤ، اُن کی رہائش کا بندوبست کرو۔ اگر وہ نافرمانی کریں۔ تو معمولی ضرب لگاؤ، چہرے پر مت مارو، اتنا نہ مارو کہ زخمی کر دو یا کوئی عضو بیکار ہو جائے۔

فرمایا۔ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ پس اگر وہ تمہاری اطاعت پر آمادہ ہو

جائیں فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْھِنَّ سَبِیْلًا تو اُن پہ کوئی الزام تراشی نہ کرو، نہ ان کے لیے کوئی راستہ یا حیلہ بہانہ تلاش کرو۔ جب عورت نافرمانی سے باز آگئی، مقصد حاصل ہو گیا، تو اب کسی قسم کی زیادتی نہیں ہونی چاہیئے۔ یاد رکھو! اللہ نے تمہیں برتری عطا کی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمہیں ان پر ہر جائز ناجائز کا اختیار حاصل ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود کے اندر رہ کر معاملات کو طے کرو۔ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیْرًا بیشک اللہ تعالےٰ بلند اور بڑا ہے۔ اُس کے احکام کو مدنظر رکھو۔ اگر خلاف ورزی ہوئی تو پھر اُس کی گرفت بھی بڑی سخت ہے۔ اس طرح گویا اللہ تعالیٰ نے مردوں کو بھی تنبیہ کر دی کہ وہ بھی حدود کے اندر رہیں۔

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾

ترجمہ : اور اگر تم کو خوف ہو اُن دونوں کی آپس میں مخالفت کا ، پس کھڑا کرو ایک فیصلہ کرنے والا مرد کے خاندان سے اور ایک فیصلہ کرنے والا عورت کے خاندان سے۔ اگر یہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ اُن کے درمیان توفیق دے گا بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے ﴿۳۵﴾

ربط آیات

گزشتہ درس میں عورتوں پر مردوں کی فضیلت کا ذکر تھا۔ اور مردوں کو عورتوں کا نگران، محافظ اور حاکم بنائے جانے کا ذکر تھا۔ اللہ تعالےٰ نے اس فضیلت کی اور وجوہات بھی بیان فرمائیں۔ پہلی وجہ تو فطری ہے۔ کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت اور ارادے سے مرد کو مرد اور عورت کو عورت بنا دیا، اور مرد کے قویٰ میں وہ استعداد اور اہلیت رکھ دی جس کی وجہ سے اُسے عورت پر برتری حاصل ہوئی، اور دوسری اختیاری ہے کہ مرد محنت مشقت کر کے روزی کماتا ہے اور پھر عورت پر خرچ کرتا ہے، اس لیے بھی اس کو فوقیت حاصل ہے۔ پھر فرمایا نیک عورتیں وہ ہوتی ہیں جو اطاعت گذار ہوں اور مرد کی غیر حاضری میں اُس کے مال اور اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کرتی ہیں۔ البتہ جن عورتوں کی طرف سے نافرمانی کا خوف ہو، فرمایا کہ اُنکی اصلاح کا طریق کار یہ ہے۔ کہ سب سے پہلے انہیں نصیحت کرو کہ درست ہو جائیں۔ اگر حالات درست نہ ہوں تو فرمایا پھر انہیں اپنی خواب گاہوں سے علیحدہ کر دو۔ ہو سکتا ہے کہ سمجھ جائیں کہ تم اُن سے ناراض ہو۔ فرمایا اگر اس کے باوجود

اصلاح نہ ہو تو انہیں مارو یعنی جسمانی سزا دو۔ اور یہ سزا بھی معمولی درجے کی ہو جس کا مقصد تادیب ہو۔ یہ سزا انتقامی کاروائی کی شکل نہ اختیار کر جائے۔ پھر یہ بھی کہ یہ تینوں طریقے یکے بعد دیگرے استعمال کرو، بیک وقت نہیں۔ اِس کے بعد اگر وہ اطاعت پر آمادہ ہو جائیں تو پھر اُن کے ساتھ زیادتی کا کوئی راستہ تلاش نہ کرو، بلکہ اب خوش اسلوبی سے گذر اوقات کرو۔

مصالحتی کمیٹی

اگر مذکورہ تینوں طریقے ناکام ہو جائیں اور میاں بیوی میں اصلاح نہ ہو سکے تو پھر وہ طریقہ اختیار کرو جو آج کے درس کا موضوع ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ غلطی ہمیشہ عورت کی ہو، بعض اوقات مرد کی طرف سے بھی زیادتی کا امکان ہو سکتا ہے۔ لہذا فرمایا فَاِنْ خِفْتُمْ اگر تمہیں خوف ہو، شِقَاقَ بَيْنِهِمَا دونوں (بیوی خاوند) کے درمیان اختلاف کا، تو پھر وہ کاروائی عمل میں لاؤ جس کا حکم دیا جا رہا ہے۔ یہاں پر خِفْتُمْ کے مخاطبین تین قسم کے لوگ ہیں۔ پہلے نمبر پر مرد اور عورت کے سرپرست، دوسرے نمبر پر جماعت المسلمین اور پھر حاکم وقت جب میاں بیوی میں تنازعہ طول پکڑ جائے تو عورت اور مرد کے سرپرستوں کا فرض ہے کہ وہ اس حکم پر عمل کریں۔ اگر سرپرست موجود نہیں ہیں تو عامۃ المسلمین یعنی گلی، محلے یا گاؤں کے لوگ آگے آئیں اور اگر ایسی بھی صورت نہ ہو تو پھر عمال حکومت کا فرض ہے۔ کہ میاں بیوی میں صلح صفائی کے لیے کاروائی کریں۔

فرمایا میاں بیوی میں ناچاقی کو ختم کرنے کے گذشتہ درس میں مذکورہ تینوں حربے یعنی نصیحت، بستر سے علیحدگی اور مار پیٹ ناکام ہو جائیں تو پھر فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ مرد کے خاندان میں سے ایک حَکم منصف، ثالث یا مصالحت کنندہ کھڑا کرو وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اور ایسا ہی ایک آدمی عورت کے خاندان سے مقرر کرو، جو دونوں کے حالات سے واقف ہوں اور میاں بیوی کی ذہنی استعداد اور اُن کے عادات و خصائل سے بھی باخبر ہوں۔ یہ دو آدمی سر جوڑ کر بیٹھیں اور باہمی مشاورت سے مرد و زن کے درمیان مصالحت کی بنیاد

تلاش کریں اور پھر اُن کے درمیان صلح کرا دیں اگر خاندان سے دو مناسب آدمی نہ مل سکیں تو پھر کوئی دوسرے اشخاص بھی مقرر کیے جا سکتے ہیں۔ مقصد وہی ہے کہ میاں بیوی کے حالات سے زیادہ سے زیادہ باخبر ہوں تاکہ انہیں کسی نتیجے پر پہنچنے میں آسانی ہو۔

اس طریقے سے مقرر کیے گئے مصالحت کنندگان کے فیصلے کو شریعت میں معتبر سمجھا جاتا ہے بعض دیگر معاملات میں بھی حکم مقرر کرنے کا حکم موجود ہے۔ اس طرح کی قائم کردہ مصالحتی کمیٹی کو اگرچہ عدالت کا درجہ تو حاصل نہیں ہوتا، تاہم اس کا فیصلہ عدالت کے فیصلہ کی طرح ہی قابل قبول ہوتا ہے۔ فریقین کے لیے لازمی ہے۔ کہ اپنی مقرر کردہ مصالحتی کمیٹی کے فیصلے کو خوش دلی سے قبول کریں۔ ہاں! بعض اوقات فیصلے میں بوجوہ غلطی بھی ہو سکتی ہے یا کسی ایک طرف طرفداری محسوس ہوتی ہے تو ایسی صورت میں باقاعدہ عدالت میں اپیل بھی کی جا سکتی ہے۔ اور اگر اصلاح کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو پھر عدالت مجاز ہے کہ فریقین کے درمیان تفریق کرا دے۔

خلافت عثمانؓ کی ایک مثال

حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں حضرت عقیلؓ کا ایک ایسا ہی معاملہ پیش آیا۔ حضرت عقیلؓ جنگ بدر میں کفار کی طرف سے شامل ہوئے تاہم فتح مکہ یا اُس کے قریبی زمانہ میں حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ اس کے بعد ایک موقع پر حضرت علیؓ سے ناراض ہو کر حضرت امیر معاویہؓ سے جا ملے تھے۔ بہر حال حضرت عقیلؓ نے فاطمہؓ بنت عتبہ سے نکاح کیا تھا۔ عتبہ، ربیعہ اور ولید وغیرہ غزوہ بدر میں مارے گئے تھے۔ — یہ خاندان تو وہی ہے جو حضور علیہ السلام اور حضرت علیؓ کا یعنی خاندان عبد مناف ہے حضرت عقیلؓ اور فاطمہؓ کے درمیان بعض اوقات مزاح بھی ہوتا تھا اور بات بڑھ بھی جاتی تھی۔ تو ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میاں بیوی کے درمیان کسی بات پر گفتگو ہو رہی تھی کہ فاطمہؓ نے پوچھا اُس کا باپ عتبہ اور ربیعہ وغیرہ کہاں ہیں تم عقیلؓ کہنے لگے، وہ تمہاری

بائیں جانب جہنم میں ہوں گے۔ حضرت فاطمہؓ نے اس بات کا بڑا منایا اور حضرت عثمانؓ کی عدالت میں عقیلؓ کے خلاف شکایت کر دی۔ کہ اس کے خاوند نے اُسے یہ بات کہہ کر ذہنی کوفت پہنچائی ہے۔ حالانکہ حضور علیہ السلام کا فرمان مبارک ہے کہ اس قسم کا مذاق نہیں ہونا چاہیئے۔ مرنے والے اپنے نتائج کو پہنچ چکے ہیں۔ لہذا اُن کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں کہنی چاہیئے جس سے اُن کے پس ماندگان کی دل آزاری ہو۔ فاطمہؓ مسلمان ہے اگر اس کا باپ کفر کی حالت میں مر گیا، تو اب اُس کو جتلانے کی کیا ضرورت ہے اس قسم کا مذاق اچھا نہیں ہوتا۔

مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمران ابن حصینؓ کی دو بیویاں تھیں۔ اُن کی آپس میں بڑی کھٹ پٹ رہتی تھی۔ اِسی طرح ایک دوسرے شخص کی بھی دو بیویاں تھیں اور اُن کی حالت بھی کچھ مختلف نہ تھی۔ ایک دفعہ ایسا ہوا۔ کہ یہ شخص حضرت عمرانؓ سے مل کر گھر آیا تو ایک بیوی نے پوچھا تم کہاں تھے کہنے لگا حضرت عمرانؓ سے مل کر آرہا ہوں بیوی نے کہا تم غلط بیانی کر رہے ہو، تم تو دوسری بیوی کے ہاں سے آئے ہو۔ بہرحال اُس نے انکار کیا اور یوں کہا کہ میں نے حضرت عمرانؓ سے ایک حدیث سُنی ہے کہ حضور نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا اقل ساکن الجنۃ النساء یعنی جنت میں جانے والی بہت کم عورتیں ہونگی کیونکہ اُن کی اکثریت جہنم میں جائے گی۔ حضور علیہ السلام کا ایک اور فرمان یہ بھی ہے یا معشر النساء رأیتکنّ اکثر اھل النار یعنی اے عورتوں کا گروہ! میں نے تمہاری زیادہ تعداد دوزخ میں دیکھی ہے۔ لہذا خدا کا خوف کیا کرو اور صدقہ خیرات وغیرہ کیا کرو۔ ایک عورت نے عرض کیا حضور! عورتوں کی اکثریت کا دوزخ میں جانے کی کیا وجہ ہے تو آپ نے فرمایا تکفرن العشیر تم خاوند کی ناشکری بہت کرتی ہو۔

عورتوں کی کمزوری

بہر حال جب حضرت فاطمہؓ نے عقیلؓ کی شکایت دربارِ عثمانؓ میں پیش کی تو حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ میں اِن دو کے بارے میں دو حکم مقرر کرتا ہوں۔ چنانچہ فاطمہؓ کے خاندان سے حضرت معاویہؓ حکم مقرر ہوئے اور عقیلؓ کے خاندان سے عبداللہ بن عباسؓ۔ حضرت عثمانؓ نے دونوں مصالحت کنندگان کو بلا کر کہا۔ کہ اِن میاں بیوی کے درمیان مصالحت کرا دو۔ چنانچہ دونوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ حضرت ابن عباسؓ کی رائے یہ تھی کہ یہ جھگڑا اختتام پذیر ہوتا نظر نہیں آتا لہٰذا بہتر ہے کہ میاں بیوی میں تفریق کرا دی جائے۔ امیر معاویہؓ کہنے لگے کہ میں عبدمناف کے خاندان کے دو شخصوں کے درمیان مفارقت کے حق میں نہیں ہوں۔ یہ دونوں پنچ حضرات باتیں کرتے ہوئے حضرت عقیلؓ کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ جب یہ اُن کے مکان پر پہنچے تو دروازہ بند تھا اور وہ میاں بیوی از خود راضی ہو چکے تھے۔ انہیں بات کرنے کا موقع بھی نہ ملا اور واپس آ گئے۔ یہ واقعہ امام ابن کثیرؒ اور بعض دوسرے مفسرین نے بھی ذکر کیا ہے۔ بہر حال یہ واقعہ نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس قسم کی مصالحتی کاروائی کا آغاز حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ہوا۔ جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں دیا ہے۔

مصالحتی کمیٹی کی ذمہ داری

بہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میاں بیوی کے درمیان تنازعہ کی صورت میں دو ارکان پر مشتمل ایک مصالحتی کمیٹی بنائی جائے۔ جو دونوں کے درمیان صلح صفائی کی کوشش کرے، تاہم صلح جوئی کا انحصار کمیٹی کے ارکان کے خلوص پر ہے۔ اگر وہ نیک نیت ہوں گے اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا اگر اُن کا ارادہ فی الحقیقت اصلاحِ احوال کا ہوگا۔ يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا تو اللہ تعالیٰ اُن میں ایسی توفیق پیدا کر دے گا کہ وہ صلح پر آمادہ ہو جائیں گے اور مصالحت کنندگان کی کوشش بار آور ہو گی۔ اگر اُن کی نیت میں فتور ہوگا، معاملہ میں جانبداری کا مظاہرہ کریں گے، تو ظاہر ہے کہ صلح صفائی

کی بجائے تنازعہ مزید بڑھے گا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر منصفان کا ارادہ اصلاح کرنے کا ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ کوئی بہتر صورت پیدا کر دیگا، جسکی وجہ سے میاں بیوی میں مصالحت ہو جائیگی۔

مصالحت کمیٹی کو تنبیہ

آگے اللہ تعالیٰ کی دو صفات بیان کی گئی ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے ان صفات کے تذکرے سے مصالحت کنندگان کو تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ دیکھو! تمہارا فیصلہ حق و انصاف پر مبنی ہونا چاہیئے کسی کی بے جا طرفداری نہ کرنا، اگر تم نے اندرون خانہ کوئی گڑبڑ کی تو اللہ تعالیٰ علیم ہے۔ وہ تمہاری نیتوں کو بھی جانتا ہے۔ اس سے کوئی چیز مخفی نہیں اور وہ ذات خبیر بھی ہے۔ تم جو کچھ جس نیت اور ارادے سے کر رہے ہو، اُس کی ہر آن اُسے خبر ہے۔ اگر فیصلے میں کوتاہی کروگے، جان بوجھ کر انصاف کی خلاف ورزی کروگے تو اللہ کے ہاں مجرم ٹھہروگے اور اُسکی گرفت میں آجاؤگے

یہ بالکل ویسی ہی تنبیہ ہے جیسی گذشتہ درس میں خاوند کو کی گئی ہے۔ کہ دیکھو! تمہیں اللہ نے عورت پر حاکم بنایا ہے تو اُس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی مت کرنا۔ یہ نہ سمجھنا کہ مجھے عورت پر کلی اختیار حاصل ہوگئے ہیں جو چاہوں کرتا پھروں۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ وہاں فرمایا کَانَ اللّٰہُ عَلِیًّا کَبِیْرًا اللہ تعالیٰ بلند بھی اور عظمت و بڑائی کا مالک بھی ہے اگر تم عورت کے ساتھ کوئی زیادتی کروگے تو پھر اللہ تعالیٰ کی عدالت میں تمہیں بہرحال پیش ہونا ہے اس عدالت سے بڑی نہ کوئی عدالت ہے اور نہ اُس عدالت کے سامنے کسی کی چرب زبانی کام آسکتی ہے وہاں تمہیں اپنی زیادتی کا جوابدہ ہونا پڑیگا۔

اگر مصالحتی کمیٹی بھی ناکام ہو جائے تو پھر آخری صورت عدالتی چارہ جوئی ہے۔ اسلامی عدالت فیصلہ کریگی۔ اللہ تعالیٰ نے محرمات نکاح کے ساتھ ساتھ یہ معاشرتی مسائل بھی بیان فرما دیے ہیں۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا
وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى
وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا
مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ
مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۞۳۶

ترجمہ :۔ اور اللہ کی عبادت کرو ، اور اُس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور قرابتداروں کے ساتھ اور یتیموں کے ساتھ اور مسکینوں کے ساتھ اور قریب والے ہمسائے کے ساتھ اور اجنبی ہمسائے کے ساتھ اور پاس بیٹھنے والے کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ اور وہ کہ جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہیں ، اُن کے ساتھ ۔ بیشک اللہ تعالیٰ اُس شخص کو پسند نہیں کرتا جو بڑائی کرنے والا ہے اور فخر کرتا ہے ۞۳۶

ربطِ آیات

سورۃ کی ابتداء سے یہاں تک حقوق ہی کا بیان آرہا ہے پہلے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے حقوق بیان فرمائے پھر یتیموں کے حقوق کا تذکرہ کیا ۔ مالی حقوق کے طور پر وراثت کے حقوق اور ورثاء کے حصص بیان کیے ۔ نکاح اور محرمات نکاح کا ذکر ہوا ۔ پھر معاشرتی مسائل آئے ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مرد عورتوں پر نگران یا محافظ ہیں ، اُن پر عظیم ذمہ داری عاید ہوتی ہے ۔ اگر نگران صحیح ہوگا تو اس کے ماتحت بھی درست ہوں گے اور اگر نگران ہی خرابی کا شکار ہوگا تو زیرِ دست بھی ویسے ہی ہوں گے ۔ اس کے

بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر عورتوں کے ساتھ اختلاف ہو جائے تو اُسے کس طرح نپٹانا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کا طریقہ بتایا اور باقاعدہ قانون مقرر فرما دیا۔

اب آج کے درس کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اُس بنیادی چیز کا ذکر کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ عبادت صرف اُسی کی کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا جائے۔ اگر انسان کی یہ بنیاد درست ہو جائے تو آگے تمام معاملات درست ہو جائیں گے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنا حق بیان کرنے کے بعد باقی حقوق کی تفریع بیان فرمائی ہے۔

عبادت صرف اللہ کی ہو

ارشاد ہوتا ہے وَاعْبُدُوا اللّٰهَ اللہ کی عبادت کرو۔ یہ بنیاد ہے۔ اگر تمام لوگ صرف اللہ ہی کی عبادت کرنے لگیں تو باقی تمام حقوق خود بخود درست ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا خالق، محسن اور مربی ہے۔ اگر اُسی کے حقوق میں کوتاہی روا رکھی گئی تو پھر باقی مخلوق کا حق کیسے ادا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ جب بنیاد ہی کمزور ہو گی تو اس پر مضبوط عمارت کیسے تعمیر ہو سکتی ہے لہٰذا سب سے پہلے اس بنیادی عنصر کا ذکر کیا، لوگو اللہ کی عبادت کرو۔

امام بیضاویؒ اور دیگر مفسرین نے عبادت کا مطلب یہ بیان کیا ہے۔ اقصٰی غایۃ التذلل والخضوع یعنی انتہائی درجے کی عاجزی اور نیاز مندی کے اظہار کا نام عبادت ہے اور یہ عمل کبھی نیت سے ہوتا ہے، کبھی مال سے کبھی قول سے اور کبھی عمل سے۔ یہ انتہائی عاجزی اور نیاز مندی مافوق الاسباب ہستی کا تصور رکھتے ہوئے محض اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مختص ہے اس کے علاوہ کسی کے ساتھ روا نہیں۔ جب عبادت صرف اللہ کے لیے خاص ہو گئی تو پھر غیر اللہ کے ساتھ ایسا معاملہ کسی طرح بھی روا نہیں۔ اگرچہ یہ بات خود بخود ذہن میں آتی ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے یہاں پر تاکیداً یہ بھی فرما دیا وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا اس مالک الملک کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

خالق اور واجب الوجود

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے اور واجب الوجود ہونے میں تو کسی کو شک و شبہ نہیں اور نہ ہی ان دو صفات میں اللہ کے ساتھ کوئی شرک کرتا ہے۔ البتہ شرک ہوتا ہے عبادت میں اور تدبیر میں۔

پوری نوعِ انسانی میں سے دہریوں کی قلیل تعداد کے علاوہ تمام مذاہب کے لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ خالق صرف اللہ ہی کی ذات ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی خالق نہیں۔ کافر، مشرک، یہودی، نصرانی، ہندو، سکھ، جینی، بدھ مجوسی کسی سے پوچھ کر دیکھ لو کہ ہر چیز کا خالق کون ہے؟ سب کہیں گے۔ کہ خالق تو صرف اللہ ہے۔ اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْئٍ انسان، حیوان، چرند، پرند، کیڑے مکوڑے سب کو کس نے پیدا کیا؟ اللہ نے، زمین آسمان، سیارے، ستارے، چاند، سورج کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ سب کہیں گے اللہ ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کے واجب الوجود ہونے کا تعلق ہے۔ اس میں بھی سب لوگ متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا وجود خود بخود ہے، یہ کسی دوسری ہستی کا عطا کردہ نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جس کا وجود ضروری ہو اور جو واجب الوجود ہو۔ لفظ اللہ کا معنیٰ ہی یہ ہے واجب الوجود مستجمع لجمیع صفات الکمال مبرأ عن النقص والزوال

یعنی وہ واجب الوجود ہے اور تمام صفات کمال کا جامع ہے، وہ نقص اور زوال سے پاک ہے۔ جب لفظ اللہ بولا جاتا ہے تو یہ ساری حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے۔ فارسی میں اللہ کے لیے خدا کا لفظ ہے جس کا مفہوم بھی یہی ہے کہ ایسی ہستی جو خود بخود موجود اور قائم ہے، کسی کی محتاج نہیں، بلکہ سب اس کے محتاج ہیں۔ لہٰذا واجب الوجود بھی اللہ ہی کی ذات ہے

شرک فی العبادات

جیسا کہ پہلے عرض کیا شرک عبادت اور تدبیر میں ہوتا ہے۔ لوگ اللہ

کے سوا غیر کی عبادت کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ عبادت بھی صرف اللہ کے ساتھ خاص ہے نَخُصُّكَ بِالْعِبَادَةِ ہم تیری ہی ذات کو عبادت کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں اِيَّاكَ نَعْبُدُ کا بھی یہی مطلب ہے کہ صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا باقی ہر چیز مخلوق ہے اور مخلوق واجب الوجود نہیں ہوتی عبادت کے لائق صرف وہ ذات ہے جو خالق اور واجب الوجود ہے۔ تمام صفات کاملہ کی جامع اور نقص اور زوال سے پاک ہے۔ وہ صرف ذات خداوندی ہے۔ ملاءِ اعلیٰ سے لے کر ملاءِ سافل تک ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، ہم جس نظام شمسی میں رہتے ہیں اس کا خالق بھی وہی ہے اور اس کے علاوہ جتنے بھی جہان ہیں۔ سیارے اور ستارے ہیں ان سب کا خالق بھی اللہ ہی ہے۔ اسی لیے تو ہر صاحب عقل انسان اقرار کرتا ہے کہ اے مولا کریم نَعْبُدُكَ وَلَا نَعْبُدُ غَيْرَكَ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیرے سوا کسی دوسرے کی عبادت نہیں کرتے۔ نہ کوئی اس لائق ہے۔ سب فانی ہیں نہ ان کا اپنا وجود ہے۔

اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں کتنے ہی لوگ ہیں جو عبادت میں شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ غایت درجے کی تعظیم جو صرف خدا تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، وہ غیروں کے سامنے کرتے ہیں کوئی بت کے سامنے گڑگڑاتا ہے، کوئی قبر پر سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ کوئی ستاروں اور سیاروں کی پوجا کرتا ہے۔ انتہائی عجز و انکساری جو خالص اللہ کے لیے روا ہے، وہی نیازمندی مافوق الاسباب ہستی تصور کرتے ہوئے جب غیر اللہ کے لیے پیش کر دی تو انسان مشرک بن گیا۔ اللہ کے علاوہ اگر کسی کو نافع اور ضار سمجھ لیا جائے اور پھر اسکی خوشنودی کے لیے اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے نیاز کے طور پر خرچ کیا جائے۔ اور یہ سمجھا جائے کہ اگر نیاز نہیں دیں گے تو نقصان ہو جائے گا، یا کم از کم برکت سے محروم ہو جائیں گے، تو یہ مال میں شرک ہوگا۔

مال بھی صرف اُسی ذات کی خوشنودی کے لیے خرچ کیا جا سکتا ہے جس نے اُس مال کو اور اُس خرچ کرنے والے کو بھی پیدا کیا پھر جب یہی چیز مخلوق کے لیے روا رکھی گئی، تو ایسا کرنے والا شرک کا مرتکب ہوگیا۔

شرک کا ارتکاب عمل کے ذریعے بھی ہوتا ہے۔ جیسے اللہ کے سوا کسی مخلوق کو سجدہ کرے۔ اسی طرح کسی کو مشکل کشا، حاجت روا، اور بگڑی بنانے والا سمجھنا یا کسی کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ صفات کمال کا حامل ہے۔ اُسے ہر چیز کا علم ہے اور وہ محیط کل ہے، یہ سب شرکیہ عقیدے ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ اللہ کی ذات کے سوا کوئی عالم الغیب ہے اور نہ محیط کل، اس معاملہ میں ملاءِ اعلیٰ کے مقربین، انبیاء کرام، شہداءِ عظام اور عام صالحین سب برابر ہیں۔ اللہ کی صفات مختصہ میں کسی کا کچھ حصہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ خالق ہے اور باقی سب مخلوق۔ اَفَمَنْ یَّخْلُقُ کَمَنْ لَّا یَخْلُقُ "کیا پیدا کرنے والے اور نہ پیدا کرنے والا برابر ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں لہٰذا عبادت کے لائق صرف ذات الٰہی ہے۔ اگر کوئی شخص اُس کے علاوہ کسی دوسرے کے ساتھ وہی عقیدہ رکھے گا جو خدا کے ساتھ روا ہے تو یہی شرک فی العبادت ہے۔

شرک فی التدبیر

شرک کی دوسری قسم یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ کے سوا غیروں کو بھی تدبیر کنندہ ماننے لگے۔ "مَنْ یُّدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ" آسمان کی بلندیوں سے لے کر زمین کی پستیوں تک کون تدبیر کرتا ہے؟ جواب یہی آئیگا، کہ وہی وحدہٗ لاشریک مدبر ہے۔ اس کے ساتھ تدبیر میں بھی کوئی شریک نہیں۔ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا تدبیر کنندہ صرف اللہ ہے۔ مگر کتنے افسوس کا مقام ہے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی لوگ غیر اللہ کو مدبر مانتے ہیں حالانکہ یہ زمانۂ جاہلیت کا عقیدہ ہے۔ آج بھی نجومی ستاروں کو مدبر مانتے ہیں اور اُن کی عبادت کرتے ہیں۔ نفع نقصان، انقلابات اور ماجریات یومیہ ستاروں سے وابستہ کی جاتی ہیں اور یہی شرک فی التدبیر ہے۔

مشرکین لات، مناۃ اور عزیٰ وغیرہ کو تدبیر کنندہ جانتے تھے اور آج یہی چیز لوگ اہل قبور کے ساتھ منسوب کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ سب سے بڑا مدبّر تو اللہ تعالیٰ ہی ہے تاہم اُن کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ اللہ نے چھوٹے چھوٹے آگے مدبر مقرر کر رکھے ہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو دنیا کے بادشاہوں یا حکومتوں پر قیاس کرتے ہیں۔ جس طرح کوئی حکومت اپنے عمال یا ناظمین مقرر کرتی ہے، اُن کا خیال ہے کہ اسی طرح اللہ نے بھی اپنے نائبین مقرر کر رکھے ہیں اور اُن کے ذمہ بعض امور لگا دیے ہیں جنہیں وہ تفویض شدہ اختیارات کے تحت انجام دیتے رہتے ہیں۔ مشرکین بعض نیک اور صالح لوگوں کے متعلق یہ تصور رکھتے ہیں کہ چونکہ وہ اللہ کے مطیع اور فرمانبردار ہیں اس لیے اللہ اُن پر الوہیت کی چادر ڈال دیتا ہے اور کچھ اختیارات اُن کو تفویض کر دیتا ہے۔ یہ سخت مشرکانہ عقیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی نبی، ولی، شہید، یا صالحین میں سے کسی کو کوئی اختیار نہیں دیتا کہ وہ جو چاہے کرتا پھرے کسی کی بگڑی بنا دے یا کسی کی حاجت روائی کر دے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ حی اور قیوم ہے وہ ہر ایک کی حاجت روائی اور مشکل کشائی براہ راست کرتا ہے وہ قدرت تامہ کا مالک ہے۔ ہر ایک کی ضرورت کو جانتا ہے کیونکہ علیم کل ہے۔ ہر ایک کی حاجت روائی بھی کرتا ہے۔

بعض لوگ اللہ کی صفات میں اُس کا شریک بناتے ہیں۔ غیر اللہ کو مختار مطلق تصور کر لیا۔ یا فلاں حاضر و ناظر ہے، وہ علیم کل ہے ذرے ذرے سے واقف ہے۔ یہ سب شرکیہ عقائد ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے تاکیداً فرما دیا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْـًٔا اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اگر تمہارا عقیدہ توحید مضبوط رہا اور شرک سے پاک رہا تو تمہارے تمام اعمال کی بنیاد پختہ ہوگی اور اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی کے بعد پھر تم حقوق العباد بھی ادا کر سکو گے۔ لامحالہ تمہاری نظر قیامت پر

ہو گی اور اُس جہان کی باز پرس پر تمہارا یقین ہو گا۔

حضرت معاذؓ کی حدیث میں موجود ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا معاذ! کیا جانتے ہو کہ اللہ کا حق مخلوق پر کیا ہے۔ عرض کیا حضور! اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں، آپ نے فرمایا اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے۔ اَنْ یَّعْبُدُوْہُ وَلَا یُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا یہ کہ عبادت خالص اللہ کی کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ مخلوق کا حق اللہ پر کیا ہے۔ پھر عرض کیا حضور! اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا کہ مخلوق کا حق اللہ پر بذاتہٖ تو کچھ نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے خود یہ حق لے رکھا ہے کہ جب اُس کی مخلوق اس کی عبادت کرے گی اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں بنائے گی تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو دوزخ میں نہیں ڈالے گا۔

والدین کے حقوق

اب حقوق العباد کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے والدین کے حقوق کا تذکرہ کیا ہے اور اُن کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ماں باپ کے ساتھ احسان کرو۔ اُن کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ اولاد اور والدین کا سب سے قریبی تعلق ہوتا ہے والدین اولاد کے محسن ہوتے ہیں اور بغیر کسی معاوضہ کے احسان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی فطرت میں اولاد کے لیے محبت ڈال دی ہے۔ اس لیے وہ اولاد کے ساتھ مشفقانہ سلوک کرتے ہیں لہٰذا اولاد پر لازم ہے کہ وہ والدین کے ساتھ بہترین سلوک کریں۔ اور انہیں قولی یا فعلی طور پر کسی قسم کی ایذا نہ پہنچائیں۔ جائز امور میں اُن کی اطاعت کریں، ضرورت کے وقت ان کی مالی مدد کریں، جسمانی طور پر انہیں راحت پہنچائیں، حتیٰ کہ والدین اگر کافر بھی ہوں تو بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ کہ اُن کا عقیدہ تو اختیار نہ کریں البتہ وَصَاحِبْھُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا مگر دُنیا میں ان کے ساتھ حسنِ سلوک

سے پیش آؤ۔

دیگر مستحقین

فرمایا والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ وَبِذِی الْقُرْبٰی قرابتداروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ ماں باپ کے بعد بہن، بھائی، چچا اور دیگر عزیز واقارب ہیں اُن کا بھی حق ہے۔ والدین کے واسطہ سے جسقدر کوئی قریبی ہے اُسی قدر اُس کا حق بھی مقدم ہے۔

آگے فرمایا وَالْیَتٰمٰی یتیموں کے حقوق ادا کرو۔ اُن کے سر پر دستِ شفقت رکھو، اُن کی ہر ممکن اعانت کرو وَالْمَسٰکِیْنَ اور ایسے نادار لوگ جو محنت کے باوجود معاشی طور پر پسپت ہیں، اُن کے جائز اخراجات آمدنی سے کم ہیں، وہ تمہارے حسن سلوک کے مستحق ہیں اُن کا بھی خیال رکھو۔ اللہ نے اُن کا حق بھی تمہارے ذمہ رکھا ہے۔

پڑوسی کے حقوق

حقوق ہی کے ضمن میں فرمایا وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی قرابتدار پڑوسیوں کا خیال رکھو۔ اگر پڑوسی رشتہ دار بھی ہے تو اس کا دہرا حق ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام سے دریافت کیا گیا حضور! پڑوسی کا حق کہاں تک ہے۔ آپ نے فرمایا چالیس گھروں تک سب تمہارے پڑوسی ہیں اُن کا تم پر حق ہے۔ صحیحین کی حدیث میں آتا ہے۔ مَا زَالَ جِبْرِیْلُ یُوْصِیْنِیْ بِالْجَارِ حَتّٰی ظَنَنْتُ اَنَّهٗ سَیُوَرِّثُهٗ جبریل علیہ السلام نے اللہ کی جانب سے مجھے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی اتنی تاکید کی کہ مجھے خیال ہوا شاید خدا تعالیٰ پڑوسیوں کو وراثت میں شریک کر دے گا۔

وَالْجَارِ الْجُنُبِ اور اجنبی یا دور کے پڑوسی کے ساتھ بھی حسن سلوک کا حکم دیا ہے کہ وہ بھی تمہاری مہربانی کے مستحق ہیں وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ اور پاس بیٹھنے والے بھی اچھے سلوک کا حق رکھتے ہیں۔ ہم جماعت طالبعلم ہیں کسی فیکٹری یا دفتر میں اکٹھے کام کرتے ہیں۔ دکان پر بیٹھتے ہیں۔

کہیں سفر کے دوران ریل گاڑی، ہوائی جہاز یا بحری جہاز میں ہم سفر ہیں، فرمایا یہ سب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ اچھے برتاؤ کا حق رکھتے ہیں۔ ہر صاحب استطاعت حسب ضرورت دوسرے کی مدد کرے۔ وَابْنِ السَّبِيلِ اور کوئی مسافر ہو خواہ مہمان ہو یا اجنبی، اُسے بھی اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو اس کا بھی تم پر حق ہے اُس کی مناسب اعانت کرو۔ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ اور وہ لوگ بھی تمہارے حسن سلوک کے مستحق ہیں جو تمہارے داہنے ہاتھ کی ملکیت یعنی زرخرید غلام ہیں۔ غلام کے متعلق حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ اس کی طاقت سے زیادہ اُس سے کام نہ لو۔ اور اگر کوئی مشکل کام اُس کے سپرد کرو تو اُس کا ہاتھ بٹاؤ۔ جو خود کھاتے ہو اُن کو بھی کھلاؤ۔ اور جو خود پہنتے ہو، اُن کو بھی پہناؤ، ورنہ آگے چل کر مؤاخذہ ہوگا۔ اب غلامی کا سلسلہ تو نہیں ہے تاہم اس سے نجی نوکر چاکر، ملازم وغیرہ بھی مراد لیے جا سکتے ہیں۔ وہ لوگ تمہاری خوش اخلاقی اور حسن سلوک کے حقدار ہیں۔

ذریعہ فلاح

اس ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام متعلقین کے ساتھ اچھے برتاؤ کا حکم دیا ہے۔ اگر اس ایک آیت پر ہی اہل اسلام عمل کر لیں تو دنیا سے شر و فساد ختم ہو جائے اور دین و دنیا میں فلاح نصیب ہو جائے مگر افسوس کا مقام ہے۔ کہ جس طرح لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے حقوق کو ادا نہیں کیا، شرک کفر اور بدعات جاری کر دی ہیں، اسی طرح حقوق العباد کے معاملہ میں بھی دور جا پڑے ہیں۔ نہ والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے ہیں اور نہ پڑوسیوں کا خیال کرتے ہیں اُن کی حوصلہ افزائی کی بجائے دل شکنی کی جاتی ہے۔ اُن کے دروازے پر جا کر گالی گلوچ، اور شور و شر برپا کیا جاتا ہے۔ پتنگ بازی کے لیے چھتوں پر چڑھ جاتے ہیں، آجکل ریکارڈنگ کی نئی مصیبت آگئی ہے پڑوس میں کوئی بیمار ہے۔ کوئی طالبعلم مطالعہ میں مصروف ہے۔ کوئی عبادت گزار اللہ اللہ کرنا چاہتا ہے مگر انہیں خدا کا خوف نہیں ہے، دوسرے

کا احساس تک نہیں۔

اب مسجدیں بھی اس شور وغل میں شامل ہو گئی ہیں۔ وقت بے وقت سپیکر کھول کر غزلیں اور نعتیں شروع کر دی جاتی ہیں اور پھر اسے کار ثواب سمجھ کر کیا جاتا ہے حالانکہ یہ مخلوق خدا کو ایذا پہنچائی جا رہی ہے حضورؐ کا فرمان ہے لاتؤذوا المؤمنین، لاتوذوا المسلمین اہل اسلام کو ایذا نہ پہنچاؤ۔ مگر یہاں کون سمجھائے اور کون سمجھے۔ دوسروں کے حقوق پہ چھاپہ مارنا کونسی نیکی ہے۔ اگر کسی کو آرام کے وقت آرام میسر نہیں، عبادت میں انہماک حاصل نہیں ہو رہا، بیمار کی نیند میں خلل آ رہا ہے، تو ایسی نیکی کا کیا فائدہ

حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ ہمارے بزرگوں میں سے ہیں۔ اُن کا معمول تھا۔ کہ گھر میں آم کھائے ہیں تو اُن کے چھلکے خود دور جا کر پھینک آتے تھے کہ کہیں پڑوسی کو تکلیف نہ ہو، نا معلوم انہیں یہ چیز میسّر ہے یا نہیں۔ صاحب توفیق ہونے کے باوجود آپ کچے مکان میں رہتے تھے لوگ کہتے تھے کہ آپ اچھا مکان تعمیر کر لیں۔ فرمایا اللہ نے توفیق تو بیشک دی ہے مگر میرے پڑوسیوں کے مکان کچے ہیں اگر میں نے پختہ مکان بنا لیا تو محلے والوں کو تکلیف ہو گی۔ پہلے دار العلوم میں جا کر درس دیتے تھے جب زیادہ ضعیف ہو گئے تو طلبا کو گھر بلانے لگے۔ آپ طلبا کو ایک ایک چھتری بھی خرید کر دے دیتے تھے کہ انہیں آنے جانے میں تکلیف نہ ہو

غرور سے بیزاری

فرمایا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا بیشک اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتا اترانے والے اور بڑائی کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کو عجز و انکساری محبوب ہے، وہ مغرور آدمی کو پسند نہیں فرماتا۔ جس شخص کے دِل میں عاجزی ہو گی اسے خدا تعالیٰ کی عبادت کا صحیح تصور بھی ہو گا، وہ وحدانیت کا شیدائی اور شرک سے بیزار ہو گا۔ ایسا شخص اللہ کے حقوق بھی ادا کرے گا اور مخلوق کے حقوق سے بھی عہدہ برآ ہو گا۔ جو شخص مال، دولت، جاہ اور اقتدار کی وجہ سے مغرور ہو گا

وہ کسی کا حق ادا نہیں کریگا۔ ایسا غرور اور شیخی بھگارنے والا شخص اللہ تعالےٰ کو ہرگز پسند نہیں۔ ایسے لوگ انسانیت کے دشمن ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بنیادی مسئلہ سمجھا دیا ہے کہ عاجزی والا شخص ہی حقوق کو ادا کر سکتا ہے۔ اگر انسان میں عجز نہیں غرور و تکبر ہے تو کوئی کام درست نہیں ہوگا۔

اِلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَیَکْتُمُوْنَ
مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ
عَذَابًا مُّھِیْنًا ﴿۳۷﴾ وَالَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ
رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ
یَّکُنِ الشَّیْطٰنُ لَہٗ قَرِیْنًا فَسَآءَ قَرِیْنًا ﴿۳۸﴾

ترجمہ: وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بخل کرنے کا حکم دیتے ہیں اور اس چیز کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دی ہے اور ہم نے تیار کر رکھا ہے کفر کرنیوالوں کے لیے ذلّت کا عذاب ﴿۳۷﴾ اور وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو لوگوں کو دکھانے کے لیے اور نہیں ایمان رکھتے اللہ پر اور نہ قیامت کے دن پر۔ اور جس شخص کا ساتھی شیطان ہو، پس وہ بہت بُرا ساتھی ہے ﴿۳۸﴾

ربط آیات

گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے اُس بنیاد کا تذکرہ فرمایا تھا جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر صحیح طور پر ایمان لایا جائے خالص اُسی کی عبادت کی جائے اور شرک سے پرہیز کیا جائے، جب اس بنیاد کے ذریعہ اللہ کے حقوق ادا ہو جائیں گے تو پھر انسان بندوں کے حقوق بھی ادا کر سکے گا۔ اس ضمن میں خداوند کریم نے فرمایا سب سے پہلے ماں باپ کے ساتھ احسان کرو۔ پھر قرابتداروں کے ساتھ حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آؤ۔ یتیموں، مسکینوں، پڑوسیوں، ہم نشینوں، مسافروں

اور غلاموں کے حقوق ادا کرو۔ جس مقام پر کوئی جس قدر ضرورت مند ہے، اُسکی حاجت براری کرو۔ ظاہر ہے کہ جس نے بندوں کے یہ حقوق ادا کر دیئے وہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ بندہ بن گیا اور جس نے ان حقوق کی ادائیگی سے روگردانی کی اُس نے غرور اور تکبر کیا، اُس نے سمجھا کہ جو کچھ اُس کے پاس مال و دولت ہے وہ اس کی اپنی کمائی ہے اور اپنی مرضی سے جہاں چاہے خرچ کرنے کا مجاز ہے، اس معاملہ میں کسی ترغیب و ترہیب کا پابند نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، میں ایسے فخر کرنے والے اور بڑائی کا اظہار کرنے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔

اگر صدق دِل سے غور کیا جائے تو انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ کہ دراصل غرور و تکبر بخل اور ریاکاری کی بنیاد ہوتا ہے۔ اسی غرور کی وجہ سے انسان بخل کا مرتکب ہوتا ہے اور جب جائز حقوق ادا نہ کرنے کی وجہ سے اُس کے پاس مال بچ جاتا ہے۔ تو پھر وہ محض دکھلاوے کے لیے خرچ کرنے لگتا ہے اور اصل نیکی سے دور چلا جاتا ہے۔ چنانچہ آج کے درس میں اللہ جل شانہٗ نے بخل اور ریاکاری کی مذمت بیان فرمائی ہے۔

بخل کی بیماری

ارشاد ہوتا ہے اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وہ لوگ جو بُخل کرتے ہیں۔ اللہ کی دی ہوئی نعمت کو دوسروں تک نہیں پہنچاتے، حالانکہ اللہ نے اُن پر یہ حق عاید کیا ہے کہ اپنی جائز ضرورت سے زاید مال میں ضرورت مندوں اور محتاجوں کو شریک کر لیں۔ ایسے لوگ نہ صرف خود بخیل ہوتے ہیں بلکہ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں۔ کہ تم بھی غربا و مساکین کے حقوق ادا نہ کرو۔ مدینے کے یہودیوں میں یہ دونوں چیزیں پائی جاتی تھیں۔ وہ خود بھی پرلے درجے کے کنجوس تھے اور اہل اسلام کو بھی مختلف حیلوں بہانوں سے خرچ کرنے سے روکتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے کہا کرتے تھے۔ کہ اگر

تم نے گاڑھے پسینے کی کمائی بغیر سوچے سمجھے ضائع کر دی، جہاد میں لگا دی صدقہ خیرات کر دیا، غریب مسکین، یا کسی مسافر اور مہمان کی خاطر مدارات میں لگا دیا تو تم قلاش ہو جاؤ گے، پھر بُرے وقت کے لیے تمہارے پاس کچھ نہیں بچے گا اور تم خود کوڑی کوڑی کے محتاج ہو جاؤ گے۔ اس طرح وہ بخل کی تعلیم بھی دیتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بخل ایک قبیح بیماری ہے جس قوم میں بخل پیدا ہو جاتا ہے وہ بد دل ہو جاتی ہے اور آخر کار غیروں کی مغلوب ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اللہ کے دیے مال کو معاشرے کے کمزور طبقے تک پہنچنا چاہیے تاکہ وہ لوگ بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں اور مسلمان من حیث القوم ایک طاقتور معاشرہ قائم کر سکیں۔

ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے اَلْبَخِیْلُ بَعِیْدٌ مِّنَ اللّٰہِ بَعِیْدٌ مِّنَ النَّاسِ بَعِیْدٌ مِّنَ الْجَنَّۃِ یعنی بخیل آدمی اللہ سے دور ہوتا ہے، لوگوں سے دُور ہوتا ہے اور جنت سے بھی دُور ہوتا بلکہ جہنم کے قریب ہوتا ہے۔ اسی طرح سخی کے متعلق فرمایا قَرِیْبٌ مِّنَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ النَّاسِ وَقَرِیْبٌ مِّنَ الْجَنَّۃِ اللہ سے قریب لوگوں سے قریب اور جنت سے بھی قریب ہوتا ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا جاہل سخی اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ اللہ کا زیادہ محبوب ہوتا ہے مِنْ عَابِدٍ بَخِیْلٍ اُس عبادت گذار کنجوس سے جو اللہ کے رستے میں خرچ نہیں کرتا۔ مقصد یہ کہ محض فرائض کی ادائیگی کے بعد فی سبیل اللہ خرچ کرنے والا اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ بندہ ہے اُس لمبی لمبی نمازیں پڑھنے والے اور نفلی روزے دار سے جو خرچ نہیں کرتا۔

حضور علیہ السلام کے سامنے بخل کا ذکر کیا گیا۔ آپ نے فرمایا اَیُّ دَاءٍ اَدْوَءُ مِنَ الْبُخْلِ یعنی کنجوسی سے بڑھ کر کون سی بیماری ہے یہ تو انسان کے لیے مہلک مرض ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا لا یدخل الجنۃ

لہ مسند احمد ص۳۰۸ ج۳ و کنز العمال ص۲۵۷ ج۳ (فیاض)

خب ولا منان ولا بخیل یعنی دھوکے باز، احسان جتلانے والا اور کنجوس ہرگز جنت میں نہیں جائیں گے۔ ترمذی شریف میں یہ روایت بھی آتی ہے لا یجتمع خصلتان فی المؤمن سوء الخلق و البخل یعنی کسی مومن میں بُرے اخلاق اور بخل جیسی قبیح بیماریاں جمع نہیں ہو سکتیں یہ مومن کی شان کے خلاف ہے کہ وہ بداخلاقی اور بخیل واقع ہو۔

بخیل کی عادت یہ ہے۔ کہ وہ مال کو گن گن کر رکھتا ہے مگر خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ حاجت مند موجود ہیں، مال بھی موجود ہے مگر خرچ کرنے کی ہمت نہیں پڑتی اسی لیے تو سعدی صاحبؒ نے گلستان میں کہا ہے۔

زر از کان کندن زر از جان کندن

یعنی سونا حاصل کرنے کے لیے کان کو کھودنا پڑتا ہے۔ اور بخیل جب مر جائے تو زر و مال حاصل ہوتا ہے۔ گویا بخیل کی جان کندن حصول زر کا ذریعہ بنتی ہے، وہ خود اپنی زندگی میں اپنے ہاتھوں خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

بخل کی ترغیب دینا دراصل شیطانی فعل ہے۔ سورۃ بقرہ میں گزر چکا ہے اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ شیطان فقر سے ڈراتا ہے۔ کہ خرچ کرو گے تو محتاج ہو جاؤ گے۔ اور اسی طرح بے حیائی کے کاموں کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ کھیل تماشے لہو و لعب، رسومات اور بدعات میں خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور اس طرح انسان کو روشنی سے نکال کر اندھیرے کی طرف لے جاتا ہے،

علم میں بخل

آگے فرمایا بخیل کی حالت یہ ہے وَیَکْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ جو کچھ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دیا ہے اُسے چھپاتے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ کے فضل سے مال و دولت

بھی ہے اور علم بھی۔ انسان خود محنت کرتا ہے، تجارت یا ملازمت یا کھیتی باڑی کے ذریعے مال کماتا ہے۔ بعض اوقات اُسے کچھ مال وراثت اور وصیت کے ذریعے بھی مل جاتا ہے اور یہ سب کچھ من فضلہ ہے اس کے علاوہ جسے اللہ نے علم کی دولت عطا کی ہے وہ بھی بہت بڑی نعمت ہے۔ بخل مال میں بھی بُرا ہے اور علم میں بھی۔ یہودیوں میں ہر دو طرح کا بخل موجود تھا۔ مال کو خرچ کرنے سے ہچکچاتے تھے۔ اور اہل کتاب ہونے کی حیثیت سے انہیں جو علم حاصل تھا اُسے بھی چھپا جاتے تھے اور لوگوں پر سچی بات ظاہر نہیں کرتے تھے۔ سنن بیہقی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ بخل فی العلم، بخل فی المال سے زیادہ قبیح ہے۔

فرمایا وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابًا مُّهِيۡنًا ہم نے کفر کرنے والوں کے لیے ذلت ناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ کہ نہ خود اچھے کام کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو کرنے دیتے ہیں۔ اس دنیا میں تو کسی نہ کسی طرح بچ جائیں مگر آخرت میں ذلت ناک عذاب اُن کا مقدر بن چکا ہے۔

ریاکاری

آگے اُن لوگوں کا تذکرہ ہے جو بظاہر مال تو خرچ کرتے ہیں۔ مگر نیک نیتی کے ساتھ نہیں، بلکہ محض دکھاوے کے لیے، تاکہ دنیا میں اُنکی شہرت اور بڑائی ہو۔ فرمایا وَالَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ رِئَآءَ النَّاسِ اور وہ لوگ جو لوگوں کے دکھلاوے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ انہیں خوفِ خدا نہیں اور نہ ہی مخلوق کے حقوق کی پاسداری ہے بلکہ وہ تو اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ لوگ انہیں بڑے مخیر سمجھنے لگیں اور اُن کی عزت میں اضافہ ہو یہ خود پسند اور متکبر لوگ ہوتے ہیں۔ بنیادی طور پر بخیل مگر ریاکاری کے کاموں میں خوب خرچ کرتے ہیں۔ یہ بھی قبیح بیماری ہے۔ حضور نے ریاکاری کو شرک خفی فرمایا۔ شرک جلی تو سابقہ درس میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ کہ

غیر اللہ کی پرستش کی جائے، انہیں حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے۔ سورۃ کہف میں واضح طور پہ آیا ہے "فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا" جو اپنے رب کے ساتھ ملاقات چاہتا ہے اُسے چاہیئے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ اس کی تفسیر میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ریا کاری نہ کرے۔ کیونکہ ریا سے عمل باطل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح صدقہ خیرات کرنے کے بعد احسان جتلانے سے بھی عمل برباد ہو جاتا ہے۔ قیامت والے دن اللہ تعالیٰ ریا کاروں سے فرمائیں گے، اس عمل کا بدلہ اُن سے وصول کرو جنہیں دکھانے کے لیے یہ کیا تھا۔ آج میں تمہیں اس کا کوئی اجر نہیں دوں گا۔ میں شرکا کے شرک سے بے نیاز ہوں، میں وہ عمل قبول کرونگا۔ جو خالص میری رضا کی خاطر انجام دیا گیا ہو۔

ایمان سے خالی

فرمایا جو لوگ دکھلاوے کے لیے خرچ کرتے ہیں، ان کی حقیقت یہ ہے کہ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وہ نہ اللہ پہ ایمان رکھتے ہیں اور نہ قیامت کے دن پہ۔ اگر وہ صحیح معنوں میں ایماندار ہوتے تو بخل کرتے اور نہ ریا کاری۔ دراصل ان کی بنیاد ہی غلط ہے جو گذشتہ درس میں بیان ہو چکی ہے "وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا" یعنی عبادت خالص اللہ کی کرو اور کسی چیز کو اُس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ۔ اِن لوگوں نے ریا کاری کی اور اس طرح اللہ کے ساتھ شرک کے مرتکب ہوئے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آچکا ہے وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا۔ ہم انہیں ذلت ناک عذاب میں مبتلا کریں گے۔ آخرت میں ان کا حساب ضرور ہو کر رہے گا۔ ہم ہر آدمی سے حساب لیں گے کسی کو چھوڑیں گے نہیں۔ ہر شخص کو جہنم کے پل پہ سے گزرنا پڑے گا۔ میزان کے پاس حاضر ہونا ہوگا، اعمال کا وزن

کیا جائیگا نیکیاں اور بدیاں سب سامنے آجائیں گی فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ وہاں پتہ چل جائیگا کہ کس نے نیکی کی تھی اور کس نے ریاکاری کی تھی۔

شیطان کا پھندا

فرمایا ریاکار لوگ دراصل شیطان کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں اور ظاہر ہے وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا جس کا ساتھی شیطان بن گیا۔ فَسَآءَ قَرِيْنًا تو وہ بڑا برا ساتھی ہے۔ یہ شیطان ہی ہے جو انسانوں کے دل میں وسوسہ ڈال کر برائی پہ آمادہ کرتا ہے۔ اس کا جہاں تک بس چلے گا، وہ انسانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کریگا۔ اس نے تو اعلان کر رکھا ہے کہ میں ہر راستے سے گھیر کر انسان کو جہنم میں پہنچاؤں گا۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ میں نے بھی لوگوں سے وعدہ لے رکھا ہے کہ شیطان کی پوجا نہ کرنا۔ سورۃ یٰسٓ میں ہے اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اے بنی آدم! کیا میں نے تم سے وعدہ نہیں لیا تھا کہ شیطان کے پیچھے نہ چلنا۔ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے وہ تمہیں ہر حیلے گمراہ کرنا چاہتا ہے۔

تو فرمایا جس نے شیطان کو اپنا ساتھی بنا لیا، اس کا نتیجہ ظاہر ہے عرب کہتے ہیں ؎

عن المرء لا تسئل وسل عن قرینه   فکل قرین بالمقارن یقتدی

کسی شخص کی اچھائی برائی معلوم کرنا مقصود ہو تو اس کے ساتھی کو دیکھو لو۔ کیونکہ ساتھی دوسرے ساتھی کی اقتدا کرتا ہے انگریزی کا مقولہ بھی ہے۔ کہ آدمی اپنی سوسائٹی سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ جس کردار کے مالک کسی شخص کے ہمنشین ہوں گے، وہ خود بھی ان سے مختلف نہیں ہوگا۔ جس نے اپنا ساتھی شیطان کو بنا لیا، وہ اسے جہنم میں ہی لے کے جائیگا۔

وَمَاذَا عَلَيۡهِمۡ لَوۡ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَاَنۡفَقُوۡا
مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمۡ عَلِيۡمًا ﴿۳۹﴾
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظۡلِمُ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنۡ تَكُ حَسَنَةً
يُّضٰعِفۡهَا وَيُؤۡتِ مِنۡ لَّدُنۡهُ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۴۰﴾ فَكَيۡفَ
اِذَا جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيۡدٍ وَّجِئۡنَا بِكَ
عَلٰى هٰۤؤُلَاۤءِ شَهِيۡدًا ؕ﴿۴۱﴾ يَوۡمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا
وَعَصَوُا الرَّسُوۡلَ لَوۡ تُسَوّٰى بِهِمُ الۡاَرۡضُ ؕ وَلَا يَكۡتُمُوۡنَ
اللّٰهَ حَدِيۡثًا ﴿۴۲﴾

ترجمہ :- اور کیا حرج اور نقصان تھا اُن کا اگر وہ ایمان لاتے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور خرچ کرتے اُس چیز میں سے جو اللہ نے اُن کو رزق دیا ہے اور اللہ اُن کے ساتھ خوب علم رکھتا ہے (۳۹) بیشک اللہ تعالیٰ نہیں ظلم کرتا ایک ذرے کے برابر بھی اور اگر وہ نیکی ہو تو اُس کو دُگنا کرتا ہے اور اپنی مرضی سے بڑا اجر دیتا ہے (۴۰) پس کیا حال ہوگا اُن لوگوں کا جب کہ ہم لائیں گے ہر امت سے گواہ اور ہم آپ کو لائیں گے اِن لوگوں پر گواہ (۴۱) اُس دِن پسند کریں گے یا آرزو کریں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی ، کاش برابر کر دی جائے اُن کے ساتھ زمین اور اور وہ نہیں چھپا سکیں گے اللہ تعالیٰ سے کسی بات کو (۴۲)

ربط آیات

گذشتہ دروس میں یہ بنیادی عقیدہ بیان ہو چکا ہے کہ عبادت صرف اللہ ہی کی کرو۔ اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اسی بنیاد پر پھر حقوق العباد کا ذکر کیا کہ والدین کے ساتھ احسان کرو۔ اور یتیموں، مسکینوں، پڑوسیوں، ہم نشینوں، مسافروں اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ اسی ضمن میں پھر بخل کی مذمت کی گئی کیونکہ بخیل آدمی اپنے بخل کی وجہ سے دوسروں کے حقوق ادا نہیں کرتا، بلکہ اپنا مال ریاکاری پر خرچ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص درِ اصل شیطانی پھندے کا شکار ہوتا ہے، جو کہ اُسے بنیادی عقیدۂ توحید سے برگشتہ کر دیتا ہے جس کی وجہ سے نہ تو اس کا ایمان اللہ کے ساتھ درست ہوتا ہے اور نہ آخرت کی جواب دہی کا یقین۔ اس لیے وہ حقوق العباد کی پروا نہیں کرتا۔ آج کی آیات اسی تسلسل میں ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے طریقے سے ایسے لوگوں کو توحید اور انفاق فی سبیل اللہ کی دعوت دی ہے۔

دعوت الی التوحید

ارشاد ہوتا ہے وَمَاذَا عَلَيْهِمْ اُن کا کیا نقصان ہوتا۔ اُن لوگوں کا کیا جاتا لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اگر وہ ایمان لے آتے اللہ پر اور قیامت کے دن پر وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ۔ اور اللہ کے دیے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے۔ تبلیغ کے سلسلے میں یہ بھی ایک طرزِ بیان ہے۔ جب بات عام طرزِ گفتگو سے دوسرے کی سمجھ میں نہ آئے تو بعض اوقات تاسف کے طور پر کہا جاتا ہے۔ کہ ان کو کیا ہو گیا ہے، بات کو کیوں نہیں سمجھتے اگر مان جاتے تو ان کا کیا نقصان ہوتا۔ یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں۔ کہ ان لوگوں کا کیا بگڑتا تھا اگر یہ اللہ پر اور قیامت پر ایمان لے آتے اور اللہ ہی کے عطا کردہ مال میں سے اپنے ہی بھائی بندوں پر خرچ کرتے۔ ایسا کرنے سے اللہ کے حکم کی تعمیل بھی ہو جاتی، اسکی وحدانیت پر اور قیامت کے دن پر ایمان پختہ ہوتا بلکہ اُن کی اپنی سوسائٹی کا معیار بھی بلند ہو جاتا۔ انہیں انسانیت

میں کمال حاصل ہوتا، رذائل سے بچ جاتے۔ کفر شرک، نفاق، بدعقیدگی دور ہوکر
اُن میں اعلیٰ اوصاف پیدا ہو جاتے۔ ایمانیات کی دعوت کا مقصد ہی یہ ہے
کہ انسان کی بری خصلتیں دُور ہو جائیں۔ اور اعلیٰ اخلاق پیدا ہو جائے۔

ایمانیات میں ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسل بھی شامل ہے اس کے
علاوہ اللہ کی کتابوں پہ ایمان، فرشتوں پہ ایمان، قیامت پر ایمان، تقدیر پہ
ایمان، اللہ کی صفات پہ ایمان سب ایمان ہی کے اجزا ہیں اگلی آیت میں
"وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ" کے الفاظ بھی آ رہے ہیں۔ جو ایمان بالرسل پہ خصوصی طور
پر دلالت کرتے ہیں۔ رسولوں کی بعثت اللہ کی صفت ہے جیسے اُس
کا فرمان ہے "اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ (الدخان۔ ۵)" یعنی رسولوں کو ہم ہی بھیجا کرتے
ہیں۔ اس آیت میں صرف ایمان باللہ اور ایمان بالقیامت کا ذکر ہے،
تاہم مراد ایمانیات کی تمام جزیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بعض
مقامات پہ ایمانیات کا اجمالاً ذکر کیا ہے اور بعض مقامات پہ تفصیلاً۔
یہاں پہ چونکہ جزائے عمل کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے اس لیے اللہ
اور قیامت پہ ایمان کا ذکر ہے، تاہم اسی سورۃ میں آگے ایمانیات کا
تفصیل کے ساتھ ذکر آئیگا۔ بہر حال یہاں پہ فرمایا کہ اُن لوگوں کا کیا نقصان
تھا اگر وہ اللہ پہ اور قیامت پہ ایمان لے آتے اور ہمارے دیے ہوئے
مال میں سے مستحقین پہ خرچ کرتے۔

فرمایا وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا اللہ تعالیٰ ان کو خوب
جانتا ہے یعنی ان کے ارادے اور اخلاص تک سے باخبر ہے کہ وہ جو
کچھ خرچ کر رہے ہیں، کس نیّت کے ساتھ کرتے ہیں۔ کیا اُن کا مقصود
واقعی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور تقرب ہے یا محض دکھاوا ہے اللہ تعالیٰ
کے علم میں ہے۔ کہ کوئی شخص اپنا مال خرچ کرکے اللہ کی عطا کردہ نعمت
کا شکریہ ادا کر رہا ہے، نوعِ انسانی سے ہمدردی کا جذبہ رکھتا ہے یا

محض ریاکاری کے طور پر رسومات کو ادا کر رہا ہے۔ کیا اُس کے پیش نظر آخرت کا اجر و ثواب ہے یا دنیا کی نمود و نمائش۔ جس نیت اور ارادے کے ساتھ کوئی شخص نیکی کر رہا ہے، اُس کے نتائج بھی ویسے ہی ظاہر ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ ظلم نہیں کرتا

فرمایا یاد رکھو! اللہ کا قانون یہ ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ بیشک اللہ تعالیٰ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ ظلم یا زیادتی اس لحاظ سے کہ انسان نے کسی جرم کا ارتکاب نہ کیا ہو اور اللہ اس کو سزا دے دے یا کسی کا جرم کسی دوسرے کے سر ڈال دے یا کسی کی معمولی سے معمولی نیکی کو بھی ضائع کر دے یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ اللہ کے قانون کے خلاف ہے۔ وہ مالک الملک اور علی الاطلاق شہنشاہ ہے وہ کسی کی حق تلفی نہیں کرے گا اور نہ کسی کے پُرخلوص عمل کی جزاء میں کمی کریگا۔

عربی زبان میں ذرہ کے کئی معنے آتے ہیں۔ ذرہ کا لفظ چھوٹی سی سُرخ رنگ کی چیونٹی پر بھی بولا جاتا ہے اس کے علاوہ یہ لفظ رائی کے دانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جب کسی روشندان یا کھڑکی سے سورج کی شعائیں اندر آئیں تو ان شعاؤں میں جو چھوٹے چھوٹے ذرات نظر آتے ہیں اور پکڑے نہیں جا سکتے، وہ بھی ذرہ ہے۔ الغرض! ذرہ کا لفظ چھوٹی سے چھوٹی چیز پر بولا جاتا ہے اور یہاں مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ معمولی سے معمولی درجے کی زیادتی بھی نہیں کرے گا۔

ظلم کا مفہوم

عربی زبان میں ظلم کا معنیٰ وضع الشیئ فی غیر محلہ کیا جاتا ہے یعنی کسی چیز کو اس کے موقع و محل کے علاوہ رکھ دینا۔ ظلم کا اطلاق چھوٹی سے چھوٹی کوتاہی سے لے کر بڑے سے بڑے جرم پر ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا وَالْکٰفِرُوْنَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ "کافر ہی ظالم ہیں" یا اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ "شرک بہت بڑا ظلم ہے"۔ اسی طرح ظلم کا اطلاق قتل پر بھی ہوتا ہے۔ اور چھوٹی چیز میں یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مسجد

میں داخل ہوتے وقت دائیں کی بجائے پہلے بایاں پاؤں داخل کرلے یا مسجد سے باہر آتے وقت بائیں کی بجائے دائیاں پاؤں پہلے نکال لے تو اس پر بھی ظلم کا اطلاق ہوگا۔ پھر یہ بھی ہے کہ ظلم کا لفظ اضداد میں سے ہے۔ اس میں کمی اور زیادتی دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ جیسے فرمایا وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئًا" وہاں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ اور زیادتی میں شرک، اسراف۔ قتل ناحق وغیرہ آتا ہے یہ بڑی بڑی زیادتیاں ہیں۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ وہ کسی پر ذرہ بھر ظلم نہیں کرتا انسانی محاورے کے مطابق ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے، وہ جو چاہے کرے، وہ خالق ہے، باقی سب اسکی مخلوق ہے۔ ہر جاندار اور بے جان چیز اُسی کی پیدا کردہ ہے اور جو کوئی اپنی چیز میں تصرف کرتا ہے اُسے ظلم پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ امام ابن کثیرؒ نے (ص ۴۰۸ ج ۲) ← اپنی تفسیر میں حدیث بیان کی ہے ان اللہ لو عذب اھل سماواتہ واھل ارضہ لعذبھم وھو غیر ظالم لھم ——— اگر اللہ تعالیٰ تمام آسمان و زمین والوں کو بغیر کسی قصور کے سزا دینا چاہے تو یہ بھی ظلم میں شمار نہیں ہوگا، کیونکہ وہ ہر چیز کا مالک ہے۔ اور وہ اپنی چیز میں جیسے چاہے تصرف کرے۔

فرمایا اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ زیادتی تو کریگا نہیں۔ البتہ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا اگر کسی کی کوئی نیکی ہوگی تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اُسے دُگنا کر دے گا۔ دُگنے کا قانون سورۃ انعام کے آخری رکوع میں موجود ہے۔ "مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا" جو کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ نیکی بھی کریگا اس کا کم از کم اجر دس گنا ملے گا اور زیادہ سے زیادہ جتنا اللہ چاہے۔ سات سو گنا، سات لاکھ گنا، سات کروڑ گنا یا سات ارب گنا اس کے ہاں کوئی کمی نہیں نیکی کا بدلہ جتنا چاہے عطا کرے۔ البتہ

کا اجر

جہاں تک جرم اور برائی کا تعلق ہے فرمایا "وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا" ایک قصور کا بدلہ اسی قصور کے برابر ہوگا "وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ" اور کوئی زیادتی نہیں کی جائیگی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی کس قدر مہربانی ہے کہ نیکی کا بدلہ تو ہزاروں لاکھوں گنا عطا کرتا ہے مگر برائی کی سزا اُس برائی سے زیادہ نہیں دیتا۔

بہر حال فرمایا کہ ایک ذرے کے برابر بھی اگر نیکی ہوگی تو اس کو دُگنا کر دیا جائے گا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا اور اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔ یہ اجر کتنا بڑا ہوگا، اس کا تصور انسان اس دنیا میں نہیں کر سکتا۔ جب نتائج سامنے آئیں گے، اجر تقسیم ہونے لگے تو پھر پتہ چلے گا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کتنی وسیع ہے۔ وہاں پر رائی کا دانہ پہاڑ بن چکا ہوگا۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کھجور کا دانہ احد پہاڑ جتنا بڑا ہو جائیگا۔ مگر شرط یہ ہے کہ جو بھی نیکی کی جائے اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے خرچ کیا جائے وہ ایمان اور خلوص نیت کے ساتھ کیا گیا ہو تو اللہ تعالیٰ اجرِ عظیم عطا فرمائیں گے۔

اللہ کے ہاں پیشی

نیکی کی ترغیب کے بعد اللہ تعالیٰ نے منکرین کا تذکرہ فرمایا ہے فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ پس کیا حال ہوگا۔ اُن لوگوں کا جب ہم ہر امت سے گواہ لائیں گے۔ جب مجرمین اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہوں گے اور اُن کو فردِ جرم پڑھ کر سنائی جائے گی، تو اس کے ثبوت کے لیے گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ مشہور تفسیر کے مطابق ہر امت کی گواہی اُس امت کا نبی دیگا۔ اللہ تعالیٰ مجرمین سے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس میرا پیغام نہیں آیا تھا۔ وہ انکار کریں گے تو اُس امت کا نبی بطور گواہ پیش ہو کر عرض کرے گا، مولا کریم! میں نے تیرے سارے احکام اِن تک پہنچا دیے تھے۔ وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى

هٰٓؤُلَآءِ شَہِیۡدًا اور اے نبی علیہ السلام! آپ کو اِن لوگوں پر گواہ بنا کر لایا جائیگا جن کا واسطہ آپ سے پڑ رہا ہے گویا جس طرح باقی انبیاء اپنی اپنی امتوں پر گواہ ہوں گے اسی طرح آپ بھی اپنی امت پر گواہ ہوں گے۔ اس کی تفسیر حضور علیہ السلام کے خطبہ حجۃ الوداع میں موجود ہے۔ آپ نے تمام لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا وَاَنۡتُمۡ تُسۡاَلُوۡنَ عَنِّیۡ فَمَا ذَا اَنۡتُمۡ قَآئِلُوۡنَ میرے بارے میں تم سے قیامت کو سوال ہوگا، اور تم کیا جواب دوگے۔ سب نے جواب دیا نَشۡهَدُ اَنَّكَ قَدۡ اَدَّیۡتَ الۡاَمَانَةَ وَبَلَّغۡتَ الرِّسَالَةَ وَنَصَحۡتَ الۡاُمَّةَ ہم گواہی دینگے کہ آپ نے حق امانت ادا کر دیا۔ اللہ کا پیغام پہنچا دیا اور امت کو نصیحت فرما دی۔ لہٰذا حضور علیہ السلام بھی اپنی امت کے متعلق گواہی دینگے کہ میں نے حق رسالت ادا کر دیا اور مولا کریم! تیرے احکام پورے پورے اپنی امت تک پہنچا دیے۔

اور دوسری گواہی اُس وقت پیش کی جائے گی جب پوری پوری امتیں انکار کر دینگی کہ اُن تک اللہ کا کوئی حکم نہیں پہنچا۔ تو پھر اسی آخری اُمت کے لوگ سابقہ انبیاء کے حق میں گواہی دینگے کہ اُن انبیاء نے اللہ کا پیغام اپنی امتوں تک پہنچا دیا۔ سابقہ امتیں اعتراض اٹھائیں گی کہ مولا کریم! یہ لوگ تو اس وقت موجود ہی نہیں تھے، ان کی گواہی کیسے قبول ہو سکتی ہے۔ تو امت آخر الزمان کے لوگ کہیں گے کہ پروردگار! ہمیں تیرے آخری نبی اور آخری کتاب کے ذریعے علم ہوا کہ تمام نبیوں نے اللہ کے احکام اپنی امتوں تک پہنچا دیے لہٰذا ہماری یہ گواہی مشاہدے کی بناء پر نہیں بلکہ علم کی بنیاد پر ہے۔ اور پھر اس امت کے حق میں نبی خاتم المرسلین کی گواہی ہوگی۔ ان دونوں گواہیوں کا ذکر سورۃ بقرہ میں موجود ہے لِتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيۡدًا یعنی تم دوسرے لوگوں پہ گواہ بنوگے اور رسول تمہاری صفائی کی شہادت پیش کریگا۔

اب رہی یہ بات کہ حضور علیہ السلام اُن لوگوں کی گواہی تو مشاہدے کی بنا پر دیں گے جو آپ کے زمانے میں آپ کے سامنے موجود تھے مگر ان لوگوں کی شہادت کیسے دیں گے جو خود آپ کے زمانے میں بھی آپ سے غائب تھے یا جو آپ کے وصال کے بعد آئے۔ اس کا تذکرہ دوسرے مقام پر موجود ہے کہ جب آپ سے اس بارے میں پوچھا جائے گا تو آپ فرمائیں گے میں تو وہی بات کہوں گا جو اللہ کے نیک بندے حضرت عیسٰی ابن مریم علیہ السلام کہیں گے "وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ" میں اُس وقت تک کا گواہ ہوں جب تک میں اُن کے درمیان رہا "فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي" مولا کریم! پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا "كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ" تو پھر تو ہی اُن کا نگران اور محافظ تھا "وَأَنْتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ" اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔

یہاں ایک اور بات بھی سمجھ لینی چاہیئے، اہل بدعت اور مشرک کہتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہر شخص کے حالات سے واقف ہیں۔ یہ عقیدہ بھی قرآن وسنت کے خلاف ہے۔ اگر نبی علیہ السلام ہر امتی کے حالات سے واقعی واقف ہوں تو پھر وہ بارگاہ الٰہی میں یہ کیوں کہیں گے۔ کہ پروردگار! میں تو وہی بات کہوں گا جو تیرے نیک بندے عیسٰی علیہ السلام نے کہی کہ میں تو اُن لوگوں کے حالات سے ہی واقف ہوں جن کے درمیان رہا اور جب تو نے مجھے اٹھالیا تو پھر تو خود ہی اُن کا محافظ تھا۔ مسلم شریف کی روایت میں موجود ہے صحابہؓ نے عرض کیا حضور! قیامت والے دن آپ ہمیں ساری امتوں میں سے کیسے پہچانیں گے۔ تو آپ نے فرمایا میں اپنی امت کو علامتوں اور نشانیوں سے پہچانوں گا۔ اس آخری امت کی خاص نشانی یہ ہوگی کہ اُن کے وضو کے اعضاء قیامت کے دن چمک رہے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اگر حضور علیہ السلام ہر شخص کے حالات بذاتہ

جانتے ہوں تو پھر علامات سے پہچاننے کا کیا مطلب رہ جاتا ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس دن نافرمانوں کا کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے گواہ لائیں گے اور آپ کو اس امت پر گواہ پیش کیا جائے گا۔

کفار کی بے بسی

آگے قیامت کا نقشہ پیش کر کے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کرنے والوں کی بے بسی کا حال بیان کیا جارہا ہے۔ ارشاد ہے یَوْمَئِذٍ یَّوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اس دن آرزو کریں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ اور رسول کی نافرمانی کی۔ یہاں پر کفر سے مراد مطلق کفر ہے کہ کوئی شخص اللہ کی وحدانیت، اس کے رسولوں، فرشتوں، کتابوں، تقدیر اور قیامت کے دن کا انکار کرے۔ اور کفر کا اطلاق محض نافرمانی پر بھی ہوتا ہے اور عام گناہ پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے کفر کا اطلاق ناشکری پر بھی ہوتا ہے جیسے وَاشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنِ" میرا شکر ادا کرو اور ناشکری نہ کرو۔ عورتوں کے بارے میں حضور علیہ السلام نے فرمایا[1] تکفرن العشیر تم اپنے خاوند کی ناشکر گزاری کرتی ہو۔ اسی طرح رسول کی اطاعت فرض ہے" مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ" جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے گویا اللہ کی اطاعت کی۔ چنانچہ فرمایا کہ جس نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی وہ پسند کریں گے لَوْ تُسَوّٰی بِھِمُ الْاَرْضُ کاش کہ ان کو برابر کر دیا جائے زمین کے ساتھ یعنی وہ ختم ہو کر مٹی میں مل جائیں تاکہ آخرت کے دائمی عذاب سے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔ سورۃ نبا میں بھی آتا ہے کہ جب کوئی کافر اپنا اعمال نامہ دیکھے گا تو کہے گا "یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا" کاش میں مٹی ہوتا۔

ترمذی شریف کی روایت[2] میں آتا ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا، دیکھو! کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی نہ کیا کرو، قیامت والے دن ہر حقدار کو اس کا حق ضرور دلایا جائے گا حتیٰ کہ اس دنیا میں اگر کسی سینگ والی بکری نے بے سینگ

---

[1] مسلم شریف ص ۱۲۰ [2] ترمذی ص ۳۴۸ (فیاض)

بکری کے ساتھ زیادتی کی ہو گی تو اس کو بھی قصاص دلایا جائے گا۔ یہ جانور وغیرہ مکلف تو نہیں ہیں۔ نہ اُن پہ دائمی سزا ہے۔ البتہ ایک دوسرے سے بدلہ دلانے کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کُونُوا تُرَابًا مٹی ہو جاؤ اور یہ سب مٹی ہو کر ختم ہو جائیں گے۔ فرمایا اسی طرح کفار اور نافرمانانِ رسول بھی آرزو کریں گے کاش وہ مٹی ہو کر دائمی عذاب سے بچ جائیں مگر ان کی یہ حسرت پوری نہیں ہو گی کیونکہ وہ شرائع الہیہ کے پابند ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عقل دی، اُن کی راہنمائی کے لیے رسول بھیجے اور کتابیں نازل کیں۔ اب اُن کا کوئی عذر قبول نہیں ہو گا۔ اور وہ عذاب کے مستحق ٹھہریں گے۔

ہر چیز ظاہر ہو گی

فرمایا ایسے لوگ خواہش کے باوجود وَلَا يَكْتُمُونَ اللّٰهَ حَدِيثًا اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کو چھپا نہیں سکیں گے۔ سورۃ طارق میں آتا ہے "يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ" قیامت کے دن تمام اندرونی راز ظاہر کر دیے جائیں گے، دُنیا میں انسان ہزاروں بھید چھپا جاتا ہے۔ "يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفَى مِنكُمْ خَافِيَةٌ" (الحاقہ) اُس دِن تم حاضر کیے جاؤ گے اور تم سے کوئی چیز چھپ نہیں سکے گی قرآن پاک میں دوسری جگہ موجود ہے کہ ایک موقع پر مشرکین اپنے شرک کا انکار کر دیں گے اور کہیں گے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ اللہ تعالیٰ ان کے مونہوں پہ مہر لگا دیں گے اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا اَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ اور مجرمین کے ہاتھ اور پاؤں گواہی دیں گے کہ مولا کریم اس نے فلاں فلاں جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ غرضیکہ اُس دن کوئی چیز چھپا نہیں سکیں گے اور اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے۔

درس بست وہشت ۲۸ — آیت ۴۳ نصف اوّل

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِىْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا

ترجمہ:۔ اے ایمان والو! نہ قریب جاؤ نماز کے اس حالت میں کہ تم نشے میں ہو جب تک کہ سمجھ نہ لو جو تم کہتے ہو اور نہ جنابت کی حالت میں (نماز کے قریب جاؤ) سوائے اس کے کہ راستے میں گزرنے والے ہو یہاں تک کہ تم غسل کرلو

ربط آیات

گذشتہ دروس میں وَاعْبُدُوا اللّٰہَ کا بنیادی عقیدہ بیان ہو چکا ہے۔ کہ عبادت صرف اللہ ہی کی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، اس کے بعد والدین، قرابتداروں اور دیگر ایسے لوگوں کے حقوق کا تذکرہ ہوا جن سے زندگی میں اکثر واسطہ پڑتا ہے پھر اللہ تعالٰے نے بخل کی مذمت بیان فرمائی۔ اور ریاکاری سے منع کیا۔ گذشتہ درس میں پھر ایمان اور انفاق فی سبیل اللہ کے تذکرہ کے بعد اللہ اور رسول کے اُن نافرمانوں کی حسرت بیان کی گئی کہ قیامت کے دِن وہ آرزو کریں گے کہ کاش وہ مٹی ہو جاتے تو جہنم کے ابدی عذاب سے بچ جاتے۔

نماز کی اہمیت

آج کے درس میں اللہ تعالٰی نے عبادت ہی کے سلسلہ میں نماز کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ عبادت میں نماز کو اولیت حاصل ہے۔ نماز چونکہ نہایت اعلٰی درجہ کی عبادت ہے۔ یہ گویا اللہ تعالٰی سے ہم کلام ہونے والی بات ہے تو اس کا تقاضا بھی یہ ہے کہ کہ انسان نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں کھڑا ہو۔ اور اگر یہ چیز پیدا نہ ہو۔ اور انسان کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے جو خشوع کے منافی ہو، تو اللہ تعالٰی نے ایسی حالت میں نماز پڑھنے سے منع فرما دیا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ نماز کے ذریعے

انسان میں خشوع اور عاجزی پیدا ہوتی ہے، اعضاء کے ساتھ آدمی آداب بجا لاتا ہے اور زبان سے اللہ تعالیٰ کی مناجات کرتا ہے۔ گویا نماز تکبر کے منافی ہے جس سے پہلے ہی منع کیا جا چکا ہے۔ اور اگر انسان نشے کی حالت میں ہوگا تو اس کے اندر خشوع نہیں ہوگا، انسان کی عقل کا توازن ہی قائم نہیں رہ سکتا، بے ہنگم حرکات کرنے لگتا ہے۔ نشہ کی حالت میں انسان کے دل میں عاجزی کا پیدا ہونا ممکن نہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ایسی حالت میں نماز سے روک دیا ہے۔

طہارت شرط نماز ہے

آج کے درس میں جو دوسری اہم بات بیان کی گئی ہے وہ طہارت ہے اور نماز جیسی اعلیٰ وارفع عبادت کرنے کے لیے طہارت شرط ہے، انسان کا جسم پاک ہو، لباس پاک ہو اور پھر وہ جگہ پاک ہو جہاں نماز ادا کرنا چاہتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے یہ بات قانون[1] کے طور پر سمجھا دی لا تقبل صلوٰۃ بغیر طھور یعنی طہارت کے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی۔ اس آیت کریمہ میں جو جنابت کا ذکر کیا گیا ہے، وہ غایت درجہ کی ناپاکی ہے۔ لہٰذا جنابت کی حالت میں بھی اللہ تعالیٰ نے نماز کے قریب جانے سے منع فرمادیا۔

گذشتہ درس میں کفار کی حسرت کا ذکر تھا، کاش وہ مٹی ہو جاتے اور آج کے درس میں طہارت کے لیے مٹی کو بھی ایک ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا گذشتہ درس کے ساتھ یہ بھی ایک مناسبت ہے۔

جنابت کی تعریف

جنابت کا معنیٰ دُوری ہے اس حالت میں انسان فرشتوں اور خدا تعالیٰ کی تجلیات سے دُور ہو جاتا ہے اس لیے ایسے شخص کو جنبی کہتے ہیں عربی زبان میں قرابت سے دور والے شخص پر بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے عربی شاعر کہتا ہے ؂

فلا تحرمنی نائلاً عن جنابة

فانی امرء وسط القباب غریب

بھائی مجھے اپنے عطیے سے محض اس لیے محروم نہ کرنا کہ میں تمہارے

---

[1] مسلم ص۱۱۹ ج۱ و ترمذی ص۲۶ (فیاض)

ساتھ قریبی تعلق نہیں رکھتا اور میں اس بستی میں اجنبی ہوں۔

جنابت خدا کی طرف سے حکمی حالت ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں جنبی آدمی کے مسجد میں داخلے کو حلال نہیں سمجھتا۔ حیض والی عورت کا بھی یہی حکم ہے۔ وہ بھی نہ مسجد میں داخل ہو سکتی ہے اور نہ طواف کر سکتی ہے۔ حضور علیہ السلام کے الفاظ ہیں وَلَا اُحِلُّ لِحَائِضٍ وَلَا جُنُبٍ ایسی حالت میں نہ قرآنِ پاک کو ہاتھ لگا سکتا ہے اور نہ زبانی تلاوت کر سکتا ہے اللہ تعالیٰ نے نماز پڑھنے کی بھی ممانعت فرما دی ہے۔

شرعی جنابت مادہ منویہ کا اخراج یا نفسِ جماع ہے۔ مباشرت میں اگر بدخوابی میں بھی مادہ خارج ہو جائے تو انسان ناپاک ہو جاتا ہے بعض آئمہ کرام فرماتے ہیں۔ کہ انسان جنبی اس صورت میں ہوتا ہے جب مادہ منویہ اچھل کر خارج ہو۔ البتہ امام شافعیؒ کا مسلک یہ ہے کہ مطلقاً مادہ خارج ہونے سے جنابت لازم آتی ہے خواہ یہ اخراج جریان کی وجہ سے ہو یا بدخوابی میں ہو جائے اور آدمی کو پتہ بھی نہ چلے کہ مادہ خارج ہو گیا ہے۔ اس صورت میں بھی غسل ضروری ہو جاتا ہے الغرض! یہ دونوں حالتیں نماز کے منافی ہیں۔ پہلی یہ کہ انسان نشے کی حالت میں ہو اور اُسے پتہ ہی نہ ہو کہ کیا کہ رہا ہے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ جنبی ہو جائے یا ناپاک ہو جائے۔

نشہ آور اشیاء

فرمایا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے ایمان والو! لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ نماز کے قریب نہ جاؤ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى اس حالت میں کہ تم نشے میں ہو۔ یہاں کونسا نشہ مراد ہے؟ بعض فرماتے ہیں کہ نشہ سے مراد حقیقی نشہ ہے جو شراب وغیرہ پینے سے آتا ہے۔ اس آیت کے نزول تک شراب کی قطعی حرمت نازل نہیں ہوئی تھی البتہ اس سے قبل سورۃ بقرہ میں شراب اور جوئے کے حسن و قبح بیان ہو چکے تھے "یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ" یعنی اے پیغمبر علیہ السلام! آپ سے شراب اور

جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ فرمادیں کہ ان میں بہت سا نقصان ہے تاہم لوگوں کے لیے کچھ فوائد بھی ہیں مگر ان میں نقصان کا پہلو زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شراب کی قباحت کے متعلق اس قدر اشارہ فرمادیا۔

آج کی آیت کی شان نزول کے متعلق ترمذی شریف اور مستدرک حاکم میں روایت موجود ہے کہ صحابی رسول حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے بعض دوسرے صحابہؓ کو کھانے کی دعوت دی۔ ان میں حضرت علیؓ بھی شامل تھے۔ کھانا کھانے کے بعد شراب کا دور بھی ہوا، جس سے بعض کو نشہ چڑھ گیا۔ اُدھر نماز کا وقت بھی ہو گیا، حضرت علیؓ کو امامت کے لیے آگے کھڑا کیا گیا، انہوں نے نشہ کی حالت میں قرآن پاک پڑھنے میں یہ غلطی کی کہ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ میں لَا حذف کر گئے جس کی وجہ سے معنیٰ بالکل ہی اُلٹ ہو گیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اے ایمان والو! نماز کے قریب نہ جاؤ اس حالت میں کہ تم نشہ میں ہو۔ حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ یہاں تک کہ تم سمجھ نہ لو جو کچھ تم کہتے ہو۔ گویا شراب کی خرابی کے متعلق یہ دوسرا حکم تھا جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ اور اس کے بعد سورۃ مائدہ میں وہ قطعی حکم آگیا جس کے مطابق شراب ہمیشہ کے لیے حرام قرار دیدی گئی۔

مجازی نشہ

بعض فرماتے ہیں کہ سُکٰرٰی سے مراد مجازی نشہ یعنی غفلت ہے۔ جب نیند کا غلبہ ہو یا غشی طاری ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ۔ نیند کے متعلق حضور علیہ السلام کا واضح ارشاد موجود ہے۔ کہ جب نیند کا غلبہ ہو اُس وقت نماز نہ پڑھو بلکہ سو جاؤ، جب نیند پوری کر لو تو پھر نماز پڑھو۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ نیند کی حالت میں تم اللہ سے بخشش طلب کرنا چاہو مگر زبان سے اپنے آپ کو گالیاں دینے لگو۔ لہٰذا نیند کے غلبے میں نماز نہ پڑھو۔ اگر نماز کا وقت جا رہا ہے تو پھر اس کا علاج یہ ہے کہ تازہ وضو کر و یا کوئی ایسی اور حرکت کرو جس سے نیند کا غلبہ دُور ہو جائے اور پھر نماز ادا کر لو۔

ہوش و حواس کی درستگی

حَتّٰی تَعۡلَمُوۡا میں بعض دیگر باتوں کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ نماز میں قرآن پاک کی قرأت ضروری ہے۔ قرآن کریم وہ عہد ہے جو خداوند کریم اور بندے کے درمیان ہو چکا ہے۔ اور بندہ اس عہد کو دہراتا رہتا ہے۔ "اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ" عہد ہی تو ہے۔ اگر کوئی شخص نشے کی حالت میں قرآن پاک پڑھے گا تو وہ کیا سمجھے گا کہ کیا کہہ رہا ہے۔ دنیا کے عہد و پیمان کا بھی طریقہ ہے کہ جب کوئی شخص کوئی اہم دستاویز تیار کرتا ہے، کوئی ہبہ یا بیع کرتا ہے، طلاق دیتا ہے، وصیت کرتا ہے یا کوئی اقرار نامہ یا (AGREEMENT) کرتا ہے۔ تو لکھتا ہے کہ میں یہ تحریر بقائمی ہوش و حواس کر رہا ہوں، گویا کسی عہد کو دہراتے وقت عقل و خرد کا درست ہونا ضروری ہے۔ اسی لیے فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ نشہ کے علاوہ نیند کی حالت میں بھی نماز ادا نہیں کرنی چاہیئے۔ نشہ آور اشیاء میں سے شراب ایک معروف چیز ہے جسے عربی میں خمر کہتے ہیں اور خمر عقل کو ڈھانپ لیتی ہے۔ جب عقل اور ہوش و حواس ہی قائم نہیں ہوں گے تو اُسے کیا معلوم ہوگا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ لہذا ایسی حالت میں نماز سے منع فرما دیا گیا۔

عربی تعلیم کی ضرورت

یہاں پہ ایک اور بات بھی ضمناً ہو جائے جو اگرچہ ضروری تو نہیں ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے اہم ضرور ہے۔ عربی زبان سے واقف آدمی جب نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ کیا پڑھ رہا ہے، مگر ایک عجمی آدمی قرآن پاک کی پوری تلاوت کر کے بھی کچھ نہیں سمجھ پاتا لہذا ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔ کہ وہ اس قدر عربی تو سیکھ لے جس سے اُسے علم ہو سکے کہ جو عہد وہ دہرا رہا ہے اس کا مطلب کیا ہے۔ انگریزی زبان سیکھنے کے لیے کتنی تگ و دو کی جاتی ہے۔ آج کل بچے کو ابتدا ہی سے انگریزی سکول میں داخل کروا دیا جاتا ہے تاکہ اور کچھ آئے یا نہ آئے اُسے انگریزی پہ دسترس حاصل ہو جائے۔ مگر نماز کے معاملہ میں مسلمانوں کی بہت بڑی غفلت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنا جو عہد دہراتے ہیں اُسے سمجھنے کی کوشش

ہی نہیں کرتے۔ زیادہ نہیں تو سورۃ فاتحہ کے علاوہ اُن چند ایک چھوٹی چھوٹی سورتوں کا ترجمہ ہی پڑھ لینا چاہیئے، جو کوئی شخص اکثر نماز میں پڑھتا ہے بہر حال یہ لازم نہیں ہے۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ نماز ضرور پڑھنی چاہیئے خواہ کوئی چیز سمجھ میں آئے یا نہ۔ اگر اس آیت میں تفھموا کا لفظ ہوتا تو ہر نمازی کے لیے قرأت کو سمجھنا ضروری ہو جاتا۔

نماز کی ممانعت

بہر حال فرمایا اے ایمان والو! نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ تم جان لو جو کچھ تم کہتے ہو۔ وَلَا جُنُبًا اور جنبی آدمی بھی نماز کے قریب نہ جائے اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ سوائے اس کے کہ وہ راستہ گزرنے والا ہو۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے۔ کہ کوئی شخص مسافر ہے اغسل کی ضرورت پڑ گئی ہے مگر پانی میسر نہیں یا اُس پر قادر نہیں تو اس کے لیے اجازت ہے کہ وہ اس وقت تک بغیر غسل کیے نماز پڑھے جب تک اُسے غسل کے لیے پانی میسر نہیں آتا۔ عابری سبیل کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ نماز کے محل یعنی مسجد میں داخل بھی نہ ہو۔ البتہ اگر وہاں سے بطور راستہ گزرنا ہو تو مسجد سے گذر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر مسجد میں بدخوابی ہو گئی ہے تو مسجد سے گزر کر باہر چلے جانا جائز ہے۔

بہر حال فرمایا دو حالتوں میں نماز کے قریب نہ جاؤ، اولاً یہ کہ تم نشے کی حالت میں ہو اور اس وقت تک نماز نہ پڑھو جب تک کہ تمہارا نشہ زائل ہو کر تم سمجھنے نہ لگو کہ کیا کہہ رہے ہو۔ اور ثانیاً یہ کہ اگر جنبی ہو جاؤ تو اُس وقت تک نماز کے قریب نہ جاؤ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا یہاں تک تم غسل کر لو۔

اب آیت کے اگلے حصے میں تیمم کا طریقہ بتایا جا رہا ہے۔ جس کے ذریعہ جنبی آدمی وقتی طور پر (جب تک پانی میسر نہ ہو) طہارت حاصل کر کے نماز ادا کر سکتا ہے۔

وَإِن كُنتُم مَّرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَآءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَآئِطِ أَوْ لَـٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَآءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُورًا ﴿٤٣﴾

ترجمہ: اور اگر تم بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص پست مقام (بیت الخلا) سے آئے یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو، پھر تم پانی نہ پاؤ۔ پس ارادہ کرو پاک زمین کا (طہارت حاصل کرنے کے لیے) پس ملو اپنے چہروں کو اور اپنے ہاتھوں کو اس کے ساتھ۔ بیشک اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنیوالا اور بخشش کرنیوالا ہے ﴿٤٣﴾

گذشتہ سے پیوستہ

آیت کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے دو حالتوں میں نماز پڑھنے کی ممانعت فرمادی۔ ایک نشہ کی حالت میں، جب تک کہ نشہ اُتر نہ جائے، اور انسان کے ہوش و حواس ٹھکانے نہ آجائیں اور دوسرا جنابت کی حالت میں جب تک کہ غسل نہ کر لیا جائے۔ اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے عبوری دور کے لیے طہارت حاصل کرنے کا طریقہ بتایا ہے کہ جب تک پانی میسر نہ ہو تیمم کر کے نماز پڑھ لو۔

طہارت بذریعہ تیمم

آیت کے اس حصّہ میں اللہ تعالیٰ نے تیمم کا طریقہ بیان فرمایا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ پانی سے طہارت کرنا، تیمم یعنی مٹی سے طہارت حاصل کرنا، اور خوشبو لگانا سب طہارت میں شمار ہوتے ہیں۔ پانی سے طہارت حاصل کرنا امر طبعی ہے۔ اور ہر شخص اس کے اثرات کو محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ پانی سے میل کچیل اور جسم کی نجاست دُور ہو جاتی ہے مگر

مٹی سے طہارت ایک پوشیدہ طہارت ہے تاہم یہ بھی ایک ذریعہ طہارت ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کے مطابق تیمم اس امت کی خصوصیات میں سے ہے امت آخر الزمان علیہ السلام سے پہلے کسی امت کو تیمم کی اجازت نہیں تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے آخری نبی کی آخری امت کے لیے اسے بھی ذریعہ طہارت بنا دیا۔ آپ نے فرمایا جُعِلَتْ لَنَا تُرْبَتُهَا طَهُوْرًا اگر پانی میسّر نہ ہو یا کوئی شخص پانی پر قدرت نہ رکھتا ہو تو پھر مٹی کے ساتھ طہارت حاصل کرے یہ طہارت ضروریہ کہلاتی ہے تاہم طہارت کا فطری ذریعہ پانی ہی ہے اللہ نے اس کی صفت بھی بیان فرمائی ہے وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ہم نے آسمان سے پاک پانی اتارا، جو خود بھی پاک ہے اور دوسری چیزوں کو بھی پاک کرتا ہے۔ جسم، کپڑا، برتن وغیرہ پانی سے ہی پاک کیے جاتے ہیں۔ اور جب پانی میسّر نہ ہو تو پھر وقتی طور پر مٹی بھی ذریعہ طہارت بن جاتی ہے۔ ہاں! بعض اوقات پانی کی موجودگی کے باوجود مٹی ذریعہ طہارت ہے۔ مثلاً اگر جوتے پر نجاست لگ گئی تو مٹی کے ساتھ کھرچنے سے نجاست دور ہو کر جوتا پاک ہو جائے گا بشرطیکہ نجاست جوتے کے اندر جذب نہ ہو چکی ہو۔ اسی طرح موزے، آئینے، تلوار یا چھری وغیرہ کو نجاست لگ جائے تو مٹی ملنے سے پاک ہو جاتی ہیں۔ گویا مٹی بھی ایک ذریعہ پاکیزگی ہے۔

بہرحال حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ایک تو تیمم اس امت کی خصوصیات میں سے ہے اور دوسری خصوصیت یہ ہے جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا میرے لیے پوری زمین کو مسجد بنا دیا گیا۔ بشرطیکہ جگہ پاک ہو۔ چند ایسی جگہوں کو جہاں عام طور پر نجاست ہوتی ہے۔ نماز کے منافی قرار دے دیا گیا ہے وگرنہ ساری زمین جہاں کوئی چاہے نماز پڑھ سکتا ہے۔ سابقہ امتوں کے لوگ صرف اپنے عبادت خانوں میں ہی عبادت کر سکتے تھے، مگر اس امت کے لیے ہر پاک جگہ پر نماز پڑھنا روا ہے۔

تیمم کی وجوہات

اب اس حصہ آیت میں وہ وجوہات بیان کی جا رہی ہیں جن کے پیدا ہونے پر کوئی شخص تیمم کے ذریعے پاکیزگی حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ اُسے پانی میسر نہ ہو یا وہ پانی پر قادر نہ ہو۔ تیمم کرنے کے بعد کوئی شخص نماز پڑھ لے گا، مسجد میں چلا جائے گا، قرآن پاک کو ہاتھ لگا سکے گا یا کوئی دیگر عبادت انجام دے سکے گا۔ تو فرمایا وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اور اگر تم مریض ہو، مرضیٰ مریض کی جمع ہے۔ یعنی تم میں سے کوئی شخص ایسی بیماری میں مبتلا ہے جس میں پانی کا استعمال بیماری میں اضافہ کا باعث بن سکتا ہے، یا ہلاکت کا خطرہ ہے، تو پانی استعمال نہ کرے بلکہ تیمم کر کے نماز ادا کرے۔ دوسری صورت یہ ہے اَوْ عَلٰى سَفَرٍ یا تم سفر میں ہو۔ بعض اوقات سفر میں پانی میسر نہیں آتا۔ ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے اور میلوں دور تک پانی میسر نہیں ہوتا تو ایسی صورت میں بھی تیمم کیا جا سکتا ہے۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام صحابہؓ کی ایک جماعت کے ہمراہ سفر پر تھے۔ پانی ختم ہو گیا۔ اتنے میں ایک عورت ملی جس کے اونٹ پر پانی لدا ہوا تھا۔ صحابہؓ نے اُس عورت سے پانی کا مقام دریافت کیا، تو اس نے بتایا کہ یہاں قرب وجوار میں کہیں پانی میسر نہیں۔ میں چوبیس گھنٹے کی مسافت سے پانی لائی ہوں۔ میری پرورش میں یتیم بچے ہیں جو پانی کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ میں یہ پانی ان کے لیے جا رہی ہوں۔ حضور علیہ السلام نے اُس کی سواری کو بٹھایا اور صحابہ کو پانی حاصل کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ کچاوے کے مشکیزے کو نچلی طرف سے کھول کر پانی حاصل کیا گیا۔ حضور علیہ السلام نے دُعا فرمائی اور عورت سے کہا کہ ہم نے تیرے پانی میں کوئی کمی نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ پانی اپنی مہربانی سے عطا فرمایا ہے، تیرا کجاوہ اُسی طرح بھرا ہوا ہے۔ پھر صحابہؓ نے کچھ اناج اور کپڑے وغیرہ اکٹھا کر کے اُس عورت کو دے دیے۔ وہ عورت خوش ہو گئی۔ اس واقعہ کا تذکرہ اُس نے اپنے علاقہ میں جا کر کیا تو اللہ تعالیٰ نے وہاں کے تمام لوگوں کو ایمان کی دولت نصیب فرمائی۔ بہرحال یہ ایک معجزہ تھا جو ظہور پذیر

ہوا ہے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ بعض اوقات انسان ایسی جگہ سفر کرتا ہے جہاں دور دور تک پانی میسر نہیں ہوتا، ریگستان ہے یا کوئی پہاڑی علاقہ ہے کہ ہر جگہ پانی موجود نہیں ہوتا، تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے پاک مٹی سے تیمم کی اجازت مرحمت فرمادی۔

تیمم کے لیے تیسری وجہ فرمایا اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ یا تم میں سے کوئی پست مقام سے آیا۔ غائط پست یا نچلی جگہ کو کہتے ہیں اور مراد جائے قضائے حاجت ہے کیونکہ عام طور پہ انسان قضائے حاجت کے لیے پست جگہ کی اوٹ لیتے ہیں تاکہ کسی کی نظر نہ پڑے۔ بہر حال اس کا معنیٰ ہے اِسْتِفْرَاغ عَنِ الْبَوْلِ وَالْبَرَازِ یعنی بول و براز سے فراغت تو قضائے حاجت کے بعد اگر پانی میسر نہ ہو تو تیمم کر کے نماز ادا کی جاسکتی ہے۔

تیمم کے جواز کی چوتھی وجہ یہ ہے۔ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو۔ لمس کا لغوی معنیٰ چھونا یا ہاتھ لگانا ہے۔ البتہ اس کے اصطلاحی معنیٰ میں فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما لمس سے مراد مباشرت لیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے بھی یہی مسلک اختیار کیا۔ بعض دوسرے فقہائے کرام اسے لغوی معنوں پہ ہی محمول کرتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ کہ اگر عورت کو محض ہاتھ لگا دیا تو وضو ٹوٹ جائیگا، امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے مگر عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے علاوہ عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ اس سے مباشرت ہی مراد لیتے ہیں۔ البتہ امام مالک رحمہ اللہ کا تیسرا مسلک ہے کہ اگر مرد و زن ایک دوسرے کو شہوت کے ساتھ ہاتھ لگائیں تو وضو ٹوٹ جائیگا اور اگر بلا ارادہ اتفاقاً ہاتھ لگ جائے تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔

تیمم کا طریقہ

بہر حال ان چار صورتوں میں کہ کوئی بیمار ہو یا سفر پہ ہو یا قضائے حاجت کے بعد آیا ہو یا عورت کو چھوا ہو فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً پھر نہ پاؤ پانی یعنی فوری طور پہ پانی میسر نہیں ہے یا تم پانی پر قادر نہیں ہو فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا

پس قصد کرو پاک مٹی کا یا پاک زمین کا۔

تیمم کا لفظی معنی قصد اور ارادے کا ہے اور مراد قصد الصعید للتطہیر ہے۔ یعنی پاک مٹی سے طہارت حاصل کرنا۔ اور اس کا طریقہ یہ فرمایا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ پس ملو اپنے چہروں کو وَأَيْدِيكُمْ اور اپنے ہاتھوں کو اس کے ساتھ۔ یعنی مٹی پر ہاتھ مار کر اسے اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مل لو۔ یہ تیمم ہو جائے گا۔ البتہ اس معاملہ میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔ کہ ایک ہی دفعہ مٹی پر ہاتھ مار کر چہرے اور ہاتھوں پر ملنا کافی ہے یا چہرے کے لیے اور ہاتھوں کیلئے علیحدہ علیحدہ یعنی دوبار مٹی پر ہاتھ مارنا ہوگا۔ امام احمدؒ اور بعض دیگر محدثین ایک ہی ضرب کے قائل ہیں کہ ایک دفعہ ہاتھ مارنے سے دونوں اعضاء پر پھیر لینا چاہیئے۔ البتہ امام شافعیؒ، امام ابوحنیفہؒ اور دیگر فقہائے کرام دو ضرب کا فتویٰ دیتے ہیں۔ پہلی دفعہ مٹی پہ ہاتھ مار کر چہرے کے اُتنے حصے پر مل لیا جاوے جتنا حصہ وضو میں دھویا جاتا ہے۔ پھر دوسری دفعہ ہاتھ مار کر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے لے کر کہنیوں سمیت مل لیا جاوے۔ بعض ہاتھوں کی کلائیوں تک ملنا کافی سمجھتے ہیں اور امام زہریؒ وغیرہ بغلوں تک کہتے ہیں مگر صحیح قول پہلا ہی ہے یعنی کہنیوں تک ملنا چاہیئے۔ مستدرک حاکم کی روایت میں حضرت جابرؓ کے مطابق ہر دو اعضا کے لیے علیحدہ علیحدہ ضرب اور مرفقین یعنی دونوں کہنیوں کے لفظ آتے ہیں۔ روایت اگرچہ درجہ دوم کی ہے مگر قابل استدلال ہے۔ اور وضو پر محمول کرتے ہوئے تیمم بھی کہنیوں تک کیا گیا ہے۔ بہرحال یہ تیمم کا طریقہ بتا دیا گیا ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر اگلی سورۃ مائدہ میں بھی آئے گا۔ وضو کی ضرورت ہو یا غسل کی اتنا تیمم کر لینا کافی ہے۔

حضرت عمارؓ کو تیمم کا طریقہ نہیں آتا تھا۔ انہیں غسل کی ضرورت پڑی تو کپڑے اتار کر مٹی میں لوٹ پوٹ ہو گئے۔ پھر جب حضور کی خدمت میں یہ عمل پیش کیا۔ تو آپ نے فرمایا غسل کی طرح سارے جسم پر مٹی ملنا ضروری نہیں تھا

بلکہ صرف چہرے اور ہاتھوں پر مل لینا کافی ہوتا ہے بہر حال حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مٹی ذریعہ طہارت ہے اگر دس سال تک بھی پانی میسر نہ آئے تو مٹی سے طہارت حاصل ہوتی رہے گی۔

مٹی ذریعہ فلاح

ترمذی شریف میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ خط لکھو تو اس پر مٹی مل لیا کرو کہ یہ ذریعہ کامیابی ہے۔ آج کل تو پٹر والی سیاہی استعمال ہوتی ہے جو فوراً خشک ہو جاتی ہے۔ گذشتہ زمانے میں عام سیاہی سے خط لکھتے تھے، جو جلدی خشک نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے اس کو سیاہی چوس سے چوس لیتے تھے یا اوپر مٹی ڈال کر خشک کر لیتے تھے۔ حضور کا یہ فرمان کہ فَاِنَّهٗ اَنْجَحُ لِلْحَاجَةِ مٹی ڈالنا ذریعہ فلاح ہے یہ دو طریق سے ہے۔ اولاً یہ کہ اگر خط لکھ کر فوراً خط کو لپیٹ دیا جائے تو حروف مٹ جاتے ہیں اور مطلب حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ سیاہی خشک کر لینے سے خط درست حالت میں منزل مقصود تک پہنچ کر کامیابی کا ضامن ہوتا ہے اور کامیابی کی دوسری توجیہہ محدثین کرام اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ بھی یہ فرماتے ہیں۔ کہ مٹی کے استعمال میں عاجزی پائی جاتی ہے۔ اللہ نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا "خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ" اور اپنی اصل یعنی مٹی کی طرف رجوع کمال چیز ہے مٹی میں عاجزی اور انکساری کا عنصر پایا جاتا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے۔ لہذا یہ کامیابی کی دلیل ہے۔ اپنی اصل کی طرف رجوع کرنے سے انسان کو طہارت بھی حاصل ہوتی ہے اس لیے پاکیزگی کے لیے مٹی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے یعنی تیمم کیا جاتا ہے۔

اشکال اور جواب

بعض ذہنوں میں یہ اشکال پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ پانی کے ذریعے تو طہارت حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ پانی میل کچیل اور گندگی کو بہا لے جاتا ہے مگر مٹی سے کیونکر پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ اس اشکال کے ازالہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی دو صفات کا تذکرہ فرمایا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا بیشک اللہ تعالےٰ

معاف کرنے والا ہے۔ یعنی اے مخاطب! اگر تمہیں طہارت میں کوئی خامی محسوس ہوتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے۔ طہارت بہر حال ہو جائیگی۔ اور اگر کوئی کوتاہی رہ گئی ہے تو اللہ تعالیٰ غفور بھی ہے۔ وہ بخشش کرنے والا ہے، لہٰذا اس معاملہ میں فکر نہ کرو۔ بعض حالات میں انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ غسل کی ضرورت ہے مگر پانی میسّر نہیں۔ اُدھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش بھی ہونا ہے، مسجد میں جانا ہے، قرآن پاک کی تلاوت کرنی ہے کوئی اور ایسا کام کرنا ہے جس کے لیے طہارت ضروری ہے تو فرمایا بغیر کسی وہم کے تیمم کر لو اور اپنے رب کی عبادت میں مشغول ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

والمحصنٰت ۵ | النسآء ۴
درس سی ۳۰ | آیت ۴۴ تا ۴۶

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُونَ
الضَّلٰلَةَ وَيُرِيدُونَ أَنْ تَضِلُّوا السَّبِيلَ ﴿۴۴﴾ وَاللهُ أَعْلَمُ
بِأَعْدَائِكُمْ وَكَفٰى بِاللهِ وَلِيًّا وَّكَفٰى بِاللهِ نَصِيرًا ﴿۴۵﴾
مِنَ الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ
وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ
وَّرَاعِنَا لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّينِ وَلَوْ أَنَّهُمْ
قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا
لَّهُمْ وَأَقْوَمَ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا
يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۴۶﴾

ترجمہ: کیا نہیں دیکھا تو نے اُن لوگوں کی طرف جن کو دیا گیا کچھ حصہ کتاب سے، خریدتے ہیں گمراہی اور ارادہ کرتے ہیں کہ تم بھی سیدھے راستے سے گمراہ ہو جاؤ ﴿۴۴﴾ اور اللہ تعالےٰ خوب جانتا ہے تمہارے دشمنوں کو، اور کافی ہے اللہ کارسازی کرنے والا اور کافی ہے اللہ مدد کرنیوالا ﴿۴۵﴾ بعض ان لوگوں میں سے جو یہودی ہوئے وہ تبدیل کرتے ہیں کلمات کو ان کے ٹھکانے سے اور وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سُن لیا اور ہم نہیں مانیں گے۔ اور سُن اور تو نہ سُنایا جائے۔ اور راعنا (کا لفظ کہتے ہیں) موڑ کر اپنی

زبانوں کو اور عیب نکالتے ہیں دین میں۔ اگر یہ لوگ یوں کہتے کہ ہم نے سُن لیا اور ہم نے اطاعت کی اور تو سُن اور ہماری طرف دیکھ تو یہ اُن کے لیے بہتر ہوتا اور زیادہ درست ہوتا۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے ان پر لعنت کی ہے اُن کے کفر کی وجہ سے۔ پس نہیں ایمان لاتے مگر بہت کم (۴۶)

ربطِ آیات

اہل کتاب کی برائیوں کا تذکرہ گذشتہ آیات میں بھی گزر چکا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالےٰ نے وراثت کے مسائل اور محرمات نکاح بیان کیے۔ پھر معاشرتی مسائل کی تشریح، اہل کتاب کے مال و علم میں بخل اور دوسروں کو بخل کی ترغیب کا بیان تھا۔ اس کے بعد نیکی بدی کا انجام اور قیامت کے محاسبے کا تذکرہ ہوا۔ درمیان میں اللہ تعالیٰ نے خاص مناسبت سے نماز کا ذکر کیا کہ نشے اور جنابت کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔ پھر پانی کی عدم موجودگی میں طہارت کے لیے تیمم کا طریقہ بتلایا، اور اب اِن آیات میں پھر اہل کتاب کی مکاری اور اسلام دشمنی کا ذکر فرمایا ہے، اس تذکرہ کے دو بنیادی مقاصد ہیں۔ ایک مقصد تو یہ ہے، کہ اہل اسلام کو باور کرایا جائے کہ یہود و نصاریٰ اُن کے دشمن ہیں، وہ ہمیشہ نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں لہٰذا مسلمانوں کو محتاط رہ کر دشمن سے اپنا دفاع کرنا چاہیئے۔ اہل کتاب مسلمانوں کے اسی طرح ازلی ابدی دشمن ہیں جس طرح شیطان پوری نسلِ انسانی کا دشمن ہے اور اللہ تعالیٰ نے بار بار اس کے شر سے محفوظ رہنے کی تلقین کی ہے

اہلِ کتاب کے تذکرے کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ اہلِ اسلام یہود و نصاریٰ میں پائی جانے والی بیماریوں، بخل، حسد، تحریف، کتمانِ حق وغیرہ سے محتاط رہیں تاکہ یہود و نصاریٰ کی طرح یہ بیماریاں اُن میں بھی پیدا نہ ہو جائیں۔

اہل کتاب کی علمی خامیاں

ارشاد باری تعالیٰ ہے اَلَمْ تَرَ کیا آپ نے نہیں دیکھا، یہ علمی رؤیت ہے، اور مطلب یہ ہے کہ کیا آپ کو معلوم نہیں ہوا۔ اِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتٰبِ کہ وہ لوگ جنہیں دیا گیا کتاب کا کچھ حصہ، نصیباً کا لفظ نکرہ ہے اور اس کا معنیٰ کچھ حصہ ہے اس کے دو معانی ہو سکتے ہیں۔ کتاب کے کچھ حصے سے ایک تو یہ مراد ہو سکتی ہے کہ یہود و نصاریٰ

کے پاس کتاب الٰہی کے صرف الفاظ ہی باقی ہیں اور یہ لوگ ان الفاظ کے معانی تک رسائی حاصل نہیں کرتے۔ یعنی زبان سے کتاب کے الفاظ ادا کرتے ہیں مگر نہ تو دل سے اُن احکام کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ ہی اُن پر عمل کرتے ہیں۔ یہ بہت بڑی گمراہی ہے۔ کہ کسی چیز پر بظاہر ایمان ہو مگر عملی طور پر اس کی مخالفت کی جائے۔ یہ بیماری اب اہل کتاب سے نکل کر مسلمانوں میں بھی پھیل چکی ہے۔ مسلمانوں کی حالت بھی اب یہ ہے۔ کہ قرآن پاک کے الفاظ تو تلاوت کرتے ہیں مگر نہ تو ان الفاظ کے معانی جانتے ہیں اور نہ ان پر عمل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص کسی قانون کا مطلب ہی نہیں سمجھتا تو اس پر عمل کیا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اشارتاً اہل اسلام کو بھی سمجھایا کہ اگر تم بھی یہودیوں کی طرح محض الفاظ ہی کو دہراتے رہے تو پھر اُن کی طرح تمہیں بھی فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔

نَصِيبًا مِّنَ الْكِتٰبِ کا دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ اہلِ کتاب کے پاس اُن کی کتاب کی کچھ یعنی چند ایک باتیں ہی سلامت ہیں باقی سب کچھ انہوں نے خود اپنے ہاتھوں بگاڑ دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کی کتاب کو تبدیل کر دیا ہے، اُس میں تحریف کے مرتکب ہوئے ہیں۔ تاہم کچھ نہ کچھ باتیں ضرور اُن کے پاس موجود ہیں جو تحریف کی دست برد سے محفوظ اور اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق ہیں۔ عیسائیوں کے بڑے بڑے پادری آج بھی تسلیم کرتے ہیں کہ انجیل مقدس میں تین ہزار سے زیادہ اغلاط موجود ہیں۔ یہ انہی پادریوں کی تحریف کا نتیجہ ہے۔ بہرحال تحریف سے محفوظ کچھ حصہ کے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک بھی موجود ہے کہ شادی شدہ زانی کو سنگسار کرنے کی سزا آج بھی موجود ہے۔ تورات میں یہ بھی موجود ہے کہ جو شخص اپنی پڑوسی کی بیوی سے زنا کرے وہ جان سے مارا جائے گا۔ اس قسم کے احکام اب بھی موجود ہیں مگر یہ لوگ معنوی تحریف کی بناء پر ان پر عمل سے قاصر ہیں بہرحال نصیبًا کا مطلب یہ ہے۔ کہ اہلِ کتاب کی کتب میں سے

کچھ نہ کچھ صحیح حصہ اب بھی اُن کے پاس موجود ہے۔ مگر اُن کا عمل وہ ہے جس کا تذکرہ آیت کے اگلے حصّے میں آرہا ہے۔

مکروہ عزائم

فرمایا اِن لوگوں کی حالت یہ ہے یَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ ایمان اور توحید قبول کرنے کی بجائے گمراہی خریدتے ہیں۔ گویا احکامِ الٰہی میں تحریف کر کے خود بھی گمراہ ہوئے ہیں وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِیْلَ اور تمہیں بھی گمراہ کرنا چاہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو خبردار کیا ہے۔ کہ اہلِ کتاب کے مکروہ عزائم سے ہوشیار رہیں تاکہ وہ تمہیں بھی گمراہ نہ کر دیں۔ وہ تمہیں صراطِ مستقیم پر گامزن نہیں دیکھنا چاہتے۔ اسی سورۃ کے پانچویں رکوع میں پہلے بھی اُن کی اس قبیح حرکت کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ وَیُرِیْدُ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِیْلُوْا مَیْلًا عَظِیْمًا کہ خواہشات کے پجاری تمہیں اصل رستے سے دُور لے جانا چاہتے ہیں، لہٰذا اُن کی مکاریوں سے خبردار رہیں۔

اہلِ ایمان کو گمراہ کرنے کے لیے یعنی اُن کو اُن کے دین سے بیزار کرنے کے لیے اہلِ کتاب اربوں روپے خرچ کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو قرآن پاک کی تعلیمات سے ہٹانے اور نبی آخر الزماں سے اُن کا تعلق منقطع کرنے کے لیے اُن کی پوری مشنیری حرکت میں ہے۔ اس معاملہ میں اہلِ ہنود بھی یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ ہیں تاہم اس معاملہ میں یہودی سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی خصوصی مذمت بیان فرمائی ہے ہر ملک میں اہلِ کتاب کی مشنریاں موجود ہیں جن کے ذریعے وہ سکول اور ہسپتال قائم کرتے ہیں اور پھر جذبہ خدمت کا اظہار کر کے اہلِ ایمان کو اپنے دام میں پھنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے مذموم عزائم کا تذکرہ مختلف انداز میں مختلف سورتوں میں موجود ہے۔

مشرقی علوم سے واقف مغربی ممالک کے باشندے مستشرق کہلاتے

ہیں۔ یہ لوگ مشرقی علوم یعنی عربی، فارسی وغیرہ سیکھ کر اسلامی علوم کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر ریسرچ یعنی تحقیق کے نام پر قرآن وحدیث کی تفاسیر شائع کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے یورپ اور امریکہ میں تحقیقاتی کمیٹیاں بنی ہوئی ہیں جو بظاہر قرآن و سنت پر تحقیق کرتے ہیں۔ اور مسلمانوں پر احسان جتلاتے ہیں کہ وہ ان کے لیے علمی میدان صاف کر رہے ہیں مگر در پردہ مسلمانوں میں گمراہی پھیلا رہے ہیں۔ ایسی الٹی سیدھی تعبیریں کرتے ہیں جن سے مسلمان اپنے دین سے بیزار ہو جائیں اس ضمن میں انہوں نے لغت (DICTIONARY) کو بھی تختہ مشق بنایا ہے اور الفاظ کے غلط معانی شائع کر کے مسلمانوں پر شب خون مارنے کی سعی کی ہے۔ عربی انگریزی ڈکشنری میں انہوں نے عیسٰے کا معنی ابن اللہ (خدا کا بیٹا) کیا ہے جو کہ سراسر غلط ہے۔ چونکہ عیسائیوں کا اپنا عقیدہ یہی ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں اس لیے انہوں نے یہی معنی ڈکشنری میں لکھ دیا ہے۔ تاکہ ڈکشنری کا مطالعہ کرنے والے لوگوں کے ذہنوں میں بھی یہی معنی راسخ ہو جائے اور اس طرح وہ اپنے عقیدے اور دین سے دور ہو جائیں۔ اسی لیے فرمایا کہ جن لوگوں کو کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا ہے وہ خود بھی گمراہی کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں اور تمہیں بھی صراط مستقیم سے بھٹکا دینا چاہتے ہیں۔

خدا پر بھروسہ

فرمایا وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ اللہ تعالیٰ تمہارے ان دشمنوں کو خوب جانتا ہے۔ اگر تمہارا یقین اللہ مالک الملک پر مضبوط رہا اور تم حق بات پر جمے رہے تو پھر تمہیں کوئی خطرہ نہیں وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا اور اللہ کافی ہے کارسازی کرنے والا۔ تم اُسی کو کارساز سمجھتے ہوئے صراط مستقیم پر چلتے رہو۔ اسی پر بھروسہ رکھو وَكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا اور کافی ہے اللہ مددگار۔ اگر خدا کی مدد پر بھروسہ رکھو گے، اپنے دین پر قائم رہو گے تو کوئی دشمن تمہیں زک نہیں پہنچا سکتا۔ یہ اصول کی بات ہے کہ دشمن کا وار اسی وقت کارگر ہو گا جب تم اپنے دین سے پھسل جاؤ گے، خدا تعالیٰ کی ذات

پر اعتماد کمزور پڑ جائے گا، اعتقاد بگڑ جائے گا، اور گناہ کا ارتکاب کرنے لگو گے۔ ہاں! "وَمَنۡ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجۡعَلۡ لَّهٗ مَخۡرَجًا" جو اللہ سے ڈرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے ضرور کوئی نہ کوئی راستہ بنا دیتا ہے۔ لہذا اللہ سے ڈرتے رہو اور اس کے دین پر قائم رہتے ہوئے دشمنانِ دین کا مقابلہ کرو۔ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے تمہیں کہاں کہاں کامیابی عطا کی۔ بدر حنین میں کیسے اسباب پیدا کیے، تبوک، یرموک اور قادسیہ کی جنگوں میں مسلمانوں کی کس طرح مدد فرمائی، جب تک مسلمان اللہ کے دین پر قائم رہے اللہ تعالیٰ کی نصرت شاملِ حال رہی۔ مگر جب ان میں بگاڑ پیدا ہو گیا تو بڑی بڑی سلطنتیں ختم ہو گئیں، خلافت اڑ گئی اور مسلمان برطانیہ، امریکہ اور روس سے مغلوب ہو کر رہ گئے۔ ہر جگہ ذلت و خواری کا منہ دیکھنا پڑا۔ آج ہماری حالت بھی یہودیوں سے کسی طرح کم نہیں۔ عقائد بگڑ چکے ہیں۔ اللہ کی عظیم کتاب کے الفاظ کا احترام ضرور ہے مگر نہ اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ کوئی عمل ہے۔

تحریف کلمات

گذشتہ آیات میں گذر چکا ہے۔ کہ یہودی اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ فضل کو چھپا جاتے ہیں۔ فضل سے مراد وہ مال و دولت بھی ہے جسے بخل کی وجہ سے چھپاتے ہیں اور وہ علم بھی جسے وہ اپنی ضد اور عناد کی بناء پر دوسروں تک نہیں پہنچاتے۔ اب یہاں پر یہودیوں کی تحریف کلمات کی خصلت بیان ہو رہی ہے مِنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا یہودیوں میں سے بعض لوگ ایسے ہیں۔ يُحَرِّفُوۡنَ الۡكَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِهٖ جو کلمات کو ان کے مواقع سے تبدیل کر دیتے ہیں۔ یہودیوں نے اپنے حسد، بغض، عناد کی بناء پر اور چوہدراہٹ کے تحفظ کی خاطر کتاب میں تحریف کی، عیسائیوں نے بھی اپنی کتاب کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ مکے کے مشرکین نے بھی اسی لیے رسول آخر الزمان کا انکار کیا کہ ایمان لے آنے سے ان کی برتری ختم ہو جاتی تھی، انہیں اطاعت کرنا پڑتی تھی یہود و نصاریٰ آج بھی اپنی اسی پرانی ضد پہ اڑے ہوئے ہیں۔

اور نہ صرف خود قبولِ اسلام سے انکاری ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اپنے دین سے برگشتہ کرنا چاہتے ہیں۔ بہرحال انہوں نے اپنی کتاب میں ہر اُس مقام پر تحریف کی جس میں اسلام کی حقانیت اور نبی آخر الزمان کی آمد کی پیشگوئیاں موجود تھیں۔ عیسائیوں نے انجیل مقدس سے فارقلیط کا لفظ ہی حذف کر دیا اور اسکی جگہ کوئی دوسرا لفظ ڈال دیا۔ سریانی زبان کا فارقلیط اور عربی کا احمد ہم معنی الفاظ ہیں۔ چونکہ حضور علیہ السلام کی آمد کی پیش گوئیاں انجیل میں موجود تھیں، اس لیے انہوں نے یہ لفظ ہی اڑا دیا عیسیٰ علیہ السلام تو اپنے ہر وعظ میں فرماتے تھے "اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ" میں اللہ کا رسول ہوں "مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ" میں اپنے سے پہلی کتاب تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں "وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ" اور اپنے بعد آنے والے رسول کی بشارت دینے والا ہوں جن کا نامِ نامی اور اسم گرامی احمد ہوگا۔ بہرحال عیسائیوں نے یہ لفظ ہی اڑا دیا تاکہ نہ یہ نام ہوگا اور نہ انہیں آخری نبی پر ایمان لانا پڑے گا۔ یہ تحریف کی بدترین مثال ہے۔

لفظی ہیرا پھیری

یہ تو اُن کی اپنی کتاب میں تحریف کرنے کا تذکرہ تھا۔ اب آگے اللہ تعالیٰ نے اُن کے اُس ناروا سلوک کا تذکرہ کیا ہے جو وہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ کرتے تھے۔ ارشاد ہے۔ وَیَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا جب نبی علیہ السلام کی مجلس میں آکر بیٹھتے ہیں اور اُن کے فرمودات سُنتے ہیں تو زبان سے کہتے ہیں، ہم نے سُن لیا۔ مگر ان کی بدبختی کی انتہا یہ ہے کہ زبانی اقرار کے ساتھ ہی دل میں کہتے ہیں وَعَصَیْنَا اور ہم نہیں مانیں گے۔ یعنی ان احکام کی تعمیل ہم سے نہیں ہو سکتی۔ علاوہ ازیں جب وہ خود حضور علیہ السلام سے مخاطب ہوتے تو کہتے وَاسْمَعْ یعنی آپ سنیں غَیْرَ مُسْمَعٍ اور نہ سنائے جائیں۔ اس قسم کے ذو معنی الفاظ بول کر وہ لوگ بظاہر تو اہلِ ایمان کی عزت افزائی کرتے تھے مگر ان کے دلوں میں عناد کی خباثت ہوتی تھی وَاسْمَعْ

غَيْرَ مُسْمَعٍ ایک معنیٰ تو یہ ہے کہ حضور! آپ ہماری بات سنیں اور آپ کو اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات نہ سنائی جائے۔ گویا آپ کی عزت واحترام کرتے تھے۔ کہ دینِ حق کا بول بالا ہو اور اس کے خلاف کوئی بات آپ تک نہ پہنچے۔ مگر ان کے دِل میں یہ مفہوم ہوتا تھا۔ کہ آپ ہماری بات تو سُن لیں مگر آپ نہ سُنائے جائیں یعنی آپ کے کان ہی ضائع ہو جائیں جن سے آپ کوئی بات سن سکیں۔ غَيْرَ مُسْمَعٍ کا توہین آمیز یہ مطلب بھی اُن کے ذہن میں ہوتا تھا۔ کہ آپ کوئی اچھی بات نہ سن سکیں۔ اس طرح گویا وہ بد دعائیہ کلمات بھی کہتے تھے۔

وَرَاعِنَا لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ وہ بدبخت اپنی زبانوں کو موڑ کر راعنا کا لفظ بھی بولتے تھے کہ حضور! ہماری رعایت کریں یعنی ہماری طرف توجہ فرمائیں مگر ان کے دل میں عبرانی زبان کا راعن ہوتا تھا جس کا معنیٰ احمق ہے۔ اس کے علاوہ عربی میں راعی چرواہے کو بھی کہتے ہیں گویا وہ زبان کو گھما کر لفظ کو بگاڑ دیتے تھے جس سے وہ ذومعنی بن جاتا تھا اور وہ اپنی خباثت کا اظہار کر لیتے تھے۔ یہ لفظ پہلے سورۃ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے لَا تَقُولُوا رَاعِنَا یعنی حضور علیہ السلام کو مخاطب کرنے کے لیے راعنا کا لفظ استعمال نہ کرو بلکہ اس کی بجائے وَقُولُوا انْظُرْنَا کہو ہماری طرف نظر کریں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اہل کتاب حضور علیہ السلام کی شان میں اس قسم کی گستاخی کرتے تھے۔ لہٰذا اہل ایمان کو اس قسم کے ذومعنی الفاظ استعمال کرنے سے منع فرما دیا۔

دین پر نکتہ چینی

فرمایا یہودیوں کی ایک بری خصلت یہ بھی ہے وَطَعْنًا فِي الدِّينِ دین میں طعن کرتے ہیں۔ اسلام کے احکام پر نکتہ چینی کرتے ہیں مثلاً محرمات نکاح کے سلسلے میں جب تمام حرام رشتوں کی وضاحت ہوئی تو یہودی کہنے لگے دیکھو جی! مسلمانوں کا دین پھوپھی کی بیٹی سے تو نکاح کو جائز قرار

دیتا ہے مگر بھتیجی سے نکاح حرام کیا ہے۔ جب تیمم کا مسئلہ بیان ہوا تو کہنے لگے کہ مسلمانوں نے نیا طریقہ نکالا ہے۔ اگر پانی نہ ملے تو مٹی مل لیا کرو۔ بھلا یہ طہارت ہے یا نجاست۔ بہر حال وہ لوگ دین میں طعن کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے تھے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا "قَاتِلُوا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ" بڑے بڑے کافر بے ایمان ہیں۔ لہٰذا ان سے مقابلہ اور جنگ کرو۔ "طَعَنُوا فِي دِينِكُمْ" یہ تمہارے دین میں طعن کرتے ہیں، عیب جوئی کرتے ہیں یہ کام آج کے ائمہ الکفر بھی بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ یورپین مشنریاں ہنود اور یہود ہمیشہ دین حق کی عیب جوئی میں لگے رہتے ہیں۔ تعدد ازدواج پر یہ لوگ ہمیشہ معترض رہے۔ کہ دیکھو! اسلام عیاش پرست مذہب ہے۔ اس میں چار شادیوں کی اجازت ہے، وغیرہ وغیرہ

لعنت کے مستحق

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر یہ لوگ اپنی ہٹ دھرمی ترک کر کے دین اسلام کو قبول کر لیتے۔ وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا اور اگر وہ یوں کہتے سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ہم نے سن لیا اور ہم اسے مانیں گے وَاسْمَعْ آپ ہماری بات سنیں وَانْظُرْنَا اور ہماری طرف دیکھیں لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ تو ایسا کہنا ان کے لیے بہتر ہوتا وَأَقْوَمَ اور زیادہ درست ہوتا مگر افسوس کہ انہوں نے ایسا نہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا وَلَٰكِن لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی۔ لعنت کا معنیٰ بُعد من الرحمۃ یعنی اللہ کی رحمت سے دوری ہے۔ ایمان لانے سے انکار کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و بخشش سے دور ہو گئے۔ انہوں نے کلام الٰہی کو حق نہ مانا۔ رسول کی تکذیب کی۔ ان کے اخلاق بگڑ گئے تھے۔ عقل الٹ گئی تھی اس لیے تمام کام خلاف عقل و فہم انجام دیتے تھے کلام الٰہی کو تبدیل کیا فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا پس وہ نہیں ایمان لاتے مگر بہت تھوڑے۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک میں مدینے کے گرد و نواح میں

یہودیوں کے دس بڑے عالم تھے۔ جن میں سے صرف ایک اسلام قبول کر سکے حضور نے فرمایا اگر یہ سارے کے سارے ایمان لے آتے تو روئے زمین پر موجود تمام یہودی حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے۔ مگر جیسا کہ یہاں فرمایا بہت قلیل لوگ ایمان لائے۔ یہ لوگ اُس وقت بھی مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے تھے اور آج بھی دُنیا میں اُسی پالیسی پہ گامزن ہیں۔ اور یہ مسلمانوں سے صرف اُسی صورت میں راضی ہو سکتے ہیں کہ مسلمان اپنا دین چھوڑ کر اُن کے دین میں مدغم ہو جائیں ۔ سورۃ بقرہ میں گزر چکا ہے "وَلَنْ تَرْضٰی عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ" یہودی اور عیسائی آپ سے کبھی خوش نہیں ہوں گے ، جب تک آپ ان کا دین نہ اختیار کر لیں ۔لہذا اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ ان دشمنانِ دین سے ہمیشہ ہوشیار رہنا ، یہ دین دشمنی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ یہ مسلمانوں کے ابدی دشمن ہیں ۔حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ یہ لوگ نزولِ مسیح تک اس قسم کی ریشہ دوانیاں کرتے رہیں گے ، لہذا ان سے محتاط رہیں ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا
لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا
عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ
السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ
اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ
وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ
مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ
يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾

ترجمہ:- اے وہ لوگو! جن کو کتاب دی گئی تھی، ایمان لاؤ اس
چیز پر جس کو ہم نے اُتارا اور وہ تصدیق کرنیوالی ہے اس چیز
کی جو تمہارے پاس ہے اُس سے پہلے کہ ہم مٹا دیں چہروں کو،
ہم پلٹا دیں اُن کو پشتوں کی طرف یا ہم اُن پر لعنت بھیجیں
جس طرح کہ ہم نے لعنت بھیجی ہفتے کے دِن زیادتی کرنیوالوں پر.
اور اللہ کا حکم تو پورا ہو کر رہتا ہے ﴿۴۷﴾ بیشک اللہ تعالیٰ نہیں
بخشتا اس بات کو کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور بخشتا ہے
اس سے ورے جس کو چاہے۔ اور جو اللہ کے ساتھ شرک کریگا
پس بیشک اس نے بہت بڑے گناہ کا افترا باندھا ﴿۴۸﴾ کیا تو

نے دیکھا اُن لوگوں کو جو اپنے آپ کو پاک بتلاتے ہیں۔ بلکہ
اللہ پاک کرتا ہے جس کو چاہے اور نہیں ظلم کیا جائے گا
اُن پر ایک دھاگے کے برابر بھی ﴿۴۹﴾ آپ دیکھیں یہ کس طرح
اللہ پر افترار باندھتے ہیں جھوٹ۔ اور کافی ہے یہ بات صریح گناہ
ہونے کے سبب سے ﴿۵۰﴾

ربط آیات

گذشتہ درس میں اہل کتاب کی بعض قبیح خصلتوں کا تذکرہ ہوا تھا۔ کہ وہ حق و صداقت کے مقابلے میں باطل پرستی کا شیوہ اختیار کرتے ہیں، اللہ کی کتاب کی تحریف کے مرتکب ہوتے ہیں، اللہ اور رسُول کی نافرمانی کرتے ہیں، بلکہ اللہ کے نبی کی توہین کے مرتکب ہوتے ہیں۔ زبان کو پیچ دیکر ذومعنی الفاظ استعمال کرتے ہیں اور دین میں طرح طرح کی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ آب آج کے درس کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو وعید سنائی ہے کہ اس قرآن پاک پر ایمان لے آؤ ورنہ ہو سکتا ہے۔ کہ تمہاری شکلیں بگاڑ دی جائیں اور تم پر اس طرح لعنت بھیجی جائے جس طرح اصحاب سبت پر بھیجی گئی اور انہیں بندر اور خنزیر بنا دیا گیا۔ اِن آیات کی شانِ نزول کے متعلق مؤرخ محمد ابن اسحاقؒ بیان فرماتے ہیں۔ کہ ایک موقع پر حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہودی عالموں کو دعوت دی اور انہیں اس طرح خطاب فرمایا کہ اے احبارِ یہود! ایمان لے آؤ، بخدا تم جانتے ہو۔ جو چیزیں میں لے کر آیا ہوں، میں اللہ کی سچی کتاب لایا ہوں، تم اس پر ایمان لے آؤ مگر یہودیوں پر اس نصیحت کا کچھ اثر نہ ہوا، بلکہ وہ اپنے باطل عقائد پر اڑے رہے۔ اس پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے اُن کی وعید کے لیے یہ آیات نازل فرمائیں۔

ایمان کی دعوت

ارشاد ہوتا ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اے وہ لوگو! جن کو کتاب دی گئی، یہودی اور عیسائی اپنے آپ کو اہل کتاب کہلاتے تھے۔ عیسائی انجیل کے حامل ہونے کے دعویدار تھے، جب کہ یہودی تورات کے۔ قرآن پاک کی اصطلاح میں بھی انہیں اہل کتاب کہا گیا ہے۔ گذشتہ درس میں "اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ" کے الفاظ تھے یعنی وہ لوگ جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا یعنی جن کے پاس محض الفاظ ہیں اور روح نہیں۔ یا یہ کہ اصل کُتب

کا کچھ حصہ ہی اپنی اصل حالت میں موجود ہے اور باقی تحریف کی نذر ہو چکا ہے۔
تاہم اس آیت میں مطلقاً اہل کتاب کو خطاب ہے کہ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا
اُس چیز پر ایمان لاؤ جس کو ہم نے نازل کیا ہے یعنی قرآن پاک۔ اور وہ ایسی کتاب
ہے مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ جو تصدیق کرتی ہے اُس چیز کی جو تمہارے
پاس ہے یعنی تورات اور انجیل۔

ظاہر ہے کہ ہر بعد میں آنے والی کتاب پہلی کتاب کی تصدیق کرتی ہے
اور بعد میں آنے والا نبی پہلے انبیاء علیہم السلام کا مصدق ہوتا ہے چنانچہ قرآن
پاک نے تورات، انجیل اور زبور کی منزل من اللہ ہونے کی تصدیق کی اور حضور
خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے سابقہ تمام انبیاء کے برحق ہونے کی تصدیق کی
البتہ سابقہ امتوں نے خود اپنی کتابوں میں خرابی ڈالی اور اُن میں تحریف کے
مرتکب ہوئے۔ اس بات کا اظہار قرآن پاک نے کر دیا ہے۔ سورۃ مائدہ
میں موجود ہے "یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ
لَكُمْ كَثِیْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ یَعْفُوْا
عَنْ كَثِیْرٍ" اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا ہے جو تمہاری
بہت سی (مسخ شدہ) باتوں کو ظاہر کرتا ہے۔ اور بعض چیزوں سے درگزر کرتا ہے
یعنی تمہاری بعض خصلتیں ایسی بھی ہیں جنہیں ظاہر نہیں کیا گیا۔ لہٰذا تم قرآن پاک پر
ایمان لاؤ جو تمہاری کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ
وُجُوْهًا اس سے پیشتر کہ تمہارے چہرے مٹا دیے جائیں یا مسخ کر دیے جائیں،
بگاڑ دیے جائیں۔ فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَا پس چہروں کو پشت کی جانب
پھیر دیں۔ ایسا وقت آنے سے پہلے پہلے ایمان لے آؤ۔ جب اللہ کا
غضب جوش میں آتا ہے تو پھر ایسا ہوتا ہے کہ دنیا میں ہی لوگوں کی شکلیں مسخ کر
دی جاتی ہیں۔ قرآن پاک میں کتنی نافرمان قوموں کا ذکر ہے جن کی شکلیں بگاڑ دی
گئیں اور انہیں جانوروں کی شکلوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا

کہ آخری زمانہ میں بھی ایسا ہوگا، قربِ قیامت میں بھی بعض لوگوں کی شکلیں مسخ کر دی جائیں گی۔ جب کسی کا قلب و ذہن باطنی گمراہی سے بھرا ہو تو ظاہر ہے کہ باطنی طور پر تو اسکی شکل بگڑ چکی ہے اور یہ شر کا دوسرا درجہ ہے۔ اس کا آخری درجہ یہ ہے کہ ظاہری شکلیں بھی بگڑ جائیں۔ عام طور پہ ایسا نہیں ہوتا، تاہم کہیں اکا دکا واقعہ پیش آجانا عین ممکن ہے۔

اصحابِ سبت

فرمایا ایمان لے آؤ قبل اس کے کہ تمہاری شکلیں مسخ کر دی جائیں اَوْ نَلْعَنَهُمْ یا ہم ان پر لعنت بھیجیں، رحمت سے دور کر دیں کَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ جس طرح کہ ہم نے اُن لوگوں پہ لعنت بھیجی جو ہفتے کے دن زیادتی کرتے تھے۔ یہ بھی بنی اسرائیل ہی کا ایک فرقہ تھا۔ اُن کو حکم تھا کہ وہ ہفتے کے دِن کوئی کاروبار نہ کریں سوائے عبادت کے، مگر انہوں نے حیلے بہانے سے مچھلی کا شکار شروع کر دیا اور اس طرح حرام چیز کو حلال بنانے کی کوشش کی اور بار بار سمجھانے کے باوجود نہ سمجھے۔ آخر اللہ کا عذاب اس شکل میں نازل ہُوا کہ اللہ نے حکم دیا کُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِیْنَ" ذلیل بندر بن جاؤ دوسرے مقام پہ فرمایا "وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِیْرَ" بعض کی شکلیں بندروں کی اور بعض کی خنزیروں کی بن گئیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اُن کے نوجوان بندروں کی شکل میں تبدیل ہو گئے اور بوڑھے خنزیر بن گئے۔ فرمایا وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا اور اللہ کا حکم تو ہو کر رہتا ہے۔ گویا اللہ تعالٰی نے یہودیوں کو وعید سنائی ہے کہ خدا کا خوف کرو، ایمان لے آؤ۔ اللہ کا نبی تو پہلی کتابوں کا مصدق ہے۔ لہذا تمہارے انکار کی کوئی وجہ باقی نہیں۔ تم کیوں کفر پہ اصرار کر رہے ہو۔

شرک ناقابلِ معافی جرم

اِن تمام ترخرابیوں کے باوجود یہودی اس دعوے پر مصر تھے کہ وہی صحیح دین پر قائم ہیں۔ وہ اپنے کفر اور شرک کا انکار کرتے تھے، مگر اللہ تعالٰی نے بطور قانون ارشاد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ بیشک اللہ تعالٰی

نہیں بخشتا اس بات کو کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔ شرک ایسی قبیح بیماری ہے کہ اس کے لیے بقائمی ہوش وحواس توبہ ضروری ہے اگر مرنے سے پہلے توبہ نہیں کی تو ایسا شخص ہمیشہ کے لیے عذاب کا مستحق بن گیا۔ البتہ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ شرک کے علاوہ دیگر جس گناہ کو اللہ چاہے اپنی رحمت سے معاف فرما دے، اللہ تعالیٰ نے یہ قانون کے طور پہ بتلا دیا کہ شرک کے علاوہ جو بھی گناہ کرے گا، اس کی معافی کی گنجائش موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو سزا دینے کے بعد معاف کر دے یا اپنی رحمت کے ساتھ بغیر سزا دیے بھی معاف کر دے مگر جہاں تک شرک جیسے عظیم گناہ کا تعلق اس کی معافی کی کوئی صورت نہیں سوائے اس کے کہ انسان موت طاری ہونے سے پہلے پہلے سچے دل سے تائب ہو جائے۔ فرمایا وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا اس نے بہت بڑے گناہ کا افترا کیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنایا جائے قرآن پاک میں شرک کی جگہ جگہ مذمت بیان کی گئی ہے۔

شرک کی تعریف

شرک کی وضاحت قرآن وسنت میں موجود ہے۔ علمائے کرام نے شرک کی تردید میں بڑی کتابیں لکھی ہیں۔ شاہ اسماعیل شہیدؒ کا رسالہ تقویۃ الایمان توحید وشرک کے مسئلہ کی خوب وضاحت کرتا ہے۔ ایک اور بزرگ مولانا حافظ احمد الدین صاحب بھیرے کے قریب موضع بگا کے رہنے والے تھے۔ مولانا شاہ محمد اسحاقؒ کے شاگرد تھے۔ چودہ سال تک دہلی میں تعلیم پائی۔ آپ نے آج سے قریباً ڈیڑھ، پونے دو سو سال پہلے دلیل المشرکین کے نام سے عربی زبان میں کتاب لکھی، جس کا ترجمہ اس فقیر نے کیا ہے۔ اس میں حافظ صاحب نے شرک کی بیس قسمیں بیان کی ہیں۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ نے قرآن پاک کے دوسرے پارے کے حاشیے میں ایک چھوٹا سا نوٹ دیا ہے یہ

مسئلہ سمجھایا ہے۔ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ" یعنی مومن مرد مشرک عورت سے نکاح نہیں کرسکتا۔ اور مومن عورت مشرک مرد کے نکاح میں نہیں آسکتی آپ فرماتے ہیں کہ اگر مرد یا عورت میں سے کسی ایک نے شرک کا ارتکاب کیا تو اُس کا نکاح ٹوٹ جائے گا کیونکہ مومن اور مشرک کا نکاح نہیں ہو سکتا۔

بعض صفات اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی صفت غیر اللہ میں مانی جائے تو شرک کا ارتکاب ہو جائے گا۔ مثلاً یہ کہ کسی پیر، ولی، بزرگ، فرشتے یا نبی کو ہر شئے کا علم ہے مشرکانہ عقیدہ ہے۔ کیونکہ "وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ" ہر چیز کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اسی طرح قدرت تامہ بھی اللہ کی صفت مختصہ ہے۔ اگر کوئی یہ اعتقاد رکھے کہ فلاں بزرگ یا نبی یا ولی جو چاہے کرسکتا ہے، تو وہ بھی مشرک ہوگیا۔ قادر مطلق ہونا بھی اللہ ہی کی صفت ہے۔ اگر کوئی شخص سمجھتا ہے کہ اُس کا بُرا بھلا کرنا کسی دوسرے کے اختیار میں ہے، کوئی نبی، ولی اُس کا نافع اور ضار ہے تو یہ بھی شرک میں داخل ہے۔ اسی طرح غایت درجہ کی جو تعظیم اللہ تعالیٰ کے سامنے کرنی چاہیئے، جیسے رکوع، سجود وغیرہ، یہی تعظیم اگر غیر اللہ کی کرے گا، تو شرک کا ارتکاب ہوگا شرک کبھی ذات میں ہوتا ہے اور کبھی صفات یا عبادت میں۔ خدا تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی دوسرے کو اگر خدا مانے گا تو یہ شرک فی الذات ہوگیا مجوسیوں کا ایک فرقہ ثنوی ہے، جو یزدان اور اہرمن دو خدا مانتے ہیں یہ بھی مشرکانہ عقیدہ ہے۔ شرک مشیت میں بھی ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی دوسری ہستی بھی ایسی مانی جائے جو جو چاہے کرسکے۔ ایک شخص نے حضور علیہ السلام کے سامنے عرض کیا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَمَا شِئْتَ یعنی جو آپ چاہیں اور اللہ چاہے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا، کیا تو مجھے خدا کا شریک بنانا چاہتا ہے۔ کہو مَا شَآءَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ جو صرف اللہ چاہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ

مختار کل کوئی نہیں ہے۔ تصرف میں شرک یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو نفع نقصان کا مالک سمجھ کر اُس سے روزی، اولاد یا شفا طلب کی جائے۔ کسی نبی، ولی یا پیر کے متعلق یہ عقیدہ رکھا جائے کہ اُسے بھی تصرف حاصل ہے تو یہ بھی شرک ہوگا۔ عبادات میں رکوع، سجود وغیرہ کا ذکر آچکا ہے، اس کے علاوہ طواف بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے اور بیت اللہ شریف کے ساتھ مختص ہے "وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ" بیت اللہ شریف کا طواف کرو۔ اگر یہی طواف کسی قبر یا مسجد کے گرد کیا، تو یہ بھی شرک ہوگیا۔ کوہ مراد پر کوئی گمراہ فرقہ ہے۔ انہوں نے کوئی ایسی جگہ بنائی ہوئی ہے جس کا طواف کرتے ہیں۔ یہ صریحاً شرک ہے۔

نذر لغیر اللہ یعنی اللہ کے سوا کسی دوسرے کی نذر ماننا بھی شرک ہے۔ نذر صرف خدا تعالیٰ کی مانی جاسکتی ہے۔ بعض اوقات شرک فی العادت ہوتا ہے کہ کئی کام عادت کے طور پر کیے جاتے ہیں جیسے زنار باندھنا، جنیوا باندھنا یا گلے میں صلیب لٹکانا وغیرہ ایک شخص صلیب لٹکا کر حضور علیہ السلام کے سامنے آیا تو آپ نے فرمایا الق عنك هذا لوثن اس بت کو اُتار پھینکو یہ شرک کی نشانی ہے۔ بعض نام بھی شرکیہ ہوتے ہیں جیسے عبدالمسیح، عبد المصطفےٰ عبدالرسول یا عبدالحسین، عبدیت کی نسبت ہمیشہ خدا تعالیٰ کی طرف ہونی چاہیئے اگر غیر کی طرف ہوئی، تو شرک ہوگیا۔ قسم اٹھانے میں بھی شرک ہوتا ہے "مَنْ اَحْلَفَ بِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ اَشْرَكَ" جس نے غیر اللہ کی قسم اٹھائی اُس نے بھی شرک کیا۔ اللہ کی ذات اور اس کی صفات کے علاوہ کسی دوسرے کی قسم اٹھانا حرام ہے۔ بعض اوقات جانور ذبح کرنے میں شرک ہوتا ہے۔ کوئی مکان یا دیگر عمارت شروع کرتے وقت اس کی بنیاد میں جانور ذبح کرتے ہیں۔ عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا تو عمارت میں نقص رہ جائے گا۔ بسا اوقات کسی درخت کے نیچے یا کسی نہر پہ جانور ذبح کیا جاتا ہے اور اس سے مقصود

کسی جن بھوت کو خوش کرنا ہوتا ہے۔ یہ بھی مشرکانہ عقیدہ ہے۔ کسی چیز میں مستقل تاثیر ماننا بھی شرک ہے۔ کیونکہ مستقل تاثیر تو خدا تعالیٰ کے حکم میں ہے اور اُس کی صفت ہی ہے۔ اُس کے علاوہ ہر تاثیر مستعار ہے۔ استعانت مافوق الاسباب میں بھی شرک ہوتا ہے۔ عالم اسباب میں ایک دوسرے کی مدد کرنا شرک نہیں بلکہ یہ تو حکم ہے۔ "تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى" نیکی اور تقوے کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو۔ البتہ مادی اسباب کے علاوہ غائبانہ طور پر اگر کوئی غیر اللہ سے مدد طلب کرتا ہے، تو وہ مشرک ہے ندا میں بھی شرک ہوتا ہے۔ غیر اللہ کو حاضر ناظر سمجھ کر پکارنا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ ہماری بات سنتے ہیں، شرک ہے۔ جیسے یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ، یا بہاؤ الحق، یا پیر دستگیر، یا علی، یا حسین وغیرہ سب شرک ہے۔ جانور ذبح کرتے وقت اگر اللہ کے علاوہ کسی دوسری ہستی کا نام لے لیا تو بھی شرک کا ارتکاب ہو گیا جیسے بسم اللہ و اسم محمد حالانکہ صرف بسم اللہ کہنا ضروری ہے اسی طرح شگون لینا بھی شرک ہے۔ کوئی جانور الو وغیرہ دائیں یا بائیں اڑ گیا تو عرب اسے منحوس خیال کرتے تھے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اَلطِّیَرَۃُ شِرْکٌ" شگون لینا بھی شرک ہے۔ مومن ہمیشہ ذاتِ خداوندی پر بھروسہ کرتا ہے، وہ اس اس قسم کے وہم میں مبتلا نہیں ہوتا۔ اگر کوئی ایسی بات ذہن میں آئے تو اُسے نکال دینا چاہیئے۔ لوگ خبریں معلوم کرنے میں بھی شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ نجومی رمال، جفار یا دست شناس سے قسمت حال معلوم کرنا شرک ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا کیا یہ لوگ غیب دان ہیں؟ عالم الغیب تو صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے فرمایا جو شخص نجومیوں سے خبریں معلوم کرتا ہے اور اُن پر یقین کرتا ہے وہ محمد کی شریعت کا انکار کرتا ہے۔ ایسی شرکیہ باتوں پر قطعاً یقین نہیں رکھنا چاہیئے۔

بعض لوگ تصور میں شرک کرتے ہیں اُن کا خیال ہے کہ بزرگوں، مشائخ یا پیران پیر کی روحیں اُن کے گھر آتی ہیں فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ ایسا عقیدہ

رکھنے والا آدمی کافر ہے، مشرک ہے، یہ تصور میں شرک ہے۔ تعویذ گنڈے میں بھی بعض اوقات فرعون، جبرائیل یا کسی جن سے مدد طلب کی جاتی ہے تعویذوں میں شرکیہ کلمات ہوتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے صراحتاً فرمایا کہ گلے میں لٹکانے والے تعویذوں میں بھی شرک ہوتا ہے بعض اوقات جھاڑ پھونک میں شرکیہ الفاظ کا استعمال ہوتا ہے۔ غیر اللہ سے استعانت طلب کی جاتی ہے۔ یہ بھی شرک میں داخل ہے۔ کبھی توسل میں شرک کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ غیر اللہ کا وسیلہ پکڑا جاتا ہے کہ وہ ہر حالت میں ہماری حاجت خدا تعالیٰ سے پوری کرا دیں گے۔ اللہ تعالیٰ راضی ہو یا ناراض، یہ بزرگ ہمارا کام ضرور کروا دیں گے۔ مشرکین عرب، لات، منات اور عزیٰ کے متعلق یہ اعتقاد رکھتے تھے۔ یہودی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہی تصور رکھتے تھے اور شیعہ امام حسینؓ کو وسیلہ پکڑتے ہیں۔ قبر پرست لوگ بہت سے بزرگوں کے متعلق یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ اُن کی نذر و نیاز دے دی جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کو ضرور راضی کر لیتے ہیں۔ اور شرک کی بیسویں قسم ریا ہے، اُسے شرک اصغر کہا جاتا ہے اگر کوئی عمل دکھاوے کے لیے کیا جائے تو شرک کا ارتکاب ہوگا۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے مَنْ عَمِلَ يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ جس نے دکھلاوے کے لیے کوئی عمل کیا۔ اُس نے شرک کا ارتکاب کیا، شرک کی یہ تمام اقسام فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا میں آتی ہیں

خودستائی

آگے اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی مذمت میں فرمایا اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ کیا آپ نے اُن لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو پاک صاف بتاتے ہیں حالانکہ ان میں کفر، شرک اور معاصی جیسی قبیح بیماریاں موجود ہیں۔ یہود و نصاریٰ اپنے آپ کو پیغمبر زادے کہتے تھے۔ اور محض اس بات پر ہی فخر کرتے تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ اُن کے علاوہ کوئی دوسرا شخص جنت میں نہیں جائیگا۔ یہ بیماری آجکل کے

مسلمانوں میں بھی پائی جاتی ہے، وہ پیرزادے اور سیدزادے کہلاتے ہیں بعض نے یہ فتویٰ بھی دیا کہ حضرت فاطمہؓ کی اولاد میں سے کسی عورت کا نکاح امتی کے ساتھ جائز نہیں، یہ ایک قسم کا خود ساختہ تقدس ہے۔ اپنے آپ کو اعلیٰ خاندان سے منسوب کرنا حالانکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑائی کا معیار نیکی، ایمان اور تقویٰ ہے۔ محض ذات پات کی وجہ سے کسی کو برتری حاصل نہیں ہے تو فرمایا کہ یہود و نصاریٰ اپنی تعریف آپ کرتے ہیں اور اس میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا

بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ پاک تو اللہ کرتا ہے، جسے چاہے پاک کر دے دوسری جگہ فرمایا وَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى اپنی پاکیزگی خود نہ کہنے لگ جاؤ، بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم میں سے کون زیادہ متقی ہے اور کون زیادہ پاک ہے۔ ہر شخص کی بغیر سوچے سمجھے تعریف کرنا درست نہیں ہے تعریف اللہ تعالیٰ کی ہے یا انبیاء کی معصوم جماعت کی، جن کے متعلق خدا تعالیٰ نے اجازت دی ہے۔ یقیناً وہ اللہ تعالیٰ کے پاک اور برگزیدہ بندے ہیں۔ اللہ نے ان کی تعریف خود وحی الٰہی میں کی ہے مگر کسی چھوٹے بڑے آدمی کی قطعی تعریف بغیر علم کے جائز نہیں ہے۔

فرمایا اللہ کا قانون یہ ہے کہ اس کے ہاں انصاف ہوگا وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ایک دھاگے کے برابر بھی کسی پر زیادتی نہیں ہوگی۔ فتیل اس چھوٹے سے دھاگے کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے درمیان ہوتا ہے۔ اسے قطمیر بھی کہتے ہیں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو جتنا عمل کرے گا، اس کے مطابق بھگتان کرتا ہوگا، مگر زیادتی کسی کے ساتھ نہیں ہوگی۔

اللہ پر افترا

فرمایا اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ فرمایا دیکھو! یہ یہود و نصاریٰ کس طرح اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں ان میں ہر برائی موجود ہے مگر پھر بھی کہتے ہیں نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ہم اللہ کے بیٹے اور

اس کے محبوب ہیں۔ ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔ ہم نبی آخرالزماں پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں، ہم اُسے (العیاذ باللہ) سچا نبی نہیں سمجھتے۔ اللہ نے فرمایا وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا اس سے بڑھ کر اور کیا گناہ ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں میں ہر قسم کی برائی موجود ہے مگر اپنا تقدس ظاہر کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر ان کی کیا بدبختی ہو سکتی ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُونَ
بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هٰٓؤُلَآءِ
أَهْدٰى مِنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا سَبِيلًا ﴿۵۱﴾ أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ
لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۖ وَمَن يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا ﴿۵۲﴾
أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ
النَّاسَ نَقِيرًا ﴿۵۳﴾

ترجمہ: کیا نہیں دیکھا آپ نے اُن لوگوں کی طرف جن کو دیا گیا کچھ کتاب سے وہ ایمان رکھتے ہیں جبت اور طاغوت پر اور وہ کہتے ہیں اُن لوگوں سے جنہوں نے کفر کیا کہ یہ زیادہ ہدایت والے ہیں اُن لوگوں سے جو ایمان لائے ﴿۵۱﴾ یہی لوگ ہیں کہ جن پر اللہ نے لعنت کی ہے، اور جس پر اللہ لعنت کر دے، پس تو نہ پائیگا اُن کے لیے کوئی مدد گار ﴿۵۲﴾ کیا اُن کے لیے حصّہ ہے بادشاہی میں سے۔ (اگر ایسا ہوتا) پس وہ نہ دیتے لوگوں کو ایک تل کے برابر بھی کوئی چیز ﴿۵۳﴾

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی قباحتوں کا تذکرہ کر کے اُن کی مذمت بیان فرمائی تھی۔ آج کی آیات بھی اُسی سلسلہ کی کڑی ہیں، یہاں بھی اُن کی ایک سازش کا ذکر ہے جو انہوں نے کفار کے ساتھ مِل کر مسلمانوں کے خلاف کی۔ جھوٹ، مکر اور فریب اُن کی سرشت میں داخل تھا۔ اللہ کے نبی کے ساتھ دشمنی اور پھر آپ کی توہین کرنا اُن کا روزمرہ کا معمول تھا۔

سورۃ نساء کے بعد اگلی سورۃ مائدہ میں بھی یہ ذکر موجود ہے کہ اہل اسلام کے سب سے بڑے دشمن یہودی ہیں، اور ان کے بعد پھر مشرک اور نصاریٰ درجہ بدرجہ آتے ہیں۔ قرآن پاک میں موجود ہے "لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا" یعنی اسلام دشمنی میں یہود سب سے بڑھے ہوئے ہیں، اس کے بعد مشرکین کا نمبر ہے اور پھر نصاریٰ کا۔ بہرحال آج کی آیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی شرارتوں کا ذکر کیا ہے۔

شانِ نزول

مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لانے کے بعد حضور علیہ السلام نے مدینے کے قبائل، جن میں یہودی بھی شامل تھے، کے ساتھ میثاق مدینہ کے نام سے ایک معاہدہ کیا تھا جس کے مطابق یہ طے پایا کہ اہل اسلام اور مدینہ کے گرد و نواح میں رہنے والے تمام قبائل اپنے اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے آپس میں اتفاق و اتحاد کی فضا برقرار رکھیں گے اور اگر مدینہ پر باہر سے حملہ ہوا تو سب مل کر اس کا دفاع کریں گے۔ یہودیوں کا ایک بڑا عالم کعب بن اشرف تھا۔ مدینہ کے قریب ہی اس کا اپنا قلعہ اور گاؤں تھا۔ صاحبِ علم اور دولت مند تاجر تھا۔ اس کی تجارت اور سودی کاروبار پورے عرب میں پھیلا ہوا تھا۔ چونکہ یہ بااثر آدمی تھا اس لیے یہودیوں کی طرف سے میثاق مدینہ پر اس نے بھی دستخط کیے تھے اور اس معاہدہ کی پابندی کا عہد کیا تھا۔ اس کے باوجود یہ شخص دل سے مسلمانوں کے ساتھ بغض رکھتا تھا اور ہمیشہ انہیں درپردہ نقصان پہنچانے کی کوشش میں رہتا تھا۔ اس سے پہلے جنگ بدر میں مسلمان کامیاب ہو چکے تھے مگر احد پر کفار کا پلہ بھاری رہا۔ اس شخص نے موقع غنیمت جانا اور ستر آدمیوں کا ایک وفد لے کر مکہ پہنچا۔ ابوسفیان سے ملاقات کر کے اسے یہ عندیہ دیا کہ ہم محمد اور اہلِ اسلام سے فیصلہ کن جنگ کرنا چاہتے ہیں، آپ ہماری مدد کریں، ہم مدینے کے معاہدہ کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ابوسفیان کو کعب بن اشرف کی بات پر یقین نہ آیا۔ اس نے کہا میں تمہاری بات کو

اِس صورت میں سچا ماننے کے لیے تیار ہوں جب کہ تم ہمارے بتوں کے سامنے سجدہ کرو۔ اسلام دشمنی کے غیظ و غضب میں اُس نے سجدہ بھی کر دیا۔ اِس کے بعد مشرکین مکہ نے کہا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ ہمارا دین اچھا ہے یا مسلمانوں کا ہم بیت اللہ شریف کے متولی ہیں طواف کرتے ہیں۔ جانور ذبح کرتے ہیں، حاجیوں کی خدمت کرتے ہیں، مگر محمد اپنے اباؤ اجداد کے دین کو ترک کر چکے ہیں۔ بہر حال انہوں نے کعب بن اشرف سے یہ تصدیق کروالی کہ اُن کا طریقہ مسلمانوں کی نسبت اچھا ہے اپنی مزید تسلی کے لیے انہوں نے کہا کہ اچھا اب ایسا کرتے ہیں کہ تیس آدمی ہمارے اور تیس آدمی تمہارے کعبۃ اللہ کے ساتھ چمٹ کر قسمیں اٹھائیں اور عہد کریں کہ دونوں فریق مسلمانوں کے خلاف جنگ میں پوری پوری کوشش اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے۔ چنانچہ کعب بن اشرف نے مشرکین کی یہ شرط قبول کر لی اور فریقین کے تیس تیس آدمیوں نے بیت اللہ کے روبرو مسلمانوں کے خلاف معاہدہ کر لیا۔ آج کی آیات میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کر کے یہودیوں کی مذمت بیان کی گئی ہے۔

جبت اور طاغوت

فرمایا اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ کیا آپ نے نہیں دیکھا اُن لوگوں کی طرف جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا ظاہر ہے کہ مکمل تورات تو اُن کے پاس نہیں ہے۔ انہوں نے تو اُس کو خلط ملط کر دیا ہے، تاہم اُس کا کچھ نہ کچھ اصل حصہ موجود ہے، اِن یہودیوں کا حال یہ ہے کہ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ یہ لوگ جبت اور طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں۔ جبت کا لفظ پورے قرآن پاک میں صرف ایک اِسی جگہ استعمال ہوا ہے، البتہ طاغوت کا لفظ مختلف سورتوں میں سات مرتبہ آیا ہے۔ عام مفسرین جبت کا معنی بت اور طاغوت کا معنی شیطان کرتے ہیں لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ یہودی بتوں اور شیطان کے پجاری ہیں۔ جیسا کہ اِن آیات

کے شان نزول میں بیان ہوا کہ کعب بن اشرف اور اس کے ساتھیوں نے اسلام دشمنی کی بنا پر مشرکین مکہ کے کہنے پر بتوں کو بھی سجدہ کیا۔ طاغوت طغویٰ کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ سرکش ہو کر حد سے بڑھ جانا ہے۔ اور یہ شیطان پر بھی صادق آتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ حبشی زبان میں طاغوت شیطان ہی کو کہتے ہیں۔

مفسرین نے جبت کا معنیٰ سحر بھی کیا ہے۔ اس ضمن میں یہودیوں کا حال سورۃ بقرہ میں بیان ہو چکا ہے۔ کہ انہوں نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال کر سحر یعنی جادو حاصل کیا وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ" اس لحاظ سے جبت کا معنیٰ جادو بھی ہے۔ سیرت کی معروف کتاب کے مؤلف امام ابن ہشامؒ فرماتے ہیں اَلْجِبْتُ عِنْدَ الْعَرَبِ مَا عُبِدَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یعنی عربوں کے نزدیک ہر وہ چیز جبت ہے کہ اللہ کے سوا جس کی پوجا کی جائے۔ اور ہر وہ چیز طاغوت ہے كُلُّ مَا اَضَلَّ مِنَ الْحَقِّ جو راہِ حق سے گمراہ کرنے والی ہو۔ جبت کی جمع جبوت اور طاغوت کی جمع طواغیت آتی ہے۔

ایک دوسری روایت کے مطابق امام ابن ہشامؒ فرماتے ہیں۔ کہ جبت کا معنیٰ سحر اور طاغوت کا معنیٰ شیطان ہے۔ سورۃ نحل میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی پر یہ حکم نازل فرمایا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ" یعنی اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی پرستش سے باز آجاؤ۔ گویا ہر سرکش اور حق سے گمراہ کرنے والا طاغوت ہے خواہ وہ شیطان ہو یا کوئی دوسری شخصیت ملوک اکثر طاغوت کی نمائندگی کرتے ہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کے حکم کی بجائے اپنا حکم چلاتے ہیں اور لوگوں کو راہِ راست سے ہٹا کر غلط بات ماننے پر مجبور کرتے کرتے ہیں۔ حدیث شریف میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں لَا تَحْلِفُوْا بِاٰبَآئِكُمْ وَلَا بِالطَّوَاغِيْتِ یعنی اپنے آباؤ اجداد یا کسی طاغوت کے نام کی قسم مت اٹھاؤ بہر حال گمراہ کرنے والی تمام طاقتیں طاغوت ہیں اور شیطان اُن کا سرغنہ ہے۔

حق پر کون؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا، دیکھو! یہ اہلِ علم کا حال ہے کہ طاغوت اور جبت پر یقین رکھتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور اُس کے سچے نبی کی مخالفت کر رہے ہیں مشرکین کے ساتھ گٹھ جوڑ کر رکھا ہے وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا کفار کے متعلق کہتے ہیں۔ هٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا کہ اہلِ ایمان کی نسبت یہ زیادہ راہِ راست پر ہیں، یعنی مکے کے کافروں اور مشرکوں کا دین مسلمانوں کے دین سے بہتر ہے۔ یہ کعب بن اشرف والے واقعہ کی طرف ہی اشارہ ہے۔ کہ اُس نے مشرکین کے استفسار پر بتایا تھا۔ کہ تمہارا دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے سے اچھا ہے۔ اس شخص کے متعلق میں نے پہلے عرض کیا کہ بڑا ظالم آدمی تھا۔ خود شاعر تھا اور دوسروں سے بھی حضور علیہ السلام کی مذمت میں شعر کہلواتا تھا۔ اس کی ضلالت کی انتہا یہ تھی کہ سودی قرضے دیتا تھا اور عام چیزوں کے علاوہ لوگوں کی عورتوں کو بھی رہن رکھ لیتا تھا۔ بہر حال اس شخص نے میثاق مدینہ کو توڑا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اجازت سے محمد ابن مسلمہؓ اور ان کے ساتھیوں نے اُسے قتل کر دیا۔

خدا کی لعنت

گذشتہ آیات میں گزر چکا ہے۔ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو فرمایا تھا یا معشر الیھود! اے یہودیو! تم جانتے ہو کہ میں خدا کا سچا نبی ہوں اور جو کچھ میں لے کر آیا ہوں، وہ برحق ہے لہٰذا تم ایمان لے آؤ تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو مگر اِن بدبختوں نے کفر پر اصرار کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی وَمَن يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا اور جس پر اللہ تعالیٰ لعنت کر دے، اُس کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

لعنت کا مفہوم

لعنت کا لفظی معنیٰ بُعد ہوتا ہے اور اصطلاحاً اِسے اللہ کی رحمت سے دوری پر محمول کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ جب کافر کے حق میں استعمال ہوتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسا شخص اللہ کی رحمت سے ابدی طور پر دور یعنی محروم ہوگیا اور سزا کا مستحق ٹھہرا جیسے سورۃ بقرہ میں کفار کے متعلق آیا ہے أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ

لَعۡنَةُ اللّٰهِ وَالۡمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِيۡنَ" ایسے لوگوں پر اللہ کی اس کے فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ البتہ جب لعنت کا لفظ گنہگار مومن کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ سزا کا مستحق ٹھہرا گرچہ ابدی طور پر نہیں مگر گناہ کی سزا بھگتنے کے بعد جنت میں داخلہ مل جائیگا بہر حال ایسے شخص کا درجہ کم ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سے بُرے کاموں پر لعنت کا لفظ استعمال کیا ہے جیسے "اَلَا لَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيۡنَ" یعنی ظلم کرنے والوں پر خدا کی لعنت ہو۔

حضور علیہ السلام کے ارشادات میں بھی بعض کاموں پر لعنت آئی ہے جیسے فرمایا لَعَنَ اللّٰهُ مَنۡ لَّعَنَ وَالِدَيۡهِ یا فرمایا لَعَنَ اللّٰهُ مَنۡ سَبَّ وَالِدَيۡهِ یعنی اس شخص پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو جو اپنے والدین پر لعنت کرتا ہے یا انہیں گالی دیتا ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا لَعَنَ اللّٰهُ الۡوَاصِلَةَ وَالۡمُسۡتَوۡصِلَةَ اس عورت پر بھی لعنت ہے جو اپنے سر کے بال دوسری عورت کو دیتی ہے تاکہ وہ بھی اپنے بال لمبے کرے اور جو عورت ایسا کرتی ہے وہ بھی ملعون ہے۔ البتہ ریشم یا دھاگے کا پراندہ بنا کر اُن کو لمبا کر لینا جائز ہے، مگر دوسری عورت کے بال لے کر اپنے بالوں کو لمبا کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح گودنے گدوانے والوں یا جسم پر نیل کے داغ لگوانے والوں پر بھی لعنت کی گئی ہے۔ آپ ﷺ نے لَعَنَ اللّٰهُ الۡمُصَوِّرِيۡنَ بھی فرمایا یعنی فوٹو کھینچنے والے بھی ملعون ہیں۔ لَعَنَ اللّٰهُ مَنۡ عَمِلَ عَمَلَ قَوۡمِ لُوۡطٍ جس نے قوم لوط کا عمل کیا وہ بھی لعنت کا مستحق ہوا۔

اِس بات کی وضاحت ہو جائے کہ کسی شخص معین پر اُس وقت تک لعنت کا اطلاق نہیں کرنا چاہیئے جب تک کہ اُس کے متعلق صریحاً علم نہ ہو کہ اس کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے جیسے ابوجہل، ابولہب یا شیطان لعین وغیرہ۔ ایک شخص واقعی کافر ہے، مگر کیا معلوم کہ مرنے سے پہلے وہ ایمان اختیار کر لے، لہٰذا اُس پر بھی

---

[1] قرطبی ص ۲۳۸ ج ۱۲ و احکام القرآن للجصاص ص ۲۷۳/۳ (فیاض)

لعنت درست نہیں جب تک کہ اُس کا خاتمہ علی الکفر نہ ہو جائے۔ اسی لیے امام ابُوحنیفہؒ یزید پر لعنت بھیجنے کو جائز قرار نہیں دیتے کیونکہ اس کا کفر پر مرنا ثابت نہیں۔ البتہ بعض افعال پر لعنت بھیجی جا سکتی ہے جیسے حضور علیہ السلام نے فرمایا لَعَنَ اللّٰہُ السَّارِقَ اللہ چور پر لعنت کرے۔ "لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ" جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہو۔

بہر حال فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں پر اُن کے افعال قبیحہ کی وجہ سے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ تعالیٰ لعنت کر دے، وہ ذلیل و خوار ہو کر رہے گا اور اُس کا کوئی حامی و ناصر نہیں ہو گا۔ یہودی ایسے خبیث لوگ ہیں جو اپنی نفسانی اغراض، ضد اور عناد کی وجہ سے اسلام کو باطل اور کفر کو حق قرار دیتے ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت دونوں جگہ ذلیل و خوار کرے گا اور وہ اللہ کے عذاب سے بچ نہیں سکیں گے۔

خدائی میں حصہ

آگے اللہ تعالیٰ نے یہودیوں ہی کے متعلق فرمایا اَمْ لَھُمْ نَصِیْبٌ مِّنَ الْمُلْکِ کیا اُن کا خدا کی خدائی میں کچھ حصہ ہے، کیا انہیں یہ اختیار حاصل ہے کہ حق کو باطل اور باطل کو حق قرار دے دیں۔ ہرگز نہیں، انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی بادشاہت میں کوئی حصہ عطا نہیں کیا اور نہ انہیں کوئی اختیار دیا ہے البتہ اگر ان کے پاس کوئی اختیار بھی ہوتا۔ فَاِذًا لَّا یُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِیْرًا اگر کوئی چیز ان کے پاس ہوتی بھی تو یہ اس قدر بخیل واقع ہوئے ہیں کہ کسی کو ایک تِل بھی نہ دیتے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے عام لوگوں کے بخل کا ذکر فرمایا ہے قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِکُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَۃِ رَبِّیْٓ اے پیغمبر علیہ السلام! آپ اِن سے فرما دیں کہ اگر تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی رحمت کے خزانے بھی ہوتے "اِذًا لَّاَمْسَکْتُمْ خَشْیَۃَ الْاِنْفَاقِ" تو تم انہیں خرچ ہونے کے خوف سے روک رکھتے۔ وَکَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا کیونکہ انسان تنگ دِل واقع ہوا ہے۔ یہاں پر بھی فرمایا کہ اگر خدا کی بادشاہت میں تمہارا

کچھ حصہ ہوتا تو تم کسی کو ایک تِل کے برابر یعنی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی دینے کے لیے تیار نہ ہوتے۔

سلسلۂ نبوت

دراصل یہودی حسد کا شکار ہو چکے تھے۔ اُن کو امید تھی کہ نبی آخر الزمان بنی اسحاق میں سے آئے گا مگر جب آخر میں سلسلہ نبوت بنی اسماعیل میں آ گیا تو یہ لوگ حسد کی آگ میں جل گئے۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ "حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ" کے الفاظ آتے ہیں۔ نبوت کا سلسلہ ہزاروں سال تک بنی اسرائیل میں جاری رہا مگر یہ انعام ہمیشہ کے لیے تو اُن کے لیے مخصوص ہو کر نہیں رہ گیا تھا بلکہ "وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ" اللہ جسے چاہے اپنی رحمت کے لیے خاص کر دے۔ اُس نے اپنی رحمت سے حضور علیہ السلام کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں مبعوث فرما دیا تو اس میں حسد کی کون سی بات ہے۔ انہیں تو چاہیئے کہ اپنی کتابوں کے مطابق آپ کی نشانیاں دیکھ کر فوراً ایمان لے آتے۔ یہ لوگ صاحب علم اور اہل کتاب تھے، اُن کو انکار نہیں کرنا چاہیئے تھا مگر یہ حسد کی وجہ سے انکار کر گئے۔

بہرحال فرمایا کہ ان کے پاس کچھ ہوتا تو یہ ایک نقیر یعنی تل کے برابر بھی کسی کو کچھ نہ دیتے۔ نقیر دراصل اُس باریک دھاگے کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے سوراخ پر ہوتا ہے جس سے پودا پھوٹ کر نکلتا ہے۔ مقصد یہ کہ نقیر بہت معمولی چیز پر بولا جاتا ہے۔ اناج کے دانوں میں سے تل بھی ایک بہت چھوٹا سا دانہ ہوتا ہے، اس لیے اس کا ترجمہ تل کر دیا گیا ہے۔ بعض اوقات چھوٹی چیز کو خردل یعنی رائی کے دانے سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے۔

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن
فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ
وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا ﴿٥٤﴾ فَمِنْهُم مَّنْ آمَنَ
بِهِ وَمِنْهُم مَّن صَدَّ عَنْهُ ۚ وَكَفَىٰ بِجَهَنَّمَ
سَعِيرًا ﴿٥٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ
نُصْلِيهِمْ نَارًا ۖ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُم بَدَّلْنَاهُمْ
جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا
حَكِيمًا ﴿٥٦﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ
جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ
فِيهَا أَبَدًا ۖ لَّهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۖ وَنُدْخِلُهُمْ
ظِلًّا ظَلِيلًا ﴿٥٧﴾

ترجمہ: کیا یہ لوگ (اہلِ کتاب) حسد کرتے ہیں لوگوں کے ساتھ اُس چیز پر جو اللہ نے اُن کو دی ہے اپنے فضل سے۔ پس بیشک ہم نے دی ہے۔ آلِ ابراہیم کو کتاب اور حکمت اور ہم نے اُن کو دی ہے بڑی سلطنت ﴿۵۴﴾ پھر اِن میں سے بعض وہ ہیں جو اس پر ایمان لائے ہیں اور بعض وہ ہیں جو اس سے روکتے ہیں۔ اور کافی ہے۔ جہنم بھڑکتی ہوئی آگ ﴿۵۵﴾ بیشک وہ لوگ جنہوں

نے ہماری آیتوں کے ساتھ کفر کیا، عنقریب ہم اُن کو آگ میں داخل کریں گے جب بھی اُن کی کھالیں جل جائیں گی، ہم اُن کے لیے دوسری کھالیں تبدیل کر دیں گے، تاکہ وہ عذاب چکھیں اور بیشک اللہ تعالیٰ زبردست اور حکمت والا ہے (۵۶) اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے شائستہ کام کیے، عنقریب ہم اُن کو باغوں میں داخل کریں گے جن کے سامنے نہریں بہتی ہوں گی اُن میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اور اُن کے لیے اُن (باغوں) میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی، اور ہم اُن کو داخل کریں گے گھنی چھاؤں میں (۵۷)

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کی بعض قباحتیں بیان فرمائی ہیں۔ کہ وہ اللہ کی کتاب میں تحریف کے مرتکب ہوئے، انہوں نے اللہ کی نافرمانی کی اور دین میں طعن بھی کی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے وعید سُنائی کہ اگر اب بھی ایمان نہیں لائیں گے، پھر اُن پر خدا تعالیٰ کی لعنت برسیگی، بالکل اسی طرح جیسے سبت یعنی ہفتہ کے دن والوں پر اللہ نے لعنت فرمائی اور انہیں بندر اور خنزیر کی شکلوں میں تبدیل کر دیا۔ اس کے بعد اللہ تعالےٰ نے اہلِ کتاب کی مزید خرابیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا یہ لوگ جبت اور طاغوت کی پرستش کرتے ہیں اور ان پر یقین رکھتے ہیں۔ سحر جیسی باطل چیزوں اور شیطان کے پیروکار ہیں۔ اللہ نے یہ بھی بیان فرمایا کہ یہ لوگ اہلِ اسلام کے ساتھ حسد میں اتنے پاگل ہو چکے ہیں کہ مشرکین کے ساتھ گٹھ جوڑ کر رہے ہیں اور اُن سے کہتے ہیں کہ مسُلمانوں کے دین کی نسبت تمہارا دین اچھا ہے اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ ملعون ہیں، اللہ کی رحمت سے دُور ہو چکے ہیں۔ اور جس پر اللہ کی لعنت نازل ہو جائے، اُس کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ کیا خدا تعالیٰ کی بادشاہی میں ان کا کچھ حصہ ہے۔ ایسا تو ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ممکن ہوتا۔ تو یہ لوگ اپنے بخل کی وجہ سے کسی کو پھوٹی کوڑی تک دینے کو تیار نہ ہوتے۔

حسد کی آگ

اَب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے یہود کی حسد جیسی قبیح بیماری کا تذکرہ فرمایا ہے

اور پھر اس بیماری میں مبتلا اہل کتاب کو جہنم کی سزا کی وعید سنائی ہے اور مومنوں کے لیے آرام و راحت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ کیا یہ لوگوں کے ساتھ اس چیز پر حسد کرتے ہیں عَلٰی مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا کی ہے۔ اس آیت کریمہ میں یَحْسُدُوْنَ کی ضمیر اہل کتاب کی طرف لوٹتی ہے کیونکہ ان کا تذکرہ پیچھے سے چلا آرہا ہے۔ اور الناس سے مراد حضور نبی کریم علیہ السلام، آپ کے صحابہ کرامؓ اور عرب کے لوگ ہیں۔ جیسا کہ گذشتہ درس میں بھی عرض کیا تھا۔ کہ یہودیوں کو اہل ایمان کے ساتھ حسد اس بات پہ تھا کہ نبی آخر الزمان بنی اسرائیل کی بجائے بنی اسماعیل میں کیوں آگیا ہے۔ حسد کی اس آگ میں وہ اس قدر جل گئے کہ انہوں نے نہ صرف حضور علیہ السلام کی نبوت کا انکار کر دیا بلکہ اہلِ اسلام کی ایذا رسانی میں اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیں۔ اس بات کا ذکر سورۃ بقرہ اور دوسری کئی سورتوں میں بھی وضاحت کے ساتھ آیا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں بھی اللہ تعالےٰ نے یہودیوں کے اسی حسد کا تذکرہ فرمایا ہے کہ یہ لوگ اُس چیز میں حسد کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کی خواہش کے خلاف دوسروں کو عطا کر دی ہے۔

حسد ہماری شریعت میں بھی حرام ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے لَا تَحَاسَدُوْا لوگو! ایک دوسرے کے ساتھ حسد نہ کیا کرو۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے دَبَّ اِلَیْكُمْ دَآءُ الْاُمَمِ قَبْلَكُمْ اَلْحَسَدُ وَالْبَغْضَآءُ گذشتہ امتوں کی بیماریاں حسد اور بغض آہستہ آہستہ تمہاری طرف آرہی ہیں هِیَ الْحَالِقَةُ یہ مونڈنے والی ہیں، پھر فرمایا لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلٰکِنْ تَحْلِقُ الدِّیْنَ میں نہیں کہتا کہ یہ بیماریاں بالوں کو مونڈنے والی ہیں۔ بلکہ یہ دین کا صفایا کرنے والی ہیں حضور علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا اِیَّاکُمْ وَالْحَسَدَ لوگو! حسد سے بچو فَاِنَّ الْحَسَدَ یَاْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ کیونکہ حسد نیکیوں

کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ خشک لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ ابلیس نے بھی حضرت آدم علیہ السلام سے حسد اور کفر کیا تھا۔ اور حسد کی تعریف یہ ہے کہ کسی کے مال و نعمت کو دیکھ کر اس کے زوال کی تمنّا کی جائے یعنی یہ خواہش کی جائے کہ فلاں شخص کے پاس جو مال و دولت، مکان، دکان، کارخانہ، مویشی، فصل موجود ہے۔ وہ اس کے پاس نہ رہے۔ یہی چیز حرام ہے۔ البتہ کسی دوسرے شخص کی نعمت دیکھ کر اگر کوئی شخص خواہش کرے کہ اُسے بھی ایسی چیز اللہ تعالیٰ عطا کرے تو یہ جائز ہے۔ اسے غبطہ یعنی رشک کہتے ہیں۔

بزرگانِ دین کا مقولہ ہے مَا خَلَا جَسَدٌ عَنْ حَسَدٍ یعنی کوئی جسم حسد سے خالی نہیں۔ اکثریت ایسے لوگوں کی ہے۔ جو کسی کا مال، خوبی، حُسن علم، نیکی یا مال و دولت دیکھ کر اُسے زوال کی تمنا کرتے ہیں، یہی حسد ہے اور حرام ہے۔ بنی اسرائیل کی بھی یہی بیماری تھی جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل کو اپنے فضل سے نبوت، علم، مرتبہ، حکومت اور اقتدار عطا فرمایا تو بنی اسرائیل حسد کی آگ میں جل اُٹھے۔ کیونکہ وہ یہ چیزیں اپنے خاندان کے ساتھ مخصوص سمجھتے تھے فرمایا ہم نے اپنے فضل سے بنی اسماعیل میں جو نبوت کا سلسلہ منتقل کیا ہے تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ کیونکہ بنی اسماعیل بھی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ بیشک ہم نے آلِ ابراہیم میں کتاب دی ہے اسی خاندان میں اللہ تعالیٰ نے کتابیں نازل فرمائیں۔ زبور، تورات اور انجیل آل ابراہیم میں آئیں وَالْحِكْمَةَ اور حکمت یعنی علم بھی اسی خاندان کو عطا کیا، اس خاندان میں بڑے بڑے حکیم دانش ور اور صاحبِ علم لوگوں کو پیدا فرمایا۔ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا اور اس خاندان کو عظیم سلطنت بھی عطا کی۔ چنانچہ بنی اسرائیل میں سے حضرت یوسف علیہ السلام کی حکومت کا تذکرہ ہر زبان پہ ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت مثالی تھی آپ نے اللہ مالک الملک سے دُعا کی تھی "هَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ

لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِیْ" الٰہی مجھے ایسی سلطنت عطا فرما جو میرے بعد کسی کو حاصل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی یہ دُعا قبول فرمائی اور مثالی سلطنت عطا فرمائی اس کے علاوہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت طالوتؑ جیسے عظیم المرتبت بادشاہ ہوئے یہ سب بنی اسرائیل میں سے تھے۔ اس نعمت کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ کی ابتداء میں بھی کیا ہے۔ تخلیق انسانی اور خلافت ارضی کا مسئلہ بیان کرنے کے بعد فرمایا "یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ" اے بنی اسرائیل میری عطا کردہ نعمتوں کو یاد کرو اور یہ بھی نوٹ کر لو کہ اب یہ نعمتِ عظمیٰ تمہارے خاندان سے منتقل ہو چکی ہے اب تمہارے لیے فلاح وترقی کا واحد ذریعہ یہ ہے "وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ" اُس چیز پر ایمان لے آؤ جو میں نے نبی آخر الزمان علیہ السلام پر نازل کی ہے اور جو اُس چیز یعنی کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس ہے، نبوت، کتاب اور حکمت اگرچہ بنی اسماعیل میں چلی گئی ہے تاہم یہ ہے بہرحال خاندان ابراہیم میں۔ لہٰذا اسے تسلیم کر لو تو تمہیں اُسی طرح عزت حاصل ہوتی رہے گی۔ مگر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی پرواہ نہ کی اور ذلیل وخوار ہو کر رہ گئے۔

یہود کی طرف سے مخالفت

فرمایا یہودی سارے کے سارے ایک جیسے نہیں بلکہ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ اُن میں سے بعض ایمان لا چکے ہیں جیسے عبد اللہ بن سلامؓ اطراف مدینہ کے دس بڑے بڑے یہودی علماء میں سے آپ واحد شخص ہیں جنہیں ایمان کی دولت نصیب ہوئی۔ باقی سب مخالفت پر اڑے رہے حضور علیہ السلام نے فرمایا اگر یہ دس آدمی ایمان لے آتے، تو روئے زمین پر کوئی یہودی باقی نہ رہتا سب ایمان لے آتے۔ بہرحال اُن میں سے بعض ایمان لائے وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ اور اُن میں سے بعض ایسے ہیں جو ایمان لانے سے روکتے ہیں۔ بلکہ اُن کی اکثریت اپنی ضد پر اڑی رہی۔ ان کے متعلق پہلے

بھی گزر چکا ہے اور آئندہ سورۃ میں بھی آرہا ہے اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ
اُن میں سے اکثر نافرمان ہیں۔ حاسد، بغیض، ضدی اور اُلٹے دماغ والے ہیں۔
دین سے روکنے میں یہود و نصاریٰ سب سے آگے ہیں۔ یہ ہر وقت اس کوشش
میں رہتے ہیں کہ کسی طرح مسلمانوں کو اُن کے دین سے برگشتہ کر دیا جائے۔
اس مقصد کے لیے وہ اپنی تمام تر توانائیاں اور مال و دولت خرچ کرتے رہتے
ہیں کہ کسی طرح مسلمان اپنے دین سے متعلق شک میں پڑ جائیں۔ اس سلسلہ میں
عیسائی اور یہودی مشنریاں پوری طرح کام کر رہی ہیں۔ مستشرقین یہی خدمت
انجام دے رہے ہیں۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ کہ دین اسلام کے نام پر
بننے والے پاکستان میں اب تک لاکھوں مسلمان عیسائی بن چکے ہیں۔ پرانے
زمانے میں اس قسم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہمارے دلوں میں پہلے
مسلمانوں جیسا جذبہ ایمان باقی نہیں رہا۔ قرون اولیٰ میں اگر کوئی مسلمان دین سے
پھر جاتا تھا تو تمام اہل اسلام پر قیامت ٹوٹ پڑتی تھی، وہ سمجھتے تھے کہ ایک
آدمی کے مرتد ہونے سے اُن کی ساری دنیا تباہ ہو گئی ہے۔ مگر آج لوگ کس
تعداد میں عیسائی اور مرزائی ہو رہے ہیں مگر ہم ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ بہر حال
اللہ تعالیٰ نے دین حق سے روکنے والوں کے متعلق فرمایا وَكَفٰى
بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا اُن کے لیے جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ کافی ہے
وہ لوگ بچ نہیں سکتے، آخر پکڑے جائیں گے۔

کفار کے لیے جہنم کی سزا

فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا جن لوگوں نے ہماری آیتوں
کے ساتھ کفر کا شیوہ اختیار کیا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا عنقریب ہم انہیں
جہنم کی آگ میں داخل کریں گے۔ کفار میں یہودی، نصرانی اور مشرکین سب شامل ہیں۔
فرمایا انہیں ایسی مسلسل سزا دی جائیگی كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ
آگ میں جا کر جب اُن کے جسموں کی کھالیں جل جائینگی بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا
غَيْرَهَا ہم اُن کی کھالیں تبدیل کر دیں گے۔ مقصد یہ ہے۔ کہ ایک دفعہ

جل جانے سے اُن کا کام ختم نہیں ہو جائیگا بلکہ ایک کھال جلنے کے بعد دوسری کھال پہنا دی جائیگی، وہ بھی جل جائیگی تو اور دے دی جائیگی۔ اور یہ سزا ہمیشہ جاری رہیگی۔ کعب احبار کی روایت کے مطابق ایک گھنٹے میں ایک سو بیس[۱۲۰] دفعہ کھال تبدیل ہو گی۔ گویا ہر ایک منٹ کے عرصہ میں دو دفعہ کھال جلائی جائیگی اور دو دفعہ نئی پہنائی جائیگی۔ یہ بات کعب احبار نے حضرت عمرؓ کے سامنے بیان کی اور کہا کہ انہوں نے پہلی کتابوں میں ایسا ہی پڑھا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس بات کی تصدیق کی۔ ابتداء میں تو ہر جہنمی کی شکل وصورت آدمی کی ہو گی مگر جہنم میں جا کر جسم میں کلانی آئیگی اور وہ بہت بڑا ہو جائیگا۔ اور جسم جتنا بڑا ہو گا اُسے گرمی، سردی وغیرہ کا اتنا ہی زیادہ احساس ہو گا۔ فرمایا ہم آگ کی یہ سزا دیں گے لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ تاکہ وہ عذاب چکھیں۔ اُس وقت وہ حسرت ویاس کا اظہار کریں گے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کا کیوں انکار کیا اور کیوں لوگوں کو گمراہ کرتے رہے۔ فرمایا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا بیشک اللہ تعالیٰ غالب ہے اور وہ مجوزہ سزا دینے پر قادر ہے۔ وہ حکیم بھی ہے کہ اپنی حکمت کے ساتھ کافروں کو مقررہ وقت پر ضرور سزا دیگا۔

مومنوں کے لیے انعام

ترہیب کے بعد آگے ترغیب کا پہلو بھی آرہا ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا جو لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور روزِ جزا پر ایمان لائے۔ نبیوں کی تصدیق کی اور آیات الٰہی کو سچا تسلیم کیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ نیک اعمال بھی انجام دیے شیخ مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ بنیادی طور پر اعمال صالحہ چار ہیں یعنی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ۔ جو شخص اِن کو انجام دیگا وہ اللہ کی رحمت کا مستحق ہو جائیگا۔ باقی اعمال انہی چار اعمال کے تابع ہیں۔ فرمایا جو نیک اعمال انجام دیں گے سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ عنقریب ہم انہیں باغوں میں داخل کریں گے ایسے باغات تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ جن کے سامنے نہریں بہتی ہوں گی۔ مومنین کا وہاں

قیام کسی خاص مدت کے لیے نہیں ہوگا بلکہ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ انہیں وہاں ہر طرح کی رہائشی سہولت حاصل ہوگی اور تمام نعمتیں میسر ہوں گی۔

پاکیزہ بیویاں

فرمایا جنت میں مومن تنہائی بھی محسوس نہیں کریں گے کیونکہ لَھُمْ فِیْھَآ اَزْوَاجٌ مُّطَھَّرَۃٌ وہاں اُن کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ جو اُن کی طبعی خواہش کو پورا کریں گی۔ اور پاکیزہ بھی ایسی کہ نہ بول و براز کی حاجت نہ حیض کی نجاست اور نہ ہی کوئی اور آلائش۔ معنوی طور پر بھی پاکیزہ ہوں گی کہ خوش شکل وصورت، خوش اطوار اور خوش اخلاق ہوں گی، تمام اخلاقِ حسنہ مطھرہ میں شامل ہیں۔ اچھی بیوی تو اس دنیا میں سعادت سمجھی جاتی ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو اچھا مکان، اچھی سواری اور اچھی بیوی میسر آگئی تو یہ دنیاوی اعتبار سے سعادت کی نشانی ہے۔ اور اگر بیوی تُعِیْنُہٗ عَلٰی اَمْرِ دِیْنِہٖ یعنی دین کے معاملات میں تعاون کرنے والی ہو تو یہ مزید باعثِ راحت ہے۔ بہرحال اللہ نے فرمایا کہ جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے جنت میں مومنوں کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ جو ہر قسم کی آلائش سے پاک اور خوش کرنے والی ہوں گی۔

مکان، لباس، خوراک، بیوی، نیک لوگوں کی رفاقت وغیرہ مادی نعمتوں کا عروج ہے مگر پھر بھی دنیا میں ایسی نعمت کوئی نہیں جو کدورت سے خالی ہو۔ اگر ہر قسم کی نعمتیں میسر ہوں، پھر بھی بقول شیخ سعدیؒ یہ کھٹکا تو لگا رہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن مرنا ہے اور یہ سب کچھ ختم ہونا ہے مگر جنت کے متعلق فرمایا کہ وہاں کی نعمتیں ابدی ہوں گی جو کبھی ختم نہ ہوں گی۔ اور پھر فرمایا۔ وَّنُدْخِلُھُمْ ظِلًّا ظَلِیْلًا ہم داخل کریں گے مومنوں کو گھنے سایوں میں۔ اس کی تشریح ترمذی شریف کی روایت میں موجود ہے۔ کہ جنت کے ایک ایک درخت کا سایہ اتنا لمبا چوڑا ہوگا کہ کوئی گھوڑ سوار

لگاتار سو سال میں بھی اُسے عبور نہیں کر سکے گا۔ اور یہ سایہ مومن کے لیے باعث راحت ہو گا۔ اگرچہ سایہ کا احساس دھوپ کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ مگر بعض اوقات محض سایہ بھی باعث تسکین ہوتا ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے انعام کے طور پہ گھنے سائے کا تذکرہ فرمایا۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا ۙ وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿۵۸﴾

ترجمہ :- بیشک اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ تم امانتوں کو ادا کرو اُن کے اہل کی طرف اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو یہ کہ فیصلہ کرو انصاف کیساتھ بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں اچھی نصیحت کرتا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ سُننے والا اور دیکھنے والا ہے ﴿۵۸﴾

ربطِ آیات

سورۃ کی ابتداء سے اب تک عموماً حقوق کا تذکرہ تھا خصوصاً حقوق العباد کے ضمن میں یتیموں کے حقوق، وراثت، نکاح اور حلت وحرمت وغیرہ کے مسائل بیان ہوئے اس کے علاوہ یہودیوں کی بہت سی قباحتوں کا تذکرہ ہوا۔ اب یہاں سے تقریباً بارہ آیات تک دوسرا مضمون بھی آرہا ہے جس کا تعلق اجتماعیت سے ہے اور جس میں سیاسیات بھی آجاتی ہیں۔

دیگر خرابیوں کے علاوہ یہودیوں میں دو بُری خصلتیں یہ بھی تھیں کہ ایک تو امانت کو ادا نہیں کرتے تھے بلکہ اس میں خیانت کرتے تھے اور دوسرے یہ کہ جب وہ کسی معاملہ میں فیصلہ کرتے تھے تو عدل وانصاف کا دامن چھوڑ کر جانبداری اور رشوت کی بنیاد پر فیصلے کرتے تھے آج کے درس کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انہی دو چیزوں کا حکم دیا ہے کہ امانتدار کو اس کی امانت ادا کرو اور فیصلے حق وانصاف کی بناء پر کیا کرو۔ اس آیت میں اہل کتاب کو اُن کی غلطیوں کا احساس دلایا گیا ہے، اور اہل اسلام کو اِن اصولوں پہ کاربند رہنے کی تلقین کی گئی ہے

نظامِ حکومت کی ضروریات

یہ ایک حقیقت ہے۔ کہ اچھی حکومت یعنی صالح حکومت صالحہ جماعت سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اور صالحہ جماعت یا قوم وہ ہوتی ہے جس کے افراد کا اعتقاد، عمل اور

اخلاق صالح ہو۔ حکومت کی ضروریات کی دو بنیادی چیزیں امانت اور عدل ہیں اگر حکومت کے افسر، حکام یا عمال امین اور عادل ہوں گے، تو نظام حکومت صحیح رُخ پر گامزن ہو گا، لوگوں کو اُن کے حقوق اور عدل و انصاف حاصل ہو گا۔ ملک میں امن و امان قائم ہو گا اور لوگ چین کی زندگی بسر کریں گے۔ برخلاف اس کے اگر کارپردازان حکومت خائن اور ناانصاف ہوں گے، تو حکومت کا نظام درست طریقے سے نہیں چل سکے گا، ملک میں بدامنی کی فضا پیدا ہو گی لوگوں کے حقوق ضائع ہوں گے اور رعایا امن و چین کی زندگی سے محروم ہو جائے گی۔

صاحب تفسیر خازن فرماتے ہیں کہ اس آیت کا اطلاق حکومت اور عوام دونوں طبقوں پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس گاؤں، قصبے یا شہر میں لوگ اکٹھے رہتے ہوں اور اُن کے مفادات مشترکہ ہوں وہاں انکے درمیان تنازعات کا پیدا ہو جانا بھی عین ممکن ہے۔ اگر دو افراد کے درمیان لین دین کا معاملہ ہو تو انہیں بھی حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حقوق کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے حقوق فرائض کی پابندی کریں اور جو فرد جس چیز کا اہل ہے، اُسے اُسکی امانت ادا کی جائے۔ اور ایک دوسرے کے درمیان عدل و انصاف کی فضا قائم کی جائے۔ افراد سے بڑھ کر یہی چیزیں جب حکومت کی سطح پر پیدا ہوں تو صالح حکومت کا بھی فرض ہے۔ کہ رعایا میں سے جو شخص جس کام کا اہل ہے، وہی کام اس کے سپرد کیا جائے۔ نیز یہ کہ جب افراد کے تنازعات فیصلہ کے لیے حکومت تک پہنچیں تو پھر حکام پر لازم آتا ہے کہ ہر شخص سے انصاف کیا جائے۔ رشوت، سفارش، اقربا پروری، اور جانبداری کو بالکل ختم کر دیا جائے۔

ادائے امانت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے۔ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا کہ امانت

اُس شخص کے سپرد کرو، جو اُس کا اہل ہے۔ یہ عمومی حکم ہے اور اس میں کسی فرد یا جماعت کو خصوصیت حاصل نہیں، لہٰذا جیسا کہ پہلے عرض کیا یہ آیت افراد اور حکومت دونوں کے لیے واجب التعمیل ہے۔

ادائے امانت کا عام فہم مفہوم تو یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے دوسرے شخص کے پاس کوئی چیز بطور امانت (ودیعت) رکھی ہے۔ تو وہ اُسے معین وقت پر واپس ادا کرے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے علی الید ما اخذت یعنی جو چیز بطور امانت یا ودیعت وصول کی ہے اُسے اسی طرح واپس کرو۔ اَلْاَمٰنَۃُ مُؤَدَّاتٌ امانت کا ادا کرنا ضروری ہے۔ اگر کوئی امانت لے کر واپس نہیں کرتا تو اُس نے خیانت کی حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ منافق کی ایک نشانی یہ بھی ہے اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ یعنی جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے۔ حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد ہے لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَّآ اَمَانَۃَ لَہٗ جس شخص میں امانت نہیں وہ ایمان سے خالی ہے گویا امانت اتنی اہم چیز ہے۔

امانت میں صرف وہی چیز شامل نہیں جو بطورِ خاص امانت کے طور پر رکھی گئی ہو۔ بلکہ کوئی شخص کسی دوسرے سے کپڑا، برتن یا کوئی دیگر چیز عاریتاً لیتا ہے تو اس کا فرض ہے، کہ استعمال کے بعد حسب وعدہ وہ چیز واپس کرے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو راستے میں کوئی گری پڑی چیز مل جائے تو اُس پر بھی ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ چیز اس کے مالک تک پہنچائے۔ حضور علیہ السلام کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق چیز پانے والا اس چیز کی تشہیر کرے تاکہ اصل کے مالک کا پتہ لگایا جا سکے۔ اس کے باوجود اگر گمشدہ چیز کا مالک نہ مل سکے تو پھر حکم ہے کہ ایسی چیز کو صدقہ کر دیا جائے۔ اگر خود غریب اور مستحق ہے تو وہ بھی استعمال کر سکتا ہے۔ یا اُسے بیت المال میں جمع کرا سکتا ہے، بہر حال یہ چیز اس کے پاس امانت ہے جس کی ادائیگی

معروف طریقے پر ہونی چاہیئے۔ اگر کسی شخص کے پاس کوئی چیز بطور رہن رکھی گئی ہے تو اس کی ادائیگی بھی ضروری ہے۔ اس طرح کوئی چیز کرائے پر حاصل کی ہے تو وہ بھی مقررہ وقت پر واپس پہنچنی چاہیئے۔ کسی کے ذمے وراثت کا حق ہے اُس کو ادا کرو۔ یتیم کا مال اُس کے حوالے کرو۔ قرضدار کا قرض ادا کرو۔ غرضیکہ جو شخص جس چیز کا حقدار ہے اُس کے حق کا اعتراف کرو۔ یہ سب چیزیں امانت میں شامل ہیں۔

منصبی امانت

کسی عہدے یا منصب پر تعیناتی کرنا متعلقہ حاکم کے ذمے بہت بڑی امانت ہے۔ ادائیگی امانت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص جس منصب کا اہل ہے وہ اُس کے سپرد کرو۔ اگر کوئی عہدہ اہل کی بجائے نااہل کو دیا جائیگا تو وہ خیانت ہوگی اور ایسا کرنے والا شخص قابل مواخذہ ہوگا۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ جو حاکم کوئی عہدہ اس کے اہل کی بجائے اپنے کسی غیر مستحق دوست یا رشتہ دار کو دیتا ہے تو وہ آدمی اللہ کے ہاں ملعون ہے، اُس نے امانت میں خیانت کا ارتکاب کیا ہے۔ گویا تقسیم منصب بھی بہت بڑی امانت ہے۔

چار خوبیاں

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے اربع اذاکن فیك اگر تمہارے اندر یہ چار خوبیاں موجود ہوں فلا علیك فیما فات من الدنیا تو پھر دنیا میں کوئی چیز بھی تم سے فوت ہو جائے، اس میں کوئی حرج نہیں۔ مطلب یہ کہ ان اعلیٰ خصلتوں کی موجودگی میں تو کسی دیگر چیز کی پرواہ نہ کر۔ فرمایا پہلی چیز حفظ امانت ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس امانت کی دولت موجود ہے تو یہ بہت بڑی خوبی کی بات ہے۔ فقہا اور مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ امانت میں وضو، غسل، نماز، روزہ وغیرہ سب شامل ہیں۔ ان امانتوں کی احسن طریقے سے مقررہ وقت پر ادائیگی ہونی چاہیئے۔

فرمایا دوسری خوبی صدق حدیث ہے یعنی ہمیشہ سچی بات کرو، خواہ اس کے لیے کتنی ہی تکلیف برداشت کرنی پڑے۔ تیسری چیز فرمایا حسن خلق

ہے۔ انسان کو ہمیشہ اچھے اخلاق اور اعلیٰ اطوار کا حامل ہونا چاہیئے۔ اور چوتھی خوبی عفت طعمہ ہے۔ انسان اپنی خوراک حلال، طیب اور پاکیزہ بنائے۔ محنت کر کے جائز ذرائع سے روزی کمائے گا تو خوراک خود بخود پاک ہو گی اور کسب حلال نہیں ہے کسی کا حق ضائع کیا، رشوت، چوری اور خیانت کا مال ہے تو پھر ایسے شخص کو پاکیزہ خوراک کیسے نصیب ہو سکتی ہے۔

تین زریں اصول

حضرت انسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا لَا تَزَالُ هٰذِهِ الْاُمَّةُ بِخَيْرٍ یہ امت ہمیشہ بہتری میں رہیگی جب تک یہ تین زریں اصولوں پہ کاربند رہیگی۔ فرمایا پہلا اصول یہ ہے مَا اِذَا قَالَتْ صَدَقَتْ یعنی امت کے افراد بات جب بھی کریں سچی کریں، اس میں جھوٹ کی ملاوٹ نہ ہو۔ دوسری بات یہ ہے اِذَا حَكَمَتْ عَدَلَتْ جب فیصلہ کریں تو حق و انصاف کے مطابق کریں کیونکہ انہیں حکم دیا جا چکا ہے کہ جب کوئی فیصلہ کرو وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ تو عدل کے ساتھ کرو۔ فرمایا تیسرا اصول یہ ہے اِذَا سْتُرْحِمَتْ رَحِمَتْ جب امت کے لوگوں سے رحم طلب کیا جائے تو وہ رحم کریں۔ فرمایا اگر یہ تین اصول امت سے خارج ہو گئے تو وہ فتنہ میں مبتلا ہو جائیگی۔ بہر حال آپ نے ان اصولوں کی پابندی کی ترغیب دلائی۔

حضرت ابن عباسؓ کے اوصاف

امام ابوبکر جصاصؒ نے اپنی تفسیر میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ کہ کسی شخص نے آپ کو گالی دے دی۔ اس کے جواب میں ابن عباسؓ نے فرمایا اِنَّكَ لَتَشْتُمُ تو مجھے گالی دیتا ہے حالانکہ میں کسی مسلمان کا بدخواہ نہیں ہوں۔ گالی تو کسی بُرے آدمی کو بھی نہیں دینی چاہیئے چہ جائیکہ تو مجھے گالی دیتا ہے جب کہ مجھ میں تین اوصاف پائے جاتے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ اِنّی لَاٰتی علی الاٰیۃ، جب میں قرآن پاک سے کوئی آیت پڑھتا ہوں۔ اور اس کے ذریعہ معانی و مطالب کے جو اسرار مجھ پر منکشف ہوتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ

وہ سب کچھ دوسرے لوگ بھی جان لیں۔ ظاہر ہے کہ اپنے بھائیوں کے ساتھ یہ انتہائی درجے کی خیر خواہی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ امت میں سب سے بڑے مفسر قرآن ہیں۔ جب وہ کوئی آیت پڑھتے ہوں گے تو آپ کے ذہن میں کیسے کیسے مضامین آتے ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ اُن کے قلب و ذہن پر کیسے کیسے راز منکشف کرتا ہوگا، فرماتے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ دوسرے لوگ بھی جان لیں۔

اس قسم کی مثال ہمیں قریبی زمانہ میں بھی ملتی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی کتاب فیوض الحرمین میں لکھتے ہیں کہ جب میں قرآن پاک کی کوئی آیت پڑھتا ہوں تو بعض اوقات اس کے تحت مجھ پر علم و عرفان کے اتنے دروازے کھُل جاتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ آیت ایسا وسیع سمندر ہے جس کا کوئی ساحل نہیں بہرحال حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔ کہ قرآن پاک کی جو تشریح اللہ کریم میرے قلب میں ڈال دیتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ سب لوگ اس سے واقف ہو جائیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ مجھ میں دوسری خوبی یہ ہے۔ کہ جب کسی مسلمان حاکم کے متعلق سنتا ہوں کہ وہ انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔ تو مجھے بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے، حالانکہ مجھے کبھی ذاتی طور پہ اُس کے سامنے مقدمہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اور شاید آئندہ بھی تازلیست ایسا موقع نہ آئے۔ تاہم اُس کے انصاف پر مجھے خوشی ہوتی ہے آپ نے فرمایا کہ تیسری بات یہ ہے۔ کہ جب میں سُنتا ہوں کہ مسلمانوں کے کسی علاقے میں باران رحمت ہوتا ہے، تو مجھے بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے حالانکہ میرے پاس کوئی جانور نہیں جسے وہاں چرنے کی ضرورت ہو۔ تاہم مسلمانوں کی بھلائی سے مجھے دلی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ کہ بارش ہونے کی وجہ سے علاقے کے مسلمان خوشحال ہوں گے۔ میں بہرحال بنی نوع انسان کا خیر خواہ ہوں مگر ایک تم ہو کہ مجھے گالی دیتے ہو۔

حکام سے عہد

امام حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکام سے تین چیزوں کا

عہد لیا ہے پہلی بات یہ ہے۔ "وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى" مسلمانوں کے حاکم یا امیر کے لیے لازم ہے کہ وہ رعایا کے حقوق کا خیال رکھے اور اپنی ذاتی خواہشات کی پیروی نہ کرے۔ عام طور پہ آج کی دنیا میں حق کی پیروی کرنے والے بہت کم حاکم ہیں۔ اُن میں سے زیادہ تر نفسانی خواہشات کی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے اُن سے عہد لیا ہے۔ کہ وہ ذاتی خواہشات کی پیروی نہیں کریں گے۔ فرمایا اللہ نے حکام سے دوسرا عہد یہ لیا ہے اَنْ يَخْشَوْا کہ وہ خدا سے ڈریں کیونکہ "وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ" یہ خدا تعالیٰ کا حق ہے کہ اُس سے خوف کھایا جائے۔ اگر حاکم میں خوفِ خدا پیدا ہو گیا تو پھر حق و انصاف کی حکومت ہو گی اور ظلم و جور کا خاتمہ ہو جائے گا۔ فرمایا تیسری بات جس کا اللہ تعالیٰ نے عہد لیا ہے، وہ یہ ہے "اَنْ لَّا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا" کہ میری آیتوں کے بدلے حقیر مال حاصل نہیں کرو گے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ حکام رشوت لے کر اللہ کے احکام کو بیچ دیتے ہیں اور فیصلہ حق و انصاف کے خلاف کر دیتے ہیں، فرمایا اللہ نے عہد لے رکھا ہے۔ کہ وہ ایسا کام نہیں کریں گے۔

یہ بیان کرنے کے بعد امام حسن بصریؒ نے قرآن پاک کی تین آیات تلاوت فرمائیں۔ پہلے عہد کے متعلق سورۃ ص کی یہ آیت "يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى" اے داؤد علیہ السلام ابیشک ہم نے آپ کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے پس آپ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کریں اور خواہش کی پیروی نہ کریں۔ اس کے بعد خوفِ خدا سے متعلق آپ نے یہ آیت تلاوت کی "فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ" اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، کہ مجھ سے ڈرو اور لوگوں سے نہ ڈرو۔ اگر خوفِ خدا دل سے نکل گیا تو پھر ظلم و جور کا بازار گرم ہو جائے گا اور رعایا کی نہ جان محفوظ ہو گی، نہ عزت اور نہ

اُن کا مال۔ اور پھر حکام کی تیسری ذمہ داری کے متعلق یہ آیت پڑھی "وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ" یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا، تو ایسے لوگ کافروں میں سے ہیں۔ اگر اللہ کے احکام کے برحق ہونے سے انکار کرتا ہے تو بلاشبہ کافر ہے۔ اور ایمان رکھنے کے باوجود غلط فیصلہ کرتا ہے تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ نے فاسق اور ظالم تو بہر حال فرمایا ہے۔

حاکم کی ذمہ داریاں

نظام حکومت چلانا بہت مشکل کام ہے۔ دنیا دار اسے آسان سمجھ کر ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ بلکہ ہر جائز ناجائز طریقے سے حاکم بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ قیامت کے دن ہر صاحب اقتدار حاکم کو ندامت اور حسرت ہو گی۔ اس دن وہ تمنا کریگا، کاش میں دنیا میں حاکم نہ بنتا۔ رعایا کے حقوق اور مظالم اُس کی گردن پر ہوں گے۔ ناانصافیاں گلے میں لٹکتی ہوں گی۔ مظلوم جنت میں چلا جائے گا۔ اور اس کے بدلے میں حاکم کو دوزخ میں پھینک دیا جائیگا، آج تو دنیا میں بڑی شان و شوکت سے حکومت کی جاتی ہے مگر جب قیامت کے دن جزائے عمل کا وقت آئیگا تو حسرت اور ندامت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔

فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے۔ کہ تم امانتیں اُن کے اہل کی طرف لوٹا دو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِهٖ بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں اچھی چیز کی نصیحت کرتا ہے۔ اُس کے احکام پر عمل کرو گے تو تمہارا نظام درست ہو جائیگا۔ تمہاری سوسائٹی پاک ہو جائیگی اور تم بلا خوف و خطر خوشحالی کی زندگی بسر کرو گے۔ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ سَمِیْعًا بَصِیْرًا بیشک اللہ تعالیٰ سمیع ہے۔ وہ ہر ایک کے ظاہر و باطن قول کو سنتا ہے۔ اور بصیر ہے۔ کہ ہر شخص کا قول اور فعل اسکی نگاہ میں ہے۔ سورۃ فجر میں فرمایا اِنَّ

رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ" بیشک تمہارا رب گھات میں ہے۔ وہ تمہارے افعال وکردار سے واقف ہے۔ وہ تمہارے اقوال کو سن رہا ہے اور اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ اِن کا نتیجہ وقت معین پر سامنے آجائیگا۔

يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي
الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ
إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ﴿۵۹﴾ ع ۹/۵

ترجمہ:- اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور تم میں سے جو صاحبِ امر ہوں اُن کی۔ پس اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو، پس لوٹاؤ اُس کو اللہ کی طرف اور رسول کی طرف، اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور پچھلے دن یعنی قیامت پر۔ یہ بات بہتر ہے اور اچھی ہے انجام کے اعتبار سے ﴿۵۹﴾

ربطِ آیات

گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے ادائے امانت اور عدل کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہی وہ اصول ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے مسلمانوں کے اجتماعی اور انفرادی نظام درست رہ سکتے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا۔ کہ یہ حکم ہر اُس شخص یا جماعت کے لیے ہے، جو کسی نہ کسی طرح اصلاحِ معاشرہ کا ذمہ دار ہے۔ سب سے پہلے یہ ذمہ داری امیر یا حکام پر آتی ہے کیونکہ سوسائٹی میں نظم و نسق کے ذمہ دار وہی ہوتے ہیں، کسی فرد یا جماعت کا حق دلانا اور فریقین میں جھگڑے کی صورت میں عدل قائم کرنا حکومتِ وقت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ دوسرے نمبر پر ہر شخص فرداً فرداً بھی اپنے حلقۂ اثر میں ذمہ دار ہے اور اُس محدود حلقہ میں ادائے امانت اور قیامِ عدل کی ذمہ داری اُسی پر عائد ہوتی ہے حضور علیہ السلام کا ارشادِ مبارک ہے كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ

تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور ہر ایک سے اسکی رعیت کے متعلق سوال کیا جائیگا اس سے ملکی اور علاقائی سطح پر حاکم وقت بھی مراد ہے اور گھریلو سطح پر گھر کا سربراہ بھی اسی زمرہ میں آتا ہے۔ گھریلو معاملات میں وہ بھی ذمہ دار ہوتا ہے۔ علاقے کا حاکم ہو یا کسی ادارے کا سربراہ، ہر شخص سے اُس کی حیثیت کے مطابق بازپرس ہوگی۔ کہ آیا اُس کے ذمہ جو امانت تھی وہ اُس نے اہل تک پہنچائی یا نہیں۔ اور تنازعے کی صورت میں اُس نے کہاں تک عدل کیا۔

بیت اللہ شریف کی چابی

ادائے امانت کے ضمن میں اکثر مفسرین نے فتح مکہ کے موقع پر بیت اللہ کی چابی کا واقعہ بیان کیا ہے۔ سنہ ۸ھ میں جب مکہ فتح ہو گیا تو حضور علیہ السلام نے بیت اللہ شریف کے اطراف کو بتوں سے پاک کیا۔ پھر خانہ کعبہ کے اندر جانے کا ارادہ فرمایا تو بنی شیبہ کے خاندان کے چابی بردار عثمان ابن طلحہ رضؓ کو طلب کیا۔ چابی اُس کی مشرکہ ماں کے پاس تھی جس نے چابی دینے سے اس لیے لیت و لعل کیا کہ اگر ایک دفعہ چابی اُس خاندان سے چلی گئی تو واپس نہیں ملیگی حضرت عثمانؓ نے ماں سے کہا کہ مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو چکا ہے اور اب اگر چابی نہ دی گئی تو اُس کی اپنی جان خطرے میں ہے۔ چنانچہ چابی آپ کی خدمت میں پیش کی گئی۔ حضور علیہ السلام نے بیت اللہ شریف کا دروازہ کھولا اندر تشریف لے گئے اور وہاں پر دُعا کی۔ پھر جب باہر آئے تو خاندان بنی ہاشم میں سے حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ نے چابی اپنی تحویل میں رکھنے کی درخواست کی تو حضور علیہ السلام نے یہی آیت تلاوت فرمائی اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا یعنی اللہ حکم دیتا ہے۔ کہ امانتیں اُن کے اہل کے پاس پہنچیں، چنانچہ آپ نے بیت اللہ کی چابی اُس کے حامل عثمان بن طلحہ ہی کو واپس کر دی، جو آج تک اُسی خاندان میں چلی آرہی ہے۔

اللہ اور رسول کی اطاعت

اب آج کی تلاوت کردہ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے وہ قانون بتایا ہے جس کے نفاذ کے ذریعے ادائے امانت اور عدل کا فریضہ انجام دیا جاسکتا ہے

ارشاد ہوتا ہے یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے ایمان والو! اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ اور تم میں سے جو صاحبِ امر ہیں اُن کی اطاعت کرو۔

یہاں پر اطاعت کے تین درجات بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا درجہ اطاعت الٰہی کا ہے اور یہ اطاعت علی الاطلاق تمام انسانوں پر فرض ہے۔ یہ اطاعت مطلقہ اور بالذات ہے، لہذا یہ ہر حالت میں ضروری ہے، اس میں کوئی استثناء نہیں، اس سے سرتابی کرنے والا نافرمان، مجرم اور جہنمی ہے، وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالٰی خالق، مالک، مربی اور محسن ہے۔ لہذا اُس کی اطاعت بہرصورت لازم ہے۔ دوسرے نمبر پر اطاعتِ رسول ہے اور یہ بھی مطلق اطاعت ہے تاہم یہ اطاعت بالذات نہیں بلکہ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اللہ تعالٰی کی اطاعت کرنے، اُس کے حکم کی تعمیل کرنے اور اُسکی مرضیات اور نامرضیات تک پہنچنے کے لیے قطعی اور یقینی واسطہ رسول ہوتا ہے۔ لہذا رسول کی اطاعت بھی لازمی ہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے "مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ" جس نے رسول کی اطاعت کی، اُس نے گویا اللہ ہی کی اطاعت کی، کیونکہ رسول دنیا میں اپنا حکم نافذ نہیں کرتا بلکہ اللہ ہی کے حکم کو نافذ کرتا ہے اس لحاظ سے پیغمبر کی اطاعت اس امر کی قطعی علامت ہے کہ کوئی شخص واقعی اللہ تعالٰی کا فرمانبردار ہے۔

اولی الامر کی اطاعت

اب تیسری اطاعت صاحبِ امر کی ہے۔ اور اس سے مراد حاکمِ وقت علماء و فقہاء اور ہر ذمہ دار شخص ہے۔ مسلمان حاکم کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت کی شرط پر لازم ہے۔ جب تک حاکمِ وقت اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت پر کاربند رہیگا، اُس وقت تک اُس کی اطاعت بھی فرض ہے۔ اُس کی ہر جائز بات ماننا ضروری ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے عَلَیْکُمُ السَّمْعُ وَالطَّاعَۃُ جب امیر حق بات کہتا ہے تو اُس کا سُننا اور اس کی اطاعت

کرنا تم پر لازم ہے خواہ تمہیں یہ بات پسند ہو یا نہ ہو۔ نبی علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا مَنْ اَطَاعَ اَمِیْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ یعنی جس نے میرے امیر کی اطاعت کی، اُس نے گویا میری ہی اطاعت کی۔ مطلب یہ کہ جب تک امیر یا حاکم اللہ اور رسول کے حکم کے مطابق راہنمائی کرتا ہے، اُس کی اطاعت فرض ہے وَاِذَا اَمَرَ بِمَعْصِیَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ اور اگر وہ نافرمانی کا حکم دے تو نہ اس کی بات سننا ضروری ہے اور نہ اس پر عمل کرنا۔ کیونکہ اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِی الْمَعْرُوْفِ اطاعت اور فرمانبرداری نیک اور جائز امور میں ہی ہو سکتی ہے۔ آپ کا یہ بھی فرمان ہے[۱] لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ یعنی اللہ کی ناراضگی کی صورت میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے بلکہ حرام ہے۔ حاکم کی اطاعت تو اُس وقت تک ہی ہو سکتی ہے مَادَامَ یَقُوْدُکُمْ بِکِتٰبِ اللّٰہِ جب تک وہ اللہ کی کتاب، اس کے دین اور شریعت کے مطابق راہنمائی کرتا ہے ایسا شخص خواہ بڑے خاندان سے تعلق رکھتا ہو یا چھوٹے سے، اعلیٰ ہو یا ادنیٰ، آقا ہو یا غلام، ہر حالت میں اس کی اطاعت لازم ہوتی ہے۔

حاکم چونکہ ظاہری طور پر شریعت کا قانون نافذ کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں، اُن کے پاس اقتدار کی امانت ہوتی ہے، اختیار ہوتا ہے، لہٰذا کسی حاکم کا جھوٹ بولنا یا غداری کرنا بہت بڑا جرم تصور ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے اختیار دیا ہے۔ تو اُس پر لازم ہے کہ تفویض شدہ امانت کے مطابق شرعی احکام نافذ کرے۔

علماء کی اطاعت

باقی رہی علما اور فقہا کی اطاعت، تو وہ اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ حضرات جائز اور ناجائز امور کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اُن کے پاس علم کی امانت ہوتی ہے جسے وہ عوام تک پہنچاتے ہیں، اس ضمن میں علمائے سوء نے تو ہمیشہ غلط راستہ اختیار کیا مگر علمائے حق نے ادائے امانت کے فریضہ کو انجام دینے میں کبھی رُو رعایت نہیں کی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے مار کھائی، تکالیف برداشت کیں

[۱] مشکوٰۃ ص۳۲۱ بحوالہ شرح السنۃ (فیاض)

مگر حق کا دامن نہیں چھوڑا۔ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ چاروں پر اپنے اپنے وقت میں آزمائش آئی، انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، جلاوطن ہوئے مگر صداقت سے روگردانی نہیں کی، بلکہ ہمیشہ سچی بات کی۔ لہذا علماء، فقہا کی اطاعت اس وجہ سے ہے کہ وہ جائز اور ناجائز میں تفریق کرتے ہیں۔ اس ضمن میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ کی اطاعت اس لیے ہے کہ وہ مالک ہے، رسول کی اطاعت اس واسطے کہ خدا تعالےٰ کا پیغام پہنچانے والا ہے اور علماء کی اطاعت اس لیے کہ وہ تبلیغ رسالت کا فریضہ انجام دینے والے ہیں۔

بہر حال یہ تیسری اطاعت جس میں حکام، فقہا اور علماء آتے ہیں مشروط ہے، اگر وہ اچھی بات کا حکم دیں تو اُن کی اطاعت کی جائیگی اور اگر کوئی غلط بات بتائیں تو اُسے تسلیم نہیں کیا جائیگا۔ چنانچہ علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی فقیہہ ایسا فتوٰی دے یا ایسا مسئلہ بتائے جو کتاب و سنت کے خلاف ہو تو اس کی بات ماننا گناہ کا ارتکاب ہوگا۔ اور اگر مسئلہ کتاب و سنت کے مطابق ہے تو پھر اُس کا ماننا ضروری ہوگا۔

شرعی قوانین کا فقدان

اس وقت میں باون مسلمان حکومتیں ہیں مگر ہر طرف ملوکیت ہے یا ڈکٹیٹر شپ کہیں سرمایہ دارانہ نظام جاری ہے اور کہیں اشتراکیت کا غلبہ ہے مارشل لاء جیسے طاغوتی قوانین تو بلا حیل و حجت نافذ کر دیے جاتے ہیں مگر جب بھی شرعی قوانین کے نفاذ کا موقع آتا ہے تو ہیرا پھیری سے کام لیا جاتا ہے۔ اور طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں۔ ہمارے ملک میں اب اس بات پر بحث ہو رہی ہے کہ اسلام میں رجم یعنی سنگساری کی سزا ہے یا نہیں یہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہے، حال ہی میں ایک زانی کو تیس کوڑے اور بارہ سال قید کی سزا دی گئی ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم تو یہ ہے کہ اگر زانی غیر شادی شدہ ہے۔ تو اُسے سرعام سو کوڑے لگاؤ۔ اگر وہ کوڑوں

کی تاب نہ لا کر مر گیا تو ٹھیک ہے، ورنہ اُسے آزاد کر دو۔ ہاں حدیث شریف میں تغریب عام کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ اُسے ایک سال کے لیے جلا وطن کیا جا سکتا ہے ضلع بدر کر دو یا جیل میں ڈال دو۔ بہرحال سورۃ نور میں سو کوڑوں کی سزا کا حکم موجود ہے۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ حکام اپنا فرض ادا کرنے سے قاصر ہیں اس سلسلہ میں علماء کی اکثریت بھی اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوتی نظر نہیں آتی، کچھ ایسے لوگ خال خال ہی ہیں۔ جنہیں اپنی ذمہ داری کا احساس ہے۔

بصورت تنازعہ

فرمایا فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ اگر کسی معاملہ میں تمہارا جھگڑا ہو جائے، حکام وقت یا فقہاء اور علماء کے ساتھ اختلاف رائے پیدا ہو جائے، تو ایسے معاملے کے متعلق فرمایا فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو کیونکہ تمام معاملات میں آخری مرجع اور آخری سند (FINAL AUTHORITY) اللہ اور رسول ہے۔ حقیقت میں قطعی سند تو اللہ تعالیٰ کی ہے مگر رسول اس کی قطعی علامت ہے۔ اسی لیے فرمایا متنازعہ معاملہ اللہ اور اس کے رسول یعنی کتاب اللہ اور سنتِ رسول کے سامنے پیش کر کے حل معلوم کر لو۔ اگر یہ مسئلہ قرآن پاک یا سنتِ خیر الانام سے صراحتاً حل ہو گیا تو ٹھیک ہے اُسے قبول کر لو۔ وگرنہ اجتہاد و استنباط کے لیے علماء اور فقہاء کے سپرد کر دو۔ آجکل کی زبان میں پہلی صورت کو قانون (LAW) کہتے ہیں اور دوسری صورت کو ضمنی قواعد (BYLAWS) کا نام دیتے ہیں۔ جب کوئی چیز قرآن و سنت سے صراحتاً مل گئی تو اس میں کسی تغیر و تبدل کی گنجائش نہیں ہوتی، البتہ اجتہاد کے ذریعے اخذ کئے گئے (BYLAWS) تبدیل بھی ہو سکتے ہیں۔ ایسے معاملات میں فقہائے کرام کے اختلاف کی وجہ یہی ہے کہ ہر فقیہ مسئلہ کا حل بذریعہ استنباط نکالتا ہے جو کہ ایک طبعی بات ہے تاہم آخری سند اللہ اور اس کے رسول کی ہے۔ حتمی فیصلہ وہیں سے ہو گا۔

حرف آخر

فرمایا تمہیں اللہ اور رسول کی بات پر ہی سر تسلیم خم کرنا ہو گا اِنْ كُنْتُمْ

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ بشرطیکہ تم اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ اگر اللہ اور رسول کی اطاعت کو قبول کر لوگے تو معاشرہ بالکل درست ہو جائیگا، انصاف کا بول بالا ہوگا، کسی حقدار کا حق ضائع نہیں ہوگا۔ اور اگر اپنے معاملات دوسرے انسانوں کے سپرد کر دیے تو پھر پورا نظام درہم برہم ہو جائے گا، زمین میں فساد برپا ہوگا۔ اور کوئی کام درست طور پر انجام نہیں دیا جا سکے گا۔ اسی لیے فرمایا کہ اپنے تمام معاملات اللہ اور اس کے رسول کے تابع کر لو، قیامت میں فیصلے کا مدار یہی چیزیں ہوں گی۔ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا یہی چیز انجام کے اعتبار سے بہتر ہے اس پر عمل پیرا رہوگے تو دنیا میں بھی امن و سکون حاصل ہوگا اور آخرت میں بھی فلاح نصیب ہوگی اور اگر ان اصولوں سے انحراف کیا تو نہ دنیا میں چین نصیب ہوگا اور نہ آخرت کی کامیابی حاصل ہوگی۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَآ
أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَن
يَتَحَاكَمُوٓا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوٓا أَن
يَكْفُرُوا بِهِۦ وَيُرِيدُ الشَّيْطَٰنُ أَن يُضِلَّهُمْ
ضَلَٰلًۢا بَعِيدًا ﴿٦٠﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ
مَآ أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَٰفِقِينَ يَصُدُّونَ
عَنكَ صُدُودًا ﴿٦١﴾ فَكَيْفَ إِذَآ أَصَٰبَتْهُم مُّصِيبَةٌۢ بِمَا
قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَآءُوكَ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنْ
أَرَدْنَآ إِلَّآ إِحْسَٰنًا وَتَوْفِيقًا ﴿٦٢﴾ أُو۟لَٰٓئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ
اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ
وَقُل لَّهُمْ فِيٓ أَنفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيغًا ﴿٦٣﴾

ترجمہ: کیا آپ نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا۔ جو کہتے ہیں (دعویٰ کرتے ہیں) کہ وہ ایمان لائے ہیں اس چیز پر جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے اور جو آپ سے پہلے اتاری گئی ہے۔ وہ ارادہ کرتے ہیں کہ اپنے فیصلے طاغوت کی طرف لیجائیں حالانکہ اُن کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کے ساتھ کفر کریں، اور شیطان چاہتا ہے کہ اُن کو گمراہ کرے اور گمراہی میں

دُور لے جائے (۶۰) اور جب اُن لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اُس چیز کی طرف آؤ جو اللہ نے نازل کی ہے اور رسول کی طرف آؤ تو آپ دیکھیں گے کہ یہودی آپ سے اعراض کرتے ہیں۔ اعراض کرنا (۶۱) پس کیا حال ہوگا جس وقت اُن کو مصیبت پہنچے گی اِن کے ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں کی وجہ سے، پھر وہ آئیں گے آپ کے پاس، قسمیں اٹھائیں گے اللہ تعالیٰ کے نام کی کہ نہیں ارادہ کیا انہوں نے مگر بھلائی کا اور آپس میں اتفاق کا (۶۲) یہی لوگ ہیں کہ جانتا ہے اللہ تعالیٰ جو کچھ اِن کے دِلوں میں ہے۔ پس آپ اُن سے اعراض کریں اور اُن کو نصیحت کریں اور کہیں اُن کو اُن کے نفسوں کے بارے میں اثر کرنے والی بات (۶۳)

ربطِ آیات

گذشتہ سے پیوستہ درس میں اللہ تعالیٰ نے دو باتوں کا حکم دیا تھا۔ ایک یہ کہ امانت اُس کے اہل تک پہنچاؤ اور دوسری یہ کہ لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ ان دونوں احکام کے مخاطبین اولاً مسلمان حکام بنتے ہیں اور ثانیاً عام مسلمان، پھر گذشتہ درس میں یہ ارشاد ہوا۔ کہ مذکورہ دو احکام کی تعمیل اسُی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے جبکہ اہل ایمان اللہ کی اطاعت کریں رسول کی اطاعت کریں اور مسلمان حکام کی اطاعت کریں۔ جب کہ وہ نیکی کا حکم دیں۔ پھر فرمایا اگر کسی معاملہ میں جھگڑا پیدا ہو جائے، حکام اور رعایا کے درمیان کسی مسئلہ میں اختلاف رائے ہو جائے تو فرمایا کہ ایسے معاملہ کو واپس اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو اور حتمی فیصلہ انہی سے لو۔ مقصد یہ کہ اہل اسلام اپنے اختلافات کتاب وسنت کے روبرو پیش کریں۔ اگر یہ معاملات کسی دوسری طرف لوٹائے گئے تو درست نہ ہوگا، کیونکہ انجام کے اعتبار سے بھی قرآن وسنت کا فیصلہ ہی بہتر ہے، قیامت میں جزا و سزا کا مدار اسی پہ ہوگا۔

اب آج کی آیات میں اسی مسئلہ کا دوسرا پہلو بیان فرمایا گیا ہے۔ وہاں ارشاد تھا، کہ

اپنے معاملات قرآن وسنت کی طرف لے جاؤ، اور یہاں یہ ہے کہ اپنے تنازعات اور فیصلے شریعت اسلامیہ کے علاوہ اور کسی طرف نہ لے جائیں اِن آیات سے خاص طور پر منافقین کی سرزنش مقصود ہے جو اپنے تنازعات اللہ اور رسول کے علاوہ غیروں کی طرف لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ اللہ کے رسول اور عام مسلمانوں کو بھی خبردار کیا گیا ہے۔ کہ وہ منافقین کی چالوں سے ہوشیار رہیں۔ وہ تمہیں اسلام سے وابستگی کا یقین دلائیں گے مگر اللہ تعالیٰ اُن کے دلوں کی باتوں کو جانتا ہے، اُن کے ساتھ احسن طریقے سے پیش آئیں۔

منافقین کا دعوے

ارشاد ہوتا ہے اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ کیا آپ نے اُن لوگوں کی طرف نہیں دیکھا، جو زعم کرتے ہیں، دعویٰ کرتے ہیں اور زعم کا معنی قول بھی ہوتا ہے اور معنی یہ ہوگا جو زبان سے کہتے ہیں اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا کہ وہ ایمان لائے ہیں بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ اُس چیز پر جو حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے یعنی قرآن کریم وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ اور وہ اُس چیز پر بھی ایمان کے دعویدار ہیں جو آپ سے پہلے نازل ہوئی یعنی تورات، انجیل وغیرہ۔

مدینے کے رہنے والے اکثر یہودی تھے اور پھر انہی میں سے کچھ لوگ بظاہر ایمان لے آئے مگر درپردہ مسلمانوں کے دشمن تھے۔ وہ مسلمانوں کو ناکام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ یہ لوگ اپنی نسبت سابقہ آسمانی کُتب کی طرف کرتے تھے اور قرآن پاک کے ساتھ ساتھ سابقہ کتب پر بھی ایمان لانے کے دعویدار تھے۔ مگر جب کوئی تنازعہ پیدا ہو جاتا تھا۔ تو اُسے شریعت اسلامیہ کی بجائے دانستہ غیروں کی طرف لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی اسی مذموم کوشش کے متعلق فرمایا کہ دعوئے ایمان کے باوجود يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے تنازعات فیصلہ کے لیے طاغوت یعنی شیطان کے پاس لے جائیں۔ جیسا کہ گذشتہ درس میں بھی عرض کیا تھا کہ طاغوت کا لفظ شیطان کے علاوہ ہر گمراہ کرنے والی طاقت

کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

شانِ نزول

مفسرین کرام نے اِن آیات کی شانِ نزول میں متعدد واقعات بیان کیے ہیں۔ مشہور واقعہ یہ ہے۔ کہ ایک یہودی اور ایک کلمہ گو منافق کے درمیان جھگڑا پیدا ہو گیا۔ حضور علیہ السلام کے زمانۂ مبارک میں آپ خود بھی معاملات کا تصفیہ فرماتے تھے اور بعض اکابر صحابہ جیسے حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ کو بھی قاضی مقرر کیا ہوا تھا۔ تو اس تنازعہ کے تصفیہ کے لیے یہودی حضور علیہ السلام کی خدمت میں یا حضرت عمرؓ کے پاس جانا چاہتا تھا مگر منافق اسے یہودیوں کے سرخیل کعب بن اشرف کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ در اصل فریقین سمجھتے تھے کہ اس معاملہ میں یہودی حق پر ہے۔ لہٰذا یہودی اہل اسلام سے انصاف کی توقع رکھتا تھا اور اپنا مقدمہ انہی کی عدالت میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ بر خلاف اس کے منافق (کلمہ گو مسلمان) کا مؤقف چونکہ کمزور تھا، وہ چاہتا تھا کہ یہ کعب بن اشرف پر اثر انداز ہو کر فیصلہ اپنے حق میں کرالے۔

بہر حال مفسرین کرام بیان کرتے ہیں۔ کہ اولاً یہ معاملہ حضور علیہ السلام کے سامنے پیش ہوا اور آپ نے یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ منافق آخر منافق تھا۔ اُس نے خیال کیا کہ حضرت عمرؓ یہودیوں کے حق میں بڑے سخت ہیں، اگر یہ مقدمہ ان کے پاس پیش ہو جائے تو وہ اُس کے حق میں فیصلہ دے دیں گے۔ چنانچہ اُس نے یہودی کو پھر راضی کر لیا کہ اب حضرت عمرؓ کے پاس چلتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر یہودی نے مقدمہ کی روئیداد سنائی اور ساتھ یہ بھی بتایا کہ حضور علیہ السلام اس مقدمہ کا فیصلہ اُس کے حق میں کر چکے ہیں، مگر اس شخص کی خواہش پر اب آپ کے پاس بھی حاضر ہو گئے ہیں۔ یہ سُن کر حضرت عمرؓ سخت برہم ہوئے اور فرمایا تم ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں۔ آپ گھر سے تلوار لائے اور منافق کا سر قلم کر دیا اور فرمایا جو شخص حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی نہیں، اُس کا فیصلہ یہی ہے۔

اب مقتول کے وارثان نے حضور علیہ السلام کی عدالت میں حضرت عمرؓ

کے خلاف قتل کا مقدمہ پیش کر دیا۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ ہمارا آدمی پکا سچا مسلمان تھا، اور مقدمہ دوسری عدالت میں پیش کرنے سے کوئی مخالفت مقصود نہ تھی بلکہ اس سے مقصود فریقین میں اتفاق واتحاد کرانا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان باتوں کی تردید فرمائی ہے

مفسرین یہ واقعہ اس مقام پر بیان کرتے ہیں مگر اس کا تعلق تفسیری روایتوں سے ہے۔ کسی صحیح حدیث میں ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ویسے بھی یہ واقعہ صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ یہ بات نقل کی ہے کہ ابوبرزہ اسلمیؓ ایک کاہن تھے جو بعد میں اسلام لے آئے۔ اکثر یہودی اپنے مقدمات انہی کے پاس لے جاتے تھے۔ یہودی اور منافق کا مقدمہ بھی اسی ابوبرزہؓ کے پاس گیا تھا جس پر یہ آئتیں نازل ہوئیں۔

منافقوں کے ساتھ سلوک

حضرت عمرؓ کا منافق کو یکدم قتل کر دینا بھی کچھ صحیح نظر نہیں آتا کیونکہ صحیح احادیث میں بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں ایسے مواقع پر حضرت عمرؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ نے بعض منافقین کو قتل کرنے کی اجازت طلب کی۔ مگر حضور علیہ السلام نے اجازت نہ دی۔ بخاری اور ترمذی شریف میں روایت موجود ہے۔ کہ جب حضرت حاطبؓ ابن ابی بلتعہ سے غلطی ہوگئی تھی تو حضرت عمرؓ نے عرض کیا تھا دعنی ان اضرب عنق ھٰذا المنافق۔

حضرت! آپ مجھے چھوڑ دیں کہ اس منافق کی گردن اڑا دوں، مگر حضور علیہ السلام نے منع فرمادیا تھا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کا ذکر بھی آتا ہے۔ کہ جب منافقین کی منافقت واضح طور پر ظاہر ہونے لگی تو آپ نے قتل کرنے کی اجازت طلب کی جو نہ مل سکی۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کو قتل کرنے کی جب اجازت مانگی گئی، تو نبی علیہ السلام نے فرمایا دعْوُا اس کو چھوڑ دو۔ ان الناس یتحدثون ان محمداً یقتل اصحابہ لوگ پراپیگنڈا کریں گے کہ محمد خدا کے رسول نہیں بلکہ مطلق العنان بادشاہ ہیں جو اپنے ساتھیوں سے ناراض ہو کر انہیں قتل کروا دیتے ہیں۔ فرمایا یہ چیز

تبلیغ اسلام کے راستے میں رکاوٹ بن جائیگی۔

جنگ حنین کے موقع پہ ایک شخص نے کہا تھا، اے محمد! آپ انصاف کریں۔ اس پہ آپ کو سخت کوفت ہوئی اور آپ نے فرمایا تو نامراد ہوگیا، اگر میں دنیا میں انصاف نہیں کروں گا تو اور کون انصاف کرنے والا ہے۔ اس موقع پہ بھی حضرت عمرؓ یا حضرت خالدؓ نے عرض کیا تھا کہ حضور! اجازت دیں اس شخص کا کام تمام کر دیں۔ آپ نے فرمایا، اس کو چھوڑ دو، یہ خارجیوں کا جد امجد ہے۔ اس کی نسل سے ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو اسلام سے بالکل اسی طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار کے آر پار نکل جاتا ہے اور اس کے ساتھ کوئی آلائش نہیں ہوتی۔ اُس زمانے میں جب کسی شکاری جانور ہرن وغیرہ پہ زور سے تیر چلاتے تھے تو وہ جانور کے پیٹ کے پار نکل جاتا تھا اور اس کے پچھلے کنارے پہ معمولی سی آلائش ہوتی تھی باقی تیر بالکل صاف ہوتا تھا۔ بہرحال فرمایا کہ اس شخص سے ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو قرآن پڑھیں گے مگر قرآن اُن کے گلے سے نیچے نہیں جائیگا۔

یہ واقعات بیان کرنے کا مقصد یہ ہے۔ کہ حضرت عمرؓ جلد بازی میں کوئی ایسا کام نہیں کرتے تھے جس کا ذکر ان تفسیری روایات میں ملتا ہے، بلکہ وہ تو ہمیشہ حضور علیہ السلام کے اشارے کے منتظر رہتے تھے۔ دین کے معاملے میں بیشک سخت تھے مگر کوئی غلط قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ اس قسم کی اجازت طلبی حضرت عمرؓ کی اپنی بیٹی اور حضور علیہ السلام کی زوجہ محترمہ حضرت حفصہ رضؓ کے متعلق بھی ملتی ہے۔ حضور علیہ السلام اپنی بیویوں سے ناراض ہوگئے اور ایک ماہ تک علیحدگی کی قسم کھا کر اُوپر چوبارے میں چلے گئے۔ لوگ سمجھنے لگے کہ حضور نے اپنی تمام بیویوں کو طلاق دے دی ہے اس پہ حضرت عمرؓ نے حضور کی خدمت میں حاضری کے لیے دو تین دفعہ نیچے کھڑے ہو کر اجازت طلب کی۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو عرض کیا کہ میں اپنی بیٹی کی سفارش کرنے کیلئے

نہیں بلکہ حقیقت حال معلوم کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں کہ کیا واقعی حضور نے بیویوں کو طلاق دے دی ہے یا محض ناراضگی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ خدا کی قسم اگر اللہ کا نبی مجھے حکم دے گا تو میں اپنی بیٹی کی گردن خود اڑا دوں گا۔

بعض روایات سے اس قدر معلوم ہوتا ہے۔ کہ اکثر منافقین اپنے مقدمات حضور علیہ السلام کے پاس اس لیے نہیں لاتے تھے کہ آپ ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیں گے۔ اس کے برخلاف وہ کعب بن اشرف جیسے طاغوتی شخص کے پاس جانا پسند کرتے تھے کیونکہ وہ اسے رشوت دیکر یا دیگر سفارشی ذرائع سے اپنے حق میں فیصلہ کرنے پر آمادہ کر سکتے تھے۔ بس اتنی بات ہے جس پر ان آیات کا نزول ہوا۔

طاغوتی نظام

مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ طاغوت سے مراد شیطان اور کعب بن اشرف جیسے موذی اور غالی لوگ ہیں۔ وسیع تر مفہوم میں طاغوت ہر وہ سرکش قوت ہے جو لوگوں کو گمراہ کرتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ کہ اس زمانے کے بڑے بڑے طاغوت قیصر اور کسریٰ تھے۔ انہوں نے دنیا بھر کے لوگوں کو غلام بنا رکھا تھا اور وہ انسانوں کو جانوروں کی طرح استعمال کرتے تھے۔ اللہ کے دین کے مخالف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کے ذریعے اس طاغوتی نظام کا قلع قمع کر دیا یہ تو اس زمانے کا ذکر ہے اور اب ہمارے زمانے میں روس اور امریکہ کے نظام طاغوتی نظام ہیں۔ ایک الحادی نظام ہے اور دوسرا سرمایہ دارانہ۔ دنیا کا ایک حصہ سرمایہ داری کی لپیٹ میں ہے اور دوسرا اشتراکیت کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے۔ مگر ہیں دونوں طاغوتی اور باطل۔ دینِ اسلام نے ہمیشہ ان کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ اللہ نے اپنے ہر نبی کی زبان سے کہلوایا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ یعنی عبادت صرف اللہ کی کرو اور ان طاغوتوں سے اجتناب کرو۔ مفسر قرآن شیخ عبدالقادر محدث دہلویؒ طاغوت کا معنی "ہڑدنگا" کرتے ہیں۔ ہندی میں ہڑدنگا اُس شخص کو کہتے ہیں جو خود ساختہ سردار ہوتا ہے۔

کسی طریقے سے اقتدار پر قبضہ کر لیتا ہے اور پھر اسے من مانے طریقے سے استعمال کرتا ہے۔ اب تو ریگن اور برزنیف قسم کے لوگ ہیں جو یہ کردار ادا کر رہے ہیں تاہم تقریباً دو سو سال تک انگریز کو بھی دنیا میں یہی حیثیت حاصل رہی جو اب کمزور ہو چکا ہے۔ بہر حال طاغوت ہر وہ طاقت ہے کُلَّمَا اَضَلَّ عَنِ الْحَقِّ جو راہِ راست سے گمراہ کر دے شرائع الٰہیہ کے خلاف جو بھی فیصلہ ہو گا وہ طاغوتی ہو گا، مارشل لاء کا نظام بھی اسی قبیل سے ہے۔ جہاں انسانوں کے بنائے ہوئے باطل قواعد جبراً نافذ کیے جاتے ہیں۔

فرمایا، وہ تو اپنے تنازعات طاغوت کے پاس لے جانا چاہتے ہیں وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِهٖ حالانکہ انہیں حکم یہ تھا کہ وہ طاغوت کا انکار کر دیں۔ تمام طاغوتی نظاموں کی نفی کر کے اللہ وحدہٗ لاشریک پر ایمان لے آئیں۔ سورۃ بقرہ میں فرمایا "فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی" جس نے طاغوت کا انکار کر دیا اور اللہ پر ایمان لے آیا، اُس نے مضبوط کڑے کو پکڑ لیا۔ وَیُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِیْدًا اور اُدھر شیطان یا طاغوت کی خواہش یہ ہے کہ لوگ دور کی گمراہی میں جا پڑیں، اور شریعت الٰہی سے منہ موڑ بیٹھیں۔

شرائع الٰہیہ کی پیروی

آگے فرمایا وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ جب منافقوں سے کہا جاتا ہے تَعَالَوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اس چیز کی طرف آؤ جسے اللہ نے نازل کیا ہے یعنی قرآن حکیم وَاِلَی الرَّسُوْلِ اور رسول کی طرف آؤ تو پھر رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ آپ ان منافقوں کو دیکھیں گے۔ مقصد یہ کہ ان منافقوں کا حال یہ ہوتا ہے۔ یَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا اعراض کرتے ہیں آپ سے اعراض کرنا صُدُوْدًا مفعول مطلق ہے اور اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ایک خاص طریقے سے اعراض کرتے ہیں تاکہ کسی کو پتہ نہ چل سکے کہ وہ در پردہ منکر ہیں۔

منافقین بظاہر کلمہ تو پڑھتے ہیں مگر شریعت الٰہی کو تسلیم نہیں کرتے اور حیلے بہانے سے اس کے احکام کو ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مولانا شیخ الہندؒ اپنے ترجمہ قرآن پاک کے حاشیے پر لکھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں میں کوئی تنازعہ پیدا ہو جائے تو انہیں قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اُن کا ملجا و ماویٰ یہی دو چیزیں ہیں۔ فرماتے ہیں کہ تنازعہ کے دو فریقوں میں سے اگر ایک شخص کہے کہ چلو بھائی اس کا فیصلہ شریعتِ الٰہی سے کرواتے ہیں اور دوسرا کہے کہ میں تو شریعت کو تسلیم نہیں کرتا۔ تو ایسا شخص کافر کہلائیگا کیونکہ اُس نے اللہ اور رسول کا حکم تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ سورۃ نور کے چھٹے رکوع میں آتا ہے کہ مومنین کی شان یہ ہے کہ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اللہ اور رسول کی طرف آؤ تو وہ خوشی محسوس کرتے ہیں اور جو اس قسم کے بودے اور منافق لوگ ہوتے ہیں وہ حیلہ سازی کرتے ہیں تاکہ بچ جائیں۔

منافقین کی بے بسی

ایسے ہی منافقین کے متعلق فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ پس کیا حال ہو گا جب ان کو مصیبت پہنچے گی اِن کے ہاتھوں کی کمائی کی وجہ سے یعنی اللہ اور رسول کو چھوڑ کر طاغوتی فیصلے حاصل کرنے والوں پر جب محاسبے کا وقت آئیگا، اُن کو تکلیف پہنچے گی تو ان کا کیا حشر ہو گا اُس وقت یہ لوگ سخت مصیبت میں ہوں گے اور یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے شریعتِ الٰہی سے اعراض کیا۔ دُنیا میں بھی جب قرآن پاک کی آیات اُن کے جھوٹ کا پول کھول دیتی تھیں تو انہیں سخت ندامت ہوتی تھی مگر اپنے مکروہ عزائم سے باز نہیں آتے تھے۔ سورۃ توبہ میں بھی موجود ہے "اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ" یعنی ہر سال میں ایک یا دو مرتبہ منافقوں کی قلعی ضرور کھلتی ہے اور وہ ذلیل ہوتے ہیں مگر پھر بھی توبہ نہیں کرتے اور نہ قبیح حرکتوں سے باز آتے ہیں۔

جھوٹی قسمیں

فرمایا اِن کا کیا حال ہو گا جب وہ اپنے کردہ گناہوں کی سزا میں مبتلا ہوں گے۔

فرمایا ثُمَّ جَآءُوكَ يَحْلِفُونَ پھر وہ آپ کے پاس قسمیں اٹھاتے ہوئے آئیں گے بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّ تَوْفِيْقًا اللہ کی قسم دوسری جگہ مقدمہ لے جانے کا مقصد نیکی اور اتفاق پیدا کرانا تھا جھوٹی قسمیں اٹھائیں گے کہ ہم اللہ اور رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔ مگر اللہ تعالی نے سورۃ منافقون میں ارشاد فرمادیا کہ ان کی قسموں کا اعتبار نہ کریں۔ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ اللہ خود گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹے لوگ ہیں۔ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً انہوں نے بچاؤ کے لیے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے، لہذا ان پر اعتبار نہ کریں۔

فرمایا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ یہی لوگ ہیں کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے۔ ان کا روگ بھلا خدا تعالی سے کیسے چھپ سکتا ہے وہ تو عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہے۔ تمام ظاہر و باطن کو جانتا ہے۔ عَالِمُ الْغَيْبِ ہے۔ اُسے علم ہے کہ منافقین میں کھوٹ کی مقدار کیا ہے۔ فرمایا ان تمام تر حقائق کے باوجود اے پیغمبر علیہ السلام! فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ آپ منافقین سے اعراض کریں انہیں اچھے طریقے سے چھوڑ دیں۔ سورۃ مزمل میں بھی فرمایا ہے۔ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا آپ انہیں اچھے طریقے سے چھوڑ دیں۔ مقصد یہ کہ کوئی برا بھلا نہ کہیں بلکہ ان کے ساتھ رابطہ کی گنجائش باقی رہنے دیں وَعِظْهُمْ اور ان کو نصیحت کرتے رہیں اور خیر خواہی کا سلوک کرتے رہیں۔ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا اور اُن کے نفسوں کے بارے میں مؤثر بات کریں جو ان کے دلوں پر اثر انداز ہو۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اگر اُن کے جھوٹ کا پول ظاہر بھی ہو جائے پھر بھی فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ علیحدگی میں اُن کے ساتھ خیر خواہی کی مؤثر بات کریں، کیونکہ اللہ کے نبیوں کا طریقہ تبلیغ یہی ہے۔ کہ وہ مخالفین کے سامنے

بھی حسن سلوک سے پیش آتے ہیں اور اُن کے ساتھ بہتر سے بہتر اچھی اور مؤثر بات کرتے ہیں تاکہ اُن کی مخالفت موافقت میں تبدیل ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ نے تبلیغ دین کے سلسلے میں یہ تعلیم بھی دے دی۔

وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذۡنِ ٱللَّهِۚ وَلَوۡ
أَنَّهُمۡ إِذ ظَّلَمُوٓاْ أَنفُسَهُمۡ جَآءُوكَ فَٱسۡتَغۡفَرُواْ
ٱللَّهَ وَٱسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ ٱلرَّسُولُ لَوَجَدُواْ ٱللَّهَ تَوَّابًا
رَّحِيمًا ﴿٦٤﴾ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤۡمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ
فِيمَا شَجَرَ بَيۡنَهُمۡ ثُمَّ لَا يَجِدُواْ فِيٓ أَنفُسِهِمۡ
حَرَجًا مِّمَّا قَضَيۡتَ وَيُسَلِّمُواْ تَسۡلِيمًا ﴿٦٥﴾

ترجمہ : اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لیے تاکہ اُس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے ۔ اور اگر یہ لوگ جب کہ انہوں نے اپنے نفسوں پر زیادتی کی ، آپ کے پاس آتے اور اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتے اور بخشش طلب کرتا اُن کے لیے اللہ کا رسول بھی ، البتہ پاتے وہ اللہ تعالیٰ کو بہت ہی توبہ قبول کرنے والا اور نہایت مہربان ﴿۶۴﴾ پس تیرے رب کی قسم یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ آپ کو فیصل بنائیں اُس چیز میں جو اُن کے درمیان جھگڑا ہوا ہے ۔ پھر نہ پائیں اپنے نفسوں میں تنگی اُس چیز پر جو آپ نے فیصلہ کیا اور قبول کریں اس کو کھلے دل سے قبول کرنا ﴿۶۵﴾

ربطِ آیات
گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان سے خطاب کر کے ، اللہ ،

اس کے رسول اور اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا تھا۔ اور پھر یہ بھی واضح فرما دیا تھا کہ اگر حکام اور رعیت کے درمیان ——— یا افراد کے درمیان کوئی تنازعہ پیدا ہو جائے تو ایسے معاملہ کو اللہ اور اُس کے رسول کی طرف لوٹانا ضروری ہو جاتا ہے۔ مقصد یہ کہ کسی بھی معاملہ میں آخری اور حتمی فیصلہ کتاب و سنت سے ہی حاصل کرنا ہوگا اگر خدا اور قیامت پر ایمان پختہ ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے منافقین کی مذمت بیان فرمائی اور واضح کیا کہ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ کتاب اللہ اور اُس کے رسُول کی طرف آؤ۔ تو یہ لوگ اعراض کرتے ہیں اور خدا و رسول کے فیصلے کو تسلیم کرنے کی بجائے اپنے مقدمات طاغوت کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ بیماری منافقین مدینہ میں فی الواقع موجود تھی، وہ اپنا معاملہ حضور علیہ السلام کے پاس لے جانے کی بجائے کعب بن اشرف جیسے کافر، فاجر، سود خور اور بد اخلاق یہودی کے پاس لے جانے کو ترجیح دیتے تھے۔ اب آج کی آیات میں اطاعت کا بنیادی مقصد بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ بنی نوعِ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ کے رسول کی اطاعت کریں۔ گزشتہ درس میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اطاعت بالذات تو فقط خدا تعالیٰ کی ہوتی ہے اور وہی مطاعِ مطلق ہے۔ مگر رسول کی اطاعت بالذات نہیں ہوتی بلکہ اُسکی رسالت کی وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ اللہ کا پیغام مخلوق تک پہنچاتا ہے، اور اس ابلاغ میں کسی قسم کی غلطی یا شبہ کا امکان نہیں ہوتا۔

اطاعتِ رسول فرض ہے

اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے اطاعتِ رسول کا مرکزی نکتہ بیان فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اُس کی اطاعت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی اور رسول مبعوث فرما کر انہیں بنی نوعِ انسان کی ہدایت پر مامور کیا۔ اور اس سلسلہ کی آخری کڑی کے طور پر حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا۔ اِن تمام انبیاء اور رسل

کی بعثت کا مقصد اُن کی اطاعت تھا، اور وہ بھی باذن اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں۔ اس لحاظ سے رسول کی اطاعت کو درجہ فرضیت حاصل ہے اور یہ اس لیے کہ رسول کی اطاعت دراصل اللہ ہی کی اطاعت ہوتی ہے۔ یہ بات اسی سورۃ میں آگے دوسرے طریقے سے بھی سمجھائی گئی ہے "مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ" یعنی جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے درحقیقت اللہ ہی کی اطاعت کی۔ اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت تک پہنچنے کے لیے رسول ہی واحد ذریعہ ہے۔ رسول کے پاس کسی شک وشبہ اور غلطی سے مبرا قطعی اور یقینی علم ہوتا ہے۔ نبی کے علاوہ ایسی کوئی دوسری ہستی موجود نہیں جس کے اخذ اور بیان میں شبہ کا امکان نہ ہو۔ نبی کو اس بات کی گارنٹی حاصل ہوتی ہے۔ کہ وہ اللہ کے احکام ٹھیک اخذ کرتا ہے اور پھر انہیں آگے مخلوق کے سامنے بلاکم و کاست بغیر کسی شبہ اور غلطی کے بیان کر دیتا ہے۔ نبی کے بیان اور اولیاء اللہ کے کشف میں یہ بنیادی فرق ہے۔ کہ پیغمبر کا بذریعہ وحی اخذ، اُس کا ضبط اور پھر بیان شک و شبہ سے پاک سو فیصدی درست ہوتا ہے جب کہ صاحب کشف کے کشفی بیان کو یہ قطعیت حاصل نہیں ہوتی۔ ولی کے کشف کو سمجھنے، اُسے ضبط کرنے اور پھر بیان کرنے میں خطا کا امکان ہے، لہذا یہ سو فیصدی قطعی اور یقینی نہیں ہوتا۔

نبی کی اطاعت دراصل اطاعتِ الٰہی کی قطعی علامت ہوتی ہے اور ہر نبی کی اطاعت اللہ ہی کے حکم سے ہوتی ہے۔ دنیا میں آنے والے ہر نبی نے یہی کہا "اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ" لوگو! عبادت اللہ کی کرو۔ "وَاَطِیۡعُوۡنِ" اور اطاعت میری کرو۔ گویا مستحق عبادت صرف اللہ کی ذات ہے، اور میری اطاعت کے بغیر کسی کو فلاح نصیب نہیں ہو سکتی کیونکہ قطعی اور یقینی علم کے حصول کا میں ہی واحد ذریعہ ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے باپ سے کہا تھا "یٰۤاَبَتِ اِنِّیۡ قَدۡ جَآءَنِیۡ مِنَ الۡعِلۡمِ مَا لَمۡ یَاۡتِکَ فَاتَّبِعۡنِیۡۤ اَہۡدِکَ صِرَاطًا سَوِیًّا" اے باپ! میرے پاس

ایسا علم ہے جو تیرے پاس نہیں ہے، اسی لیے میں کہتا ہوں کہ میری بات مان لو میں تمہیں صراطِ مستقیم کی منزل دکھادوں گا۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اطاعت کا یہی مرکزی مضمون سمجھایا ہے۔ کہ نبی کی اطاعت اللہ کے حکم سے ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ فرض ہے اور اس سے سرتابی کفر ہے۔

طلبِ معافی کے آداب

فرمایا کہ لوگوں کا فرض تھا کہ وہ اللہ کے رسول کی اطاعت کرتے۔ خدا کی نازل کردہ ہدایت کی طرف رجوع کرتے مگر یہ لوگ اپنے معاملات اللہ کے رسول کے پاس لانے کی بجائے طاغوتوں کے پاس لے جاتے ہیں۔ وَلَوْ اَنَّھُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ اور جب کہ ان لوگوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا یعنی گناہ اور زیادتی کا ارتکاب کر بیٹھے، تو ادھر اُدھر جانے کی بجائے جَآءُوْكَ آپ کے پاس آجاتے فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰہَ اور اللہ سے بخشش طلب کرتے وَاسْتَغْفَرَ لَھُمُ الرَّسُوْلُ اور اللہ کا رسول بھی اُن کے لیے بخشش طلب کرتا۔ لَوَجَدُوا اللّٰہَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا تو اللہ تعالیٰ کو بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا اور نہایت مہربان پاتے۔ گویا طلبِ بخشش کے لیے یہ طریقہ اختیار کرتے کہ اللہ کے نبی کے پاس آجاتے، خود بھی اللہ سے اپنی لغزش کی معافی مانگتے۔ اللہ کے رسول سے بھی درخواست کرتے اور وہ بھی اُن کے لیے بارگاہِ رب العزت میں ہاتھ اٹھا دیتے۔ تو اللہ تعالیٰ تو ہے ہی تواب اور رحیم، اُن کی معافی کا انتظام ہو جاتا۔

معلوم ہوا کہ معافی کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان ایمان سے متصف ہو۔ کیونکہ ایمان کے بغیر بخشش نہیں۔ نبی اِسی صورت میں گنہگار کے لیے بخشش کی دُعا کرے گا جب کہ اُس کے اندر ایمان موجود ہو۔ کیونکہ مشرک جس کا خاتمہ کفر اور شرک پر ہوا ہو، اُس کے لیے معافی کی درخواست کرنا جائز نہیں۔ بہرحال فرمایا اولاً یہ لوگ خود ایمان دار ہوں اور ثانیاً اپنی بخشش کے لیے خود اللہ تعالیٰ سے عرض کریں کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے "مَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ"

اللہ کے سوا کون ہے جو انسان کی غلطیوں، کوتاہیوں کو معاف فرما دے۔ اور تیسری بات یہ کہ اللہ کا رسول بھی انکی معافی کے لیے اللہ تعالیٰ سے سفارش کرے۔ اور ایسا کرنا نبی کے لیے عین روا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ" (سورۃ محمد) یعنی اپنی لغزشوں کی بھی اللہ سے معافی مانگیں اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے بھی بخشش کی دعا کریں۔ آپ کے اپنے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ فتح میں خوشخبری سنا دی "لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ" اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی تمام اگلی پچھلی خطائیں فرما دیں تاہم مومنین اور مومنات کی بخشش طلب کرنے کا قانون موجود ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر وہ لوگ آپ کے پاس آجاتے، وہ خود بھی اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے اور اللہ کا رسول بھی اُن کے لیے معافی کی درخواست کرتا تو یقیناً وہ اللہ کو تواب اور رحیم پاتے

عرضِ اعمال

مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس آیت میں مذکورہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے طلب معافی کی درخواست بظاہر آپ کی حیات مبارکہ کے ساتھ ہی مختص معلوم ہوتی ہے۔ کہ جو کوئی غلطی کا مرتکب آپ کی حیات مبارکہ میں ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا، خود بھی استغفار کی اور اللہ کے رسول سے بھی طلب معافی کی درخواست کی، تو اللہ نے معاف کر دیا، تاہم مولانا فرماتے ہیں۔ کہ اس کا تعلق عالم برزخ میں بھی قائم ہے۔ عرض اعمال کے متعلق صحیح احادیث موجود ہیں جن کے مطابق امت کے اعمال ملاء اعلیٰ میں حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے مطابق ملاء اعلیٰ کے ممبران میں تین گروہ شامل ہیں۔ پہلا گروہ ملائکہ مقربین اور دیگر بلند پایہ فرشتوں کا ہے جس میں حاملین عرش فرشتے بھی ہیں۔ دوسرا گروہ بھی فرشتوں کا ہے، جو دوسرے نمبر پہ ہیں اور تیسرا گروہ بنی نوع انسان میں افاضل الآدمیین کا ہے یعنی وہ کامل الایمان لوگ جو اپنی زندگیاں دین کی خاطر وقف کر دیتے ہیں اور

بنی نوع انسان کی اصلاح کا فریضہ انجام دیے ہیں۔ اس گروہ میں تمام انبیائے کرام اور اللہ کے دیگر نیک بندے شامل ہوتے ہیں۔ اور ان ممبرانِ ملاء اعلیٰ کا کام کیا ہے؟ ان کی پہلی مصروفیت یہ ہے کہ ان کی نگاہ ہر وقت خدا تعالیٰ کی تجلی عظم پر مرکوز رہتی ہے اور ان کا دوسرا کام یہ ہے کہ وہ اللہ کے نیک بندوں کے لیے بخشش کی دعائیں مانگتے ہیں۔ حاملین عرش کے متعلق تو خود قرآن پاک میں موجود ہے کہ وہ ایمان والوں کے لیے بخشش کی دعائیں کرتے ہیں اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (سورۃ المؤمن) تو مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرماتے ہیں۔ کہ حضور علیہ السلام کی اس دنیا سے رحلت کے بعد بھی امت کے اعمال انکی خدمت میں ملاء اعلیٰ کے مقام پر پیش کیے جاتے ہیں اور وہ امت کے لیے بخشش کی دعا بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ اس گروہ میں شامل ہونے والوں کی ایک مصروفیت طلب بخشش بھی ہے۔

روضۂ رسول پر استشفاع

حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ اپنی تفسیر معارف القرآن میں لکھتے ہیں کہ اس آیت کریمہ کے الفاظ سے حضور علیہ السلام کی حیات طیبہ میں آپ سے استشفاع تو بالکل واضح ہے۔ جب کوئی شخص غلطی کرتا، پھر اُسے ندامت ہوتی تو وہ حضور ختمی رسالت کی خدمت میں حاضر ہو کر اللہ سے اپنے گناہ کی معافی طلب کرتا، پھر آپ سے بھی بخشش طلب کرنے کی درخواست کرتا تو حضور علیہ السلام اس کے لیے معافی مانگتے تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا۔ اس قسم کے واقعات بہت سے صحابہؓ کے متعلق احادیث میں آتے ہیں۔ مثلاً حضرت اسامہؓ سے غلطی ہو گئی تو آپ ناراض ہو گئے، پھر اسامہؓ نے عرض کیا، حضور میرے لیے بخشش کی دعا کریں تو آپ نے ایسا کیا تاہم مفتی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ آیت کا عموم بتاتا ہے۔ کہ اگر حضور علیہ السلام کی وفات کے بعد بھی کوئی شخص آپ کے روضہ اقدس پر حاضر ہو کر اپنی غلطی کی اللہ سے معافی طلب کرے اور نبی علیہ السلام کی خدمت

میں بھی طلب معافی کی درخواست کرے تو ایسا کرنا جائز ہے۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ تمام فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ حضور علیہ السلام سے استشفاع کی دعا کرنا جائز ہے۔ صلوٰۃ وسلام عرض کرنے کے بعد بندہ حضور علیہ السلام سے درخواست کرے کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں سفارش کریں کہ اللہ میرے گناہ معاف فرمائے میرا خاتمہ بالایمان ہو اور میں آپ کی مِلّت میں شریک رہوں۔

سماعِ موتٰی

سماعِ موتٰی کے متعلق حضور علیہ السلام کی یہ صحیح حدیث موجود ہے[1]۔ مَنْ صَلَّ عَلَيَّ نَائِيًا اُبْلِغْتُهٗ جو مجھ پر دور سے درود شریف پڑھتا ہے وہ مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔ وَمَنْ صَلَّ عَلَيَّ عِنْدَ قَبْرِيْ سَمِعْتُهٗ اور جو کوئی میری قبر پر آکر درود پڑھے تو میں اس کو سنتا ہوں۔ مولانا گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ عام مُردوں کے سننے کے متعلق علما میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض سماع کے حق میں ہیں اور بعض مخالفت میں، مگر صحابہ کرام کے دور سے لے کر آج تک یہ اختلاف ختم نہیں ہو سکا، لہٰذا اس مسئلہ میں زیادہ سختی کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے۔ تاہم انبیاء علیہم السلام کی سماعت کے متعلق کسی کو اختلاف نہیں۔ اگر نبی علیہ السلام کی قبر اطہر پر جا کر سلام عرض کیا جائے تو آپ بنفس نفیس اُسے سماعت فرماتے ہیں۔ علمائے دیوبند کے مسلک کے مطابق بھی یہ مسئلہ متفق علیہ ہے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق آتا ہے کہ وہ سفر پر روانگی سے پہلے اور سفر سے واپسی پر حضور علیہ السلام کے روضہ اقدس پر حاضر ہو کر سلام عرض کرتے۔ ظاہر ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ قبر شریف پر حاضر ہو کر سلام کہنے سے حضور خود سنتے ہیں۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو انہیں وہاں قبر پہ جانے کی کیا ضرورت تھی، درود وسلام تو ہر مقام سے آپ کی خدمت میں پہنچ ہی جاتا ہے۔

اس ضمن میں امام ابن کثیرؒ نے عتبی والی روایت بھی نقل کی ہے۔ عتبی کہتے ہیں کہ میں روضہ رسول پر موجود تھا کہ ایک اعرابی قبر مبارک پر حاضر ہوا اور یہی آیت تلاوت کی وَلَوْ اَنَّهُمْ ...... الآیۃ پھر عرض کیا اللہ کے رسول میں اپنی

---

[1] مشکوٰۃ صـ۸۷ (فیاض)

غلطی کا اعتراف کرتا ہوں اور اللہ سے معافی مانگتا ہوں اب آپ کے پاس آیا ہوں، آپ بھی خدا کی بارگاہ میں میرے لیے بخشش کی دعا کریں۔ یہ کہہ کر دیہاتی چلا گیا۔ عتبی کہتے ہیں کہ وہیں مجھ پہ نیند غالب آگئی۔ خواب میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت نصیب ہوئی اور آپ نے مجھے حکم دیا کہ دوڑ کر اس اعرابی کے پیچھے جاؤ اور اسے خوشخبری سنا دو کہ اللہ نے اس کے گناہوں کو معاف فرما دیا ہے

رضائے قضائے رسول

اگلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے فَلَا وَرَبِّكَ تیرے رب کی قسم۔ یہاں پہ لَا تاکید قسم کے لیے استعمال ہوا ہے اور اس قسم کی مثالیں قرآن پاک میں دوسرے مقامات پر بھی موجود ہیں مثلاً "لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ" اور "لَا أُقْسِمُ بِهَٰذَا الْبَلَدِ" تو معنی یہ ہوا، تیرے رب کی قسم لَا يُؤْمِنُونَ یہ لوگ ایماندار نہیں ہو سکتے حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ جب تک کہ وہ آپ کو اپنے تنازعات میں حَکم یا منصف مقرر نہ کریں۔ شَجَرَ میں ہر قسم کے معاملات اور تنازعات شامل ہیں خواہ وہ احکام میں ہوں یا عقائد میں۔ ہر معاملہ میں اللہ کے رسول کو منصف بناؤ اور پھر آپ کے ارشادات میں جو چیز مل جائے اُسے صدقِ دل سے تسلیم کر لو۔

شانِ نزول

اس آیت کریمہ کی شان نزول کے متعلق ترمذی شریف اور صحاح کی دیگر کتب میں حدیث موجود ہے جسے مفسرین کرام نے نقل کیا ہے۔ حضرت زبیرؓ اور ایک انصاری کے درمیان کھیت کو سیراب کرنے کے متعلق تنازعہ پیدا ہو گیا۔ حضرت زبیرؓ کا کھیت پانی کے رستے میں پہلے واقع تھا لہٰذا وہ اپنے کھیت کو پہلے سیراب کرتے تھے اور بعد میں پانی انصاری کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ انصاری کا مطالبہ یہ تھا کہ اُس کا کھیت چونکہ دور ہے اس لیے سیرابی کا حق پہلے اُسے ملنا چاہیے۔ معاملہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش ہوا آپ نے اخلاقی طور پہ زبیرؓ سے فرمایا کہ اپنا کھیت تھوڑا بہت سیراب

کر کے پانی اپنے انصاری بھائی کے لیے چھوڑ دیا کرو۔ انصاری صحابی کو یہ فیصلہ پسند نہ آیا، کہنے لگا کہ آپ نے حضرت زبیرؓ کی رعایت کی ہے کیونکہ وہ آپ کا پھوپھی کا بیٹا ہے۔ اس پر حضور علیہ السلام سخت ناراض ہوئے اور حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ تم اپنے کھیت کو خوب سیراب کیا کرو حتیٰ کہ پانی دیواروں تک چڑھ جائے اور اس کے بعد انصاری کے لیے چھوڑا کرو۔ حضرت زبیرؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ ہمارے اس معاملہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ انصاری صحابی بھی پکا سچا مسلمان تھا بلکہ بدری صحابی تھا مگر جہالت میں ایسی بات کہ دی جس سے حضور علیہ السلام کو کوفت ہوئی۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تیرے رب کی قسم یہ لوگ اس وقت تک کامل الایمان مومن نہیں ہو سکتے "جب تک کہ ہر معاملہ میں آپ کو حکم مقرر نہ کرلیں

دلی تسلیم و رضا

فرمایا کامل الایمان ہونے کے لیے پہلی بات تو یہ ہے۔ کہ ہر معاملہ میں حضور علیہ السلام ہی کو حکم بنایا جائے۔ اور جب آپ فیصلہ فرما دیں۔ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ تو پھر اس فیصلے کے فیصلے کے متعلق اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں، بلکہ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا آپ کے فیصلے کو خوشی سے قبول کرلیں۔ اسی میں اللہ کی رضا اور ہماری بہتری ہے خواہ اس فیصلے میں کوئی نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ بہرحال حضور علیہ السلام کا فیصلہ انجام کے لحاظ سے لازماً بہتر ہوگا جیسا کہ گذشتہ آیت میں بھی گذر چکا ہے "ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا"۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہر فیصلے کو قبول کرنا تین اعتبار سے ہوگا پہلا یہ کہ انسان کا اعتقاد درست ہو اور اُسے اس بات پر اعتماد ہو کہ حضور علیہ السلام کا فیصلہ بالکل صحیح اور برحق ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان زبان سے بھی فیصلہ کی صحت کا اقرار کرے اور تیسرے یہ کہ عملی طور پر اپنا معاملہ حضور کے سامنے پیش کردے۔ اگر دل سے تسلیم کرتا ہے اور زبان سے اقرار بھی کرتا ہے مگر عملاً اپنے معاملات دربار نبوی کی طرف نہیں لے جاتا تو بھی

فاسق متصور ہوگا کیونکہ اُس نے تسلیم و رضا کے تین درجات مکمل نہیں کیے۔

دائمی تحکیم نبوی

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ تعالیٰ کی جانب سے حاکم تو بہر حال ہیں۔ اب تنازعات آپ کے پاس لانا ہی آپ کی تحکیم کا قیام ہے۔ ایمان کا تقاضا بھی یہی ہے۔ کہ تمام معاملات حضور ہی کے سامنے پیش کیے جائیں اگر ایسا نہیں کریں گے تو نفاق ثابت ہوگا۔ آپ علیہ السلام کی حیات مبارکہ میں ایسے معاملات ذاتی طور پر آپ کے سامنے پیش ہوتے رہے اب آپ کے بعد یہ معاملات آپ کی سنت، شریعت اور تعلیمات کے سامنے پیش کر کے فیصلہ حاصل کیا جائے گا۔ رسول کی اطاعت کا یہی مطلب ہے۔ اس لیے آیت مبارکہ میں فرمایا گیا ہے۔ کہ یہ لوگ اُس وقت تک کامل الایمان نہیں ہو سکتے جب تک اپنے معاملات میں نبی اکرم کو منصف نہ مقرر کریں اور پھر آپ کے فیصلہ پر سر تسلیم خم نہ کر لیں۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ
اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ
مِّنْهُمْ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ
لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿۶۶﴾ وَّاِذًا
لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۶۷﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ
صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۶۸﴾

ترجمہ :- اور اگر ہم اُن پر فرض کر دیتے کہ اپنی جانوں کو قتل کرو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ ، تو یہ لوگ ایسا نہ کرتے مگر ان میں سے بہت تھوڑے ۔ اور اگر یہ لوگ کرتے اس چیز کو جس کی ان کو نصیحت کی جاتی ہے تو البتہ یہ بات ان کے حق میں بہتر ہوتی اور زیادہ ثابت رکھنے والی ہوتی ﴿۶۶﴾ اور اُس وقت ہم البتہ اُن کو دیتے اپنی طرف سے بہت بڑا اجر ﴿۶۷﴾ اور ہم اُن کو صراطِ مستقیم کی ہدایت دیتے ﴿۶۸﴾

ربطِ آیات

گذشتہ سے پیوستہ درس میں منافقین کی مذمت بیان ہوئی تھی کہ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت ، دین اور کتاب کی طرف آؤ اور اس کے رسول سے اپنے تنازعات کا تصفیہ کراؤ تو وہ اعراض کرتے ہیں ۔ فرمایا یہ لوگ جھوٹے بہانے کرتے ہیں قسمیں اٹھاتے ہیں مگر یہ چیزیں انجام کے اعتبار سے ان کے لیے نہایت ہی نقصان دہ ثابت ہوں گی ۔ اس کے بعد گذشتہ درس میں رسولِ خدا کی اطاعت کی فرضیت کا تذکرہ

تھا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی مرضیات اور نامرضیات معلوم کرنے کا واحد ذریعہ اللہ کے نبی اور رسول ہوتے ہیں، لہٰذا اُن کا اتباع ضروری ہے۔ اس کے بغیر نہ خدا کی رضا حاصل ہو سکتی ہے اور نہ انسان کامیاب ہو سکتا ہے۔ اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کے فوائد بیان ہوئے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ منافقین کے غلط رویے کی مذمت بھی ہے۔

ابتلا من اللہ

ارشاد ہوتا ہے وَلَوْ اَنَّا کَتَبْنَا عَلَیْھِمْ اور اگر ہم لکھ دیتے یعنی ان منافقین پر فرض کر دیتے۔ کَتَبَ کا لغوی معنی لکھنا ہوتا ہے مگر مطلب یہ ہے کہ فرض قرار دیتے۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ تم پر لڑائی فرض کی گئی ہے۔ یا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں۔ اسی طرح فرمایا کہ اگر ان پر فرض کر دیا جاتا اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ کہ اپنے آپ کو قتل کرو۔ یعنی خودکشی کر لو۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا۔ جب انہوں نے بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے اُن سے کہا تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، لہٰذا اب اس کا ازالہ یہ ہے کہ اپنے رب سے توبہ کرو اور "فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ" یعنی اپنی جانوں کو ہلاک کرو۔ تو فرمایا اگر ہم تم پر بھی خودکشی فرض کر دیتے اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِیَارِکُمْ یا اپنے گھروں سے نکل جانے کو ضروری قرار دیتے۔ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِیْلٌ مِّنْھُمْ تو وہ ایسا نہ کرتے مگر ان میں سے بہت تھوڑے لوگ۔

بنی اسرائیل کو خودکشی کا حکم ہوا اور انہوں نے لیت و لعل کرنے کے بعد حکم کی تعمیل بھی کی مگر ہماری شریعت میں خودکشی حرام ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا جو کوئی خودکشی کرے گا اُسے برزخ اور آخرت میں وہی سزا ملیگی جو طریقہ اُس نے خودکشی کے لیے اختیار کیا۔ مثلاً کسی نے زہر کھا لیا یا کسی تیز دھار آلے سے یا گولی مار کر خودکشی کی، کسی بلند مقام سے چھلانگ لگائی، پانی میں ڈوب مرا،

تو فرمایا آخرت میں اُسے اسی قسم کی سزا دی جائیگی اور وہ اسی طرح خودکشی کرتا رہیگا
اپنے آپ کی قربانی پیش کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایسا قربانی کا حکم
حکم نہیں دیا اور اگر دے دیتا تو بہت تھوڑے لوگ اس کی تعمیل پر تیار ہوتے۔ اللہ تعالیٰ
کا قانون ہے "لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا" کہ وہ کسی کو اس کی طاقت
سے زیادہ بوجھ نہیں اٹھواتا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے جانی قربانی پیش کرنے کا حکم
نہیں دیا۔ صاحب روح المعانی اور دوسرے مفسرین کرام حضرت عمرؓ کا قول
نقل کرتے ہیں۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں حکم دیتے کہ ہم اپنے آپ کو اس کی راہ میں
قربان کر دیں تو ہم یقیناً ایسا کر گزرتے مگر الحمد للہ اللہ نے ایسا حکم نہیں دیا۔ حضرت
ابوبکر صدیق رضؓ سے بھی اسی قسم کا جواب منقول ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ حکم
دیتا تو میں اپنی اور اپنے بال بچوں کی جانیں اللہ کی راہ میں قربان کر دیتا۔ حضور علیہ السلام
نے صدیق اکبرؓ کا یہ جذبہ سُنا تو فرمایا صَدَقْتَ یَا اَبَابَکْرٍ اے ابوبکر! تو نے
سچ کہا، تمہارا ایمان واقعی اتنے اعلیٰ درجے کا ہے،

عبداللہ بن رواحہؓ انصار کے خاندان کے اکابر صحابہ میں سے ہیں، اپنے
قبیلہ کے سردار اور شاعر بھی تھے۔ ان کے متعلق بھی اسی قسم کی بات منقول ہے۔
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اگر اللہ تعالیٰ قربانی پیش کرنے کا حکم دیتا تو
عبداللہ بن رواحہ اُس قلیل تعداد میں شامل ہوتے، جو اس حکم کی تعمیل کر گزرتی۔
حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق بھی آتا ہے۔ کہ وہ بھی اس قسم کے حکم کی تعمیل
کرتے الحمد للہ مالک الملک نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا، ورنہ لوگ سخت آزمائش میں مبتلا ہو جاتے
اور بہت کم لوگ اس حکم کی تعمیل کر پاتے مگر اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی ہے کہ جانی قربانی کا حکم نہیں دیا بلکہ جو کوئی
شخص سچے دل سے خدا کی طرف رجوع کر کے معافی مانگے تو اللہ تعالیٰ صرف توبہ کرنے سے معافی دے دیتا ہے

مفسرین کرام اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ اَنِ اقْتُلُوْا
اَنْفُسَکُمْ سے مراد جہاد ہے۔ اور اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِیَارِکُمْ
سے مراد ہجرت ہے۔ مگر یہ دونوں چیزیں منافقین کے لیے بھاری ہیں۔

وہ تو اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں وہ جہاد اور ہجرت جیسے مشکل امور کیسے انجام دینگے، حالانکہ اسلام نے انہیں فرض قرار دیا ہے اسی لیے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ اِن دو باتوں کا حکم دیتا ہے تو اس پر بہت قلیل تعداد عمل پیرا ہوتی۔

ہجرت اور جہاد کی اہمیت

ہجرت کی اہمیت کے متعلق آتا ہے اِنَّ شَانَ الْھِجْرَۃِ لَشَدِیْدٌ یعنی ہجرت کا معاملہ بڑا شدید ہوتا ہے۔ جب کسی علاقے میں کفار کو غلبہ حاصل ہو جائے اور اہل ایمان کے لیے شریعت پر عمل کرنا ممکن نہ رہے تو اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی کی خاطر وہاں سے ہجرت کرنا فرض ہو جاتا ہے ایسے حالات میں جو شخص ہجرت کے لیے تیار نہ ہو، وہ سخت گنہگار ہے اور اس کے لیے جہنم کی وعید آئی ہے۔ اسی طرح اللہ کے دین کی اقامت کے لیے جہاد بھی فرض ہے۔ جہاد میں قتال بھی شامل ہے جیسے سورۃ بقرہ میں آچکا ہے کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَھُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ تم پر لڑائی فرض قرار دی گئی ہے اگرچہ وہ تمہیں ناپسند ہو۔ اس میں جان کا خطرہ ضرور ہے مگر انجام کے اعتبار سے اس میں تمہارے لیے بہتری ہے۔ جہاد کے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے ذروۃ سنام الاسلام الجہاد یعنی اسلام کی کوہان (بلندی) جہاد ہے۔ جس طرح اونٹ کی شان اُسکی کوہان سے ظاہر ہوتی ہے اسی طرح اسلام کی رفعت جہاد سے ہے۔ جہاد کے بغیر نہ حدود اللہ قائم ہو سکتی ہیں اور نہ امن قائم ہو سکتا ہے۔ گویا دشمن کو مغلوب کرنے اور شریعت کے اجرا کے لیے جہاد ضروری ہے۔ عام حالات میں جہاد فرض کفایہ ہوتا ہے اگر مسلمانوں کی ایک جماعت اس فریضہ کو ادا کر رہی ہے تو یہ تمام اہل اسلام کی طرف سے ادا تصور ہوگا، اور اگر قوم کا کوئی فرد بھی جہاد کے لیے تیار نہیں تو پوری کی پوری مسلمان قوم و ملّت گنہگار ہوگی۔ قتال کے علاوہ دین اسلام کی تعلیم و تبلیغ، اشاعت اور تقریر و تحریر بھی جہاد ہی کا ایک حصہ ہے۔ قتال کی طرح یہ فریضہ بھی فرض کفایہ

ہی ہے۔ اور مسلمانوں کی ایک جماعت کو یہ فریضہ ہمیشہ ادا کرتے رہنا چاہیئے، اگر اسلام کی تبلیغ بالکل رُک گئی تو پھر بھی ساری قوم گنہگار ہوگی۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اگر ہم جہاد اور ہجرت ان لوگوں پر فرض قرار دیتے تو اس حکم کی تعمیل کرنے والے بہت کم لوگ ہوتے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اس قلیل تعداد میں صحابہ کرامؓ تو سب کے سب داخل ہیں کیونکہ وہ ہر حکم کی تعمیل کے لیے ہمیشہ تیار رہے، البتہ کمزور ایمان والے اور منافق لوگوں کے لیے یہ دونوں چیزیں بہت مشکل ہیں۔ وہ خود غرضی اور آرام طلبی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لہذا یہ مشکل کام اُن کے بس کا روگ نہیں رہتے۔

تعمیل حکم کا ثمرہ

منافقین کی اس کمزوری کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ اگر یہ لوگ ہمارے حکم کی تعمیل کر لیتے ہیں یعنی جس بات کی نصیحت کی جا رہی ہے۔ اُسے کر گزرتے، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے، اپنے تمام معاملات رسول خدا کے پاس لاتے، قرآن وسنت کو اپنی آخری پناہ گاہ بنا لیتے، تو فرمایا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ یہ اُن کے لیے بہتر ہوتا۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل پیرا ہو جاتے دنیا میں بھی کامیابی حاصل ہوتی اور آخرت کی فلاح تو بہرحال یقینی ہے وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا اور حکم دین کی تعمیل پر پختگی کی دلیل ہوتا۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ دین پر پختگی کسی شخص کے اعتقاد اور ایمان کی پختگی کی علامت ہوتی ہے دین کے احکام پر جس قدر عمل ہوگا اسی قدر اعتقاد اور ایمان میں مضبوطی آئیگی۔ اور عمل میں جس قدر کمزوری آئیگی، اعتقاد اور ایمان بھی اسی قدر کمزور ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اگر ایمان میں پختگی آئیگی تو انسان جہاد اور ہجرت کے لیے تیار ہو جائے گا۔ پھر اُس کے لیے کوئی کام دشوار نہیں رہے گا۔

ایمان کی پختگی

روایات میں آتا ہے۔ کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ بعض لوگوں کے ایمان زمین میں گڑھے ہوئے پہاڑوں سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں

آپ نے کامل الایمان لوگوں کی مثال پہاڑوں کے ساتھ دی۔ ایک شاعر نے نے کہا ہے ؎

تزول الجبال الراسیات وقلبنا علی العهد لا یلوی ولا یتغیر

مطلب یہ ہے کہ انسان کا عقیدہ اس قدر مضبوط ہونا چاہیئے۔ کہ مضبوط پہاڑ تو اپنی جگہ سے ٹل جائیں مگر ہمارا عہد و پیمان اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ علامہ اقبال مرحوم نے بھی یہی بات یوں بیان کی ہے ؎

بخود خزیدہ و محکم چوں کوہساراں زی
چوں خس مزی کہ ہوا تند و شعلہ بیباک است

یعنی مستقل مزاج بن کر پہاڑوں کی طرح زندہ رہو تنکوں کی طرح زندگی مت گزارو کہ ہوا تیز ہے اور شعلہ بیباک ہے مطلب یہ کہ اگر حقیر تنکے بن جاؤ گے تو پھر نہ ہوا کے سامنے ٹھہر سکو گے اور نہ آگ لگنے سے بچ سکو گے اگر عزت و ناموس کی زندگی گزارنا ہے، تو پہاڑوں اور چٹانوں کی طرح مضبوط بن جاؤ۔

آج کی سوسائٹی میں لوگ ڈانواں ڈول پھر رہے ہیں۔ چاروں طرف گمراہی اور اس کے اسباب پھیلے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے ایمان کی پختگی باقی نہیں رہی لوگ معمولی سی آزمائش پر بھی پورا نہیں اترتے بلکہ قدم قدم پر پھسل جاتے ہیں۔ رسم و رواج اور بدعات میں غرق ہو چکے ہیں، مشرک، کافر، اور دہریہ اقوام نے دنیا میں ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ لوگ گمراہی کی طرف فوراً راغب ہو جاتے ہیں لہو و لعب، کھیل تماشہ، عریانی، فحاشی اور بے حیائی کے کاموں پر فوراً تیار ہو جاتے ہیں، ایمان بالکل کمزور ہو چکا ہے ان حالات کے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے الصابر علی الدین کالقابض علی الجمر یعنی دین پر ثابت قدم رہنا اتنا مشکل ہو جائیگا جیسے جلتے ہوئے کوئلے کو ہاتھ میں پکڑنا مشکل ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پورے کا پورا ماحول اور برادری بگڑ چکے ہیں۔ سب کے سب رسومات اور بدعات کے پیچھے لگے ہوئے ہیں،

ایسے وقت میں ایک صحیح مومن کے لیے گزر اوقات کس قدر مشکل ہو گی۔

دنیا و آخرت کی کامیابی

فرمایا اگر یہ لوگ احکام خداوندی پر عمل پیرا ہو جائیں وَاِذًا لَّاٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِیْمًا تو ہم انہیں اجرِ عظیم عطا کرتے یعنی اگر یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی تابعداری کرتے، تقویٰ کی راہ اختیار کرتے، ہر معاملہ میں شریعت سے راہنمائی حاصل کرتے اور تمام معاملات میں دین ہی کو مقدم رکھتے تو آخرت میں اللہ تعالیٰ انہیں بہت بڑا صلہ عنایت فرماتے وَلَهَدَیْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا اور انہیں دنیا میں صراط مستقیم کی طرف راہنمائی بھی حاصل ہوتی۔ مقصد یہ کہ تعمیل حکم کی صورت میں انہیں دنیا میں صراط مستقیم حاصل ہو جاتا، جس پر چل کر وہ کامیاب زندگی گزار سکتے، اور پھر آخرت میں اجرِ عظیم کے مستحق ہوتے۔ اس طرح دنیا اور آخرت دونوں مقامات پہ کامیاب و کامران ہوتے دوسرے مقام پہ فرمایا "وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًی" جو کوئی ہدایت کے راستے پہ چل نکلتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہدایت میں اضافہ فرما دیتا ہے۔ صراط مستقیم ہر مومن کا مطلوب و مقصود ہے جس کے حصول کے لیے ہر نماز میں دعا کی جاتی ہے "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" اے اللہ! ہمیں صراط مستقیم پہ چلا۔ جسے یہ چیز حاصل ہو جائے اس کے لیے بہت بڑی کامیابی ہے اسی لیے اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ صراط مستقیم اس شخص کو حاصل ہوتا ہے۔ جو اس کے احکام پہ عمل پیرا ہو جاتا ہے۔

درس سی و نہ ۳۹ آیت ۶۹ تا ۷۰

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ
اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ
وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۗ ﴿۶۹﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ
مِنَ اللّٰهِ ۗ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿۷۰﴾ ع ۹/۱۱

ترجمہ :- اور جو شخص اطاعت کریگا اللہ کی اور رسول کی پس یہی لوگ ہیں اُن کے ساتھ جن پہ اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے ، انبیاء ، صدیق ، شہداء اور صالحین میں سے ۔ اور بہت ہی اچھی ہے ان لوگوں کی رفاقت ﴿۶۹﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل ہے ۔ اور کافی ہے اللہ جاننے والا ﴿۷۰﴾

ربط آیات

گذشتہ آیات میں منافقین کی مذمت بیان کی گئی کہ وہ اللہ اور اُس کے رسول کے فیصلے پر راضی نہیں ہوتے اور اپنے معاملات کو طاغوت کے پاس لے جانا پسند کرتے ہیں ۔ اس کے بعد اللہ نے ارشاد فرمایا کہ انسانوں کی فلاح کا دارومدار اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پہ ہے ، جب تک وہ اللہ کے رسُول کو اپنا حکم مقرر نہ کریں ۔ وہ کامل الایمان نہیں ہو سکتے ، پھر فرمایا ، اگر اللہ تعالیٰ اُن پہ کوئی مشکل احکام نازل فرما دیتا جیسا کہ بنی اسرائیل کی توبہ کو اُن کی جانوں کے قتل کے ساتھ مشروط کر دیا تھا ۔ تو لوگوں کے لیے بڑی دشواری ہوتی ۔ اللہ تعالیٰ نے بڑی مہربانی فرمائی کہ کوئی ایسا حکم نہیں دیا جو تکلیف مالایطاق میں داخل ہو ، لہٰذا اِن لوگوں کی بہتری اسی چیز میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی گئی نصیحت پہ عمل پیرا ہو جائیں ۔ ایسا کریں گے تو انہیں بہتری ، ایمان میں پختگی ، اجرِ عظیم

اور صراطِ مستقیم نصیب ہو جائیگا۔ اللہ تعالیٰ نے اِن چار انعامات کا تذکرہ فرمایا۔ ہر نیکی کنندہ کے لیے آخرت میں اجرِ عظیم تو بلاشبہ ہے، اُسے دنیا میں بھی وہ صراطِ مستقیم نصیب ہو جائیگا۔ جس کی دُعا ہر مومن ہر نماز میں کرتا ہے۔

انعام یافتہ لوگ

آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت کرنیوالوں کے لیے پانچویں انعام کا ذکر کیا ہے۔ یہ بلند ترین لوگوں کی رفاقت ہے جو کہ بڑی ہی فضیلت والی چیز ہے۔ فرمایا وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریگا۔ اللہ تعالیٰ تو مطاع مطلق بالذات ہے تاہم رسول کی اطاعت بالذات تو نہیں مگر وہ بھی رسالت کی وجہ سے مطلقاً فرض ہے۔ ایسے لوگوں کو خوشخبری سنائی گئی ہے۔ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ان لوگوں کو اللہ کے اُن کاملین کی معیت نصیب ہو گی جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے اور یہ انعام یافتہ گروہ چار ہیں مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ یعنی انبیاء، صدیق، شہدا اور صالحین ہیں۔ یہ انہی لوگوں کی رفاقت کا تذکرہ ہے جن کے متعلق ہر نمازی سورۃ فاتحہ میں دعا کرتا ہے "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" اے اللہ! ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔ "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" اور وہ سیدھا راستہ اُن لوگوں کا ہے جن پر تو نے انعام کیا سورۃ فاتحہ میں تو انعام یافتہ لوگوں کی تشریح بیان نہیں کی گئی، اُن کا تذکرہ اب اِس آیت کریمہ میں ہو رہا ہے منعم علیہم مذکورہ چار معیاری گروہ ہیں۔ ان کے علاوہ باقی لوگ اِن سے کم تر درجہ میں ہیں۔

انبیاء علیہم السلام

انعامات دو قسم کے ہیں یعنی مادی اور روحانی۔ اِس دنیا میں مادی انعامات میں تو مومن اور کافر وغیرہ سب شریک ہیں۔ البتہ روحانی نعمتیں اللہ کے مقبول بندوں کو حاصل ہوتی ہیں۔ اور اِن میں سرِ فہرست انبیاء علیہم السلام کی جماعت ہے علم العقائد ایک مستقل فن ہے جس کے ذریعے اچھے اور برے عقائد

کی تشریح کی جاتی ہے۔ تو اس فن کے ماہرین نے عقائد کی کتابوں میں نبی کی تعریف یوں کی ہے کہ نبی انسان ہوتا ہے، جسے اللہ تعالیٰ اپنے احکام پہنچانے کے لیے بنی نوع انسان کی طرف مبعوث فرماتا ہے۔ انسانوں کے علاوہ نبوت کا منصب کسی دوسری مخلوق کو حاصل نہیں ہوا، فرشتوں یا جنات میں سے کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا، البتہ اپنے پیغام پہنچانے کے لیے اللہ تعالیٰ رسالت کا فریضہ انسانوں کے علاوہ فرشتوں کے سپرد بھی کر دیتے ہیں۔ جیسا سورۃ حج میں فرمایا "اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ" اللہ تعالیٰ فرشتوں اور لوگوں میں سے رسول منتخب فرما لیتا ہے۔

انسان کی تعریف

اہل منطق نے انسان کی تعریف بھی کی ہے، کہ انسان کیا ہے، پرانے زمانے کے یونانی کہتے تھے کہ انسان حیوانِ ناطق ہے۔ یعنی ایسا جاندار ہے جو بولتا ہے اور ادراک رکھتا ہے۔ حضرت امام شاہ ولی اللہؒ کے سلسلہ کو ماننے والے انسان کی تعریف یوں کرتے ہیں مَا یَتَفَکَّرُ وَیَصْنَعُ بِالْاٰلَاتِ یعنی جو غور و فکر کرتا ہے اور آلات کو استعمال کرتا ہے۔ یہ بہترین تعریف ہے جو شاہ رفیع الدینؒ فرزند شاہ ولی اللہؒ نے اپنی منطق کی کتاب میں کی ہے۔ قرآن پاک میں آتا ہے۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ" اللہ تعالیٰ نے انسان کو لوتھڑے سے پیدا کیا اگر اس میں علم و شعور اور دین اور ایمان ہو گا تو وہ صحیح معنوں میں انسان ہے، ورنہ وہ لوتھڑا ہی ہے جس سے اس کی پیدائش عمل میں آئی ہے۔

نبی انسان ہوتا ہے

تو مقصد یہ ہوا کہ نبی انسان ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی طرف شرعی احکام کی تبلیغ کے لیے مبعوث فرماتا ہے۔ اہل بدعت نبی کو انسان ماننے کے لیے تیار نہیں حالانکہ نبی کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ انسان ہوتا ہے۔ اس بات کی وضاحت قرآن پاک میں بار بار کی گئی ہے خود حضور خاتم النبیین اور آپ سے پہلے آنے والے رسول انسان ہی تھے۔ سورۃ انبیاء میں واضح طور پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان موجود ہے "وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْھِمْ"

یعنی اے پیغمبر علیہ السلام ! آپ سے پہلے ہم نے جتنے بھی رسول بھیجے سب مرد تھے رجل مرد انسان یا بشر کو کہتے ہیں انسان یا بشر ہونا کوئی عیب کی بات نہیں ہے ۔ اس بات کا اظہار اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو سامنے کیا تھا اِنِّیْ خَالِقٌ م بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ، میں گارے سے بشر کو پیدا کرنے والا ہوں بشر تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا شاہکار ہے ۔ اسے اللہ نے اپنی تمام مخلوق میں زیادہ پیچیدہ ، غامض اور جامع الصفات پیدا کیا ہے ۔ انسان جیسا شرف کسی اور مخلوق کو حاصل نہیں ۔

نبی معصوم ہوتا ہے

بہر حال نبی کو منعم علیہم میں سے پہلا درجہ حاصل ہے اور یہ معصوم ہوتا ہے نبی کی معصومیت اسکی خصوصیات میں داخل ہے اس کو گارنٹی حاصل ہوتی ہے کہ اس سے گناہ نہیں سرزد ہونے دیا جائیگا ۔ اشرف المخلوقات میں سے یہ شرف کسی دوسری ہستی کو حاصل نہیں ۔ ملائکہ بھی معصوم ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ۔ لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ مگر فرشتے انسان کی طرح مادی مخلوق نہیں بلکہ وہ لطیف اور نورانی مخلوق ہے ۔ تاہم انسانوں میں سے صرف انبیاء کی جماعت ہی معصوم ہے ۔ ان سے جو تھوڑی بہت کوتاہی ہوتی ہے وہ لغزش کہلاتی ہے ۔ یہ معمولی چیزیں زلات میں آتی ہیں مگر بعض اوقات معمولی سی لغزش پر بھی بہت بڑی گرفت ہو جاتی ہے ، حالانکہ ایسی کوتاہی صغیرہ یا کبیرہ گناہ کی تعریف میں نہیں آتی ۔ اہل سنۃ والجماعۃ کا یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ نبوت ملنے سے پہلے اور بعد اللہ تعالیٰ انبیاء کو معصیت سے محفوظ رکھتا ہے اس کی وجہ یہ ہے ، کہ نبی کی اطاعت مطلقہ فرض ہوتی ہے اور نبی کا ہر فیصلہ قابلِ عمل ہے لہذا نبی سے کوئی غلط بات سرزد نہیں ہوتی ۔

ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ کوئی جج یا قاضی غصے کی حالت میں فیصلہ نہ کرے کیونکہ اس حالت میں غلطی کا امکان ہے ۔ اسی طرح اگر کوئی قاضی کسی نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہے تو اس کا فیصلہ درست تسلیم نہیں ہوگا ۔ یہ صرف اللہ کے نبی کو شرف حاصل ہے کہ اس کے فرمودات غصے اور مزاج کی حالت

میں تو مومن اور کافر وغیرہ سب شریک ہیں ۔ البتہ روحانی جمیں اللہ کے مقبول بندوں کو حاصل ہوتی ہیں ۔ اور ان میں سرفہرست انبیاء علیہم السلام کی جماعت ہے علم العقائد ایک مستقل فن ہے جس کے ذریعے اچھے اور برے عقائد

میں بھی برحق ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا، حضور! بعض اوقات آپ ہمارے ساتھ مزاح فرماتے ہیں۔ فرمایا اِنِّیْ لَا اَقُوْلُ اِلَّا الْحَقَّ ایسی حالت میں بھی میں حق کے سوا کچھ نہیں کہتا۔ اسی طرح اگر آپ نے کوئی فیصلہ غصے کی حالت میں بھی کیا ہے تو بھی برحق اور قابلِ تعمیل ہوگا۔ یہ نبی کی خصوصیت ہے کہ اگر اس سے کوئی لغزش ہو جائے تو اُسے خبردار کر دیا جاتا ہے مگر ایک عام انسان کے لیے یہ ضروری نہیں بہر حال نبی معصوم عن الخطا ہوتا ہے اور اس کی اطاعتِ مطلقہ فرض ہے۔

مفسر قرآن امام بیضاویؒ فرماتے ہیں۔ کہ پہلا درجہ انبیاء کا ہے۔ وہ تقدس کے بلند ترین مقام پر ہوتے ہیں۔ وہ حد کمال سے بڑھ کر حد تکمیل تک پہنچے ہوئے ہوتے ہیں، اُن میں ہر خوبی بذاتہ موجود ہوتی ہے۔ تمام اوصاف حسنہ اور اخلاق فاضلہ کے حامل ہوتے ہیں۔ اُن کے رفعت تقدس کے پیش نظر ہم یوں کہ سکتے ہیں کہ وہ تمام حقائق ایمانیہ، صفات ربانیہ، ملاء اعلیٰ یا ملکوت وجبروت کا قریب سے مشاہدہ کرنے والے ہوتے ہیں۔

صدیق کی تعریف

صدیق راست باز اور سچے انسان کو کہتے ہیں۔ مسلم شریف، ترمذی اور دوسری کُتب احادیث میں آتا ہے لا یزال العبد یتحری الصدق حتیٰ یکتب عند اللہ الصدیق مومن قول، فعل، وعدہ غرضیکہ ہر بات میں سچائی کی کوشش کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ صدیق لکھ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جھوٹے آدمی کے متعلق بھی آتا ہے لا یزال الرجل یتحری الکذب حتیٰ یکتب عند اللہ الکذاب کوئی شخص مسلسل جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے نزدیک کذاب لکھ دیا جاتا ہے۔ بہر حال انبیاء علیہم السلام سب کے سب صدیق ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن پاک میں کئی انبیاء کے متعلق آتا ہے "اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا" کہ وہ صدیق نبی تھا۔ البتہ انبیاء کے علاوہ دیگر مومن لوگ بھی صدیق ہوتے ہیں۔ مگر وہ دوسرے درجے میں آتے ہیں اِن میں مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی۔

یہ فضیلت کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔ صدیق ظاہراً اور باطناً کمال درجے کا اطاعت گزار ہوتا ہے۔ وہ اپنے قول، فعل اور عقیدے میں ہمیشہ سچا ہوتا ہے۔

شہید اور شہادت

شہید کا معنیٰ گواہ ہے اور کسی معاملہ میں گواہی عموماً مشاہدہ کی بنا پر ہوتی ہے مگر کبھی علم کی بنیاد پر بھی ہو سکتی ہے۔ اسلام میں قانون شہادت بڑا اہم قانون ہے۔ گواہی کے متعلق قرآنِ پاک میں متعدد مقامات پر آیا اَقِیْمُوا الشَّھَادَۃَ لِلّٰہِ یعنی اللہ کے لیے بلاکم وکاست گواہی دو۔

انگریز نے تو قانون شہادت کو بھی برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ موجودہ قانون کے تحت عدالتوں میں گواہی دی نہیں جاتی بلکہ پڑھائی جاتی ہے۔ پولیس اور وکیل گواہوں کو اچھی طرح سکھاتے ہیں کہ یوں گواہی دینا ورنہ کیس خراب ہو جائے گا۔ یہ کیسی گواہی ہے۔ صحیح گواہی تو یہ ہے کہ اولاً گواہ مومن، شریف اور عقل مند ہو، فاسق فاجر یا پاگل آدمی کی گواہی قابل قبول نہیں ہوتی اور پھر یہ ہے کہ جو کچھ اس نے دیکھا صاف صاف عدالت میں بیان کر دے۔ مقدمات کا صحیح فیصلہ اس قسم کی گواہی پر ہی ہو سکتا ہے۔ اگر انگریزی قانونِ شہادت کے مطابق کرائے کے گواہ ہی گواہی دیتے رہے تو کبھی درست فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

بہر حال یہاں پر شہید سے مراد نبی اور صدیق کے بعد تیسرے درجے کے وہ مومنین ہیں جو حق و صداقت اور ایمان کی خاطر اپنی جان کی بازی بھی لگا دیں۔ انہیں حقائق کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنی عزیز ترین متاع جان کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ان میں صدیقین جیسی علمی قوت تو نہیں ہوتی مگر ان کی عملی قوت کامل درجے کی ہوتی ہے جو کہ انبیاء کی قوت عملیہ کا عکس ہوتی ہے۔ یہ تیسرے درجے کے منعم علیہ ہوتے ہیں۔

صالحین

انعام یافتہ لوگوں کا چوتھا گروہ صالحین کا ہے۔ یہ صلاحیت اور نیکی کے حامل لوگ ہوتے ہیں۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اتباع میں کامل ہوتے ہیں۔ انہیں نہ تو شہیدوں جیسا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اور نہ صدیقوں جیسا کمالِ علم۔ یہ

دوسروں سے بات سُن کر یقین قلب کے ساتھ اُس پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں، اُن کا ذہن شک و تردد سے پاک ہوتا ہے اور وہ عمر بھر کمال درجے کی نیکی پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ یہ صالحین کا گروہ ہے، جو چوتھے درجے میں آتا ہے۔

قرآن وسنت کی اصطلاح میں صالح شخص وہ ہے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو ادا کرے۔ حقوق سے روگردانی کرنے والا شخص صالح نہیں ہو سکتا۔ اچھے اور نیک لوگ اِن چار گروہوں کے علاوہ بھی ہیں مگر وہ اِن سے کم تر درجہ میں ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ گروہ یہ چار ہی ہیں۔ یہی لوگ صراطِ مستقیم کے راہی ہیں، وہ صراطِ مستقیم جس پہ چلنے کی ہر مومن دعا کرتا ہے۔

منعم علیہم کی جامع تعریف

شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔ کہ نبی پہ وحی نازل ہوتی ہے اور اُسے حد درجے کا قرب حاصل ہوتا ہے لہٰذا وہ عالم بالا کی چیزوں کا قریب سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ کہ صدیق میں غایت درجے کی قلبی صفائی ہوتی ہے اُس میں فضائل کی بہتات ہوتی ہے اور رذائل اُس سے دُور ہوتے ہیں نبی پہ جو وحی نازل ہوتی ہے، صدیق شہادت قلبی سے اُس کی تصدیق کرتا ہے، اس کے لیے اُسے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے واقعات میں موجود ہے۔ غرضیکہ نبی کا مشاہدہ قریب سے ہوتا ہے اور صدیق کا مشاہدہ دور سے۔ اس کے بعد شہید کا درجہ ہے اُسے یہ درجہ دلائل و براہین کے ساتھ ریاضت اور عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور صالح وہ ہے جس کے قلب میں قرینے کے ساتھ اطمینان پیدا ہوتا ہے، جس کے ذریعے وہ اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے۔ امام بیضاویؒ نے یوں بھی تاویل کی ہے۔

منعم علیہم کی رفاقت

فرمایا جس نے اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کی اُسے انعام یافتہ لوگوں کی رفاقت نصیب ہوگی وَحَسُنَ أُولٰئِكَ رَفِيقًا اور اِن لوگوں کی رفاقت نہایت ہی اچھی ہے، جسے نصیب ہو جائے اس رفاقت کی تشریح حدیث شریف میں موجود ہے۔ اور وہ اس طرح کہ بلند درجے والے اور

نچلے درجے والے جنتیوں کی آپس میں ملاقاتیں ہونگی، ایک دوسرے کی مصاحبت حاصل ہوگی اور آپس میں گفتگو ہوگی۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ ہفتہ میں ایک دن یعنی جمعہ کے روز اطاعت گزار لوگ انعام یافتہ لوگوں سے ملاقات کیا کریں گے۔ اس ملاقات سے نچلے درجے والا جنتی بھی اس قدر مطمئن ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو اعلیٰ درجے والے منعم علیہ کا ہم اعزاز ہی سمجھے گا۔ اُن پر ایسی کیفیت طاری ہوگی کہ وہ اپنے آپ کو کمتر خیال نہیں کریں گے۔ حالانکہ اُن کے درجات میں اس قدر تفاوت ہو گا جتنا زمین اور بلند تر ستارے کے درمیان فرق ہے۔

بہر حال کمال درجے کی اطاعت کرنے والوں کو منعم علیہم کی معیت نصیب ہوگی اور اچھی سوسائٹی کا مل جانا بذاتِ خود بہت بڑی سعادت ہے۔ دنیا میں اچھی سوسائٹی کا مل جانا بھی کوئی کم نعمت نہیں مگر آخرت کی یہ پاکیزہ سوسائٹی تو جنت، علیین، حظیرۃ القدس اور ملاءِ اعلیٰ میں نصیب ہوگی۔ اس دنیا میں تو اس انعام کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے تو انبیاء نے بھی دُعا کی تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ "الٰہی مجھے اسلام پر موت اور صالحین کی رفاقت نصیب فرما۔

یہاں پر یہ بات بھی واضح کر دی جائے کہ قادیانیوں نے اس آیت کریمہ سے غلط استدلال کیا ہے۔ یہ لوگ کافر اور مرتد ہیں اور یہ ملعون فرقہ ہے۔ انہوں نے اس آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے۔ کہ جو کوئی اللہ اور رسول کی اطاعت کریگا وہ نبی، صدیق، شہید یا صالح بن جائیگا۔ اس طرح وہ مرزا غلام احمد کی نبوت کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آیت کریمہ کا مطلب واضح ہے۔ کہ اللہ اور اسکے رسول کے اطاعت گزاروں کو ان چار انعام یافتہ گروہوں کی رفاقت نصیب ہو جائیگی۔

شانِ نزول

حضرت ثوبانؓ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آزاد کردہ غلام تھے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک دفعہ سخت بے چینی کی حالت میں نبی کریمؐ کی خدمت

میں حاضر ہوئے۔ آپ نے اضطرار کی وجہ دریافت کی تو عرض کیا حضور! جب میں اس دنیا میں اپنے گھر پہ ہوتا ہوں اور بے چین ہو جاتا ہوں تو آپ کی زیارت کر کے سکون حاصل کر لیتا ہوں۔ اگلے جہاں میں نامعلوم کیا صورت حال ہو گی۔ اوّل تو میرا جنت میں جانا قطعی معلوم نہیں اور اگر میں خدا کے فضل سے وہاں پہنچ بھی گیا تو میں تو کسی ادنیٰ درجے میں ہوں گا جب کہ آپ عزت کے بلند ترین مقام میں ہوں گے، تو وہاں آپ کی زیارت سے اپنی آنکھیں کیسے ٹھنڈی کر سکوں گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت ربیعہ بن کعب اسلمیؓ حضور علیہ السلام کے خادم تھے۔ سفر و حضر میں آپ کی خدمت انجام دیتے تھے۔ ایک رات حضور علیہ السلام نے وضو کیا اور نماز پڑھی۔ پھر ربیعہؓ سے فرمایا، کوئی خواہش ہے تو بیان کرو۔ عرض کیا، حضور! میری تمنّا یہ ہے کہ جنت میں آپ کی معیت حاصل ہو جائے۔ آپ نے پھر فرمایا۔ اَوَغَيْرَ ذٰلِكَ اس کے علاوہ کچھ مطلوب ہو۔ پھر عرض کیا میری خواہش صرف یہ ہے کہ آپ کی رفاقت حاصل ہو جائے۔ اس پر آپ نے فرمایا اَعِنِّيْ عَلٰى نَفْسِكَ بِكَثْرَةِ السُّجُوْدِ اپنے نفس کے خلاف سجدوں کی کثرت کے ساتھ میری مدد کرو۔ یعنی کثرت سے نمازیں پڑھا کرو، تاکہ تمہارے اندر لطافت پیدا ہو جائے، تزکیہ نفس ہو جائے اور پھر میں بھی دعا کروں گا تو اللہ تعالیٰ تمہیں میری رفاقت نصیب کر دیں گے۔ بہر حال اس قسم کے بعض دیگر واقعات بھی اس آیت کریمہ کے شانِ نزول میں بیان کیے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فضل

فرمایا ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ انبیاء، اصدقا، شہدا اور صالحین کی معیت حاصل ہو جانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل ہے، جسے نصیب ہو جائے یہ اُس کی خاص مہربانی اور انعام ہے وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا اور کافی ہے اللہ تعالیٰ جاننے والا۔ یہ چیز رب العزت کے علم میں ہے کہ کون شخص کتنے خلوص کا حامل ہے اس میں ایمان اور تقویٰ کی کتنی مقدار ہے لہٰذا ہر شخص کو اسکی حیثیت کے مطابق ثمرہ ادا کیا جائے گا۔ علیم کل فقط ذاتِ خداوندی ہے۔

درس چہل ۴۰ | آیت ۷۱ تا ۷۴

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ خُذُوا۟ حِذْرَكُمْ فَٱنفِرُوا۟ ثُبَاتٍ
أَوِ ٱنفِرُوا۟ جَمِيعًا ﴿٧١﴾ وَإِنَّ مِنكُمْ لَمَن لَّيُبَطِّئَنَّ
فَإِنْ أَصَٰبَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَالَ قَدْ أَنْعَمَ ٱللَّهُ عَلَىَّ
إِذْ لَمْ أَكُن مَّعَهُمْ شَهِيدًا ﴿٧٢﴾ وَلَئِنْ أَصَٰبَكُمْ
فَضْلٌ مِّنَ ٱللَّهِ لَيَقُولَنَّ كَأَن لَّمْ تَكُنۢ
بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُۥ مَوَدَّةٌ يَٰلَيْتَنِى كُنتُ مَعَهُمْ
فَأَفُوزَ فَوْزًا عَظِيمًا ﴿٧٣﴾ فَلْيُقَٰتِلْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ
ٱلَّذِينَ يَشْرُونَ ٱلْحَيَوٰةَ ٱلدُّنْيَا بِٱلْءَاخِرَةِ ۚ وَمَن
يُقَٰتِلْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ
فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿٧٤﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے بچاؤ کا سامان اختیار کرلو پھر کوچ کرو جُدا جُدا گروہوں کی شکل میں یا سب اکٹھے ہو کر (۷۱) اور بیشک بعض تم میں سے البتہ وہ ہیں جو تاخیر کرتے ہیں۔ پس اگر تمہیں کوئی مصیبت پہنچے تو وہ کہتا ہے کہ اللہ نے مجھ پر انعام کیا ہے جب کہ میں اُن کے ساتھ حاضر نہیں تھا (۷۲) اور اگر تم کو اللہ کا فضل پہنچتا ہے، تو وہ کہتا ہے (پھر اُس کی حالت ایسی ہوتی ہے) گویا تمہارے اور اُس کے درمیان دوستی کا کوئی

تعلق نہیں۔ (پھر کہتا ہے) کاش میں بھی اُن کے ساتھ ہوتا، تو میں بھی کامیابی حاصل کرتا بڑی کامیابی (۷۳) پس چاہیئے کہ لڑیں اللہ کے رستے میں وہ لوگ جو بیچتے ہیں دُنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے، اور جو شخص بھی لڑے گا اللہ کے راستے میں، پھر وہ مارا جائے یا غالب آئے (ہر صورت میں) عنقریب ہم دیں گے اُس کو اجرِ عظیم (۷۴)

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسُول کی اطاعت کے لزوم کا بیان تھا۔ اور اسے کامیابی کا ذریعہ بتلایا گیا تھا، پھر اس اطاعت کے فوائد گنوائے گئے کہ اطاعت گذاروں کو نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحین کی معیت نصیب ہوگی جو کہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ اس سے پیشتر اطاعت ہی کے ضمن میں منافقین کا اعراض اور ان کی مذمت بیان ہوئی کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے پر راضی نہیں ہوتے لہذا وہ اپنے تنازعات کا رُخ رسُول خدا کی بجائے طاغوت کی طرف موڑتے ہیں۔ پھر یہ بھی بیان ہُوا۔ کہ منافقین کے ساتھ کیا روش اختیار کرنی چاہیئے۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا کیونکہ تقوٰے ہی مومنین کا مقصود ہے۔ اس ضمن میں حلال وحرام کا امتیاز واضح کیا گیا۔ محرمات نکاح کی وضاحت ہوئی۔ وراثت کے مسائل بیان ہوئے، حقوق اللہ اور حقوق العباد کا تذکرہ ہُوا اور خاص طور پر یتیموں کے حقوق کی حفاظت کی تاکید کی گئی۔ اہلِ کتاب کی قباحتوں کو بیان کر کے ان سے بچنے کی تلقین کی گئی، یہ سب تقویٰ ہی کی جزئیات ہیں پھر اسی ضمن میں دین کے دشمنوں کے ساتھ مقابلہ کا بیان ہے مخالفین کے ساتھ جہاد اور قتال بھی حصولِ تقوی ہی کا ذریعہ ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے اللہ کا حکم غالب آتا ہے، لہٰذا آج کی آیات سے جہاد کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے جس کے مضامین اور متعلقات آئندہ تقریباً چھ رکوع تک بیان ہونگے۔

دفاع کے لیے تیاری

ارشاد ہوتا ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے صاحبِ ایمان لوگو! خُذُوْا حِذْرَكُمْ اپنے بچاؤ کا سامان کر لو۔ حذر کا معنیٰ احتیاط ہوتا ہے، یعنی اپنی حفاظت کا بندوبست کر لو، کیونکہ اب دشمن سے ٹکر لینا ضروری ہو گیا ہے۔ بچاؤ یا دفاع کے سلسلے

میں جن جن ہتھیاروں یا دیگر لوازمات کی ضرورت پیش آتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اُن سب کو جمع کرنے اور اپنی قوی کو مجتمع کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس ضمن میں مفصل احکامات سورۃ انفال اور توبہ میں بیان ہوئے ہیں کیونکہ ان سورتوں کا موضوع ہی "اسلام کا قانونِ جنگ اور صلح" ہے۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ نے یہی حکم ان الفاظ کے ساتھ دیا ہے۔ "وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ" یعنی اپنی پوری طاقت کے ساتھ دشمن سے مقابلے کے لیے تیار رہو۔ وہاں پر گھوڑوں کا خاص طور پر ذکر کیا کہ اُس زمانے میں میدانِ جنگ میں سامان حرب کے علاوہ گھوڑوں کو بھی خاص اہمیت حاصل ہوتی تھی۔ حضور علیہ السلام کے فرمان کے مطابق اس زمانے میں تیراندازی بھی نہایت ہی موثر طریقہ جنگ تھا۔ چنانچہ تیراندازی سیکھنا ضروری اور سیکھ کر بھلا دینا یعنی اس کی مشق ترک کر دینا گناہ تھا۔ بہرحال من قوۃ میں حرب و ضرب کے تمام وہ ذرائع آجاتے ہیں جو جنگ کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ اُس زمانے میں تلوار، تیر، نیزہ وغیرہ تھے۔ اب گردشِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اوزارِ جنگ بھی تبدیل ہوتے ہیں۔ تیر تلوار کے بعد آتشیں اسلحہ ایجاد ہوا، بندوق آئی، پھر توپ بنائی گئی۔ بم تیار ہوئے اور پھر انہیں پھینکنے کے لیے تیز رفتار ہوائی جہاز ایجاد ہوئے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر راکٹ اور میزائل بنائے گئے جن کے ذریعے گھر بیٹھے دشمن پر وار کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال مقصد یہ ہے کہ دشمن سے نبرد آزما ہونے کے لیے جس جس زمانہ میں جس جس سامانِ دفاع کی ضرورت ہو، وہ سب جمع کر لو اور اپنی تمام قوتیں اور وسائل اس کام پر لگا دو۔

جدید ٹیکنالوجی کی ضرورت

خُذُوْا حِذْرَکُمْ میں یہ بات بھی آتی ہے کہ ہر زمانے میں کامیاب جنگ لڑنے کے لیے جدید ترین ٹیکنالوجی کا حصول بھی ضروری ہے۔ اس کے بغیر کوئی قوم دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس ضمن میں مسلم اقوام تقریباً گذشتہ چار سو سال سے انحطاط کا شکار ہیں۔ ترکوں نے بڑی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

اَب اِس دور میں جدید ترین جنگی ٹیکنالوجی برطانیہ، فرانس، جرمنی، روس اور امریکہ کے پاس ہے۔ انہوں نے بڑی کوشش اور محنت سے جدید ٹیکنالوجی حاصل کی ہے اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر خطرناک سے خطرناک اسلحہ تیار کر رہے ہیں۔ ایٹم بم پھینکنے کا واحد تجربہ امریکہ دوسری جنگ عظیم میں کر چکا ہے اب روس اور امریکہ کے درمیان دور مار میزائلوں کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ اور دنیا میں یہ خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ اب اگر عالمی جنگ چھڑ گئی تو اس قسم کے خطرناک ہتھیار دنیا کو تباہی کے منہ میں دھکیل دیں گے۔ اس کے مقابلے میں مسلم ممالک کی حالت زار یہ ہے۔ کہ بڑی طاقتوں سے بچے کچھے ہتھیاروں کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ اور انہیں یقین دلا رہے ہیں۔ کہ ہمیں فلاں فلاں سامان جنگ دے دو، کسی ضرورت کے وقت ہم بھی تمہارے ساتھ ہوں گے مگر غیر مسلم بڑی عالمی طاقتیں (SUPER POWERS) جدید ترین اسلحہ مسلم ممالک کو دینے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتیں، انہیں خطرہ ہے کہ یہ ہتھیار خود اُن کے خلاف بھی استعمال ہو سکتے ہیں۔ آج اسلامی دنیا کے پاس وسائل موجود ہیں مگر ٹیکنالوجی نہیں۔ وہ ذہنی طور پر مغلوب ہو چکے ہیں۔ بڑی طاقتوں نے انہیں غلام بنا رکھا ہے۔ اُن کے دل و دماغ پر ایسا جادو کر دیا ہے کہ اُن میں حریت کا مادہ ہی ختم ہو چکا ہے۔ آج اسلامی دنیا کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ سب مل کر اپنے وسائل جمع کر لیں اور جدید ٹیکنالوجی حاصل کریں اس کے ذریعے سامان دفاع تیار کریں تاکہ بوقت ضرورت دشمن پر بھرپور وار کیا جا سکے۔

سلف کے کارنامے

ہمارے اسلاف نے تمام ممکن ذرائع استعمال کیے اور جان پہ کھیل کر بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں۔ مصر کی فتح میں حضرت زبیرؓ نے عظیم قربانی پیش کی۔ قلعہ مضبوط تھا اور سر ہونے میں نہیں آتا تھا۔ آپ نے ساتھیوں سے کہا کہ مجھے ٹوکرے میں ڈال کر قلعے کی دیوار سے کسی طرح قلعے کے اندر پھینک دو کہ اب یہی ایک طریقہ باقی رہ گیا ہے۔ آپ کے ساتھیوں نے ایسا ہی کیا آپؓ نے قلعہ میں داخل ہوتے ہی اندھا دھند تلوار چلانی شروع کر دی۔ مصری سمجھے

کہ مسلمانوں کی پوری فوج قلعہ میں داخل ہوگئی ہے لہٰذا انہوں نے بھاگنے کے لیے قلعہ کے دروازے از خود کھول دیے۔ پروگرام کے مطابق مجاہدین قلعہ سے باہر منتظر تھے، جونہی دروازہ کھلا انہوں نے یکبارگی حملہ کر دیا اور اس طرح یہ مضبوط قلعہ فتح ہوا۔ یہی حضرت زبیرؓ ہیں جنہوں نے شامیوں کے ساتھ جنگوں میں اپنی بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ ایک ایک لاکھ دشمن کی صفوں میں تن تنہا گھس جاتے تھے۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق انہوں نے اپنے بیٹے عروہؒ سے کہا بیٹے! میرے جسم کی کوئی ایک انچ جگہ بھی زخم سے خالی نہیں۔ میں نے بڑی بڑی جنگیں لڑی ہیں، مگر شہادت نصیب نہیں ہوئی۔ موت تو آخر اپنے وقت پر ہی آئے گی۔ ایک موقع پر دشمن کا نیزہ آپ کے جسم سے آر پار ہو گیا، اگرچہ زخم مندمل ہو گیا مگر وہاں پر ایک گڑھا سا بن گیا تھا، جس میں ہاتھ ڈال کر عروہؒ بچپن میں کھیلا کرتا تھا۔

جنگی حکمتِ عملی

بہرحال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اپنی قوت، سرمائے اور دیگر وسائل کے ساتھ جنگ کی تیاری کرو۔ مسلمان مادی لحاظ سے اگرچہ کمزور ہیں تاہم اگر قوت ایمان بھی موجود ہو تو پھر بھی مسلمان ناقابل تسخیر ہوتا ہے مگر افسوس کہ مسلمان اس سے بھی محروم ہیں۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کا حکم یہی ہے کہ ایمان والو! اپنے دفاع کے لیے ہر مطلوبہ سامان مہیا کرو، جدید ترین آلات حرب سے لیس ہونے کی کوشش کرو اور پھر مناسب جنگی حکمت عملی کے تحت دشمن پر حملہ آور ہو۔ اور اس سلسلہ میں فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا نکل کھڑے ہو گروہوں کی صورت میں یا سب اکٹھے ہو کر۔ مقصد یہ ہے کہ موقع کی مناسبت سے خواہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں حملہ آور ہو یا یکدم پوری قوت اور لشکر جھونک دو۔ جس طریقے سے کامیابی کا امکان ہو، وہی طریقہ استعمال کرو۔ بعض اوقات کھلے عام ٹکر لینے کی بجائے گوریلا وار زیادہ مناسب حال ہوتی ہے ویٹ نامیوں نے امریکہ کے خلاف دس سال تک گوریلا جنگ لڑی جس میں تیس لاکھ آدمی ہلاک

ہوئے اور بالآخر امریکہ کو ویٹ نام سے جانا ہی پڑا۔ بہر حال فرمایا کہ پوری تیاری کے بعد مناسب طریقہ سے جنگ کا آغاز کرو۔

منافقین کی روش

جہاں اہل ایمان کو جنگ کی ترغیب دی جا رہی ہے وہاں منافقین کے نفاق کا پردہ بھی چاک کیا جا رہا ہے۔ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ اور تم میں سے بعض ایسے ہیں جو تاخیر کرتے ہیں۔ یعنی جب مجاہدین کی روانگی کا وقت آتا ہے تو منافق لوگ حیلے بہانے سے روانگی میں دیر کرتے ہیں تاکہ کسی طرح جنگ میں شریک ہونے سے بچ جائیں اور جنگ کے نتیجے میں ایسا بھی ہوتا ہے فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ اگر تم پر یعنی مسلمانوں پہ کوئی مصیبت آتی ہے۔ شکست آجاتی ہے یا جانی اور مالی نقصان ہو جاتا ہے، تو منافق کہتا ہے۔ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اللہ تعالیٰ نے مجھ پہ بڑا احسان کیا ہے اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا کہ میں ان مجاہدین کے ساتھ شامل نہیں تھا۔ اگر ان کے ساتھ جہاد میں شریک ہو جاتا تو مجھ پہ بھی وہی آفت آتی جو ان پہ آئی ہے۔ اور اگر اس کے برخلاف وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ تمہیں اللہ تعالیٰ کا فضل حاصل ہو جائے فتح حاصل ہو یا مال غنیمت ہاتھ آئے تو منافق کی حالت یہ ہوتی ہے۔ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ گویا تمہارے اور اُس کے درمیان دوستی کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ اُسے تمہاری کامیابی پر قطعاً کوئی خوشی نہیں ہوتی اور پھر بالکل اجنبی بن کر کہتا ہے يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ کاش کہ میں بھی مجاہدین کے ہمرکاب ہوتا فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا تو مجھے بھی بہت بڑی کامیابی حاصل ہوتی اور میں بھی ایمان والوں کے برابر مفاد حاصل کرتا

مسلمان بحیثیت جماعت

یہ تو منافق کا حال بیان کیا گیا ہے۔ مگر پکے سچے مسلمان کی حالت یہ ہے، کہ شکست ہو جائے یا کوئی دیگر نقصان ہو جائے تو ہر مسلمان کو اُس پہ دلی افسوس ہوتا ہے۔ اور اگر مسلمانوں کی جماعت کامران ہو جاتی ہے تو ہر مسلمانوں کو خوشی حاصل

ہوتی ہے کہ الحمدللہ ہماری جماعت کو کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر منافق ہمیشہ اپنے ذاتی نفع و نقصان پر نظر رکھتا ہے۔ مفاد حاصل ہوگیا تو خوش ہوگیا، ورنہ افسوس کرتے بیٹھ گیا۔ مسلمان اور منافق کے تقابل سے بتانا یہ مقصود ہے کہ مسلمان من حیث الجماعت ہی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ یَدُ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے، اُسے خداوند عالی کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے۔ اور جب جماعت کی بجائے انفرادیت پیدا ہوگی تو پوری قوم خودغرضی کا شکار ہو جائیگی اور تباہی کے کنارے پر پہنچ جائے گی۔ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ جو جماعت سے علیحدہ ہوگیا وہ جہنم رسید ہوگیا۔ انفرادیت کی جڑ خودغرضی ہوتی ہے اور جب انفرادیت آتی ہے تو جماعت اور ملت خراب ہو جاتی ہے۔ اور مسلمان بحیثیت قوم مغلوب ہو جاتا ہے۔

طبری نے لکھا ہے کہ قرونِ اولیٰ میں مسلمان ایک مضبوط قوم کی حیثیت سے زندہ تھے۔ جب جنگ کے نتیجے میں قید ہونے والے قیدیوں کا تبادلہ کیا جاتا تھا تو انہیں اختیار دیا جاتا تھا کہ وہ چاہیں تو کافروں کے ساتھ واپس چلے جائیں اور اگر وہ مسلمان ہو کر مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہونا چاہیں تو انہیں خوش آمدید کہا جائیگا۔ کہتے ہیں کہ اس طریقے سے اگر کوئی کافر قیدی مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جاتا تھا تو مسلمانوں کو اس قدر خوشی حاصل ہوتی تھی۔ گویا انہیں دنیا و مافیہا کی ہر چیز میسر آگئی۔ اور اگر کوئی ایک مسلمان بھی کفار کے ساتھ جا ملتا تھا تو مسلمانوں پر غم و اندوہ کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ ہماری ساری دنیا ہی لُٹ گئی ہے۔ مگر آج ہم دیکھ رہے کہ ہمارے اپنے ملک پاکستان میں کتنے لوگ دائرہ اسلام سے نکل کر عیسائیت اور مرزائیت کی آغوش میں جا چکے ہیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ آج ایسے واقعات سے ہمارے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ جب زیاں کا احساس تک باقی نہ رہے تو اس سے بڑھ کر بدبختی کیا ہو سکتی ہے۔

کامیابی کی کلید — مسلمانوں کو قعرِ ذلت سے نکالنے کے لیے فرمایا فَلْیُقَاتِلْ فِی

سَبِیْلِ اللّٰہِ پس چاہیئے کہ اللہ کے راستے میں لڑیں وہ لوگ اَلَّذِیْنَ یَشْرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَۃِ جو بیچتے ہیں دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے میں۔ مقصد یہ کہ اہل ایمان محض اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر جنگ میں کود جائیں۔ اُن کا یہ جہاد، دولت، شہرت اور سلطنت کے لیے نہیں بلکہ اللہ کے دین کی بلندی کے لیے ہونا چاہیئے۔ اِس مضمون کو سورۃ توبہ میں اسطرح بیان کیا گیا ہے۔ "اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ" اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور مال جنت کے بدلے میں خرید لیے ہیں۔ مومن مال اور جان کی بازی اس لیے لگاتا ہے کہ اُسے ایمان میں کمال حاصل ہو جائے، اور اس کی ذات میں قرآن کا اخلاق پیدا ہو جائے۔ وہ اس راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کرتا چلا جاتا ہے، یہی ایک مومن کی شان ہے۔ وہ اپنی جان و مال کا نذرانہ پیش کر کے عزیز و ابدی مقام جنت کا ٹکٹ حاصل کرتا ہے۔ اس راستے میں رکاوٹ ڈالنے والے یا تو ملوک ہوتے ہیں یا غلط قسم کے مولوی اور پیر یہی طاغوت ہیں۔ کیونکہ قرآنِ پاک کی اصطلاح میں ہر وہ طاقت طاغوت ہے جو ایمانی اور قرآنی اخلاق کی تکمیل میں رکاوٹ بنتی ہے۔

اجرِ عظیم

آگے فرمایا وَمَنْ یُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ جو کوئی اللہ کی راہ میں سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے۔ فَیُقْتَلْ تو خواہ وہ قتل کر دیا جائے یعنی شہید ہو جائے اَوْ یَغْلِبْ یا دشمن پر غالب آجائے۔ اللہ تعالیٰ فتح عطا کر دے، دونوں صورتوں میں فَسَوْفَ نُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا عنقریب ہم اُسے اجرِ عظیم عطا کریں گے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے۔ تَکَفَّلَ اللّٰہُ لِلْمُجَاھِدِیْنَ اللہ تعالیٰ نے مجاہدوں کو ضمانت دے رکھی ہے۔ کہ اگر شہید ہو گیا تو اُسے اللہ تعالیٰ بلند ترین مرتبے تک پہنچائیں گے اور اگر غازی بن کر آیا تو دنیوی اعتبار سے بھی مستحق اجر ہو گا کہ اسے مال غنیمت سے

حصہ ملیگا۔ جہاد اس قدر بلند مرتبہ چیز ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ذُرْوَۃُ سَنَامِہِ الْجِہَادُ یعنی اسلام کی بلندی جہاد میں ہے حدود اللہ جہاد کے ذریعے ہی قائم ہو سکتے ہیں۔ جب تک مسلمانوں میں جذبہ جہاد زندہ رہے گا، وہ غالب رہیں گے۔ جب ضرورت پڑے گی میدانِ جنگ میں کودنے سے دریغ نہیں کریں گے اور خود اپنے دفاع کو مضبوط رکھیں گے۔ اسی عمل میں ان کے لیے دنیا کی عزت اور آخرت کی فلاح ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ
مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَآ
أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا ۚ
وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا ۚ وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ
نَصِيرًا ﴿٧٥﴾ الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ۖ
وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ فَقَاتِلُوا
أَوْلِيَآءَ الشَّيْطَانِ ۖ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا ﴿٧٦﴾ ع ۱۰

ترجمہ :۔ اور تمہیں کیا ہے۔ کہ تم اللہ کے راستے میں نہیں لڑتے حالانکہ مردوں ، عورتوں اور بچوں میں سے کمزور کہتے ہیں ، اے ہمارے پروردگار ! ہمیں اس بستی سے نکال کہ اس کے رہنے والے ظالم لوگ ہیں اور بنادے ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی سرپرستی کرنیوالا ۔ اور بنا دے ہمارے لیے اپنی طرف سے مددگار ﴿۷۵﴾ ایمان والے لوگ لڑتے ہیں اللہ کے راستے میں اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ، وہ لڑتے ہیں طاغوت کے راستے میں ۔ پس اے ایمان والو! لڑو شیطان کے حمائیتوں سے ۔ بیشک شیطان کی تدبیر کمزور ہے ﴿۷۶﴾

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اللہ اور رسول کی اطاعت کو فرض قرار دیا۔ دُنیا اور آخرت کی کامیابی کا انحصار اطاعت ہی پر ہے۔ جن لوگوں کو اطاعت نصیب ہو جاتی ہے، اُن کے دین میں پختگی آجاتی ہے، اجرِ عظیم کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ اور پھر اللہ تعالےٰ

انہیں صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتا ہے اس کے نتیجے میں اطاعت گذار لوگوں کو آخرت میں انبیاء، اصدقا، شہدا اور صالحین کی رفاقت نصیب ہو جاتی ہے۔

معاملات کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ کفر و شرک کے علمبرداروں کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ پھر اہل ایمان کو خصوصی خطاب فرمایا خُذُوا حِذْرَكُمْ یعنی دشمن سے بچاؤ کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کر لو۔ اسلحہ جمع کر لو اور پھر جنگی حکمت عملی کے تحت خواہ گروہوں کی صورت میں دشمن پر حملہ آور ہو جاؤ یا پوری طاقت کے ساتھ یکبارگی ٹکرا جاؤ، حالات کے مطابق دونوں صورتیں روا ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دشمن کے مقابلہ سے گریز کرنے والوں کو منافقین کے زمرہ میں شمار کیا اور فرمایا کلمہ پڑھنے کے باوجود بعض لوگ منافق ہیں۔ فرمایا مقابلے میں اگر مسلمانوں کو نقصان ہو جائے تو منافقین خوش ہوتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اچھا ہوا ہم ان کے ساتھ شامل نہیں تھے، ورنہ ہم بھی مصیبت میں گرفتار ہو جاتے۔ برخلاف اس کے اگر مسلمان دشمن سے مقابلے میں کامیاب لوٹیں تو یہ لوگ کفِ افسوس ملتے ہیں، اور حسرت کے ساتھ کہتے ہیں کاش کہ ہم بھی مالِ غنیمت اور دیگر مفاد میں مجاہدین کے ساتھ شریک ہوتے۔

اب آگے اللہ تعالیٰ نے جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب دی ہے۔ اور فرمایا کہ اہل ایمان قرآنی اصولوں پر مبنی اخلاق اور آخرت کی فلاح کے لیے اپنی ہر چیز قربان کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ بوقتِ ضرورت جان کا نذرانہ بھی پیش کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ جہاد اور اس سے متعلقات کا سلسلہ آگے تقریباً چھ رکوع تک چلیگا۔ آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے دو باتوں کا بطور خاص ذکر فرمایا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ مومن محض اللہ کے راستے میں جہاد کرتا ہے، اس کے پیشِ نظر کوئی ذاتی مفاد ہرگز نہیں ہوتا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ مظلوموں کو ظلم سے نجات دلانا اہل ایمان کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔

جہادِ فی سبیل اللہ

ارشاد ہوتا ہے وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کہ تم اللہ کے راستے میں لڑائی نہیں کرتے۔ یہ پہلی بات ہے۔ فی سبیل اللہ کا ذکر قرآن پاک میں کثرت سے ملتا ہے۔ اور اس سے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ اہل ایمان کی دشمن کے ساتھ جنگ نہ کسی ذاتی مفاد کے لیے ہے، نہ ہوس ملک گیری ہے اور نہ نسلی، وطنی یا زبان کی بنیاد پر کسی کی مخالفت مقصود ہے، بلکہ جہاد فی سبیل اللہ کا واحد مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ اللہ کا دین تمام ادیان پر غالب آجائے اور اہل دنیا پر ثابت ہو جائے کہ "کَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا" ہر مقام پر اللہ کی بات کو ہی برتری حاصل ہے۔ اسی موضوع کو سورۃ فتح میں یوں بیان کیا گیا ہے "هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اُسے ادیانِ عالم پر غالب کیا جا سکے۔ چنانچہ جب تک مسلمان جہاد کے لیے کمربستہ رہے، کامیابی ان کے قدم چومتی رہی۔ حضرت عثمان رضؓ کی شہادت تک مسلمانوں میں جذبہ جہاد قائم تھا لہٰذا مسلمانوں کو ہر میدان میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ اُس وقت نہ کوئی فرقہ تھا، نہ پارٹی اور نہ اہل اسلام میں اختلاف رائے تھا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔ کہ حضور علیہ السلام کا اپنا زمانہ مبارک پھر شیخین حضرات ابوبکر صدیقؓ، اور فاروق اعظمؓ کا دورِ خلافت اور حضرت عثمانؓ کے ابتدائی چھ سال کا عرصہ تاریخ اسلام میں نمونہ کے طور پر محفوظ ہے۔ جو امور اس نمونہ کے مطابق انجام دیے جائیں گے، وہی درست ہوں گے، اس نمونہ سے ہٹ کر انجام پانے والے امور کی گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان جنگ صفین تک پچاس سال کے عرصہ میں مسلمان آدھی دنیا پر چھا گئے تھے، دلیل اور حجت کے اعتبار سے تو حق ہمیشہ غالب ہوتا ہے، تاہم مذکورہ پچاس سالہ دور میں اہل اسلام کو دنیا میں سیاسی غلبہ بھی حاصل تھا۔ اس لحاظ سے جہاد کو عبادت کا درجہ حاصل ہے فقہائے کرام باب باندھ کر سمجھاتے ہیں کہ عقیدے کی درستگی کے بعد نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد پانچ عبادات

فرض ہیں۔ عام طور پہ جہاد فرض کفایہ میں آتا ہے۔ جب مسلمانوں کا ایک گروہ جہاد کے لیے ہر وقت تیار ہو تو پھر تمام لوگوں پہ جہاد ضروری نہیں رہتا۔ اور بعض اوقات اگر حالات کا تقاضا ہو تو جہاد ہر مسلمان پہ فرض عین بھی ہو جاتا ہے۔

ان آیات میں اسی بات کی توجہ دلائی گئی ہے۔ کہ مسلمان بوقت ضرورت اللہ کی راہ میں کیوں نہیں لڑتے، دین حق کی تبلیغ کا فریضہ کتنے لوگ ادا کر رہے ہیں۔ ذاتی مفادات کے لیے کتنے لمبے لمبے سفر کیے جاتے ہیں مگر اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کیا کچھ کیا جا رہا ہے۔ کفر اپنی پوری قوت کے ساتھ اسلام کے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہے مگر مسلمان لہو ولعب اور کھیل تماشے میں مصروف ہے۔ وہ دین حق کو غالب کرنے کے سلسلے میں اپنا فرض ادا کرنے سے کیوں گریزاں ہے۔

جہاد کی راہ میں رکاوٹ

مولانا عبید اللہ سندھیؒ ہمارے انقلاب پسند اکابرین میں سے ہیں آپ انگریز کے سخت خلاف تھے۔ وہ آپ سے اس قدر خوفزدہ تھے۔ کہ حجاز کے قیام کے دوران مولانا کے پیچھے جاسوس بھیجتے تھے تاکہ معلوم کیا جا سکے ہمارے خلاف کیا تدبیر کر رہے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔ کہ جہاد کے راستے میں رکاوٹ بننے والا ہر فرد منافق ہے، خواہ وہ مولوی ہو یا پیر سلطان ہو یا بادشاہ، سرمایہ دار ہو یا دہریہ۔ فرماتے ہیں۔ کہ ملوک وسلاطین اکثر جہاد کے راستے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اور انہوں نے فی سبیل اللہ کا نظریہ ہی خراب کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک صحیح اور غلط کا کوئی معیار مقرر نہیں بیت المال کو باپ دادا کی جاگیر سمجھ کر اپنی من مانی کارروائیوں پہ صرف کرتے ہیں۔ انہوں نے دین کا نظام ہی درہم برہم کر دیا ہے اُن کی حمایت علمائے سوء کرتے ہیں، پیر انکی پشت پہ ہوتے ہیں۔ اور اس طرح وہ غلط ملط فتوے حاصل کر کے اپنے مذموم عزائم پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں اور اس طرح عوام بیچارے ظلم کی چکی میں پستے رہتے ہیں صاحب اقتدار اپنے اقتدار کی بقا کے لیے ہر جائز ناجائز کام کر گزرتا ہے اور پھر عالمی سطح پر اقتدار کی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ آج دنیا میں روس اور امریکہ کے درمیان کیا ہو رہا ہے، محض اقتدار کی ہوس ہے ہر کوئی دنیا میں اپنی چودھراہٹ چاہتا ہے

چین اور روس ایک ہی اشتراکی نظریہ کے حامل ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ دست وگریباں ہیں محض اقتدار کی بھوک ہے کہ کسی طرح دنیا میں برتری حاصل ہو جائے زیادہ سے زیادہ ممالک اُن کے ہمنوا ہو جائیں۔ یہ سب مادیت پرستی کا نتیجہ ہے۔ کافر مال و دولت اور اقتدار کے لیے جنگ لڑتا ہے۔ مگر ایک سچا مسلمان اللہ کے دین کی خاطر جہاد کرتا ہے۔ کفر و اسلام کا یہی طرۂ امتیاز ہے

نظریہ حق و باطل

تاریخ عالم پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ غیر اقوام محاذ جنگ پہ جانے والے سپاہیوں کے لیے عیاشی کے تمام سامان مہیا کرتی ہیں کیونکہ ان کا مقصد ملک گیری ہوتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں ہزاروں ٹن شراب سپاہیوں کو پلائی گئی، حتیٰ کہ انکی عیاشی کے لیے عورتیں بھی مہیا کی گئیں اس جنگ میں امریکہ کے جاپان پر حملہ کے نتیجے میں سوا لاکھ حرامی بچے پیدا ہوئے، اتنی کثیر تعداد میں جاپانی عورتیں امریکی سپاہیوں کی ہوس کا نشانہ بنیں۔ یہ کوائف تو صرف پیدا ہونے والے ناجائز بچوں کے ہیں۔ اس کے علاوہ کیا کچھ ہُوا، وہ تو اللہ ہی کے علم میں ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اُن عورتوں کے لیے انعامات کا اعلان کیا تھا جو فوجی سپاہیوں کی خوش طبعی کے لیے اپنے آپ کو پیش کریں دوسری طرف فی سبیل اللہ کا نظریہ ہے۔ کوئی بدکاری اور عیاشی نہیں محض اللہ کے دین کی سربلندی مطلوب ہے۔ جب محمد بن قاسم حملہ آور ہُوا تو ہندوؤں کی حسین ترین لڑکیاں استقبال کے لیے موجود تھیں مگر کسی سپاہی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ آخر کیا وجہ تھی اُن کا ایک ہی مشن تھا اور وہ یہ دین اسلام کو دنیا میں غالب کرنا ہے اور اُسکی تعلیمات کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچانا ہے۔ وہ جانتے تھے۔ کہ انھوں نے اتنا لمبا سفر اللہ کے دین کی خاطر کیا ہے، نہ کہ ذاتی مفاد اور نمود و نمائش کے لیے۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ دنیا کی خاطر جہاد کرنے والے اور اپنی پہلوانی کا سکہ بٹھلانے والے مجاہد کو اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ جاؤ تمہارے لیے میرے پاس کچھ اجر نہیں تم نے ریاکاری کے لیے جہاد کیا تھا، میری رضا مقصود نہ تھی، پھر حکم ہو گا کہ اسے اُٹھا

کہ جہنم میں پھینک دو۔

اغیار کے پروگرام

جوں جوں مسلمان جہاد کے فریضہ سے غافل ہوئے ہیں، غیر اقوام نے اسلام پر شب خون مارنا شروع کر دیا ہے۔ وہ تو کفر کے پروگرام کو دنیا میں غالب دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے کفار کی تمام طاقتیں مشترکہ طور پر کوشش کر رہی ہیں مسلمانوں کو عیسائی اور مرزائی بنایا جا رہا ہے۔ کچھ نیم عیسائی اور کچھ دہریہ ہو چکے ہیں سکول اور فری شفاخانے قائم کئے جا رہے ہیں اور خدمت خلق کی آڑ میں مسلمانوں کے ایمان پر ڈاکے ڈالے جا رہے ہیں اس کے برخلاف مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ اپنی تمام توانائیاں عیاشی اور فحاشی پر خرچ کر رہے ہیں۔ کھیل تماشے سے دل بہلا رہے ہیں۔ بڑی بڑی کاروں اور کوٹھیوں کی ریس لگی ہوئی ہے۔ ہر ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی دوڑ میں بھاگا جا رہا ہے۔ اغیار انہیں دین سے برگشتہ بنانے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ جہاد سے منہ موڑ چکے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ کہ عالمی سطح پر بڑی طاقتوں کے غلام بن چکے ہیں۔

رفع التظالم مظلوم کی مدد

نزول قرآن کے زمانے میں مسلمانوں کا ایک مظلوم طبقہ مکہ میں کفار کے ظلم وستم کی چکی میں پس رہا تھا مظلوم کو ظلم سے نجات دلانا جہاد کا دوسرا سبب ہے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں۔ کہ بیشک انبیاء کی بعثت کے مقاصد میں یہ بات داخل ہے، کہ رفع التظالم من بین الناس یعنی مظلومین کو ظلم سے نجات دلائی جائے، جس طرح دین حق کی تبلیغ انبیا کا فرض منصبی ہے اسی طرح ظلم کی بیخ کنی بھی ان کے فرائض میں داخل ہے۔[1] بخاری شریف کی روایت[2] میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے صحابہ سے جن امور کی بیعت لی تھی، ان میں عون الضعیف ونصر المظلوم یعنی کمزوروں کی اعانت اور مظلوم کی مدد بھی شامل تھی۔ چنانچہ فتاویٰ کی تمام کتابوں میں یہ مسئلہ موجود ہے کہ اگر کوئی ظالم مشرق میں کسی مسلمان عورت کو قیدی بنا لے تو مغرب کے سارے مسلمانوں پر فرض عائد ہو جاتا ہے۔ کہ وہ اس مظلوم کو رہا کرائیں، ورنہ سب گنہگار ہوں گے۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۳۳۷ [2] بخاری ص ــــ (فیاض)

آج دنیا میں لاکھوں مظلوم ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں مگر کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ گذشتہ تین سال میں دس لاکھ کابلی ہلاک ہو چکے ہیں دس ہزار زندہ باشندوں کو گڑھوں پر پھینک کر اوپر مٹی ڈال دی گئی اور وہ بیچارے زندہ درگور ہو گئے۔ ان پر ہونے والے ظلم کا جواب کون دے رہا ہے اُن کی تکلیف کا کس کو احساس ہے عالمی سطح پر کانفرنسیں تو ہوتی ہیں مگر اُن کے دکھ کا کیا مداوا ہو سکا ہے مسلمان ممالک ان کی کیا مدد کر پائے ہیں۔ محض بیان دینے سے کسی کی تکلیف رفع نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے عملی قدم اٹھانا ہو گا۔ جب مصریوں پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹے تو عالم اسلام نے کیا مدد کی۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے نہر سویز پر سوا لاکھ مصریوں کو ہلاک کر دیا، اربوں روپے کا مالی نقصان ہوا مگر کون پوچھنے والا ہے۔

کمزوروں کی امداد ہمارا جزوِ دین ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے لا تظلم ولا تظلم یعنی نہ خود کسی پر ظلم کرو اور نہ کسی کے ظلم کو برداشت کرو۔ آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے والا جذبہ مسلمانوں میں باقی نہیں رہا۔ امیر شکیبؒ نے اپنی کتاب "حاضر العالم الاسلامی" میں لکھا ہے۔ کہ جب اٹالین طرابلس میں مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھا رہے تھے تو میں نے اپنے قریب پچاس کے قریب ایسے نوجوان دیکھے جن کی شکل و صورت عربوں سے مشابہ نہ تھی۔ میں نے دریافت کیا، تم کون لوگ ہو۔ کہنے لگے ہم کابل سے اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کے لیے آئے ہیں۔ ظلم کے خلاف جذبہ انسانی ہمدردی انہیں کابل سے طرابلس لے گیا۔ مگر اب وہ چیز کہاں ؟

مکہ کے مظلوم مسلمان

ہجرت مدینہ کے بعد بھی مسلمانوں کا ایک کمزور طبقہ مکہ میں رہ گیا تھا جو ہجرت پر قادر نہیں تھے اور کفار کے ظلم کا تختہ مشق بنے ہوئے تھے۔ یہ کون لوگ تھے وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ یہ مردوں عورتوں اور بچوں پر مشتمل ایک نہایت ہی کمزور طبقہ تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں اور میری والدہ انہی لوگوں میں شامل تھے کافروں نے

انہیں زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا اور انہیں طرح طرح کی تکالیف دی جاتی تھیں سلمہ بن ہشام رض، ولید بن ولید رض اور ابوجندل رض وغیرہ بھی انہی لوگوں میں شامل تھے۔ قید و بند کے دوران یَقُوْلُوْنَ وہ یوں دعائیں کرتے تھے۔ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ الظَّالِمِ اَھْلُھَا اے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے باشندے ظالم لوگ ہیں اور ساتھ یہ بھی کہتے تھے۔ اے مولا کریم! وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا اپنی طرف سے ہمارا کوئی حمایتی بنا دے۔ جو ہمیں اس ظلم سے نجات دلا سکے۔ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ نَصِیْرًا اور اپنی طرف سے ہمارے لیے کوئی مددگار بنا دے۔ انہی حالات میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی توجہ اس طرف دلاتے ہیں کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کہ تم اللہ کی راہ میں قتال نہیں کرتے۔

آخر اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا قبول فرما لی۔ خود حضور علیہ السلام بھی مدینے میں اُن کے لیے دعائیں کرتے تھے اور نماز میں قنوت نازلہ پڑھتے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ قید سے آزاد ہو کر مدینے پہنچ گئے۔ حضور علیہ السلام نے قنوت نازلہ پڑھنی چھوڑ دی تو صحابہ نے عرض کیا کہ حضور! اب آپ قنوت کیوں نہیں پڑھتے فرمایا دیکھتے نہیں جن لوگوں کے لیے دعائیں کی جا رہی تھیں ان میں سے ابن ہشام رض ولید رض اور ابوجندل رض وغیرہ مدینہ پہنچ چکے ہیں۔ اور پھر جب مکہ فتح ہو گیا تو اللہ تعالےٰ نے اپنی طرف سے حمایتی بھی پیدا کر دیا۔ آپ نے ایک اٹھارہ سالہ نوجوان کو مکہ کا گورنر مقرر فرمایا۔ عتاب بن اسید رض بڑے ذہین اور سنجیدہ قسم کے انسان تھے۔ انہوں نے مظلوموں کی خوب مدد کی اور احسن طریقے سے امن و امان قائم کیا، اللہ نے اُن کی یہ دعا بھی قبول فرما لی۔

اللہ اور طاغوت کے راستے

آگے پھر وہی بات دہرائی جا رہی ہے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ جو اہل ایمان ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑائی کرتے ہیں، ان کا مقصود و مطلوب محض رضائے الٰہی ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے دین کو غالب کرنا

چاہتے ہیں۔ برخلاف اس کے وَالَّذِينَ كَفَرُوا کفار کا شیوہ یہ ہے کہ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ وہ طاغوت کے راستے میں لڑتے ہیں۔ اور طاغوت کا معنی ہی یہ ہے کُلُّ مَا اَضَلَّ عَنْ سَبِيلِ اللهِ ہر وہ طاقت جو اللہ کے راستے سے روکتی ہے، وہ طاغوت ہے۔ اس میں وہ ملوک سلاطین وغیرہ سب آجاتے ہیں جو اعلائے کلمۃ اللہ کے مخالف ہیں شیطان بذات خود طاغوت ہے اور اس کا یہی مشن ہے۔ اللہ نے اپنے تمام انبیاء پر یہی وحی بھیجی اَنِ اعْبُدُوا اللهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ یعنی اللہ کی عبادت کرو اور طواغیت کو چھوڑ دو۔ دنیا میں جو کوئی جہاں بھی کسی پر ظلم کا مرتکب ہوتا ہے طواغیت کی فہرست میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کا مقصد طاغوتی پروگرام کا غلبہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ اے ایمان والو! فَقَاتِلُوٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ شیطان کے دوستوں سے مقابلہ کرو۔ ان کے خلاف جہاد کرو کیونکہ وہ اس کے حمائتی ہیں اور کفر کے پروگرام کو غالب کرنا چاہتے ہیں۔ اور یاد رکھو ایمان والو! اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيفًا شیطان کی تدبیر بالکل کمزور ہے اگرچہ شیطان کے مکر و فریب کا جال بہت وسیع ہے مگر اللہ کے نزدیک اس کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ یوسف میں عورتوں کے مکر و فریب کے متعلق فرمایا اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ کہ تمہاری مکاریاں بہت زیادہ ہیں۔ شیطان عورتوں ہی کو اپنا جال بنا کر لوگوں کو گمراہ کرتا ہے لہٰذا وہ عورتوں سے بھی بڑا دھوکہ باز اور مکار ہے۔ تاہم اگر مومن صحیح راستے پر گامزن ہو جائیں۔ دین کے غلبے کے لیے کمربستہ ہو جائیں تو پھر اللہ ان کا حمائتی بن جائیگا۔ اور جس کا حمائتی خود اللہ بن جائے، شیطان اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اسی لیے فرمایا کہ شیطان کی تدبیر کمزور ہے۔ سورۃ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ "اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ"

اگر خدا تعالیٰ کی مدد تمہارے شاملِ حال ہو گی تو تم پہ کوئی غالب نہیں آسکتا اور اگر تمہاری بد عقیدگی اور بد عملی کی وجہ سے خدا تمہیں رسوا کر دے تو اس کے علاوہ کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ تم لاکھ دنیا کی طاقتوں پر بھروسہ کر و اس کا کچھ فائدہ نہیں ہو گا، تمہیں عزت و آبرو حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی حمایت اور مدد حاصل کرنے کے لیے صراطِ مستقیم پہ گامزن ہو جاؤ۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ
وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَآتُوا الزَّكَوٰةَ ج فَلَمَّا كُتِبَ
عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ
النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً ج وَقَالُوا
رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ج لَوْلَا أَخَّرْتَنَا
إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ط قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ج
وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ قف وَلَا تُظْلَمُونَ
فَتِيلًا ﴿۷۷﴾ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ
وَلَوْ كُنتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ ط

ترجمہ: کیا نہیں دیکھا آپ نے اُن لوگوں کو کہ اُن سے کہا گیا کہ روکو اپنے ہاتھوں کو اور قائم کرو نماز کو اور دیتے رہو زکوٰۃ پس جب فرض کی گئی اُن پر لڑائی، تو اچانک اُن میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو ڈرتے ہیں لوگوں سے، جیساکہ اللہ سے ڈرنا ہوتا ہے یا اس سے بھی زیادہ ڈر۔ اور اُن لوگوں نے کہا، اے ہمارے پروردگار! تو نے کیوں فرض قرار دے دیا ہے ہمارے اُوپر لڑائی کو۔ کیوں نہیں تو نے مؤخر کیا ہمیں تھوڑی مدت تک۔ اے پیغمبر! آپ کہ دیجئے، فائدہ دُنیا کا بہت تھوڑا ہے اور آخرت بہتر ہے

اس شخص کے لیے جو ڈرتا ہے ، اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا ایک دھاگے کے برابر بھی (۷۷) جہاں بھی تم ہو گے پالے گی تم کو موت ، اگرچہ ہو تم مستحکم قلعوں میں ۔

ربط آیات

یہ آیات بھی جہاد ہی سے متعلق ہیں اور یہ سلسلہ اس سورۃ مبارکہ میں دُور تک چلا جائے گا۔ گذشتہ رکوع کی ابتدار میں اہلِ ایمان کو اپنے دفاع کی تلقین کی گئی تھی اور حکم دیا گیا تھا کہ موقع کی مناسبت سے گروہوں کی شکل میں حملہ کرو یا یکبارگی پوری قوت میدان میں لے آؤ، دشمن کا مقابلہ بہر حال کرنا ہے۔ پھر جہاد سے اعراض کرنے والوں کا تذکرہ فرمایا کہ منافق لوگ حیلے بہانے سے جہاد میں شرکت سے گریز کرتے ہیں۔ اسبابِ قتال بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کا ایک مقصد تو اللہ کے دین کو غالب کرنا اور دوسرا مظلوموں کو ظلم سے نجات دلانا ہے۔ اس کے بعد جہاد کی غرض وغایت بیان فرمائی کہ اہلِ ایمان اللہ کے راستے میں، اُس کے دین کے قیام اور اُسے غالب بنانے کے لیے جنگ کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے کافر، مشرک، منکرِ دین و توحید شیطان کے راستے میں لڑتے ہیں۔ وہ دنیا میں شیطانی پروگرام کو غالب کرنا چاہتے ہیں۔ ملوکیت یا ڈکٹیٹر شپ اسی طاغوتی پروگرام کا حصّہ ہے۔ شیطانی پروگرام اللہ کے دین کی بجائے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین نافذ کرنا چاہتا ہے۔ جن کی بنیاد ملک گیری، نسل پرستی، زبان یا علاقائیت پر ہوتی ہے۔ اور مقصود مال و دولت، اقتدار اور شہرت ہوتی ہے۔ مسلمان صرف خدا کے دین کی بلندی کے لیے جہاد کرتا ہے اُس کے پیش نظر ہمیشہ كَلِمَةُ اللهِ هِيَ الْعُلْيَا ہوتا ہے۔ فتنہ و فساد کی بیخ کنی اور مظلوموں کی مدد اُس کا مطمح نظر ہوتا ہے۔ یہی عظیم مقصد انبیار علیہم السلام کی بعثت کے مقاصد میں بھی داخل ہے۔ بہر حال وہاں پر جہاد کی ترغیب اور اس راستے میں آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اور آج کی آیات میں جہاد کے مبادی کا ذکر کیا گیا ہے۔

جہاد کی عدم اجازت

مکّی زندگی کے تیرہ، چودہ سال اہلِ ایمان کو لڑائی کرنے کی اجازت نہیں تھی، کیونکہ اُس وقت مسلمان کمزور تھے اور ایسی حالت میں طاقتور دشمن سے مقابلہ مناسب حال نہیں

تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے اَلَمْ تَرَ کیا نہیں دیکھا تم نے اے مخاطب! یہ بات بعض گذشتہ دروس میں بھی بیان ہو چکی ہے کہ یہاں دیکھنے سے مراد رؤیت بصری نہیں بلکہ رؤیت قلبی ہے جس کی بنیاد علم پر ہوتی ہے۔ امام ابن جریرؒ اور بعض دوسرے اہل لغت نے بھی یہی فرمایا ہے کہ رؤیت ہمیشہ چشم دید ہی نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات یہ علمی رؤیت بھی ہوتا ہے۔ اس کی کئی ایک مثالیں پہلے بھی گذر چکی ہیں اور آئندہ بھی قرآن پاک میں آتی رہیں گی جیسے "اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ" (سورۃ بقرہ) یا سورۃ فجر میں یوں آتا ہے "اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ" سورۃ فیل میں بھی ہے "اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ" اسی طرح اس آیت میں بھی اَلَمْ تَرَ کا لفظ ہے۔ اور مقصد ان تمام کا رؤیت قلبی یا رؤیت علمی ہے نہ کہ عینی مشاہدہ۔

بہر حال فرمایا کیا آپ نے نہیں دیکھا اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ ان لوگوں کی طرف کہ جن کو کہا گیا كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ اپنے ہاتھ روک لو۔ ابھی دشمن کے مقابلے میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں۔ مکی دور میں ایمان والوں کو بڑی بڑی تکالیف برداشت کرنا پڑیں، وہ ان مصائب سے تنگ آکر دشمنان دین سے ٹکرا جانا چاہتے تھے مگر اللہ نے فرمایا کہ ابھی قتال کی اجازت نہیں ہے ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے فرمایا کہ اس امت میں میں اولین شخص ہوں جس نے ایک کافر پر ہاتھ اٹھایا۔ واقعہ یوں ہوا کہ حضور علیہ السلام اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کسی درے میں نماز ادا کر رہے تھے، کہ ایک کافر کو علم ہو گیا، وہ نماز کی حالت میں ہی مسلمانوں پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا۔ حضرت سعدؓ کے قریب ہی اونٹ کے جبڑے کی ہڈی پڑی تھی۔ آپ نے اٹھا کر کافر کے سر پر دے ماری جس سے اس کا سر زخمی ہو گیا اور وہ وہاں سے بھاگ گیا۔ تاہم مکہ کے قیام کے دوران صبر و تحمل ہی کی تلقین کی جا رہی تھی۔ مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا تھا۔ انہیں دو دفعہ ہجرت پر بھی مجبور کیا گیا، ان مہاجرین میں حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی شامل تھے، مگر

جلد ہی واپس آ گئے ۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ہاتھ روک رکھے تھے اور اس کے لیے مناسب موقع کا انتظار تھا۔

ابتدائی تربیت

کسی انقلابی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تربیت یافتہ جماعت کی تشکیل ضروری ہے۔ تربیت کے بغیر کام شروع کرنے سے کامیابی کے امکان روشن نہیں ہوتے۔ مکی دور میں اگرچہ مسلمان ظلم وستم کا نشانہ بن رہے تھے اور وہ کفار کا مقابلہ بھی کرنا چاہتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ انہیں میدان جنگ میں لانے سے پیشتر اُن کی تربیت کرنا چاہتا تھا تاکہ جب وقت اصل مقصد کی طرف رجوع کریں تو انہیں ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تربیت کے لیے یہ دو اصول بتائے " وَاَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ " یعنی نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ گویا یہ تمہارا تربیتی نصاب ہے جب ان پر کاربند ہو جاؤ گے تو تمہارے اندر ایک تربیت یافتہ جماعت تیار ہو جائے گی جو دشمن سے ٹکر لے سکیگی۔ سورۃ مزمل مکی زندگی کی ابتدائی سورتوں میں سے ہے وہاں بھی یہی بات سمجھائی گئی ہے " قُمِ الَّيْلَ " کہ آپ رات کو اُٹھ کر نماز پڑھا کریں تاکہ ابتدائی تربیت مکمل ہو سکے۔ جب یہ تربیت مکمل ہو جائیگی تو پھر جنگ کرنے کی اجازت بھی دیدی جائے گی۔ ساتھ یہ بھی فرمایا " لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا " معبود برحق اللہ کی ذات ہے اور اسی کو کارساز بناؤ تاہم اس کے ساتھ ساتھ ظاہری اسباب وعلل کی بھی ضرورت ہے۔ سامان ضرب و حرب بھی اکٹھا کرنا ہوگا، تاکہ دشمن پر بھرپور وار کیا جا سکے۔ اور اس ضمن میں فرمایا " خُذُوا حِذْرَكُمْ " اپنے دفاع کا سامان کر لو " وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ " بھی فرمایا کہ پوری طاقت کے ساتھ دشمن کے مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بہرحال مکی زندگی میں مسلمانوں کی تربیت پر ہی زور دیا گیا۔

عام مادی زندگی میں تربیت سے مراد فوجی تربیت ہوتی ہے۔ جس کا اہتمام دنیا کے تمام ممالک اپنی فوج کے لیے کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اولین تربیت یا ٹریننگ

وردی پہن کر خاص قسم کی ورزش یا پریڈ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ اسلحہ کے استعمال کی ٹریننگ ہوتی ہے مگر اس ٹریننگ کے ذریعے نہ تو تعلق باللہ پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی مظلوم کو ظلم سے نجات دلانے کا جذبہ۔ جب تک یہ دو چیزیں کسی قوم میں نہیں پائی جائیں گے، امن کا قیام ممکن نہیں۔ امریکہ اور روس جیسی بڑی طاقتیں دنیا میں امن قائم کیوں نہیں کر سکیں؟ وجہ یہی ہے کہ اُن کے تربیتی پروگرام میں وہ چیزیں شامل ہی نہیں جو امن وامان کا پیش خیمہ بن سکتی ہیں۔ ان سے قیام امن کی امید محض عبث ہے۔ یہ لوگ تربیت کے لیے لاکھ کالج اور یونیورسٹیاں بنا لیں، فوج جمع کر کے اسلحہ کے انبار لگالیں، مگر قیام امن کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ قرآن پاک کی اصطلاح میں یہ غیر مہذب لوگ ہیں، کیونکہ اللہ کے نزدیک مہذب وہ قوم اور جماعت ہوگی جو اس کے مقرر کردہ تربیتی نصاب کا کورس مکمل کرے گی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نماز قائم کرو، اس کے ذریعے تعلق باللہ قائم ہوگا۔ اور پھر زکوٰۃ دو کہ اس کے ذریعے تمہارے اندر مستحقین کے لیے جذبہ ہمدردی پیدا ہوگا۔ جب تم یہ تربیت مکمل کر لوگے، تو پھر اس قابل ہو جاؤ گے کہ دنیا سے ظلم وستم کا خاتمہ کر کے اللہ کے دین کو غالب کردو اور مظلوم کو ظلم سے نجات دلادو۔ ان دو اصولوں کے بغیر انسانی ہمدردی پیدا نہیں ہوسکتی، دنیا میں شر و فساد کا بازار گرم رہیگا، بدکاری اور عیاشی ہوگی اور نسل بگڑے گی، لہذا اللہ کے دین کے قیام اور دنیا میں امن وامان کے دور دورہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ تربیت کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ بہر حال مسلمانوں کی مکی زندگی اُن کے لیے تربیتی دور تھا تاکہ ابتدائی ٹریننگ حاصل کر کے جماعت المسلمین کو مضبوط بنایا جاسکے جو آگے چل کر دین کے غلبہ کے لیے عملی قدم اٹھا سکے۔

ام العبادات نماز

نماز انسان کی بدنی عبادت اور جامع العبادات ہے۔ نماز کو ام العبادات المقربہ الی اللہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ کا قرب دلانے والی عبادات کی جڑ اور بنیاد ہے یہ جماعت میں اتحاد فکر پیدا کرتی ہے مسلمانوں کو تنظیم اور ڈسپلن کا درس دیتی ہے

یہی نماز اجتماعیت، مساوات طہارت اور انسانی ہمدردی سکھاتی ہے۔ اللہ تعالے نے سورۃ حاقہ میں فرمایا ہے۔ کہ قیامت کے دن جب مؤاخذہ ہوگا، تو نافرمانوں سے پوچھا جائیگا کہ تم دوزخ میں کیسے پہنچے ہو، تو وہ کہیں گے۔ "اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ" پہلی بات تو یہ کہ خدائے عظیم پر ایمان نہیں تھا۔ اگر ایمان مضبوط ہوتا تو نماز ادا کرتا۔ اور دوسری بات یہ کہ مساکین کو خود کھانا کھلانا تو کجا کسی کو کھلانے کی ترغیب بھی نہیں دیتا تھا۔ گویا خدا کا بھی دشمن اور انسانی سوسائٹی کا بھی دشمن۔ سورۃ مدثر میں بھی اسی قسم کے الفاظ آتے ہیں کہ جب اہل جنت مجرمین سے پوچھیں گے کہ تم دوزخ میں کس طرح آگئے تو وہ کہیں گے "لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ" ہم نماز نہیں پڑھتے تھے "وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ" اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ بہرحال نماز ایک بنیادی عبادت اور اہل ایمان کی اولین تربیت کا ایک حصہ ہے مگر افسوس کا مقام ہے۔ کہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد عمر بھر نماز ادا نہیں کرتی۔ دس بیس سال گذر جاتے ہیں مگر نماز کا خیال تک نہیں آتا۔ دنیا کے باقی تمام امور شان و شوکت سے انجام دیے جاتے ہیں مگر خدا تعالیٰ کے حق کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ نجات تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، اگر ایمان موجود ہے تو ہو سکتا ہے کہ نجات حاصل ہو جائے مگر مجرم اور باغی ہونے میں تو کوئی شک نہیں۔

نماز تعلق باللہ کی استواری کا بہترین ذریعہ ہے انسان اس کے بغیر طہارت پر قائم نہیں رہ سکتا۔ جب کوئی شخص نماز میں مناجات کرتا ہے۔ قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے، تو گویا اللہ تعالیٰ کی صفت کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اسی لیے نماز میں قرآن پاک پڑھنے کا ثواب سب سے زیادہ ہے۔ نماز کے علاوہ قرآن پاک پڑھنے کا ثواب صدقہ خیرات سے بھی زیادہ ہے بلکہ نفلی روزے سے بھی تلاوت کا ثواب زیادہ ہے۔ قرآن پاک ایک ورد بھی ہے اور ہمارا مکمل پروگرام بھی۔ اس لحاظ سے نماز کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

زکوٰۃ کی ادائیگی

تربیت کا دوسرا جزو زکوٰۃ کی ادائیگی ہے۔ یہ بھی دور کے ابتداء میں ہی فرض ہو گئی تھی مگر اس کا نصاب مدنی زندگی کے دوسرے سال میں مقرر ہوا۔ مکی زندگی میں زکوٰۃ کی ادائیگی صرف اس حد تک تھی کہ اپنے مال کا کچھ حصہ غرباء، و مساکین اور دیگر نیکی کے کاموں پر خرچ کیا جائے۔ مالی عبادات میں سے زکوٰۃ اہم ترین عبادت ہے۔ کیونکہ یہ بنی نوعِ انسان کے ساتھ ہمدردی کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ سے تعلق مطلوب ہے۔ تو اس کی مخلوق کے حقوق ادا کرنا بھی لازم ہیں۔ اس لیے مالی عبادات میں زکوٰۃ سرِفہرست ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ توبہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ اگر یہ لوگ کفر و شرک سے تائب ہو کر ایمان میں داخل ہو جائیں تو پھر اُن کو دو لحاظ سے پرکھا جائے گا فَاِنْ تَابُوْا اگر وہ توبہ کر لیں وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ" اور نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ یہ بھی فرمایا "فَخَلُّوْا سَبِیْلَھُمْ" پھر اُن کا راستہ چھوڑ دو۔ یہ اب تمہارے بھائی ہیں۔ اب یہ تمہاری سوسائٹی کے رکن ہیں۔ ان کی جان و مال محفوظ ہے مقصد یہ کہ نماز اور زکوٰۃ ایمان لانے کی ظاہری علامات ہیں۔ انہیں علاماتِ فارقہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ انہی کے ذریعے مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کے ذریعے انسان کو دو فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اس میں پہلا فائدہ تو یہ ہے۔ کہ انسان کی اپنی تہذیبِ نفس ہوتی ہے۔ روحانی پاکیزگی اور طہارت حاصل ہوتی ہے۔ سورۃ آلِ عمران میں گزر چکا ہے "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" اپنی بہترین اور پسندیدہ چیز کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہی اصل نیکی ہے اس سے بخل جیسی رذیل خصلت دفع ہوتی ہے بخل بہت بڑی بیماری ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا اَیُّ دَاءٍ اَدْوَءُ مِنَ الْبُخْلِ[۱]

[۱] مسند احمد ص۳۰۸ ج۳ و کنز العمال ص۲۵۷ ج۳ (فیاض)

بخل سے بڑھ کر کونسی روحانی بیماری ہے۔ جو اس سے بچ گیا وہ کامیاب ہو گیا۔ فرمایا وَمَنْ يُّوقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ
فرمایا تہذیب نفس کے لیے زکوٰۃ کی ادائیگی نہایت ضروری ہے۔ کوئی انسان محض اچھے لباس، اچھے مکان اچھی سواری کے ذریعہ شائستہ اور مہذب نہیں بن جاتا بلکہ مہذب وہ ہے جسے شریعت مہذب قرار دے دے۔ اور وہ ایسا شخص ہے جس کے دل و دماغ میں رذائل کی جگہ پاکیزہ خصائل پیدا ہو جائیں اور یہ چیز زکوٰۃ کی ادائیگی سے بطریق احسن حاصل ہو جاتی ہے۔

امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کا دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایک انسان کا تعلق دوسرے انسان کے ساتھ درست ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مال دار کے مال میں یتیم، مسکین اور نادار کا حق رکھا ہے۔ فرمایا فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ جب تک اس حق کو ادا نہیں کرے گا، اللہ کے ہاں مجرم تصور ہو گا۔ حاصل کلام یہ ہے۔ کہ تہذیب نفس اور انسانی ہمدردی زکوٰۃ کے دو بڑے فوائد ہیں مگر آج مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ شادیوں پر لاکھوں روپے اڑا دیں گے۔ اپنی نام و نمود کی خاطر سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ مگر اللہ کی مقرر کردہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے لیت و لعل کرتے ہیں۔

لڑائی سے اعراض

مکی دور میں ایسے ایماندار بھی موجود تھے۔ جو کفار کے ظلم و ستم سے تنگ آکر اُن کے خلاف جہاد کرنے پر بھی آمادہ تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے روک دیا۔ کیونکہ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا وقت مقرر کر رکھا ہے، لہٰذا قبل از وقت کوئی کام انجام دینا مطلوبہ نتائج نہیں دے سکتا۔ پھر جب مسلمانوں کی ابتدائی تربیت مکمل ہو گئی، ایک مضبوط جماعت تیار ہو گئی جو دشمن سے ٹکر لے سکے۔ تو پھر فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ مدنی دور میں جب اُن پر لڑائی فرض کر دی گئی۔

اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ یَخْشَوْنَ النَّاسَ کَخَشْیَۃِ اللّٰہِ تو اُن میں سے ایک گروہ لوگوں سے اس طرح ڈرتا ہے جیسے اللہ سے ڈرنا چاہیئے اَوْ اَشَدَّ خَشْیَۃً یا اللہ کے خوف سے بھی زیادہ ڈرتا ہے مقصد یہ کہ اب جب کہ لڑائی لازمی قرار دے دی گئی ہے۔ تو ایک فریق کو یہ بات ناگوار گذرتی ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا گروہ ہے جو جہاد سے گریز کر رہا ہے۔ منافقین کے متعلق تو پہلے ہی بتایا جا چکا ہے۔ کہ جہاد کا اعلان ان پر گراں گذرتا تھا اور وہ ہر حیلے بہانے سے اس میں شرکت سے گریز کرتے تھے ابھی پچھلے رکوع میں گذر چکا ہے وَاِنَّ مِنْکُمْ لَمَنْ لَّیُبَطِّئَنَّ تم میں سے ایسے بھی ہیں جو پیچھے رہ جاتے ہیں یا تاخیر کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جہاد میں شرکت پر آمادہ نہیں ہوتے۔ تاہم اکثر مفسرین کرام جن میں امام ابومنصور ماتریدیؒ اور صاحب معالم التنزیل بھی شامل ہیں، فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جس فریق کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے مراد کمزور ایمان والے لوگ ہیں اگرچہ وہ منافق نہیں مگر اُن پر لڑائی گراں گذرتی ہے وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ کَتَبْتَ عَلَیْنَا الْقِتَالَ اور وہ کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! تو نے ہم پر لڑائی کیوں فرض کر دی ہے۔ زبان سے ایسا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دل سے لڑائی کو بُرا نہیں سمجھتے بلکہ اسکی مشکلات کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ اور اُن کی زبان سے بے ساختہ اس قسم کے الفاظ نکل جاتے ہیں

اور اگر خدانخواستہ جہاد پر اُن کا اعتقاد ہی نہیں رہا، تو انھوں نے ایک فرض کا انکار کر دیا اور مجرمین کی فہرست میں شامل ہو گئے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ بعض اوقات بات زبان تک بھی نہیں آتی بلکہ محض دل میں وسوسے پیدا ہوتے ہیں کہ شاید ہم دشمن کا مقابلہ نہ کر سکیں اور مغلوب ہو جائیں یا مارے جائیں اُسے حدیث نفس کہتے ہیں۔ اور یہ قابلِ مؤاخذہ نہیں ہے۔ تاہم ایسی باتوں کو جی میں نہیں لانا چاہیئے۔

پھر وہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ

اے اللہ! ہمیں کچھ مزید مہلت دے دی ہوتی تاکہ ہمیں دشمن سے مقابلہ نہ کرنا پڑتا کیونکہ اس میں مال و جان کا ضیاع ہے۔

دنیا بمقابلہ آخرت

لوگوں کے اس قسم کے خیالات کے متعلق حکم ہوا قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ دنیا کی زندگی کا فائدہ تو بالکل تھوڑا ہے۔ یہ زندگی کتنی لمبی ہو سکتی ہے، دس، بیس، پچاس یا سو سال، بالآخر کار ایک دن ختم ہونا ہے۔ تم زندگی کے اس معمولی سے فائدے کی خاطر آخرت کے اجر عظیم سے محروم ہونا چاہتے ہو۔ یاد رکھو! وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى خدا تعالیٰ سے خوف کھانے والے، کفر، شرک اور معصیت سے بچنے والے کے لیے آخرت بہتر ہے اس دنیا کی کچھ پروا نہیں۔ وہ جانتا ہے۔ کہ جسے آخرت میں بہتری حاصل ہو گئی، اُسے ابدی رحمت نصیب ہو گئی۔ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا اور تم پر ایک دھاگے کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائیگا۔ ایمان اور جہاد کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، اس لیے تم جہاد سے روگردانی کر کے اپنے اجر میں کمی کیوں کرتے ہو۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے یہ بات لطیف پیرائے میں بتا دی ہے۔ کہ دل میں برے وسوسے نہ آنے دو۔ اگرچہ ان کا مؤاخذہ نہیں ہے، پھر بھی حتی الامکان ان کو قریب نہ پھٹکنے دو، بلکہ جہاد پر کمربستہ ہو کر اللہ کی دائمی رحمت میں داخل ہو جاؤ۔

موت سے مفر نہیں

آگے فرمایا، یہ دنیا کی زندگی بالکل عارضی ہے۔ یہ بہر طور ختم ہونے والی ہے۔ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تمہیں پالے گی اور تم اس سے بچ نہیں سکتے۔ گذشتہ سورۃ میں بھی گذر چکا ہے۔ کہ اگر تم لڑائی میں شامل نہ بھی ہو۔ تو تمہارے پاس کیا گارنٹی ہے کہ تم ہمیشہ زندہ رہو گے۔ ہو سکتا ہے کہ جنگ میں شریک ہونے والوں سے پہلے تمہیں موت آجائے۔ جس چیز سے انسان بھاگتا ہے وہی اس کے پیش آتی ہے۔ موت کا فرشتہ تو بہر صورت پہنچ جائے گا وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ

اگرچہ تم مضبوط اور مستحکم قلعوں میں کیوں نہ بند ہو جاؤ۔ حضرت مولانا انور شاہ صاحب کاشمیریؒ فرماتے ہیں مضبوط دیواریں اور قلعے فرشتوں کے سامنے ہوا میں اڑنے والے پرندوں کی مانند ہیں۔ جس طرح پرندوں کو ہوا چیرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی اسی طرح ملک الموت اور دوسرے فرشتے بلا روک ہر مقام پر پہنچ جاتے ہیں لہٰذا تمہیں موت سے ہرگز خوف نہیں کھانا چاہیئے اور جہاد کے لیے ہمیشہ آمادہ رہنا چاہیئے۔

وَإِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۖ
وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِنْدِكَ ۚ
قُلْ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۖ فَمَالِ هَٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ
لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا ﴿٧٨﴾ مَا أَصَابَكَ
مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ۖ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ
سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ ۚ وَأَرْسَلْنَاكَ لِلنَّاسِ
رَسُولًا ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ﴿٧٩﴾ مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ
فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ۖ وَمَنْ تَوَلَّىٰ فَمَا أَرْسَلْنَاكَ
عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ﴿٨٠﴾

ترجمہ :- اور اگر پہنچے ان کو بھلائی تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر پہنچے ان کو کچھ برائی تو کہتے ہیں کہ یہ تیری طرف سے ہے (تیری وجہ سے ہے) اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے ، سب اللہ کی جانب سے ہے پس کیا ہے ان لوگوں کو نہیں قریب کہ یہ سمجھیں کسی بات کو ﴿٧٨﴾ جو پہنچتی ہے تجھ کو بھلائی پس وہ اللہ کی جانب سے ہوتی ہے اور جو پہنچتی ہے تجھ کو کچھ برائی ، پس تیرے نفس کی طرف سے ۔ اور بھیجا ہے ہم نے تجھ کو لوگوں کے لیے خدا کا پیغام پہنچانے والا اور کافی ہے

اللہ تعالیٰ گواہ (۷۹) جس شخص نے اطاعت کی رسول کی، بیشک اُس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے روگردانی کی تو نہیں بھیجا ہم نے آپ کو نگہبان بنا کر (۸۰)

ربط آیات

گذشتہ رکوع میں منافقین کے متعلق یہ بیان ہو چکا ہے۔ کہ بعض لوگ ایسے ہیں لَمَنۡ لَّيُبَطِّئَنَّ جو جہاد میں شامل ہونے کے لیے تاخیر کرتے ہیں یا بالکل شریک نہیں ہوتے انہوں نے بظاہر اسلام قبول کر رکھا ہے مگر ان کے دل ایمان سے خالی ہیں۔ گذشتہ درس میں بعض ایسے لوگوں کا ذکر ہوا تھا۔ جو قتال کو ناپسند کرتے ہیں اور وہ لوگوں سے اس طرح ڈرتے ہیں جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہیئے بلکہ اس سے بھی زیادہ خوف کھاتے ہیں اس سلسلہ میں مفسّرین کے دو قول ہیں۔ بعض فرماتے ہیں۔ کہ یہ آیت بھی منافقین کے بارے میں ہی ہے۔ جب تک جہاد فرض نہیں ہوا تھا، وہ اس سے بچے ہوئے تھے مگر جب یہ فرض ہو گیا۔ تو وہ گھبرانے لگے، بعض دوسرے مفسّرین کا خیال ہے کہ یہ آیت منافقین کے متعلق نہیں بلکہ کمزور مسلمانوں کے متعلق آئی ہے۔ جہاد ایک مشقت طلب کام ہے اور اس کی ناپسندیدگی ایک طبعی امر ہے، انسان عام طور پر کمزور واقع ہوا ہے اور اسی کمزوری کی وجہ سے جہاد سے ہچکچاتا ہے، تاہم یہ لوگ ایماندار ہیں۔ بعض کمزور دل لوگوں کے دلوں میں بھی وسوسے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ جنگ جیسے مشکل کام میں نہیں پڑنا چاہتے تو اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا کہ دُنیا کا ساز و سامان تو بالکل تھوڑا ہے اور اس کے مقابلے میں متقین کے لیے آخرت بہت بہتر ہے۔ دُنیا کی زندگی تو بالکل مختصر ہے، اصل تیاری تو آخرت کی دائمی زندگی کے لیے ہونی چاہیئے اور یہ زندگی اچھے اعمال سے ہو گی، لہٰذا جہاد اور دیگر اعمال صالحہ سے گریز نہیں کرنا چاہیئے۔ موت تو اپنے وقت پر بہرصورت آنی ہے تم اُسے مضبوط قلعوں میں بند ہو کر بھی نہیں ٹال سکتے، لہٰذا بزدلی کا اظہار مفید نہیں ہے۔ بلکہ آخرت کے حصول کے لیے بڑھ چڑھ کر کام کرنا چاہیئے، اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرما دی تاکہ اہلِ اسلام دین کے معاملہ میں کمزوری نہ دکھائیں۔

حسنہ اور سیئہ

آج کی آیات میں بھی یہودیوں اور منافقین کے بعض قبیح نظریات کا رد کیا گیا ہے یہ لوگ خیر اور شر کو مختلف ذرائع کی طرف منسوب کرتے تھے اس آیت کریمہ میں حسنہ اور سیئہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی اگر انہیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو اُسے اتفاقی قرار دیتے ہیں۔ اور کسی تکلیف کی صورت میں اللہ کے نبی کو الزام دیتے ہیں۔ مفسر قرآن امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ حسنہ اطاعت اور نیکی کو کہا جاتا ہے اور اس کا اطلاق اچھی حالت پر بھی ہوتا ہے اگر کسی کو نصیب ہو جائے۔ سرسبزی، دولتمندی صحت وغیرہ حسنہ میں شمار ہوتے ہیں قرآن کی زبان سے یہی دُعا سکھلائی گئی ہے۔ "رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً" اے اللہ! ہمیں دنیا میں حسنہ بہتری یا بھلائی عطا فرما، یعنی ایسی بہتر اور اچھی حالت عطا فرما جو تیرے نزدیک پسندیدہ ہو۔ برخلاف اس کے سیئہ سے مراد بری حالت، تنگدستی، پریشانی، قحط سالی، فقر و فاقہ، بیماری اور شکست وغیرہ کی حالت ہے۔ ان دونوں حالتوں کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کیا ہے۔ اور اس ضمن میں منافقین اور یہود کے نظریہ باطل کا پردہ چاک کیا ہے۔

نبی پر الزام تراشی

فرمایا وَاِنْ تُصِبْھُمْ حَسَنَۃٌ اور اگر اِن لوگوں یعنی یہود و منافقین کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے۔ خوشحالی، آسودگی یا فتح حاصل ہوتی ہے۔ یَّقُوْلُوْا ھٰذِہٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ منافقین اور یہود کا بھلائی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا فی الحقیقت اللہ تعالیٰ پر ایمان و یقین کا مظہر نہیں بلکہ ایسی بات وہ محاورے کے طور پر کہتے تھے کہ یہ ایک اتفاقی بات ہے جو اللہ کی جانب سے ہوگئی ہے اور دوسری طرف وَاِنْ تُصِبْھُمْ سَیِّئَۃٌ اگر ان کو کوئی مشکل پیش آجاتی ہے جنگ میں جانی اور مالی نقصان ہو جاتا ہے، کوئی بیماری یا تنگدستی آجاتی ہے قحط سالی کا شکار ہو جاتے ہیں یَّقُوْلُوْا ھٰذِہٖ مِنْ عِنْدِکَ تو پھر اللہ کے نبی کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ تکلیف تمہاری طرف سے آئی ہے۔ یعنی

یہ تکلیف تمہاری بے تدبیری یا العیاذ باللہ نحوست کی وجہ سے پہنچی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ یہود و منافقین بڑا شگون بھی لیتے تھے۔ قحط سالی واقع ہو گئی، بارش رک گئی، پھل کم آیا تو کہتے تھے۔ کہ یہ ان کی نحوست کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ پہلے ہم مدینہ میں بڑے خوشحال تھے۔ جب سے مسلمان یہاں آئے ہیں، ہم طرح طرح کے مصائب کا شکار ہو گئے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شگون کو ویسے بھی شرک سے تعبیر فرمایا ہے الطیرۃ من الشرک حالات کا اتار چڑھاؤ یا بناؤ بگاڑ تو اللہ کی مشیت اور ارادے سے ہوتا ہے۔ ان امور کی نسبت غیر اللہ کی طرف کرنا شرک ہے۔ الغرض! یہ لوگ اس قسم کے نظریات کا اظہار کر کے اپنی خباثت کا ثبوت فراہم کرتے تھے۔ اور نبی پر الزام تراشی کرتے تھے۔

بھلائی منجانب اللہ ہے

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زبان سے کہلوایا قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ آپ فرما دیجئے کہ ہر چیز اللہ ہی کی طرف سے ہے، کیونکہ حقیقی موجد تو وہی ہے اور اس کی قدرت اور مشیت کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا آسودگی ہو یا بدحالی، فتح ہو یا شکست، صحت ہو یا بیماری، ہر چیز کا خالق خدا تعالیٰ ہے، لہٰذا سب کچھ اسی کی جانب سے آتا ہے۔

منکرین کی بدبختی

فرمایا ان حقائق کے باوجود فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا یہ کوئی بات سمجھتے ہی نہیں۔ اس طرح یہود و منافقین کی مذمت بیان کی گئی ہے۔ کہ یہ لوگ کیسی الٹی باتیں کرتے ہیں۔ کوئی راحت پہنچے تو اسے اتفاقی امر کہتے ہیں اور تکلیف کا سامنا ہو تو اللہ کے رسول پر الزام دیتے ہیں۔ حالانکہ میدانِ احد میں جو نقصان اٹھانا پڑا، وہ اللہ کے رسول کی بے تدبیری کی وجہ سے نہ تھا۔ آپ نے تو بہترین جنگی منصوبہ بندی کی تھی، مگر بعض مجاہدین سے کوتاہی ہو گئی جس کی وجہ سے مسلمانوں کی فتح شکست میں تبدیل ہو گئی۔ لہٰذا اللہ کے نبی پر الزام نہیں لگانا چاہیئے۔ یہ بڑی قبیح بات ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتراض منصب انسانیت کے خلاف ہے اسی طرح رسولِ خدا پر اتہام سخت گستاخی اور بے ادبی ہے۔ یہ بات آیت کے

اگلے حصے ہیں سمجھائی گئی ہے۔ تاہم انسانوں کی تادیب کے لیے

فرمایا مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ آپ کو جو بھی بھلائی پہنچے تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے کسی انسان کا اپنا کمال ہرگز نہیں۔ اگر خدا کا فضل شامل حال نہ ہوتا تو نہ تم کو وجود ملتا اور نہ کوئی دوسری نعمت میسر آتی جیسا کہ اللہ نے فرمایا "وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً" (سورۃ لقمان) اُس نے تمہارے لیے ظاہری اور باطنی نعمتیں مکمل بنائی ہیں۔ "وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ" (سورۃ نحل) تمہیں جو بھی نعمت پہنچتی ہے، سب اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے۔ آرام و راحت، آسودگی خوشحالی سب اللہ کا فضل ہے۔

برائی از نفس انسانی

فرمایا وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ اور جو تم کو تکلیف یا برائی پہنچتی ہے تو انسان کا فرض ہے۔ کہ وہ اُسے اپنی کوتاہی پر محمول کرے۔ کہ ضرور ہم سے کوئی لغزش ہوئی ہے جس کی وجہ سے یہ مصیبت آئی ہے۔ کیونکہ ہر چیز کا خالق اور موجد تو اللہ ہے، البتہ اُس نے کسب کرنے کا اختیار انسان کو دیا ہے۔ اگر کوئی تکلیف پہنچے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اُس کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔ اور جب کوئی نعمت ملے تو سمجھ لینا چاہیے۔ کہ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی ہے وگرنہ ہم تو اُس کے بالکل مستحق نہ تھے۔ انسان کا جسم اور اس کے فائدے کی تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و رحمت سے عطا کی ہیں اور اگر کوئی مشکل پیش آئے تو وہ انسان کی اپنی کوتاہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

بخاری شریف کی روایت میں ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا، کہ انسان کو جو بھی برائی پہنچتی ہے، وہ اس کی کسی لغزش، کوتاہی یا گناہ کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ کافر کے متعلق تو یہ بات واضح ہے۔ کہ کفر اور نفاق بذاتہ بری چیز ہے۔ اس سے انسان کی عقل، روح اور دل ناپاک ہو جاتے ہیں اور کافر پہ اللہ کی لعنت برستی

رہتی ہے "لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ" اسی طرح مشرکین بھی ملعون ہیں۔ استسقا والی روایت میں آتا ہے کہ جب مومنین بارش کے لیے دعا کی خاطر باہر نکلیں تو کسی کافر کو ساتھ نہ لے جائیں کہ وہ ملعون ہے اس پہ خدا کی لعنت برستی ہے۔ لہذا خدا تعالی کی رحمت کو متوجہ کرنے کے لیے ایسے لوگوں کا ہمراہ ہونا درست نہیں۔ بہر حال فرمایا کہ کافر کو جو مشکل پیش آتی ہے وہ لازماً اس کی کوتاہی کا نتیجہ ہوتی ہے البتہ نیک لوگوں پہ مصیبت کا آنا، اُن کے گناہوں کی وجہ سے نہیں ہوتا، بلکہ یہ ایک نعمت ہوتی ہے جو اُن کی بلندیِ درجات کا ذریعہ بنتی ہے انبیاء علیہم السلام کے متعلق تو یہ بالکل واضح ہے کہ نہ ان سے حقیقی گناہ سرزد ہوتا ہے اور نہ ہی انہیں حقیقی سزا ملتی ہے۔ انہیں تکلیف ضرور پہنچتی ہے مگر وہ ان کے رفعتِ درجات کے لیے ہوتی ہے اور اس کے ذریعے اُن کی تربیت مقصود ہوتی ہے۔

ابرار کے لیے درجاتِ عالیہ

اِسی لیے انکی معمولی سے معمولی لغزش پر بھی گرفت آجاتی ہے۔ تو یہاں پر یہی بات سمجھائی گئی ہے اگر تمہیں بھلائی پہنچے تو اسے اللہ تعالی کا فضل سمجھو۔ اور اگر کوئی تکلیف آجائے تو ادب کا تقاضا یہ ہے کہ اُسے اپنی ذاتی کوتاہی پہ محمول کرو۔

وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ہم نے آپ کو تمام انسانوں (اور جنات) کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اللہ کا رسول حقیقت میں اپنی اطاعت نہیں کراتا بلکہ وہ اللہ تعالی کی فرمانبرداری کراتا ہے۔ رسول تو اللہ کا پیغام اسکی مخلوق تک پہنچاتا ہے اور خود بھی اس پہ عمل کرتا ہے تاہم آمر تو اللہ تعالے ہی ہے۔ یہاں پہ یہ نکتہ بھی سمجھا دیا کہ کسی شخص کے لیے روا نہیں کہ وہ خدا کے نبی کا معارضہ کرے یا اُس پہ الزام لگائے، انسانیت اور شرافت کا تقاضا ہے کہ انسان ہر مشکل کو اپنی کوتاہی پہ محمول کرے۔

خود احتسابی

گذشتہ سورۃ میں بھی یہ بات سمجھائی گئی تھی۔ کہ جب اُسے کوئی تکلیف پہنچے تو خود احتسابی کے عمل کے ذریعے اُس کی وجوہات تلاش کرے تاکہ کسی کہ وہ کوتاہی اور لغزش کا ازالہ کیا جا سکے۔ اس عمل کی واضح مثال جنگ قادسیہ کے موقع پر سامنے

آئی تھی۔ جب بعض محاذات پر مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا تو سالار لشکر حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ نے مجاہدین کو جمع فرمایا اور کہا کہ لوگو! ہمیں بعض محاذوں پر شکست کا سامنا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض آدمیوں کے دلوں میں خودغرضی پیدا ہو گئی ہے، وہ مفاد پرستی کا شکار ہو چکے ہیں۔ اگر ایسی بات ہے تو اللہ تعالیٰ کے روبرو توبہ کرو۔ اپنی لغزشوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگو۔ لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ اپنے دلوں سے تمام کدورتیں صاف کر دیں۔ پھر تین دن رات متواتر جنگ ہوئی اور اللہ کی مدد سے یہ عظیم معرکہ سر ہوا اور ایران فتح ہو گیا۔

تفقہ فی الدین

بہرحال ان تمام حقائق کو بے نقاب کرنے کے بعد فرمایا کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ کہ یہ بات کو نہیں سمجھتے۔ یہاں پر یَفْقَھُوْنَ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا معنی سمجھ، بوجھ اور فقاہت ہے۔ یہ لفظ متعدد احادیث میں بھی آتا ہے۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حق میں دعا فرمائی اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْکِتٰبَ وَفَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ اے اللہ! اس بچے کو قرآن پاک کا علم اور دین میں سمجھ عطا فرما۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور حضرت عبداللہ کو قرآن کا وسیع علم اور فقاہت فی الدین عطا فرمائی۔ آپ نے ہزاروں لوگوں کو قرآن پاک کی تعلیم دی۔ بخاری شریف کی روایت[2] میں آتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا مَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا یُّفَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے، اُسے دین میں سمجھ عطا کرتا ہے ایسے شخص پر اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی ہوتی ہے۔ مسند احمد شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا تو ہر اُس شخص کو دیتا ہے جسے وہ پسند کرتا ہے یا ناپسند کرتا ہے مگر یُؤْتِی الدِّیْنَ مَنْ اَحَبَّ دین کی سمجھ اسی کو عطا کرتا ہے جسے وہ محبوب سمجھتا ہے۔

علم فقہ اور فقہائے کرام

قرآن و سنت میں تحقیق کا نام فقہ ہے۔ یہ ایک بلند پایہ چیز ہے جس میں ہزاروں کتابیں موجود ہیں اور اس سے مراد دین کی سمجھ ہے۔ جس طرح لوگ سائنس اور دیگر

---

[1] مسلم ص۲۹۸ ج۲ [2] بخاری ص۱۶ ج۱ (فیاض)

علوم میں ریسرچ کر کے اس علم کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اسی طرح قرآن وسنت میں ریسرچ کر کے اس علم کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اسی طرح قرآن وسنت میں ریسرچ کا نام فقہ ہے۔ تحقیق کنندگان (RESEARCH WORKERS) اس کے ذریعے قرآن وسنت سے استنباط کر کے نئے نئے مسائل کا حل پیش کرتے ہیں اور نئی نسلوں کے لیے دین کی سمجھ کے لیے آسانیاں پیدا کرتے ہیں۔

جن لوگوں نے قرآن وسنت میں تحقیق کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اُن میں امام بخاریؒ اور امام سفیان ثوریؒ بھی شامل ہیں مگر اُن کی فقہ امام ابوحنیفہؒ کے مقابلے میں کمزور تھی کسی پوچھنے والے نے پوچھا کہ امام سفیان ثوریؒ بڑے فقیہ ہیں یا امام ابوحنیفہؒ۔ تو جواب دینے والے نے کہا کہ سفیان ثوریؒ مُتَفَقِّہ ہیں، یعنی آپ بہ تکلف فقیہ ہیں جب کہ امام اُبوحنیفہؒ حقیقی فقیہہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی طبیعت میں فقاہت کا ایسا وافر مادہ رکھ دیا، جو کسی دوسرے کے حصے میں نہ آسکا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ اَلنَّاسُ عَیَالٌ عَلٰی اَبِیْ حَنِیْفَۃَ یعنی فقہ کے معاملہ میں باقی سب لوگ امام اُبوحنیفہ کے بچے ہیں۔ ان سب نے امام صاحب سے ہی فقہ کا علم سیکھا

بعض لوگ نادانی یا تعصب کی وجہ سے کہتے ہیں۔ کہ امام اُبوحنیفہؒ حدیث کو نہیں مانتے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ قرآن وسنت ہی فقہ کے اصل ماخذ ہیں اور ان کے بغیر تو اجتہاد ممکن نہیں ہے۔ لہذا حدیث کو ترک کر کے کوئی شخص فقیہہ کے منصب پر کیسے فائز ہوسکتا ہے۔ آپ کو ہزارہا احادیث یاد تھیں، قرآن اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا جن کی بناء پر وہ اجتہاد کرتے تھے آپ کے شاگردوں نے بھی یہ فریضہ انجام دیا اور فقہ حنفی کے بارہ لاکھ مسائل مدون کیے۔ اگر آپ کے بیان کردہ بعض مسائل درست نہیں ہیں تو انہیں چھوڑ دیا جائے گا، ان پر عمل نہیں کیا جائیگا بعض غلط باتیں تو حدیث کی کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ لہذا امام صاحب کی بعض اغلاط کو بنیاد بنا کر فقہ کا انکار کرنا درست نہیں۔ غلطی سے پاک تو صرف نبی کی ذات ہے۔ کوئی انسان اس سے محفوظ نہیں لہذا انصاف کا تقاضا یہ ہے۔ کہ ہر درست

بات کو تسلیم کر لیا جائے اور نادرست کو ترک کر دیا جائے۔ بہر حال امام ابو حنیفہ رح کو اللہ تعالیٰ نے بلند فہم عطا کیا تھا۔ عبادت و ریاضت میں بھی آپ کا کوئی مقابلہ نہیں آپ نے اپنی تحقیق کے ذریعے قرآن و سنّت کے سمجھنے میں آسانی پیدا کی۔ حضور علیہ السلام کی احادیث مبارکہ کو فقہ کی صورت میں سہل کیا جس کو لوگوں نے دستور العمل بنا لیا۔

الغرض فرمایا کہ ان منافقین اور یہودیوں کو کیا ہو گیا ہے۔ کہ یہ حقیقت کو سمجھنے کی بجائے نبی کی ذات پر الزام تراشی کرتے ہیں اور اپنی کوتاہی کو تسلیم نہیں کرتے۔ فرمایا ہم نے آپ کو رسول بنا کر سب لوگوں کی طرف بھیجا ہے۔ انہیں آپ کی اتباع کرنی چاہیئے۔ اور اگر یہ اپنی ہٹ دھرمی پر مصر ہیں تو فرمایا وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا اللہ تعالیٰ کافی گواہ ہے وہ سب حالات کو دیکھ رہا ہے اور ان منکرین سے خود ہی نپٹ لیگا۔

رسول کی فرمانبرداری

فرمایا مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ جس نے رسول کی فرمانبرداری کی، حقیقت میں اُس نے اللہ ہی کی فرمانبرداری کی کیونکہ رسول خود آمر نہیں ہوتا بلکہ اُس کا کام احکام الٰہی لوگوں تک پہنچانا ہوتا ہے۔ وہ مبلغ ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے اوامر پہنچانے کا قطعی ذریعہ ہوتا ہے۔ اس واسطے اُس کی اطاعت ضروری ہوتی ہے۔ اور اس سے جھگڑا کرنا اور اس پر الزام لگانا قبیح فعل ہے۔

فرمایا وَمَنْ تَوَلّٰى جس نے رسول کی اطاعت سے روگردانی کی۔ فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ہم نے آپ کو ان پر کوئی نگہبان یا داروغہ بنا کر تو نہیں بھیجا۔ آپ کا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے ان کو پکڑ پکڑ کر راہِ راست پر لانا آپ کا کام نہیں ہے اِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ باقی ان لوگوں کی گرفت کرنا اور انہیں سزا دینا ہمارا کام ہے۔ ہم انہیں مقررہ وقت پر پکڑ لیں گے۔ کیونکہ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا سب کچھ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہے۔ شہید کا معنیٰ گواہ یا دیکھنے والا ہوتا ہے۔ کسی جگہ وکیل

کا لفظ آیا ہے۔ کہیں ولی فرمایا ہے۔ کہ سب اللہ کی صفات ہیں۔ آپ اُن پر داروغہ نہیں ہیں۔ آپ تو اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور نامرضیات کو پہنچانے والے ہیں۔ روگردانی کرنیوالوں سے اللہ تعالیٰ خود نپٹ لے گا۔

وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِندِكَ بَيَّتَ
طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ وَاللَّهُ يَكْتُبُ
مَا يُبَيِّتُونَ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ
وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ﴿٨١﴾ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ
مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا
كَثِيرًا ﴿٨٢﴾

ترجمہ: اور کہتے ہیں یہ لوگ کہ ہمارا معاملہ اطاعت کا ہے پھر جب وہ نکلتے ہیں آپ کے پاس سے تو رات کے وقت اُن میں سے ایک گروہ مشورہ کرتا ہے اس کے خلاف جو آپ کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ لکھتا ہے جو کچھ وہ مشورہ کرتے ہیں۔ پس آپ اُن سے اعراض کریں اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کریں۔ اور کافی ہے اللہ تعالیٰ کام بنانیوالا ﴿٨١﴾ کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا، تو البتہ وہ ضرور پاتے اس میں بہت سا اختلاف ﴿٨٢﴾

ربط آیات

گذشتہ درس میں منافقین اور یہود کا یہ رویہ بیان ہوا کہ جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس کا الزام حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر لگاتے ہیں۔ کہ آپ کی بے تدبیری کی وجہ سے ایسا ہوا ہے یا پھر بُرا شگون لیتے ہیں کہ حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہ کی مدینے آمد کی وجہ سے اُن پر نحوست پڑی ہے (العیاذ باللہ) اللہ نے فرمایا یہ دونوں

باتیں غلط ہیں شگون لینا تو ویسے ہی شرک ہے۔ کسی کے آنے یا جانے سے نفع یا نقصان نہیں ہوتا کیونکہ ہر چیز کا خالق اور موجد تو اللہ تعالیٰ ہے۔ البتہ انسانوں کو یہ ادب سکھایا گیا ہے کہ جب انہیں کوئی راحت پہنچے تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے اور جب کوئی تکلیف پہنچے تو اسے اپنی کوتاہی پر محمول کرنا چاہیئے۔ پھر فرمایا ان منافقین کو کیا ہو گیا ہے لَا یَکَادُوْنَ یَفْقَھُوْنَ حَدِیْثًا یہ بات کو سمجھتے ہی نہیں۔ ویسے ہی الٹی سیدھی ہانکتے جاتے ہیں۔ اگر یہ معاملہ کو سمجھتے اور اس کی تہ تک پہنچ جاتے تو اللہ کے رسول پر الزام تراشی نہ کرتے۔ مگر منافق ہمیشہ بے عقل ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا خَصْلَتَانِ لَا یَجْتَمِعَانِ فِیْ مُنَافِقٍ دو خصلتیں منافق میں جمع نہیں ہو سکتیں فرمایا حُسْنُ خُلُقٍ وَلَا فِقْہٌ فِی الدِّیْنِ یعنی حسنِ اخلاق اور دین کی سمجھ۔ منافق ان چیزوں سے خالی ہوتا ہے اسی لیے پیغمبر کی ذات پر اعتراض کرتا ہے۔

گذشتہ درس میں یہ بھی بیان ہو چکا ہے۔ کہ اللہ کے رسول کی اطاعت بعینہٖ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ کیونکہ اللہ کا رسول آمر نہیں ہے۔ آمر تو خدا تعالیٰ کی ذات ہے، رسول تو مبلغ ہوتا ہے۔ جو اللہ کا پیغام، دین اور شریعت لوگوں تک پہنچاتا ہے اور خود بھی اس پر عمل کر کے نمونہ پیش کرتا ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ ان حقائق کے باوجود منافقین آپ سے اعراض کریں تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں، کیوں کہ آپ ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ ان کے اس بغض، عناد اور ہٹ دھرمی کے متعلق اللہ تعالیٰ خود ان سے باز پرس کرے گا۔

قول و فعل کا تضاد

اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی ایک اور بری خصلت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اور آپ کو تسلی دی ہے۔ کہ آپ فکر مند نہ ہوں بلکہ ان سے اعراض کریں ارشاد ہوتا ہے وَیَقُوْلُوْنَ طَاعَۃٌ ان منافقوں کا حال یہ ہے کہ جب آپکی مجلس میں آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہمارا معاملہ تو اطاعت کا ہے، آپ جو کچھ فرما دیں ہم اس کی اطاعت کریں گے۔ مگر فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِکَ جب آپ

سے نکل کر چلے جاتے ہیں بَیَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ اُن میں سے ایک گروہ رات کو مشورہ کرتا ہے، اُس کے خلاف جو بات آپ نے کہی ۔ بیت کا معنی گھر ہوتا ہے ۔ بیتوتت رات گزارنے کو کہتے ہیں کیونکہ رات عموماً گھر میں گزاری جاتی ہے ۔ اور تبییت رات کے وقت مشورہ کرنے کو کہتے ہیں ۔ منافقین کی یہ روش بیان کی جا رہی ہے ۔ کہ جب تک آپ کے ہاں بیٹھے رہتے ہیں، آپ کی فرمانبرداری کا اقرار کرتے ہیں ۔ پھر جب اُٹھ کر چلے جاتے ہیں ۔ تو رات کو علیحدگی میں آپ کے مشن کے خلاف مشورہ اور منصوبہ بندی کرتے ہیں ۔ کہ اسلام اور اہل اسلام کو کس طرح نقصان پہنچایا جائے ۔ اپنی انہی سازشوں کی وجہ سے منافقین اسلام کے خلاف خطرناک ترین گروہ تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُن کی سازشوں کو وقتاً فوقتاً بے نقاب کیا اور انہیں سخت سزا کی وعید سنائی ۔ مذکورہ سازش کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ منافقین جو کچھ مشورہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُس کو لکھتا ہے ۔ یعنی اُس کے فرشتے اُن کی ہر ہر حرکت کو نوٹ کر رہے ہیں ۔ پھر قیامت کے دن یہی نوشتہ ان کے سامنے کر دیا جائے گا ۔ اُس دن تمام راز فاش ہو جائیں گے اور منافقین سخت سزا کے مستحق ٹھہریں گے ۔ کراماً کاتبین تو ہر شخص کا ہر قول و فعل متواتر نوٹ کر رہے ہیں ۔ اور ان میں منافقوں کی سازشیں بھی شامل ہیں ۔ پھر یہی نوشتہ اعمال نامہ کی صورت میں اُن کے گلے میں لٹکا دیا جائے گا ۔

اللہ نے فرمایا کہ ان لوگوں کی تمام تر کرتوتوں کے باوجود فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ آپ اُن سے اعراض کریں، اُن کی طرف توجہ نہ کریں ۔ اور یہاں اشارتاً یہ بھی سمجھا دیا کہ منافقین یہ نہ سمجھیں کہ اُن کا راز فاش نہیں ہوا ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو بوقت ضرورت آگاہ کرتا رہتا ہے پیغمبر خود تو عالم الغیب نہیں مگر اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے ۔ اپنے نبی کو غیب پر مطلع کر دیتا ہے ۔ قرآن پاک میں متعدد مقامات پر موجود ہے کہ اللہ نے پیغمبر علیہ السلام کو وحی کے ذریعے بہت سی باتیں بتلا دیں ۔ تو یہاں بھی مقصود

یہی ہے ۔ کہ آپ فکر نہ کریں ، ہم وقت مقرر پر ضرور ان کو پکڑ لیں گے اور پھر انہیں اپنے کیے کی سزا بھگتنا ہو گی ۔

توکل برخدا

فرمایا آپ منافقین کی طرف توجہ نہ فرمائیں بلکہ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ رکھیں ۔ کیونکہ مومن کی شان یہی ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا عَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ یعنی بھروسہ رکھنے والے فقط خدا تعالیٰ کی ذات پر ہی بھروسہ رکھتے ہیں ۔ نیز یہ بھی متعدد مقامات پر آیا ہے وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ یعنی اہل ایمان اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں ۔ یہاں بھی پیغمبر علیہ السلام کو یہی نصیحت کی جا رہی ہے ۔ کہ آپ منافقین کی سازشوں سے پریشان نہ ہوں بلکہ اللہ پر بھروسہ رکھیں وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا کارساز اللہ ہی کافی ہے ۔ وکیل کا معنیٰ کام بنانے والا ہوتا ہے ۔ ہر چیز تو قبضہ قدرت میں ہے لہٰذا منافقوں کی سکیمیں کامیاب نہیں ہو سکتیں ۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو ضرور غالب کریگا ۔ اس پر پختہ یقین ہونا چاہیئے ۔ سورۃ مزمل میں بھی اسی طرح فرمایا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ، لہٰذا کارساز بھی اُسی کو پکڑو ، کام بنانے والا وہی ہے ۔ منافقوں کی چالوں کو وہی ناکام بنائے گا ۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے منافقین کی سازشوں کا علاج یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ رکھیں اور اپنا کام کرتے جائیں ۔

تدبر فی القرآن

آگے اللہ تعالیٰ نے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ منافقین کی یہ تمام قبیح حرکات قرآن پاک میں غور و فکر کے فقدان کی وجہ سے ہیں ۔ اگر یہ اللہ کے پاک کلام قرآن پاک کو پڑھتے ، اُسے سمجھتے اور پھر اُس پر عمل کرتے تو نبی کی ذات کے متعلق شکوک و شبہات میں نہ پڑتے ۔ اسی لیے فرمایا اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ یہ لوگ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے ۔ اللہ کا رسول دین کا پروگرام تو قرآن پاک کی شکل میں پیش کرتا ہے ، پھر اس کی تشریح اور وضاحت بھی کرتا ہے ، اُس پر عمل کر کے خود نمونہ بھی بنتا ہے ۔ اگر یہ قرآن میں غور کرتے

تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور دین کے پروگرام کے متعلق ان کے تمام شبہات دور ہو جاتے۔ اُنہیں قرآن کی حقانیت کا یقین آجاتا، وہ جان لیتے یہ اللہ کا کلام اور اُس کی پاک صفت ہے، یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔ اس میں پیش کردہ نظام تمام عیوب سے پاک ہے۔ یہ چیزیں قرآن میں غور و تدبر کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہیں۔ مگر یہ لوگ قرآن پاک کی طرف متوجہ ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دیدہ و دانستہ اللہ کے دین سے اعراض کر رہے ہیں۔ اگر ایسا کسی غلطی سے ہوتا تو علیحدہ بات ہے، انسان کی غلط فہمی کبھی نہ کبھی دور ہو جاتی ہے۔ مگر یہ تو ازلی ابدی عنادی ہیں۔ ان کا منتہائے مقصود مخالفت برائے مخالفت ہے، لہٰذا پیغمبر علیہ السلام کو درگزر کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

قرآن پاک میں غور و فکر ہر انسان کے لیے اپنے درجے میں ضروری ہے مجتہدین اور علمائے کرام بھی اس میں تدبر کرتے ہیں۔ مجتہدین ایک ایک آیت سے ہزاروں مسائل استنباط کرتے ہیں اور علماء اُن کی تصدیق کرتے ہیں۔ اُن کے فہم میں بھی اضافہ ہوتا ہے البتہ عوام کا تدبر اتنا ہی ہے کہ وہ قرآن پاک کے معانی ہی سمجھ لیں۔ اس سے اُن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور محبت پیدا ہوگی۔ جو ایمان کی جڑ ہے تو گویا ہر ایک کے لیے قرآن میں غور و فکر کرنا ضروری ہے۔ اس کو سمجھے گا تو علم حاصل ہوگا اور پھر اُس پر عمل کی نوبت بھی آئیگی۔ علم کے بغیر عمل کا درست ہونا ممکن نہیں اور نہ ہی اعتقاد صحیح ہو سکتا ہے۔ لہٰذا قرآن پاک کا کم از کم تدبر یہ ہے کہ اس کے معانی ہی سمجھ لیے جائیں۔ یہی دانائی کی بات ہے۔

قرآن تضاد سے پاک ہے

آگے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حقانیت کی دلیل کے طور پر فرمایا وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ اگر یہ اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا تو وہ اس میں بہت بڑا اختلاف پاتے۔ قرآن پاک منجانب اللہ ہونے کی یہ واضح دلیل ہے۔ کہ اس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں پایا جاتا اس کی ہر بات محکم اور اس کا ہر اصول

مضبوط ہے۔ اگر یہ اللہ کے علاوہ کسی مخلوق کا کلام ہوتا تو اس میں جگہ جگہ تضاد پایا جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ جس ذات پاک کا یہ کلام ہے وہ علم محیط کی مالک اور ہر قسم کے نقص و عیب سے پاک ہے۔ لہٰذا اس کی ہر بات پکی ہے۔ مخلوق میں سے اِن صفات کی حامل کوئی ہستی نہیں۔ اس لیے اگر یہ غیر اللہ کا کلام ہوتا تو اس میں ضرور نقوص و عیوب اور تضاد ہوتا۔ قرآنِ پاک کی تمام آیات حدِ اعجاز میں داخل ہیں، یہ معجز ہیں اور مخلوق میں سے کوئی بھی اس کا معارضہ نہیں کر سکتا۔ نہ ایسا فصیح و بلیغ کلام پیش کر سکتا ہے۔ اس میں ماضی اور مستقبل کی بیشمار غیب کی باتیں موجود ہیں مگر کہیں ذرہ بھر بھی تفاوت نہیں پایا جاتا، اسی لیے فرمایا کہ یہ کلام اختلاف سے پاک ہے۔

قرآن معجزہ ہے

قرآن پاک نے جو نظام پیش کیا ہے۔ ایسا مربوط نظام پیش کرنا کسی مخلوق کے بس میں نہیں۔ نہ کوئی فرد واحد ایسا کر سکتا ہے اور کوئی جماعت، قوم، اسمبلی بلکہ تمام انسان اور جن ملکر بھی قرآن پاک کی نظیر پیش نہیں کر سکتے۔ خود قرآن پاک کا چیلنج ہے وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا اگرچہ وہ سب ایک دوسرے کے ممد و معاون ہی کیوں نہ بن جائیں، قرآن پاک کی ایک آیت کا معارضہ بھی محال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ایک آیت میں اپنی مصلحت رکھی ہے۔ اس لیے قرآن کا نظام بھی معجز ہے اور اسکی تعلیم بھی معجز ہے۔ اس کی صداقت کی یہ بھی ایک بین دلیل ہے کہ اس نے جو جماعت پیدا کی ہے اور جس نے اس پر عمل کیا ہے، اس پہ اعتقاد رکھا ہے، وہ دنیا میں بے نظیر جماعت ہے۔ یہ صحابہ کرام کی جماعت ہے، جنہوں نے قرآن میں تدبر کیا اور اس پہ حقیقتاً عمل کیا۔ انسانیت کی پوری تاریخ صحابہ کی مثال پیش نہیں کر سکتی، یہ خود قرآن پاک کا معجزہ ہے۔ یہ ساری چیزیں غور و فکر کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہیں۔ اسی لیے قرآن پاک غور و تدبر کی دعوت دیتا ہے۔

یہ قرآن پاک میں تدبر کا نتیجہ تھا کہ عربوں جیسی جاہل قوم نے دنیا بھر کی قیادت

سنبھال لی ۔ یہ اسی قرآن کا اعجاز تھا ۔ کہ اخلاقی طور پر انتہائی گری ہوئی قوم اخلاق کی بلندیوں تک پہنچ گئی اور نادان اور بے سمجھ لوگ علم و حکمت کے دریا بہانے لگے ۔ یہ سب قرآن پاک کی برکات اور اس کا اعجاز تھا ۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ یہ شک و شبہ سے بالا کتاب ہے اس میں جن لوگوں نے شک و شبہ کا اظہار کیا وہ اُن کی اپنی کج فہمی کا نتیجہ تھا ۔ بھینگے آدمی کو ایک چیز دو نظر آتی ہیں ۔ یرقان کے مریض کو ہر چیز زرد نظر آتی ہے یہ ان کے دماغ و نظر کی خرابی ہوتی ہے مگر درحقیقت ہر چیز اپنی اصل حالت پر ہی قائم ہوتی ہے ۔ اسی طرح قرآن پاک میں شک کرنے والوں کی اپنی عقل و فکر صحیح نہیں ہوتی ، ورنہ وہ کلام پر اعتراض کی جرأت نہ کریں ۔ کوئی بھی صاحب علم و عقل اس میں غور کرے گا تو اُسے کوئی تفاوت نظر نہیں آئے گا ، جس طرح قرآن کے الفاظ فصاحت و بلاغت کی بلندیوں کو چھوتے ہیں اس طرح اس کا نظام بھی بے مثال ہے اس کی حکمت و دانائی کا کوئی مقابل نہیں ۔ یہ سب باتیں تدبر سے سمجھ میں آتی ہیں مگر منافقین اس کے لیے تیار نہیں ، یہی وجہ ہے کہ اس کی حقانیت پر انہیں یقین نہیں آتا اور وہ اللہ کے رسول کی مخالفت پر کمربستہ رہتے ہیں ۔

درس چہل و پنج ۴۵ | آیت ۸۳ تا ۸۴

وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ إِلَى الرَّسُوْلِ وَإِلٰٓى أُولِى الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ إِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾ فَقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَّكُفَّ بَأْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَاللّٰهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَّأَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾

ترجمہ: اور جب پہنچتی ہے اُن کے پاس کوئی بات امن کی یا خوف کی تو اُس کو پھیلا دیتے ہیں اور اگر وہ پلٹاتے اُس کو رسول کی طرف اور اُن میں سے جو صاحب امر ہیں اُن کی طرف تو البتہ تحقیق معلوم کرتے وہ لوگ جو اس بات کی تحقیق کرتے ہیں (اس کو نکالتے ہیں) اُن میں سے اور اگر نہ ہوتا تم پر اللہ کا فضل اور اسکی رحمت تو تم شیطان کی پیروی کرتے، مگر بہت تھوڑے ﴿۸۳﴾ پس اے پیغمبر! آپ اللہ کی راہ میں لڑیں، نہیں تکلیف دی جائیگی مگر تیرے نفس کو، اور برانگیختہ کریں ایمان والوں کو۔ اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ روک دے برائی اُن لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا اور اللہ تعالیٰ سخت لڑائی والا اور سخت سزا دینے والا ہے ﴿۸۴﴾

ربط آیات

گذشتہ آیات میں منافقین کی مذمت بیان ہوئی تھی کہ یہ لوگ حضور علیہ السلام کی مجلس میں بیٹھ کر آپ کی اطاعت کا اظہار کرتے ہیں مگر جب وہاں سے اٹھ کر جاتے ہیں تو اسلام اور اہل اسلام کے خلاف مشورے کرتے ہیں اور سکیمیں بناتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ اُن کی تمام باتیں لکھ لی جاتی ہیں اور وہ قیامت کے دِن سزا کے مستوجب ہوں گے۔ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرمایا کہ آپ اِن لوگوں سے اعراض کریں، اور خدا کی ذات پہ بھروسہ کرتے ہوئے اپنا کام کرتے رہیں آپ کے لیے اللہ تعالیٰ کارساز ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے منافقین اور یہود کا شکوہ کیا کہ یہ لوگ قرآن پاک میں غور و فکر کیوں نہیں کرتے اگر اس طرف توجہ دیتے تو جان لیتے کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اس میں کوئی تعارض یا تخالف نہیں پایا جاتا۔ اس کے معارف بلند اور تمام اطوار صحیح ہیں۔ یہ علم و حکمت کا خزانہ ہے۔ اور اس کا لایا ہوا نظام بیمثال ہے۔ جب یہ چیزیں واضح ہو جائیں تو انہیں نبی کی ذات کے متعلق کوئی تردد باقی نہ رہتا اور کلام پاک میں کوئی شک نہ کرتے۔

تشہیر کی ممانعت

اب آج کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہر خبر کی بلا تصدیق و تحقیق تشہیر کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اسلام کی ابتدائی جنگوں کے دوران لوگ محاذوں سے آنے والی خبروں کے منتظر رہتے تھے۔ اور پھر جو بھی کوئی خبر پہنچتی اُسے بلا تحقیق مشہور کر دیتے، حالانکہ جنگی حکمت عملی کے پیش نظر بعض چیزوں کی تشہیر نقصان کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس معاملے میں منافقین اور یہود پیش پیش تھے۔ اور کمزور دل مسلمان بھی اُن کے ساتھ شامل ہو جاتے تھے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے سے منع فرما دیا۔ ارشاد ہوتا ہے وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ جب ان کے پاس کوئی خبر آتی ہے، امن کی یا خوف کی۔ یہاں امن کی خبر سے مراد خوشخبری ہے، مسلمانوں کو فتح حاصل ہو گئی، مال غنیمت حاصل ہو گیا یا کوئی اور کامیابی ہو گئی تو اسے امن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف اگر شکست آ گئی، جانی یا مالی نقصان ہو گیا تو اسے خوف کا نام دیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ جب کوئی ایسی خبر پہنچتی ہے۔ تو منافقین

اور کمزور مسلمان اَذَاعُوا بِہٖ اس کو پھیلا دیتے ہیں، عام کر دیتے ہیں، حالانکہ ایسی باتوں کی تشہیر بعض اوقات مناسب نہیں ہوتی اور اہل اسلام اور دین کے لیے نقصان کا باعث بن جاتی ہے۔ ہر بات کو بلا تحقیق آگے پہنچا دینا درست نہیں ہوتا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے[1] کَفٰی بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ یعنی کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ کہ وہ ہر سُنی سنائی بات بغیر چھان بین کے آگے چلا دے۔

پیشگی تحقیق

فرمایا جب بھی کوئی ایسی خبر پہنچے تو اس کے لیے صحیح طریق کار یہ ہے۔ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ اور اگر یہ لوٹاتے ایسی بات کو رسول کی طرف وَاِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ اور اپنے میں سے صاحب امر کی طرف۔ تو اس کا فائدہ یہ ہوتا لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ کہ اُن میں سے تحقیق و تجسس کرنے والے بات کی حقیقت کو جان لیتے۔ مقصد یہ ہے۔ کہ کسی خبر کو عام کرنے سے پہلے لازم ہے۔ کہ اُسے ذمہ دار لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ وہ اس کی باقاعدہ تحقیق و تصدیق کریں اور پھر فیصلہ کریں کہ آیا اس خبر کی تشہیر اسلام کے مفاد میں ہے یا نقصان میں، اس ضمن میں فرمایا کہ کسی معاملہ میں حتمی فیصلہ اللہ کے رسول کا ہوتا ہے اگر اللہ کا رسول اُس مقام پر موجود ہے۔ تو ایسی بات فوراً اُس کے نوٹس میں لاؤ اور پھر اُس کے فیصلے کے مطابق عمل کرو۔ اور اگر رسولِ خدا موجود نہیں ہیں تو پھر ایسی بات آپ کے نایب یا اولی الامر کے پاس لے جاؤ، تاکہ وہ حالات کے پیش نظر فیصلہ کر سکے کہ اس کی تشہیر مفید ہے یا نہیں۔

اولی الامر کا لفظ پیچھے اسی سورۃ کے آٹھویں رکوع میں بھی آ چکا ہے وہاں بھی حکم ہوا تھا۔ کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اور اپنے میں سے صاحب امر کی اطاعت کرو۔ وہاں پر بھی اس بات کی وضاحت کی گئی تھی کہ صاحب امر سے مراد مسلمان حکام بھی ہیں اور امت کے علماء و فقہاء بھی۔ اگر معاملہ انتظامی نوعیت کا ہے۔ تو وہ حاکم وقت کے پاس جائیگا، کیونکہ فوج کی تنظیم،

[1] مسلم صہ ۸ ج ۱ (فیاضی)

شہری دفاع اور دیگر ملکی نظم ونسق کی ذمہ داری حکام پہ ہوتی ہے، اس لیے ایسے معاملہ میں وہی بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اور اگر معاملہ حلت وحرمت کا ہے یا کسی بات کے جائز ناجائز کا ہے، اور اس میں شرعی فتویٰ کی ضرورت ہے تو پھر ایسا معاملہ علما وفقہاء کے سامنے پیش کرنا چاہیئے تاکہ وہ اپنی علمی تحقیق وتجسس کی روشنی میں مسئلہ کا حل پیش کر سکیں۔ امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ اولی الامر میں حکام وقت اور علماء فقہاء کے دونوں گروہ شامل ہیں۔

جیساکہ عرض کیا، ہر نازک معاملہ کی پیشگی تحقیق ازبس ضروری ہوتی ہے، وگرنہ کسی غلط فہمی یا غلط خبر کی وجہ سے بڑے سے بڑے نقصان کا خطرہ بھی ہوسکتا ہے روایت میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے کسی شخص کو ایک قوم کے پاس زکوٰۃ کی وصولی کے لیے بھیجا۔ جب یہ شخص اُس بستی کے قریب پہنچا تو وہ لوگ اُسے حضور علیہ السلام کے معزز نمائندہ سمجھ کر استقبال کے لیے بستی سے باہر نکلے۔ اُس شخص کی گاؤں والوں سے کچھ دیرینہ عداوت تھی، وہ سمجھا کہ شاید اُس عداوت کی بنا پر یہ لوگ مجھے ہلاک کرنے کے لیے نکلے ہیں۔ اسی غلط فہمی کی وجہ سے حضور کا محصّل اُن لوگوں کو ملے بغیر واپس آگیا اور آکر یہ مشہور کر دیا کہ وہ لوگ نہ صرف دین سے پھر گئے ہیں اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا ہے بلکہ مجھے مارنے کے لیے نکلے تھے۔ معاملہ بڑا نازک تھا۔ اہل اسلام ایک قوم کے ارتداد اور زکوٰۃ سے انکار کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اگر صورتحال کی تحقیق نہ کی جاتی تو قریب تھا۔ کہ اُن لوگوں کے خلاف کوئی فوری کارروائی ہو جاتی اور مسلمانوں کے ہاتھوں ہی مسلمانوں کا نقصان ہو جاتا۔ اسی لیے اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ جب کوئی ایسی خبر پہنچے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو۔ سورۃ حجرات میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی ارشاد فرمایا ہے کہ اے ایمان والو! "إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا" اگر کوئی ایسی ویسی خبر پہنچے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو کہیں نادانی اور جہالت کی وجہ سے کوئی نقصان نہ اٹھا بیٹھو۔ اسی سورۃ میں آگے تیرھویں

رکوع میں بھی یہ لفظ آیا ہے۔ وہاں بھی اللہ نے فرمایا کہ کسی شخص کو غلط فہمی کی بناء پر کافر سمجھ کر قتل نہ کر دیا کرو بلکہ اسکی تحقیق کر لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ بے گناہ مسلمان تمہارے ہاتھوں مارا جائے۔

دورانِ جنگ بعض ایسی خبریں جنگی پراپیگنڈا کے طور پر بھی پھیلائی جاتی ہیں۔ تاکہ دشمن پر اس کا منفی اثر ہو۔ بعض اوقات اپنی کامیابی اور دشمن کی ناکامی کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے تاکہ مخالف فریق کی فوج کو اعصابی طور پر کمزور کیا جا سکے اور عوام میں بد دلی پھیلا دی جائے۔ سورۃ احزاب میں اللہ نے فرمایا کہ منافقین کا حال یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں ضعف پیدا کرنے کے لیے غلط پراپیگنڈا کرتے ہیں کہ ہم نے یہ کر دیا یا وہ کر دیا۔ موجودہ زمانے میں انگریز نے پراپیگنڈا کے ہتھیار کو مؤثر طور پر استعمال کیا ہے۔ الغرض! اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہر خبر کو بلا سوچے سمجھے مشتہر نہ کر دیا کرو بلکہ اُسے اس کے اہل لوگوں کے پیش کر دیا کرو اور پھر وہ جو کچھ فیصلہ کریں، اُس کے مطابق عمل کرو۔

استنباط مسائل

امام رازیؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس آیت کریمہ میں آمدہ لفظ یَسْتَنْبِطُوْنَهٗ سے کئی باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ نئے پیش آمدہ مسائل کا حل کلی طور پر نصوص سے نہیں ہو سکتا۔ نص تو ایسی چیز کو کہتے ہیں جو قرآن پاک یا حدیث شریف سے صراحتاً ثابت ہو۔ نئے مسائل میں چونکہ نص موجود نہیں ہوتی۔ لہٰذا اِن کا حل استنباط سے ہی ممکن ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اپنے معاملات اللہ کے رسول یا صاحب امر کے پاس لے جاؤ جو استنباط کی اہلیت رکھتے ہیں ظاہر ہے کہ اگر کوئی انتظامی نوعیت کا معاملہ ہے تو حکامِ وقت نپٹائیں گے اور اگر حدود شریعت کا مسئلہ ہے تو اُسے اہل علم کے سامنے پیش کرنا ہوگا۔ ہر شخص ہر مسئلہ میں خود مفتی نہیں بن سکتا۔ کیونکہ قرآن پاک میں یہ عام حکم بھی موجود ہے فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ اگر تمہیں کسی معاملہ کا علم نہیں تو اہل علم سے دریافت کر لو، وہی اس کا حل پیش کریں گے

گویا کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں استنباط کا عظیم اصول بیان فرمایا ہے۔ استنباط کا لفظ نبط کے مادہ سے ہے اور اس کا معنیٰ زمین کی تہ میں موجود مخفی پانی کو آلات کی مدد سے نکالنا ہے۔ یہاں بھی استنباط سے مراد قیاس و اجتہاد کے ذریعے کسی مسئلے کا استخراج ہے۔ یہ مجتہد کا کام ہے کہ وہ مسئلہ کی بنیاد تلاش کرے اور دیکھے کہ اس کا تعلق کون سی دلیل کے ساتھ ہے۔ پھر اس میں غور و فکر کر کے پیش آمدہ مسئلہ کا حل پیش کرے۔ ظاہر ہے۔ کہ مجتہد کے پاس قطعی علم تو نہیں ہوتا کیونکہ قطعی علم فقط نبی کو بذریعہ وحی حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا مجتہد کا اجتہاد ظن غالب پر مبنی ہوتا ہے۔ اور اسی پر وہ مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے۔

استنباط شرعی حجت ہے

امام رازیؒ فرماتے ہیں۔ کہ استنباط حجتِ شرعی ہے۔ اور یہ ہر شخص کا کام نہیں۔ ظاہر ہے کہ نیا مسئلہ اہل علم کے آگے پیش ہوگا۔ اور جب وہ اس کا حل پیش کر دے تو پھر عام لوگوں کا فرض ہوگا کہ وہ اس پر عمل کریں، اس طرح گویا اہل علم کی تقلید عوام پر واجب ہو گئی۔ اسی لیے اللہ نے ایسے مسائل کو اہل علم کی طرف لوٹانے کا حکم دیا ہے۔ تاکہ باقی لوگ اُن کے فیصلے پر سر تسلیم خم کر لیں۔ یہی تقلید ہے۔ امام ابوبکر حصاصؒ فرماتے ہیں۔ کہ استنباط نبی اور امتی دونوں میں پایا جاتا ہے۔ بعض اوقات جب وحی نہیں آتی تو نبی خود بھی مسئلہ کا استنباط کرتا ہے اور پھر آپ کے علاوہ انتظامی امور میں ذمہ دار حکام وقت اور شرعی معاملات میں اہل علم و دانش استنباط و استخراج مسائل کے ذمہ دار ہیں۔ اہل سنت کے ائمہ اربعہ نے استنباط کے ذریعے ہزاروں اور لاکھوں شرعی مسائل کا حل پیش کر کے اسکی افادیت کو ثابت کر دیا۔

امام اور معصومیت

استنباط کے قانون سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے۔ کہ استنباط یا استخراج مسائل غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور غور و تدبر میں آراء کا مختلف ہونا بھی عین ممکن ہے۔ لہٰذا رافضیوں کا عصمتِ امام کا عقیدہ درست نہیں ہے معصوم وہ ہوتا ہے جسکی بات قطعی ہو، اور وہ صرف پیغمبر کی ذات ہوتی ہے

اگر امام کی بات بھی قطعی ہو تو پھر استنباط کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ استنباط تو وہیں ہو گا جہاں غور و فکر کی ضرورت ہے اور جب کوئی چیز غور و فکر کے ذریعے نکالی جائے تو وہ قطعی نہیں ہو سکتی، لہٰذا ثابت ہوا کہ امام معصوم نہیں ہوتا۔

ضرورت قیاس

ماہرین اصول فقہ کہتے ہیں۔ کہ دلائل شرع چار ہیں یعنی کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع امت یعنی اتفاق صحابہؓ اور قیاس۔ مقصد یہ ہے کہ جب مسئلہ کا حل نہ قرآن پاک سے معلوم ہو اور نہ حدیث رسول سے اور جس پر اجماع صحابہؓ بھی ثابت نہ ہو تو اُس کا حل قیاس کے ذریعے معلوم کیا جائیگا۔ ائمہ اربعہ نے لاکھوں مسائل کا حل قیاس کے ذریعے پیش کیا اور وہ سب کے سب حق پر ہیں۔ اُن کے درمیان بعض مسائل میں فروعی اختلاف پایا جاتا ہے مگر دین کے بنیادی مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں۔ فروعی اختلاف فہم اور استخراج کے طریق کار میں اختلاف کی وجہ سے ہوتا ہے۔ چونکہ یہ غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ کے رسول نے اسے امت کے لیے باعثِ رحمت فرمایا ہے۔ بہر حال دلائل شرع میں سے چوتھی دلیل قیاس ہے اور اس کی ضرورت ہر زمان اور ہر مکان میں موجود رہیگی۔ اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔

فرمایا وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت شامل نہ ہوتی لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا تو چند کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے چل نکلتے۔ شیطان انسان کے دل میں وہم ڈال کر گمراہ کر دیتا ہے وہ گمراہی کی بات کو بڑا مزین کر کے پیش کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے کم علم لوگ اس کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ البتہ کچھ سمجھدار اور اہل علم لوگ اُس کے جال سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ تو فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے۔ کہ اُس نے تمہاری ہدایت کے لیے تمام سامان مہیا کر دیے ہیں۔ اور وہ طریقے بھی تبلا دیے ہیں۔ جن سے پیش آمدہ مسائل کا حل معلوم کیا جا سکے۔

جہاد فی سبیل اللہ

اگلی آیت میں پھر جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس کا تعلق بھی

جہاد کی گذشتہ آیات کے ساتھ ہی مربوط ہے۔ گذشتہ آیات میں گزر چکا ہے۔
"اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" یعنی ایماندار
لوگ محض اللہ کی رضا کے لیے میدان جہاد میں آتے ہیں۔ اس سے پہلے فرمایا
"مَا لَکُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ اللہ
کے راستے میں قتال نہیں کرتے، حالانکہ کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کو
دشمن کی قید سے آزاد کرانا ضروری ہے۔ قبل ازیں یوں بھی ارشاد ہوا کہ اے ایمان
والو! "خُذُوْا حِذْرَکُمْ" دفاع کا سامان مکمل کرلو اور پھر گروہوں کی شکل میں
حملہ کرو یا سب کے سب یکبارگی دشمن کا مقابلہ کرو۔ اس معاملہ میں لیت و لعل
اور تاخیر کرنے والے منافق شمار ہوں گے۔ موت تو بہرحال آجانی ہے اور جہاد سے
محروم رہنے والے شہادت کی موت سے محروم رہ سکتے ہیں۔

اب اس آیت میں بھی ارشاد ہے۔ "فَقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ"
اے پیغمبر! اللہ کی راہ میں قتال کریں۔ فی سبیل اللہ کی تشریح پہلے عرض کر دی
گئی ہے۔ کہ مومن کی جنگ محض اس لیے ہوتی ہے۔ "لِیُظْهِرَهٗ عَلَی
الدِّیْنِ کُلِّهٖ" تاکہ اللہ کے دین کو تمام ادیان پر غالب کر دے، اس کا مطلوب
و مقصود، ملک گیری، مال و دولت کا حصول یا شجاعت و بہادری کی تشہیر نہیں ہوتا۔
بلکہ اعلائے کلمۃ اللہ ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام خود جنگ کے موقع پر دعا فرمایا کرتے
تھے اللھم منزل الکتب ومجری السحاب اھزم
الاحزاب کتاب کو نازل کرنے والے اور بادلوں کو چلانے والے خدایا! دشمن
کو مغلوب کر دے اور ہمیں فتح نصیب فرما۔ یہاں بھی یہی بات سمجھائی گئی ہے
کہ مسلمان کی جنگ کسی دنیوی مقصد کے لیے نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کتاب کے
پروگرام کو غالب بنانا مقصود ہوتا ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے۔
پھر فرمایا "لَا تُکَلَّفُ اِلَّا نَفْسَکَ" نہیں تکلیف دی جائیگی مگر آپ کے
نفس کو۔ مقصد یہ ہے۔ کہ اگر لوگ جہاد کے معاملہ میں سستی کرتے ہیں تو ان کا مؤاخذہ

آپ کی ذات سے نہیں ہوگا بلکہ آپ سے سوال آپ کی ذات کے متعلق ہوگا۔ لہٰذا آپ اللہ کے راستے میں ہمیشہ مستعد رہیں۔ چنانچہ حضور علیہ السلام نے بعض مواقع پہ فرمایا کہ کوئی دوسرا میرے ہمراہ جائے یا نہ جائے، میں تنہا بھی دشمن کے مقابلے کے لیے ضرور نکلوں گا۔

دشمن پہ گہری نظر

فرمایا وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ آپ مسلمانوں کو جہاد پہ آمادہ کریں اور اس کے لیے ہمیشہ تیار رہیں عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ کفار کی طرف سے لڑائی کو روک دے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر آپ ہمہ وقت مستعد رہیں گے تو دشمن پہ اس کا رعب پڑیگا اور وہ کسی ممکنہ حملے سے باز آئیگا۔ اُسے پتہ چل جائے گا کہ دوسرا فریق غافل نہیں بلکہ ہر وقت آمادہ جنگ ہے تو پھر وہ سوچ سمجھ کر حملہ آور ہوگا بتایا یہ جا رہا ہے۔ کہ لبا اوقات فریق ثانی کی مستعدی کی وجہ سے بھی دشمن جنگ سے گریز کر جاتا ہے۔ عرب کہتے ہیں اِذَا حُوصِیَ سَقَطَ دشمن کا محاصرہ کروگے تو اس کو شکست ہوگی، اگر سست ہوجاؤگے، جہاد کی تیاری میں غفلت برتوگے تو دشمن کو حملہ کرنے کی ترغیب ملیگی، لہٰذا آپ ہر وقت مقابلہ و مقاتلہ کے لیے تیار رہیں۔

فرمایا وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا اللہ تعالیٰ سخت گرفت والا ہے وَاَشَدُّ تَنْكِيْلًا اور اس کی سزا بھی سخت ہوتی ہے۔ گرفت تو لبا اوقات دنیا میں ہوجاتی ہے اور سزا آخرت کے لیے مقرر کر دی جاتی ہے۔ جب مومن اللہ کا نام لے کر اللہ کے دین کے قیام کے لیے نکلیں گے تو دشمن کو ذلت ناک شکست ہوگی۔ دنیا نے دیکھا کہ بدر کے مقام پہ کفار کو کیسی شکست ہوئی۔ وہ تمام تر سامان ضرب و حرب کے باوجود میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے، وجہ یہی تھی کہ مسلمان اللہ کے دین کی بلندی کے لیے جان ہتھیلی پہ رکھ کر میدان میں اترے تھے۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ
مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ
كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾
وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ
اَوْ رُدُّوْهَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾ النصف
اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ
لَا رَيْبَ فِيْهِ ۗ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾ ع ۸

ترجمہ : جو شخص سفارش کریگا اچھی سفارش ، اس کے لیے ہو گا اُس میں سے حصہ ، اور جو شخص سفارش کریگا بری سفارش تو ہو گا اس کے لیے بوجھ اُس سے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۸۵﴾ اور جب تم کو دُعا دی جائے سلام کے ساتھ ، تو تم بھی دُعا دو اُس سے بہتر یا اُسی کو لوٹا دو ۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے ﴿۸۶﴾ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے وہ ضرور جمع کرے گا تمہیں قیامت کے دن جس میں کوئی شبہ نہیں ہے ۔ اور کون زیادہ سچا ہے بات میں اللہ تعالیٰ سے ﴿۸۷﴾

ربطِ آیات

گذشتہ درس میں جہاد کے سلسلہ میں منافقین کی مذمت بیان کی گئی تھی ، اور اس بات کا تذکرہ تھا کہ امن وجنگ کے زمانہ میں غلط بات کی تشہیر نہیں کرنی چاہیئے

منافقین کا طریقہ تھا۔ کہ وہ ہر ایسی بات کو عام کر دیتے تھے جس سے اہل اسلام کو نقصان پہنچنے کی امید ہو اور پھر اُن کے ساتھ کمزور دل مسلمان بھی شامل ہو جاتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا، نیز یہ فرمایا کہ جب کوئی ایسی بات پہنچے تو اسے بلا تحقیق آگے چلانے کی بجائے رسولِ خدا کے سامنے پیش کر دو یا پھر حاکم وقت کے نوٹس میں لاؤ، جو پوری تحقیق و تجسس کے بعد فیصلہ کریگا کہ آئندہ لائحہ عمل کیا ہونا چاہیئے۔ پھر اسی ضمن میں علما، فقہاء کا ذکر بھی آیا کہ انتظامی امور بلاشبہ انتظامی حکام کے سامنے ہی پیش کرنے چاہئیں۔ تاہم شرعی معاملات علماء و فقہا کے پاس لیجانے چاہئیں۔ پھر تحقیق کے بعد جو وہ فیصلہ کریں اُس پر عمل درآمد ہونا چاہیئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے احسان جتلایا کہ اُس نے اپنے فضل سے تمہیں برائی سے بچنے کے تمام سامان مہیا کر دیئے، ورنہ تم میں سے اکثر لوگ شیطان کا اتباع کرتے۔

پھر ترغیب جہاد ہی کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خطاب فرمایا کہ آپ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہیں۔ آپ سے صرف آپ کی ذات کے متعلق ہی مؤاخذہ ہوگا۔ دوسروں کے متعلق آپ سے باز پُرس نہیں ہو گی۔ نیز فرمایا کہ آپ اہل ایمان کو جہاد کی ترغیب دیتے رہیں اور دشمن کے خلاف ہمیشہ مستعد رہیں، اُمید ہے۔ کہ اس سے دشمن پر رعب طاری ہو گا اور وہ اسلام کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے رُک جائیگا۔ البتہ یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کافروں کی سخت گرفت کرے گا اور پھر اُس کی سزا بھی بڑی سخت ہے۔

اچھی اور بُری سفارش

اب آج کے درس کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اچھی اور بُری سفارش اور پھر اُس کے نتائج کا تذکرہ کیا ہے۔ گذشتہ درس میں جہاد پر برانگیختہ کرنے کا ذکر تھا اور یہ بھی ایک اچھی سفارش ہے۔ تو اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے اچھی اور بری سفارش کی وضاحت فرمائی ہے ارشاد ہوتا ہے۔ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً جو شخص سفارش کریگا کوئی اچھی سفارش يَكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا تو اُس کو اُس میں سے حصہ ملیگا۔ یعنی اچھی سفارش کرنے اور پھر اس پر عملدرآمد

سے جو اچھے نتائج مرتب ہوں گے، اُن کے اجر و ثواب میں سے سفارش کنندہ یعنی اچھے کام کی ترغیب دینے والے کا بھی حصہ ہوگا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے۔ اَلدَّالُ عَلَی الْخَیْرِ کَفَاعِلِہٖ یعنی نیکی کی دعوت دینے والا ایسا ہی ہے جیسے اُس نیکی کو انجام دینے والا۔

اسی طرح غلط کام کی ترغیب کے متعلق فرمایا وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَۃً سَیِّئَۃً جو کوئی بری سفارش کریگا یَکُنْ لَّہٗ کِفْلٌ مِّنْھَا تو اس میں سے اُس سفارش کنندہ کے لیے بھی بوجھ ہوگا۔ یعنی بُرے کام پر اکسانے اور پھر اس پر عمل درآمد سے جو بُرے نتائج مرتب ہوں گے، ایسا سفارشی بھی اُس گناہ میں شریک سمجھا جائیگا، وہ بھی مجرم تصور ہوگا اور مستوجب سزا بھی۔ اور ایسا مؤاخذہ کرنا اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے کیونکہ وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ کوئی چیز اس کے احاطہ قدرت سے باہر نہیں۔ لہٰذا اچھے اور بُرے کام پر اُبھارنے والوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اُن کی کوششیں رائیگاں نہیں جائینگی اور بلکہ حسب حال اُن پر اچھی یا بُری جزا ضرور مرتب ہوگی۔ منجملہ بُری سفارشات کے ایک یہ بھی ہے کہ کسی کو جہاد میں شمولیت سے ڈرایا جائے۔ اور اس قسم کا پراپیگنڈا کیا جائے۔ جس سے مسلمانوں میں خوف و ہراس پیدا ہو اور وہ جہاد کے معاملہ میں کمزور پڑ جائیں۔

جائز سفارش پر ثواب۔

کسی مومن بھائی کے لیے اُس کی پس پشت دُعا کرنا بھی اچھی اور جائز سفارش میں شامل ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ دَعْوَۃُ الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ لِاَخِیْہِ بِظَھْرِ الْغَیْبِ مُسْتَجَابَۃٌ کسی مومن کی اپنے بھائی کے لیے پس پشت دُعا قبول ہوتی ہے یہ بھی ایک سفارش ہے۔ کہ اللہ — میرے بھائی کی فلاں مشکل آسان کر دے یا اس کی فلاں جائز ضرورت پوری فرما دے اس کے علاوہ ہر جائز کام میں کسی کی مدد کرنا نیکی کا کام ہے۔ اور جس قدر ثواب اُس کام کے انجام دینے والے کو ہوگا، اُس میں

سے سفارش کرنے والے کا بھی حصہ ہوگا اور وہ بھی محروم نہیں رہیگا۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ بھی ارشاد ہے اِشْفَعُوْا وَلْتُوْجَرُوْا جائز امور میں سفارش کیا کرو تمہیں اجر ملیگا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا وَیَقْضِی اللّٰہُ عَلٰی لِسَانِ نَبِیِّہٖ مَاشَآءَ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان پر جو چاہے فیصلہ کرتا ہے۔ لہٰذا اچھی بات کی ہمیشہ ترغیب دینی چاہیئے۔ اور اس کی انجام دہی کے لیے سفارش کرنی چاہیئے۔ اگر کام نہ بھی ہو، تو سفارش کرنے والے کو بہر حال اچھی سفارش کا اجر مل جائیگا۔

ناجائز سفارش پر عتاب

جائز سفارش اجر و ثواب کا موجب ہے تو ناجائز سفارش معصیت میں شامل ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ جائز یا ناجائز سفارش کی اجرت لینا حرام ہے۔ جائز میں اس لیے کہ یہ عبادت کا درجہ رکھتی ہے اور عبادت کی اجرت لینا حرام ہے اور ناجائز سفارش کی اجرت اس لیے حرام ہے کہ وہ بذاتِ خود معصیت ہے۔ مگر مقامِ افسوس ہے کہ آج کے دور میں لوگ جائز و ناجائز کی حدود کو قائم نہیں رکھتے۔ اس زمانہ میں اکثر سفارشات ناجائز ہوتی ہیں ایک شخص کسی عہدہ کا اہل نہیں مگر وہ عہدہ اُسے سفارش کے ذریعے دلایا جاتا ہے، یہ کیسے درست ہو سکتا ہے۔ آج ہمارے گرد و پیش میں کتنے معاملات ہیں جن میں سو فیصد غلط کام کی سفارش کی جاتی ہے اس کا لازماً مواخذہ ہوگا۔ آج کے دور میں حکومت کے اکثر محکمے رشوت اور سفارش کی بنیاد پر چل رہے ہیں۔ اس کے علاوہ رشتہ داری، دوست نوازی اور اقربا پروری کی بنیاد پر غلط ملط کام کی سفارش کی جاتی ہے۔ سفارش کے ذریعے صریح مجرم کو بچایا جاتا ہے، اور بے گناہ کو سزا دلوائی جاتی ہے آخر اس ظلم کا وبال ضرور پڑے گا۔ یہ چیزیں تہذیب و تمدن کو تباہ کرنے والی ہیں۔ جب حالات ایسے ہو جائیں تو پورے معاشرے کا امن و سکون تباہ ہو جاتا ہے اور "جسکی لاٹھی اُسکی بھینس" والا ماحول جنم لیتا ہے۔ لَعَنَ اللّٰہُ مَنْ اٰوٰی مُحْدِثًا مجرم کو پناہ دینے والے پر اللہ کی لعنت برستی ہے۔ جو شخص حقیقی چور کے ہاتھ نہ کاٹنے کی سفارش کرتا ہے

ظاہر ہے کہ وہ بھی اُس جرم میں شریک ہے۔ اور اس بُرائی میں سے اُسے بھی اپنے حصے کا بوجھ اُٹھانا ہو گا۔

سلام مکارم اخلاق

معاشرتی معاملات میں مکارمِ اخلاق کو اعلیٰ حیثیت حاصل ہے اور سلام مکارمِ اخلاق ہی کا حصہ ہے۔ سلام کرنا ایک دوسرے کے حق میں سلامتی کی دُعا ہے اور اس لحاظ سے یہ بھی ایک اچھی اور جائز سفارش ہے کہ کسی بھائی کو ایمان اور ہر لحاظ سے سلامتی نصیب ہو۔ تو اگلی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کو سلام کرنے کی ترغیب دی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ جب تمہیں دُعا دی جائے، سلام کے ساتھ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا تو تم اُس سے بہتر دُعا دو اَوْ رُدُّوْهَا یا کم از کم اُسی کو لوٹا دو۔ یہ تحیۃ اور حیٰوۃ زندگی کے لیے دُعا کو کہا جاتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ یوں کہا کرتے تھے حَيَّاكَ اللّٰهُ یا حُيِّيْتَ یعنی تم دیر تک زندہ رہو تمہیں اللہ سلامتی کے ساتھ زندہ رکھے۔ اُس زمانے میں اَنْعِمْ صَبَاحًا (تمہاری صبح خوشگوار ہو) کے الفاظ بھی بولے جاتے تھے۔ آج کل بھی GOOD MO-RNING (صبح بخیر) جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ تاہم اسلام نے یہ طریقہ جاری کیا۔ کہ جب تمہیں کوئی سلام کہے تو تم اُس سے بہتر سلام کہو یا کم از کم اُسی کو لوٹا دو صرف لوٹانا یہ ہے کہ جب کوئی السلام علیکم کہے تو تم جواب میں وعلیکم السلام کہہ دو۔ اور بہتر سلام یہ ہے کہ السلام علیکم کے جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ کہو۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اگر کوئی شخص صرف علیکم السلام کہتا ہے تو اُسے دس نیکیاں حاصل ہوتی ہیں اور اگر کوئی اس کے ساتھ ورحمۃ اللہ بھی کہہ دے تو بیس نیکیوں کا حقدار بن جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اگر کوئی وبرکاتہ کا لفظ بڑھا دے تو تیس نیکیاں اور ومغفرتہ کا اضافہ کرنے سے اُس کے نامہ اعمال میں چالیس نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں۔ تو گویا بہتر سلام یہ ہوا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، ومغفرتہ، تاہم سلام کا کم از کم جواب وعلیکم السلام ہے۔

صحیحین کی روایت میں آتا ہے۔ کہ سلام کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے جاری فرمایا۔ آپ کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بہشت میں فرشتوں کی ایک جماعت ہے، اس کو جا کر سلام کرو۔ جو جواب وہ دیں گے وہی جواب تمہارے لیے اور تمہاری اولاد کے لیے ہو گا۔ چنانچہ آدم علیہ السلام نے فرشتوں کے پاس جا کر السلام علیکم کہا، تو انہوں نے جواب میں السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا۔ چنانچہ سلام کا یہی طریقہ بنی آدم میں رائج ہو گیا۔

سلام کی تشہیر

یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ سلام کرنا سنت ہے اور اُس کا جواب دینا واجب۔ اور پھر یہ بھی ہے۔ کہ جو شخص سلام میں پہل کرتا ہے۔ اُس کو زیادہ اجر ملتا ہے۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ راستوں پر نہ بیٹھا کرو، اگر بیٹھنا ہے تو راستے کا حق بھی ادا کیا کرو۔ اور راستے کا حق یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا کرو، بھٹکے ہوئے آدمی کو راہ دکھاؤ اور آنے جانے والوں کو سلام کہو۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میں تم کو ایسی چیز نہ بتاؤں جس پر عمل کر کے تم آپس میں محبت کرنے لگو۔ اور آپس میں محبت کرو گے تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ تمہیں جنت عطا کریں گے۔ فرمایا وہ چیز ہے اَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَکُمْ یعنی آپس میں سلام پھیلاؤ۔ ایک دوسرے کو السلام علیکم کہا کرو۔ علیٰ مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ جس کے ساتھ جان پہچان ہے اُسے بھی سلام کہو اور جس کے ساتھ تعارف نہیں ہے، اس کو بھی سلام کرو۔ یہ پیار و محبت کا بہترین نسخہ ہے۔

کفار اور سلام

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس آیت کے مخاطبین اہل اسلام ہیں۔ اور سلام کرنے کا حکم انہی کے لیے ہے۔ کہ جب آپس میں ملو تو ایک دوسرے کو سلام کیا کرو اور اس کا بہتر جواب دیا کرو۔ یہ حکم کافروں کے لیے نہیں ہے۔ لہٰذا حتی الامکان کفار کے ساتھ سلام میں ابتداء نہ کرو لا تبدؤا الیھود والنصاریٰ بالسلام۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ اگر کوئی شخص کفار کے ملک میں اُن کے

زیر اثر رہتا ہے۔ اور سلام نہ کرنے سے اُسے نقصان اٹھانے کا خطرہ ہے تو اُسے سلام کرنا مباح ہوگا، گنہگار نہیں ہوگا مگر عام حالات میں ابتداء نہیں کرنی چاہیئے۔ اور اگر کوئی غیر مسلم خود سلام میں ابتداء کرے تو اُس کے جواب میں وعلیکم کہ دینا کافی ہے۔ اس سے زیادہ نہ کہے اگر کسی مجلس میں مومن اور کافر ملے جلے ہوں تو سلام کرتے وقت مومنوں کے حق میں نیت کرو یا فرشتوں کا تصور کر کے السلام علیکم کہو۔

آدابِ سلام

یاد رہے کہ بعض حالتوں میں سلام کرنا مکروہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً بول و براز کی حالت میں سلام نہیں کرنا چاہیئے۔ اذان، نماز، تلاوت یا دیگر علمی مشاغل کے دوران سلام مکروہ ہے۔ اسی طرح اگر کوئی معصیت کا کام مثلاً کبوتر بازی، پتنگ بازی، بٹیر بازی، گانے بجانے کے دوران سلام کرنا مکروہ ہے۔

آدابِ سلام کے سلسلے میں حضور علیہ السلام نے یہ تعلیم بھی دی ہے کہ چھوٹا بڑے کو سلام کرے، سوار پیدل کو سلام کرے، چلنے والا بیٹھنے والے کو سلام کرے۔ یہ مکارم اخلاق کی تعلیم ہے۔ تاکہ لوگوں میں تکبّر پیدا نہ ہو۔ کسی شخص کو لائق نہیں کہ وہ دوسرے شخص کے سلام کا منتظر رہے۔ بلکہ ہر شخص کو سلام میں ابتداء کی کوشش کرنی چاہیئے۔ حضور علیہ السلام کی عادت مبارک تھی کہ آپ سلام میں پہل فرماتے تھے، جب آپ کا بچوں پہ گذر ہوا۔ تو سلام کیا، عورتوں کے پاس گزرے تو وہاں بھی سلام کیا۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ عورتیں اپنی اعزہ و اقارب میں سے ہوں یا عمر رسیدہ ہوں تو اُن کو سلام کیا جاسکتا ہے۔ نوجوان عورتوں کو اجنبی نوجوان کا سلام فتنہ کا باعث ہوسکتا ہے لہٰذا اس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

حضور علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا کہ جب اپنے گھر جاؤ تو بیوی بچوں کو سلام کرو اس میں اللہ تعالیٰ تمہارے لیے خیر و برکت ڈال دے گا۔ اگر کسی خالی گھر میں جاؤ تو وہاں بھی سلام کہو اور یوں کہو اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَ عَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِيْنَ ہم پر سلام ہو اور اللہ کے نیک بندوں پر سلام ہو۔ فرمایا وہاں اللہ کی کوئی دیگر مخلوق فرشتے وغیرہ ہوں گے تو وہ بھی اِس سلام میں شامل ہو جائیں

گے۔ یہ تمام باتیں احادیث میں آتی ہیں اور فقہائے کرام نے ان کی تشریح بیان کر دی ہے یہ مکارمِ اخلاق کا حصہ ہے۔

سلام کی تکمیل مصافحہ

تمام التحیہ یعنی سلام کی تکمیل مصافحہ سے ہوتی ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے اللہ تعالیٰ مصافحہ کرنے والوں کے گناہوں کو گراتا ہے۔ مصافحہ ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ سے ملانے کو کہا جاتا ہے۔ اور یہ مسنون ہے۔ البتہ مصافحہ کی تتمیم دونوں ہاتھوں سے ہوتی ہے۔ بعض لوگ دونوں ہاتھ ملانے سے گریز کرتے ہیں یہ ٹھیک نہیں مصافحہ کی تکمیل دونوں ہاتھوں سے ہے تاہم یہ ضروری بھی نہیں۔ اس کے علاوہ معانقہ کی بھی اجازت ہے۔ حضور علیہ السلام نے بعض موقع پر اپنے صحابہ سے معانقہ بھی کیا یعنی گلے ملے۔ یہ انتہائی محبت و الفت کی علامت ہے۔ بشرطیکہ کسی فتنہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ نہ ہو۔

بہر حال فرمایا کہ جب تمہیں سلام کے ساتھ دعا دی جائے تو اس سے بہتر جواب دو یا کم از کم اسی کو لوٹا دو۔ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ حَسِیْبًا بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی ضائع نہیں کرے گا۔ اور خلوص و محبت کے ساتھ ایک دوسرے کو سلام کہنے پہ جنت نصیب فرما دیگا۔

اسلام کی بنیاد توحید

فرمایا اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں یہ اسلام کی بنیاد ہے اور ہمیشہ مدنظر رہنی چاہیئے۔ اگر بنیاد درست ہو گی تو تمام معاملات درست ہوں گے اگر بنیاد ہی غلط ہو گئی، تو اس پہ تعمیر ہونے والی پوری عمارت خراب ہو گی۔ لہٰذا اسلام کے بنیادی عقیدہ توحید کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیئے، اسی پہ تمام اعمال کا دارو مدار ہے۔ تمہاری عبادات، جہاد، سلام، ملاقاتیں سب اس بنیادی عقیدہ کے تابع ہیں۔ یہی تمہارا نظریہ (IDEOLOGY) اور جب اس پہ یقین مکمل ہو جائے تو یاد رکھو لَیَجْمَعَنَّکُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ اللہ تعالیٰ تم سب کو قیامت کے دن اکٹھا کرے گا، وہاں محاسبہ ہو گا، لہٰذا اپنے بچاؤ کا سامان کر لو۔

ایسا نہ ہو کہ وہاں تمہارے نامہ اعمال میں کچھ نہ نکلے، وہاں کے محاسبے کے لیے ابھی سے تیاری شروع کر دو۔ اور وہ قیامت اور محاسبے کا دن ایسا ہے "لَا رَیْبَ فِیْہِ" جس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں، وہ بہرصورت آکر رہے گا، اللہ تعالےٰ نے یہ سب باتیں واضح کر دیں۔

حاصل کلام

فرمایا اللہ تعالیٰ نے یہ باتیں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیْثًا اور اللہ کی بات سے بڑھ کر سچی بات کس کی ہو سکتی ہے۔ وہ اصدق القائلین ہے۔ اس کے تمام احکام اور فرامین برحق ہیں لہذا ہر انسان کا فرض ہے۔ کہ وہ بلاچون وچراں ان پر عمل پیرا ہو اور اس سلسلہ میں کسی شک وشبہ کو اپنے دل میں جگہ نہ دے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاد کے بعد سفارش کا مسئلہ اور پھر سلام و دعا کی تفصیل سے بھی آگاہ کر دیا۔ مکارم اخلاق کی تربیت بھی دے دی۔ اب آئندہ جہاد کا وہی سلسلہ آگے چلے گا جو گذشتہ رکوع سے بیان ہو رہا ہے۔ اور ساتھ ساتھ منافقین کی مذمت کا پہلو بھی ہے یہ سلسلہ آگے دور تک چلا جائے گا۔

درس چہل و ہفت ۴۷ — آیت ۸۸ تا ۸۹

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ
بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ
وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾
وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً
فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ
حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا
وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾

ترجمہ: پس کیا ہو گیا ہے تمہیں (اے اہل ایمان) منافقوں کے بارے میں کہ تم دو گروہ ہو گئے ہو۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اُلٹ دیا ہے ان کے اعمال کی وجہ سے جو انہوں نے کمائے ہیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ راہ راست پر لاؤ اُن کو جنہیں اللہ نے گمراہ کر دیا ہے اور جس کو اللہ گمراہ کر دے پس ہرگز نہ پائیگا تو اس کے لیے راستہ ﴿۸۸﴾ یہ تو چاہتے ہیں (پسند کرتے ہیں) کہ تم بھی کفر کرو جیساکہ انہوں نے کفر کیا اور ہو جاؤ تم برابر (سو تمہیں یہ حکم دیا جاتا ہے اے اہل ایمان) نہ بناؤ ان میں سے کسی کو اپنا ساتھی، یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں اللہ کے راستے میں اور اگر وہ روگردانی کریں پس اُن کو پکڑو اور مارو جہاں بھی اُن کو پاؤ اور نہ بناؤ اُن میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار ﴿۸۹﴾

منافقوں کی دو قسمیں

منافقین کی مذمت کا سلسلہ پیچھے سے چلا آرہا ہے اور اُن کی مختلف سازشوں کا پردہ چاک ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں جہاد فی سبیل اللہ اور دیگر ضروری مسائل بھی بیان ہو چکے ہیں۔ آج کی آیات بھی منافقین ہی سے متعلق ہیں۔ اِن میں اہل اسلام کو تنبیہ کی گئی ہے۔ کہ وہ منافقین کے بارے میں مختلف آراء سے پرہیز کرتے ہوئے کسی ایک رائے پر ہی متفق رہیں اور انہیں کوئی ایسا موقع نہ دیں کہ وہ الٹا تمہیں گمراہ کر سکیں

مفسرین کرام نے منافقین کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ پہلی قسم اعتقادی منافقین کی ہے اور دوسری عملی منافقین کی۔ اعتقادی منافق وہ ہے جو بظاہر کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا دِل کفر پر جما رہتا ہے۔ نزولِ قرآن کے زمانہ میں مدینہ میں اکثر منافقین کا تعلق اِس قسم کے ساتھ تھا۔ وہ حصول مقصد یا کسی ممکنہ نقصان سے بچنے کے لیے کلمہ شہادت زبان سے تو ادا کر لیتے تھے مگر اُن کا باطن ایمان سے خالی ہوتا تھا۔ منافقین کی یہ بدترین قسم ہے، جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اسی سورۃ میں واضح فرما دیا ہے اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ منافقین جہنم کے زیریں ترین اور بدترین حصے میں ہوں گے۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں اکثر منافقین یہودیوں میں سے تھے۔ منافقین کا تذکرہ قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں موجود ہے۔ سورۃ بقرہ، آل عمران اور اسی سورۃ نساء میں ان کے قبیح خصائل کا تذکرہ ہے منافقین کے نام سے مکمل سورۃ بھی موجود ہے۔ سورۃ توبہ میں بھی اِن کے متعلق بہت کچھ آیا ہے مقصد یہ ہے کہ اہل ایمان ان بدبختوں کی سازشوں سے ہوشیار رہیں اور ان کے دامِ فریب میں نہ پھنس جائیں۔

منافقوں کی دوسری قسم عملی منافق ہیں۔ ایسے منافقین کا ذکر احادیث میں کثرت سے آیا ہے۔ اِن کو اخلاقی منافق بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ دل میں نورِ ایمان موجود ہے، توحید کی تصدیق بھی کرتے ہیں مگر عمل اور اخلاق اس کے خلاف ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسے منافق کی نشانیاں یہ بتائیں اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ جب بات کرے جھوٹ

بولے اِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ جب وعدہ کرے تو خلاف کرے وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ یہ عملی منافق ہیں۔ آپ کے زمانے کے بعد اور ہر زمانہ میں عملی منافق کثرت سے موجود رہے ہیں۔ آج بھی دیکھ لیں کہ زبانی عقیدہ تو درست ہے مگر قول و فعل میں تضاد ہے نماز کو فرض مانتا ہے مگر نہیں پڑھتا۔ جانتا ہے کہ روزہ فرض ہے مگر نہیں رکھتا چوری، خیانت، جھوٹ، حرام ہیں مگر کیے چلا جا رہا ہے، یہی عملی منافقت ہے اور اس قسم کے منافقین سے دنیا بھری پڑی ہے۔

اس آیت میں مذکورہ منافقین

آج کی آیت میں جن منافقین کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اُن کا تعلق کس گروہ کے ساتھ ہے۔ کیا اِن سے مراد اعتقادی منافق ہیں یا عملی منافق۔ حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان سے وہ اعتقادی منافق مراد ہیں۔ جو اُحد کے موقع پر عبداللہ بن ابی کی قیادت میں راستے ہی سے واپس چلے گئے تھے اور اس جنگ میں مسلمانوں کو کافی جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اِن منافقوں کے متعلق اہل ایمان کی دو رائیں ہو گئی تھیں۔ بعض کہتے تھے کہ ان کے ساتھ بالکل کافروں جیسا سلوک ہونا چاہیے اور بعض دوسرے اُن کے لیے قدرے نرم گوشہ رکھتے تھے۔

تفسیر روح المعانی میں یہ بات بیان کی گئی ہے۔ کہ اس آیت میں مذکور منافقین سے وہ کفار مراد ہیں جو مکے سے مدینے آئے، اسلام کے ساتھ اظہار ہمدردی بھی کیا اور پھر تجارت کے بہانے سے واپس مکے چلے گئے۔ در اصل اِن لوگوں کو اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا، بلکہ یہ لوگ جاسوسی کی غرض یا کسی دیگر سازش کے تحت مدینے آئے تھے اور پھر واپس چلے گئے اِن کے متعلق بھی اہل ایمان دو مختلف رائیں رکھتے تھے۔ بعض کہتے تھے کہ وہ ایمان لا چکے ہیں مگر کسی مجبوری کی وجہ سے واپس نہیں آسکے جب کہ دوسرے لوگوں کا خیال تھا، کہ یہ کافر تھے اور کفر پر ہی واپس چلے گئے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس پورے رکوع میں جن منافقین کا ذکر ہے اُن سے مراد دراصل کافر ہیں۔ اور منافق کا لقب انہیں محض لغوی اعتبار سے دیا گیا ہے، کیونکہ منافق ذی وجہین یعنی دو رُخہ ہوتا ہے۔ اِدھر کچھ بات کی اور اُدھر کچھ اور سکیم بنائی۔ بہرحال شاہ صاحب کی تحقیق بھی یہ ہے۔ کہ یہ آیات مکے کے اُن کافروں کے متعلق ہیں جو مدینے آکر واپس چلے گئے تھے، نہ کہ مدینہ کے اعتقادی منافق۔

چونکہ اہل ایمان اِن کے متعلق دو مختلف رائے رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اسے ناپسند فرمایا اور کہا فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ کہ منافقوں کے بارے میں تم دو گروہ ہوگئے ہو۔ وَاللّٰهُ أَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اُلٹ دیا ہے اُن کی کمائی کی وجہ سے۔ لہذا تمہیں اُن کے متعلق مختلف رائیں نہیں رکھنی چاہئیں۔ بلکہ ایک بات پر متفق ہوجانا چاہیئے کہ یہ کافر ہیں اور بہت بُرے لوگ ہیں۔ اِن کی کرتوتوں کی وجہ سے اللہ نے انہیں ذلیل وخوار کردیا ہے لہذا اِن کے متعلق کوئی اچھا گمان نہ رکھو۔ اللہ نے اگلی آیت میں اُن کے خلوص کا معیار بھی مقرر کردیا ہے۔ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ جب تک یہ ہجرت کرکے مدینہ طیبہ نہ آجائیں یہ قابلِ اعتماد لوگ نہیں ہیں۔ لہذا انہیں اُس وقت تک کافر ہی تصور کیا جائے۔

ہجرت کی تین قسمیں

ہجرت تین اقسام سے ہے۔ اِسکی پہلی قسم تو فرض ہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے کہ جب کسی علاقے میں کفار کا اس قدر غلبہ ہو کہ اہل ایمان شعار اسلام اور شعار ایمان ادا نہ کرسکیں تو وہاں سے ہجرت فرض ہوجاتی ہے۔ چنانچہ ابتدائے اسلام میں جب کفارِ مکہ نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کردیا تو اُن کے لیے ہجرت واجب ہوگئی چنانچہ مسلمانوں نے دو دفعہ حبشہ کی طرف ہجرت کی اور تیسری دفعہ مدینہ میں آکر قیام پذیر ہوگئے اسوقت ایمان کا معیار ہی یہ تھا، کہ کفار کے زیر تسلط رہنے والا مسلمان

جب تک ہجرت نہیں کرتا اُس کے ایمان کا کچھ اعتبار نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص کسی بھی وقت کفار کے غلبہ سے مغلوب ہو کر ایمان کا دامن چھوڑ سکتا ہے۔ چنانچہ اس سورۃ میں بھی اور دیگر سورتوں میں بھی اس معاملہ میں سخت وعید آئی ہے اسی سورۃ میں پہلے گزر چکا ہے۔ کہ کچھ کمزور مرد، عورتیں اور بچے مکہ میں رہ گئے تھے۔ کفار کے مظالم برداشت کرتے تھے مگر ہجرت کے لیے طاقت نہیں رکھتے تھے، بیچارے مجبور تھے۔ ایسے لوگوں کو تو معذور سمجھا جا سکتا ہے، مگر کوئی صحت مند جوان اور ہجرت کی استطاعت رکھنے والا شخص اگر ہجرت نہیں کرتا، تو اُس کے ایمان کا کچھ اعتبار نہیں کیا جاتا تھا، ہجرت بہر صورت ایک مشکل کام ہے اور اس کے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے اِنَّ شَانَ الْهِجْرَةِ لَشَدِيْدٌ ہجرت کا معاملہ بڑا دشوار ہے۔ بہر حال یہ ہجرت ابتدائے اسلام کے زمانہ سے فتح مکہ تک فرض تھی۔ جب مکہ فتح ہو گیا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ یعنی فتح کے بعد ہجرت کی ضرورت نہیں۔ ہاں! اگر پھر کسی جگہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں جیسے مکہ میں تھے۔ کفار کے غلبہ کی وجہ سے اہل ایمان اپنے ایمان کو قائم نہ رکھ سکتے ہوں، تو اُن پر وہاں سے ہجرت فرض ہو جائیگی۔

یہاں پر مسئلہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ جو شخص ایک دفعہ دار الکفر سے ہجرت کر کے دار الاسلام آگیا اور دوبارہ دار الکفر میں چلا گیا، اسکی ہجرت باطل ہو جائے گی۔ اسی لیے حضور علیہ السلام صحابہ کرام کے متعلق دُعا کیا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ اَمْضِ لِاَصْحَابِیْ هِجْرَتَهُمْ اے اللہ! میرے صحابہ کی ہجرت کو جاری فرما کسی کی ہجرت باطل نہ ہو۔ مگر حضرت سعد ابن خولہؓ کی ہجرت باقی نہ رہی کیونکہ وہ حجۃ الوداع کے موقع پر اونٹنی سے گر کر شہید ہو گئے تھے۔ حضور نے اُن کی وفات پر اظہار افسوس کیا کہ وہ جہاں سے ہجرت کر گئے تھے اُن کی موت اسی جگہ واقع ہوئی۔ بہر حال ہجرت کا معاملہ بڑا دشوار ہے۔ کیونکہ اسمیں گھر بار، خاندان، قبیلہ، مکان، زمین اور ہر قسم کی جائداد کی قربانی دینی پڑتی ہے

تاہم جہاد کیطرح یہ بھی ضروری ہے اور کوتاہی کرنے والے کے لیے جہنم کی وعید آئی ہے ۔
ہجرت کی دوسری قسم یہ ہے ۔ کہ آدمی پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ جہاد میں شریک ہو جائے ۔ منافقین مدینہ کے لیے یہ بڑی دشوار تھی ۔ وہ حیلے بہانے سے جہاد سے گریز کرتے تھے ، پیچھے رہ جاتے تھے ۔ چنانچہ اُحد کے موقع پر ایسا ہوا کہ عبداللہ بن ابی تین سو آدمیوں کی جماعت کے ساتھ اس لیے واپس آگیا کہ ان کی رائے کا احترام نہیں کیا گیا تھا ۔ وہ مدینہ میں رہ کر دشمن کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے جب کہ صحابہ کی اکثریت باہر میدان میں نکل کر لڑائی کرنا چاہتی تھی ۔ ان منافقین کے متعلق بھی بعض مسلمان اچھا خیال رکھتے تھے کہ یہ کلمہ گو ہیں ۔ نمازیں پڑھتے ہیں ، ہر مجلس میں شامل ہوتے ہیں ۔ لہٰذا ان کے متعلق بدگمانی نہیں ہونی چاہیئے ۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب تک یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شریک نہ ہوں ۔ ان کا کچھ اعتبار نہیں ۔ لہٰذا ان کی ہجرت یہ تھی کہ وہ جہاد میں شامل ہو جائیں ۔
ہجرت کی تیسری قسم کے متعلق حضور علیہ السلام کی حدیث مبارک ہے کہ مومن وہ ہے جو اپنے پڑوسیوں کے ساتھ امن و امان سے وقت گزارے ، اُن کو تکلیف نہ پہنچائے ، اور مسلمان وہ شخص ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں ۔ پھر فرمایا وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ مہاجر وہ ہے جو ہر اُس چیز کو چھوڑ دے جس سے اللہ نے منع فرمایا ہے ۔ حقیقی مہاجر وہ ہے جو گناہ سے بچ جائے ۔ گھر بار اور وطن چھوڑنے کے باوجود اگر اسلام کے باقی احکام پورے نہیں کرتا ، اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے اجتناب نہیں کرتا ، تو وہ حقیقی مہاجر نہیں ہے ۔

الغرض ! فرمایا کہ اے ایمان والو ! تمہیں کیا ہو گیا ہے ۔ کہ تم ان کافروں کے متعلق دو رائیں رکھتے ہو ۔ تمہاری اجتماعیت کا تقاضا ہے کہ ہمیشہ ایک رائے پر متفق ہو جایا کرو ۔ دشمنانِ دین کے متعلق تمہیں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے امریکہ ہو یا روس ، یہود ہوں یا ہنود اسلام دشمنی میں یہ سب متفق ہیں ۔ مگر مسلمانوں کی

مرکزیت کا فقدان

اجتماعیت کا شیرازہ بکھر چکا ہے، یہ اپنوں کی بجائے غیروں سے دوستانہ رکھتے ہیں، ان سے غلط توقعات وابستہ کرتے ہیں اور پھر نقصان اٹھاتے ہیں۔ حالانکہ قرآن پاک بتلا رہا ہے کہ مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع ہونا چاہیئے، ان سب کی ایک رائے ہونی چاہیئے۔ مگر اجتماعیت کے فقدان نے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ آج کسی ملک یا کسی علاقے میں کسی مسلمان پر افتاد آجائے تو کوئی دوسرا مسلمان اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ آج مسلمان اغیار کے دام فریب میں گرفتار ہیں۔ ان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کو تیار نہیں۔ آج کون ہے جو فلسطین افغانستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کی مدد کو پہنچے۔ ہماری حکومتیں بڑی طاقتوں سے اس قدر مرعوب ہیں۔ کہ وہ کسی کو مسلمانوں کی امداد کے لیے جانے کی اجازت بھی نہیں دے سکتیں۔ وجہ یہی ہے۔ کہ آج ہم مرکزیت کو بھول چکے ہیں۔ دنیا میں اتنی بڑی تعداد میں مسلمان آباد ہیں مگر ہر ایک کی رائے جُدا جُدا ہے، نہ کوئی مرکز ہے اور نہ اس کے تحت مسلمان کوئی مفاد حاصل کر رہے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا اپنا زمانہ مبارک اور خلفائے راشدین کا زمانہ مرکزیت کا زمانہ تھا، اس وقت تمام دنیائے اسلام ایک مرکزی حکم کی پابند تھی، سب ایک رائے پر متفق تھے، مگر آج یہ چیز ختم ہو چکی ہے اس لیے مسلمان طرح طرح کے مصائب کا شکار ہیں۔

باطل نظام ہائے معیشت

اس وقت دنیا میں دو بڑے نظام ہائے معیشت جاری ہیں ایک انگریز کا نظام سرمایہ داری اور دوسرا سوشلسٹ ملکوں کا اشتراکی نظام مگر یہ دونوں باطل ہیں۔ انگریز سے دوستانے اور سرمایہ دارانہ نظام نے مسلمانوں کو کتنا نقصان پہنچایا ہے۔ سرمایہ داری نظام محض مفاد پرستی پر مبنی ہے اس میں حلال حرام کی کوئی تمیز نہیں دولت جس راستے سے چاہو کماؤ اور جس راستے میں چاہو خرچ کرو۔ کسی پر کوئی پابندی نہیں مقررہ ٹیکس ادا کر کے گورنمنٹ سے لائسنس حاصل کر لو اور پھر چاہے سینما جاری کر لو، شراب کی دکان کھول لو یا قحبہ خانہ چلا لو، ہوٹل قائم کر لو جہاں پر شراب اور خنزیر کا گوشت کھلاؤ، کون پوچھتا ہے۔ اشتراکی نظام کی اپنی قباحتیں ہیں۔ وہاں

انسان اور حیوان میں کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا، انسان کو کوہلو کے بیل کی طرح چلایا جاتا ہے اور پھر اُس کی جائز ضروریات بھی پوری نہیں کی جاتیں۔ یہ دونوں نظامہائے معشیت باطل ہیں۔ قرآن پاک کا اپنا نظام معیشت ہے جس کی بنیاد اللہ کی توحید اور قیامت کے تصور پر ہے یہ نظام اللہ تعالیٰ کی حدود پر قائم ہوتا ہے۔ حرام حلال کی تمیز سکھاتا ہے۔ نہ ناجائز ذرائع سے طلب زر کی اجازت دیتا ہے اور نہ ناجائز امور پر خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اسلام کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ کسی کا مال ناحق مت کھاؤ۔ اللہ کا یہ بھی حکم ہے لَا تُسْرِفُوْا اگر مال آگیا ہے۔ تو اُسے ضائع نہ کرو۔ وَلَا تُبَذِّرْ وا فضول خرچی نہ کرو۔ اُسے جائز امور پر خرچ کرو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسراف وتبذیر کی کون جرأت کر سکتا تھا، وہ کمائی پر قدغن لگاتے تھے اور اخراجات کو بھی کنٹرول کرتے تھے، مگر آج فضول خرچی کو کون روک سکتا ہے ہمارے ملک میں اتنی بڑی بڑی عمارتیں بن رہی ہیں جن کی نقشہ نویسی پر ہی لاکھوں روپیہ لگ جاتا ہے۔ ذرا اندازہ فرمائیں کہ ایسی عمارتوں کی کل لاگت کیا ہوگی۔ یہ سب فضول خرچی اور عیاشی ہے جو کہ مرکزیت سے عدم تعلقی کی وجہ سے ہے۔

آگے اہل ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم کفار سے دوستانہ اس لیے کرتے ہو کہ شاید وہ راہ راست پر آجائیں، اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ کیا تم ان لوگوں کو ہدایت یافتہ بنانا چاہتے ہو، جنہیں اللہ نے گمراہ کر دیا ہے۔ فرمایا یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔ کیونکہ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے، اُسے کون راہ راست پر لا سکتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے بِمَا كَسَبُوْا اُن کی اپنی کمائی کی وجہ سے۔ جب وہ حق کی مخالفت پر تُل جاتے ہیں۔ تو پھر اللہ انہیں سیدھے راستے سے بھٹکا دیتا ہے دوسرے مقام پر فرمایا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ "اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ جب تک ظالم اپنے ظلم۔

ہدایت بدست خدا

باز نہ آجائے اور سچی توبہ نہ کرلے اُس وقت تک اُسے ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی ۔ فرمایا کفار و منافقین کی بُری کمائی کی وجہ سے اللہ نے انہیں الٹ دیا ہے تم انہیں کیسے ہدایت کی راہ پر چلا سکتے ہو ۔

اغیار کی دلی خواہش

فرمایا اسلام دشمن طاقتوں کی خواہش یہ ہے ۔ وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح کفر کا راستہ پکڑ لو جس طرح وہ خود کفر کیے بیٹھے ہیں ۔ ساری دنیا کے کفار کی یہی تمنا ہے ۔ یہودی ہوں یا عیسائی ، ہندو ہوں یا کوئی اور سب چاہتے ہیں کہ اہل ایمان کو اپنے دین میں داخل کرلیں ، وہ چاہتے ہیں کہ اُن کی طرح تم بھی شتر بے مہار ہو جاؤ ، نہ حلال حرام کی تمیز اور نہ جائز ناجائز کی فکر ۔ جس طرح چاہو کماؤ اور جیسے چاہو خرچ کرو ۔ پہلے دو سو سال تک برطانیہ کا طوطی بولتا تھا ، وہ من مانی کرواتا رہا ۔ اب اس کی جگہ امریکہ آگیا ہے اس کی خواہش بھی یہی ہے ، کہ ساری دنیا اسی کے پیچھے لگ جائے ۔ یہ سب طاغوت ہیں اور لوگوں سے اپنا اتباع کرانا چاہتے ہیں ۔ پھر فرمایا کہ اغیار کی خواہش پر انہی کا طریقہ اختیار کر لینے سے ان کی مراد یہ ہے فَتَكُونُونَ سَوَآءً تاکہ سب برابر ہو جائیں ، کوئی کسی کو کہنے والا نہ ہو ۔ مگر اللہ نے اسلام کے متبعین کو فرمایا فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ اُن میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ ۔ یہ سب تمہارے دشمن ہیں ۔ دوستی کی آڑ میں تمہارے ساتھ دھوکا کرنا چاہتے ہیں ۔ لہٰذا ان سے بچ کر رہو ۔ جب تک یہ لوگ اپنی روش ترک نہ کریں اور دار الکفر کو چھوڑ کر دار الاسلام میں نہ آجائیں اور پھر تمہارے ساتھ جہاد میں شریک نہ ہو جائیں حَتّٰى يُهَاجِرُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ یعنی ہجرت جیسا اہم فریضہ پورا نہ کریں ، اُس وقت تک ان کا کچھ اعتبار نہیں اللہ تعالیٰ نے اُن کی دوستی سے منع فرما دیا ۔

اُن کے لیے حکم

فرمایا فَاِنْ تَوَلَّوْا اگر وہ روگردانی کریں ۔ تمہارے ساتھ شامل نہ ہوں ، کفار کی چاپلوسی ترک نہ کریں تو پھر سمجھ لو کہ یہ پکے کافر ہیں ۔ پھر اُن کا علاج یہ ہے فَخُذُوهُمْ اُن کو پکڑ لو وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوهُمْ اور انہیں جہاں

بھی پاؤ مارو۔ وَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيرًا اور نہ بناؤ اُن میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ آیت کے اس حصہ سے واضح ہے کہ اِن لوگوں سے مراد مکے کے کافر ہیں کیونکہ اعتقادی منافقوں کو مارنے کا حکم نہیں تھا۔ عبداللہ بن ابی اور دوسرے منافقین کے بعض نفاق جب ظاہر ہوتے تھے۔ تو صحابہ انہیں قتل کر دینے کی اجازت طلب کرتے تھے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ اگر منافقین کو قتل کرنا شروع کر دیا گیا تو اَنَّ النَّاسَ يَتَحَدَّثُونَ اَنَّ مُحَمَّدًا يَقْتُلُ اَصْحَابَهٗ لوگ باتیں بنانے لگیں گے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو قتل کرنے لگے ہیں۔ اور اس طرح دین کی تبلیغ میں رکاوٹ پڑے گی۔ لہٰذا حضورؐ منافقین کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ البتہ ان پر زبانی کلامی سختی کا حکم دیتے تھے۔ گویا کافروں کے ساتھ عملی سختی کا حکم تھا اور منافق کے ساتھ زبانی سختی روا تھی۔ بہر حال اس آیت میں مذکورہ لوگ ہیں۔ جو در اصل کافر ہی تھے مگر چاپلوسی کے ذریعے مسلمانوں کو اپنی حمایت کا یقین دلاتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے نفاق کا راز فاش کر دیا اور ان کے ساتھ مقاتلہ کی اجازت دیدی بلکہ حکم صادر فرما دیا۔

البتہ جن لوگوں سے لڑنے کی اجازت نہیں دی گئی، اُن کا ذکر اگلی آیت میں آئے گا۔ یہ بعض قسم کے منافقین ہیں۔ جنہیں مخصوص حالات میں لڑائی سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ اسکی تفصیل آگے آئیگی۔

إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ
مِّيثَاقٌ أَوْ جَاءُوكُمْ حَصِرَتْ صُدُورُهُمْ أَنْ
يُّقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ
لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقَاتَلُوكُمْ ۚ فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ
فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا
جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا ﴿٩٠﴾ سَتَجِدُونَ
آخَرِينَ يُرِيدُونَ أَنْ يَّأْمَنُوكُمْ وَيَأْمَنُوا قَوْمَهُمْ
كُلَّمَا رُدُّوا إِلَى الْفِتْنَةِ أُرْكِسُوا فِيهَا ۚ فَإِنْ
لَّمْ يَعْتَزِلُوكُمْ وَيُلْقُوا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ
وَيَكُفُّوا أَيْدِيَهُمْ فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ
حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ ۚ وَأُولَٰئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ
عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُّبِينًا ﴿٩١﴾ ع

۱۲ ع ۹

ترجمہ :۔ مگر وہ لوگ جو ملتے ہیں اُن لوگوں سے کہ تمہارے اور اُن کے درمیان عہدوپیمان ہے یا وہ لوگ جو تمہارے پاس اس حال میں آتے ہیں کہ ان کے دِل تنگ ہیں تمہارے ساتھ لڑنے سے یا اپنی قوم کے ساتھ لڑنے سے اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا، پس وہ تم سے لڑتے، پس اگر وہ الگ

رہیں تم سے اور تم سے نہ لڑیں اور تمہاری طرف صلح کی پیشکش
ڈالیں تو پس نہیں بنایا اللہ نے تمہارے لیے اُن پر کوئی راستہ ﴿۹۰﴾
تم پاؤ گے کچھ اور لوگوں کو کہ وہ چاہتے ہیں کہ تم سے بھی
امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں (لیکن وہ ایسے
ہیں) کہ جب بھی اُن کو پلٹایا جاتا ہے فتنے کی طرف تو اس طرف پلٹا
دیے جاتے ہیں پس اگر یہ تم سے الگ نہ رہیں اور تمہاری طرف
صلح کی پیش کش نہ کریں اور اپنے ہاتھوں کو نہ روکیں۔ پس پکڑو اُن
کو، اور مارو اُن کو جہاں بھی پاؤ اور یہی لوگ ہیں کہ ہم نے بنایا ہے
تمہارے لیے اُن کے اُوپر کھلا غلبہ ﴿۹۱﴾

ربط آیات

گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو متنبہ کیا، کہ وہ منافقین کے بارے میں دو رائیں نہ رکھیں بلکہ اُن کے خلاف واحد مشترکہ پالیسی اختیار کریں۔ اعتقادی منافقین کو یہ رعایت حاصل ہے کہ انہیں قتل نہ کیا جائے بلکہ زبانی طور پر اُن سے سختی برتنی چاہیے، البتہ انہیں قتل کرنے کا حکم نہیں ہے اُن کا اعتماد صرف اِسی صورت میں بحال ہو سکتا ہے کہ وہ جماعت المسلمین میں پورے خلوص کے ساتھ داخل ہو جائیں اور پھر اُن کے ساتھ جہاد میں بھی شریک ہوں۔ محض زبانی کلمہ پڑھ لینے سے اُن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، گذشتہ درس میں جن منافقین کا ذکر تھا، وہ دراصل کافر ہیں، جو مسلمانوں سے مل کر محبت کا اظہار کرتے ہیں اور چاپلوسی بھی کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں کی طرف سے کسی ممکنہ تکلیف سے بچ جائیں اُدھر جب اپنی کفار کی جماعت میں جاتے ہیں۔ تو اُن کے ساتھ تعاون کرتے ہیں ایسے منافقین کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اُن کے متعلق دو رائیں نہ رکھو، یہ خدا اور اس کے دین کے دشمن ہیں۔ ان کا حکم خالص کافروں جیسا ہے۔ انہیں جہاں بھی پاؤ ان کے ساتھ لڑائی کرو۔ انہیں اپنا دوست اور مددگار نہ سمجھو، یہ خطرناک لوگ ہیں۔

رعایت بوجہ معاہدہ

اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے واضح کیا ہے کہ صرف دو صورتیں ایسی ہیں

جن میں مذکورہ کفار منافقین کو رعایت دی جا سکتی ہے اور یہ مسلمانوں کے عتاب سے بچ سکتے ہیں۔ فرمایا اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ وہ لوگ مستثنا ہیں جو ایسے لوگوں سے ملتے ہیں بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ کہ تمہارے اور اُس قوم کے درمیان عہد و پیمان ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ جس گروہ کے ساتھ کوئی معاہدہ ہو چکا ہے، اس کے ساتھ لڑنے کی اجازت نہیں۔ اور اگر یہ منافق قسم کے کافر تمہارے ساتھ معاہدہ میں شریک لوگوں سے جا ملتے ہیں۔ تو پھر اُس معاہدہ کی رُو سے اِن کو بھی امان حاصل ہو گی اور ان کے ساتھ جنگ نہیں کی جائے گی۔ اس کی مثال معاہدہ صلح حدیبیہ ہے اس معاہدہ کی رو سے بعض قبائل مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو گئے تھے اور بعض نے قریش مکہ کے ساتھ شریک ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ چنانچہ بنو خزاعہ مسلمانوں کے حلیف تھے اور بنو کنانہ قریش مکہ کے تو فرمایا کہ اس قسم کے عہد و پیمان میں شامل لوگوں کے ساتھ لڑائی کی اجازت نہیں۔ لہٰذا اگر یہ کفار منافقین کسی ایسے فریق کے ساتھ اتحاد کر لیتے ہیں جس کے ساتھ تمہارا بعض شرائط پر معاہدہ ہو چکا ہے۔ تو پھر ان کے ساتھ بھی لڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ استثنٰی کی پہلی صورت ہے۔

رعایت بوجہ عجز

فرمایا ایسے لوگوں کے ساتھ رعایت برتنے کی دوسری صورت یہ ہے اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ کہ وہ تمہارے پاس اس حالت میں آجائیں۔ کہ اُن کے دِل تمہارے ساتھ لڑنے یا کفار کے ساتھ لڑنے سے تنگ آچکے ہیں وہ اس قدر عاجز آچکے ہیں اور اپنے آپ کو اتنا بے بس پاتے ہیں۔ کہ نہ تم سے نبرد آزما ہو سکتے ہیں۔ اور نہ تمہارے ساتھ مل کر اپنی قوم کے خلاف لڑ سکتے ہیں۔ تو فرمایا ایسے لوگوں کو بھی رعایت حاصل ہے کہ مسلمان اُن کے خلاف ہتھیار نہ اٹھائیں۔

حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک میں اس قسم کے بعض واقعات ملتے ہیں مثلاً سراقہ بن مالک رض مدلجی حضور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اُس وقت تک

اسلام نہیں لایا تھا، اور عرض کیا۔ کہ حضور! معلوم ہوا ہے کہ آپ ہمارے قبیلہ مدلج کی طرف حضرت خالد بن ولیدؓ کو سرکوبی کے لیے بھیج رہے ہیں، مگر ہماری پالیسی اس وقت یہ ہے کہ ہم آپ کے خلاف بھی نہیں لڑتے، نہ دوسروں کا ساتھ دیتے ہیں۔ ہم تو قریش کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اگر وہ اسلام قبول کر لیں گے، تو ہم بھی کر لیں گے۔ اگر وہ نہیں مانتے، تو پھر ہم از خود سوچیں گے کیا کرنا ہے۔ بہر حال ہم مسلمانوں کے خلاف ہرگز نہیں۔ تو فرمایا جو لوگ اس قسم کی عاجزی کا اظہار کریں کہ وہ نہ از خود مسلمانوں کے ساتھ لڑنے کے لیے تیار ہوں اور نہ اسلام کے خلاف دوسروں کی مدد کریں تو ان کے ساتھ بھی لڑائی کی اجازت نہیں ہے، وہ بھی مستثنیٰ ہیں۔

اللہ کی خاص مہربانی

فرمایا وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو انہیں تم پر مسلط کر دیتا فَلَقٰتَلُوْكُمْ اور تم سے لڑائی کرتے۔ مگر یہ اُس مالک الملک کی خاص مہربانی ہے۔ کہ انہیں تم پر غالب نہیں ہونے دیا۔ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ پس اگر یہ تم سے الگ رہیں فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ اور تمہارے ساتھ لڑائی کرنے سے باز رہیں وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ اور تمہاری طرف صلح کی پیش کش ڈالیں۔ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے خلاف تمہارے لیے کوئی راستہ نہیں بنایا۔ مطلب یہ ہے۔ کہ اگر وہ تم سے آمادہ جنگ نہیں ہوتے بلکہ صلح کا ہاتھ بڑھاتے ہیں تو پھر اُن کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہو۔ یہ صلح و جنگ کے قوانین ہیں جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے ہیں۔ اسلام کسی دشمن کے خلاف بھی اس وقت تک کارروائی کی اجازت نہیں دیتا جب تک اُس کا شر و فساد واضح نہ ہو جائے لہٰذا ایسے کفار کے ساتھ بھی جنگ نہ کرو، جو تمہارے ساتھ جنگ کرنے کی بجائے صلح پہ آمادہ ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کا معاہدہ ہے اور مسلمان معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ فرمایا اس قسم کی پیش کش کو قبول کر لو۔

قوانین صلح و جنگ

صلح و جنگ کے بعض قوانین اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں بیان کیے اور بعض

دیگر قوانین سورۃ انفال، سورۃ توبہ اور سورۃ فتح میں بھی آتے ہیں۔ یہ ایک پورا نظام صلح و جنگ ہے۔ مگر چونکہ ہم اپنے اجتماعی نظام سے منسلک نہیں ہیں، اس لیے ہمیں علم ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس ضمن میں کیا قوانین نازل فرمائے ہیں۔ صلح و جنگ کے یہ بنیادی اصول اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں اور ان کی شرح احادیث میں موجود ہے۔ پہلی صدیوں میں ان پر ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں اور انہیں عمل درآمد کے لیے بالکل واضح کر دیا ہے دنیا کے کسی مذہب اور لٹریچر میں یہ قوانین اس قدر وضاحت کے ساتھ موجود نہیں جس قدر اسلام نے پیش کیے ہیں مگر آج کی دنیا میں ہم اغیار کے رحم و کرم پر ہیں۔ سیاست بھی اسی کی چلتی ہے جس کا غلبہ ہو غالب قومیں اپنی مرضی کے قوانین نافذ کرتی ہیں۔ جو سراسر ناانصافی پر مبنی ہوتے ہیں۔ آج اسلام کے قانون کو کون پوچھتا ہے۔ حالانکہ یہ منزل من اللہ ہے اور اعلیٰ و ارفع ہے۔ یہ قانون حضور علیہ السلام نے عملی طور پر نافذ کر کے دکھائے آپ کے دس سالہ مدنی دور میں چھوٹی بڑی پچاس جنگیں ہوئیں۔ آٹھ جنگوں میں تو باقاعدہ آمنے سامنے لڑائی ہوئی اور بعض میں لڑائی کی نوبت نہیں آئی اگرچہ اسلامی لشکر میدان جنگ میں پہنچ گیا۔ آپ نے اپنی زندگی میں ______ کسی محاذ پر بڑی فوج بھیجی اور کسی پر چھوٹے دستے۔ کہیں مجاہدین کی تعداد ہزاروں میں تھی اور کہیں سینکڑوں میں۔ مگر آپ نے قوانین صلح و جنگ کو نافذ کر کے ان پر عمل کر کے دکھا دیا۔ بہر حال فرمایا کہ یہ منافق نما کافر صرف دو صورتوں میں مسلمانوں کے عتاب سے بچ سکتے ہیں۔ یا تو یہ ان لوگوں کے ساتھ اتحاد کر لیں جن کے ساتھ مسلمانوں کا عہد و پیمان ہو چکا ہے۔ اور یا وہ اتنے عاجز آ چکے ہوں کہ نہ تمہارے ساتھ لڑنے کی ہمت پاتے ہوں اور نہ ہی اپنی قوم کے خلاف آواز اٹھانے کے قابل ہوں۔ لہٰذا اگر وہ صلح کا ہاتھ بڑھائیں تو ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنی چاہیئے۔

فتنہ پرور لوگ

اس کے بعد فرمایا سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ تم بعض ایسے لوگوں کو بھی

پاؤ گے۔ يُرِيدُونَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ جو چاہتے ہیں کہ تمہاری طرف
سے بھی امن میں رہیں وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ اور اپنی قوم سے بھی امن میں
رہیں۔ فرمایا یہ فتنہ پرور لوگ ہیں۔ اِن کی خصلت یہ ہے کہ كُلَّمَا رُدُّوْٓا
اِلَى الْفِتْنَةِ جب انہیں فتنہ کی طرف پلٹایا جاتا ہے۔ اُرْكِسُوْا فِيْهَا
تو فوراً اس کی طرف پلٹا دیے جاتے ہیں۔ امام ابوبکر جصاص رح فرماتے ہیں۔ کہ یہاں
فتنہ سے مراد کفر اور شرک ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی ہوشیاری اور چالاکی
سے مسلمانوں اور کفار دونوں طرف سے مامون و محفوظ رہنا چاہتے ہیں۔ مگر جونہی
انہیں موقع ملتا ہے یہ فوراً کفر و شرک کی طرف لوٹ جاتے ہیں گویا ان کے دلوں میں
اسلام کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ لوگ مسلمانوں کی طرف سے کی جانی والی
کسی کارروائی سے بچنے کی خاطر اُن کے ساتھ چاپلوسی کا اظہار کرتے ہیں، حقیقت
میں ان کا رجحان کفر و شرک کی طرف ہی ہے مفسرین کرام بیان کرتے ہیں۔ کہ
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ مبارک میں بنی اسد اور بنی غطفان کے قبائل کا یہی
حال تھا۔ وہ کفار اور مسلمانوں دونوں طرف سے مامون رہنا چاہتے اور دونوں طرف
اپنی ہمدردی کا یقین دلاتے تھے۔ مگر جونہی موقع ملتا، وہ کفر و شرک میں مبتلا لوگوں
کے ساتھ مل جاتے اور اس طرح اسلام کی عملی طور پر مخالفت کرتے۔

ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ اگر یہ تم
سے الگ نہ رہیں وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ اور صلح کی پیش کش نہ
کریں وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ اور اپنے ہاتھوں کو تمہارے خلاف لڑنے
سے نہ روکیں۔ مقصد یہ کہ اس قسم کے فتنہ پرداز لوگ اہل ایمان کے ساتھ تعاون
نہ کریں بلکہ موقع ملنے پر انہیں نقصان پہنچانے کے درپے ہوں فَخُذُوْهُمْ
پھر اُن کو پکڑ لو، وَاقْتُلُوْهُمْ ان کے ساتھ لڑائی کرو حَيْثُ
ثَقِفْتُمُوْهُمْ جہاں بھی انہیں پاؤ۔ اب ان کے ساتھ کوئی رعایت
نہیں۔ وہ جہاں بھی ملیں اُن سے لڑو۔ یہ عرب کے مشرکین تھے اور بظاہر مسلمانوں سے

ہمدردی کا اظہار کرتے تھے مگر دل سے کفار کے ساتھ ہی تھے۔

جزیرۃ العرب کی پاکیزگی

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مشرکینِ عرب کے متعلق اللہ تعالیٰ کا آخری فیصلہ یہی ہے کہ انہیں جہاں بھی پاؤ، مارو۔ فتح مکہ کے بعد مشرکین کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا، کچھ لوگ مرتد ہو گئے، جن کا خاتمہ کر دیا گیا اور باقی وہاں سے بھاگ گئے۔ مقصد یہ تھا کہ جزیرۃ العرب کو مشرکین کی نجاست سے بالکل پاک کر دیا جائے کیونکہ اس خطہ زمین کو مرکزِ اسلام کی حیثیت دلانا مقصود تھا۔ حضور علیہ السلام کا اپنا بھی ارشاد موجود ہے۔ کہ جزیرہ نما عرب میں دو دین نہیں چل سکتے"، یہاں ایک ہی دین ہو گا، اور وہ دین اسلام ہے جب وہاں پر حق آ گیا تو باطل کو جانا ہی تھا۔ وہاں پر ایک قبلہ ہو گا، دوسرا نہیں۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ اس سرزمین میں جزیہ کے عوض بھی کسی کو امان دینا روا نہیں کیونکہ وہاں دو دین نہیں چل سکتے۔ دوسرے مقامات پر تو غیر مسلم جزیہ ادا کر کے مامون ہو سکتے ہیں لیکن اس پاک سرزمین پر ایسا کرنے کی گنجائش بھی نہیں۔ وہاں کا اٹل فیصلہ یہی ہے کہ اسلام قبول کر لو، یا وہاں سے چلے جاؤ ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔

اباحت خون

فرمایا اگر یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف ہتھیار اٹھائیں، صلح کی پیش کش نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو پھر یہ جہاں ملیں انہیں قتل کر دو۔ یہ مباح الدم لوگ ہیں۔ ان لوگوں کا خون تمہارے لیے مباح ہے۔ معاہدہ یا صلح کی صورت میں تو خون گرانا حرام ہوتا ہے۔ مگر اس قسم کے سازشی لوگوں کے لیے کوئی رعایت نہیں ان کا معاملہ ویسا ہی ہے۔ جیسا کھلے کافروں کا وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُّبِيْنًا یہی لوگ ہیں۔ کہ ہم نے تمہارے لیے ان پر غلبہ یا کھلی سند بنائی ہے۔ یعنی ان فتنہ پرور لوگوں کا خون تم پر مباح کر دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکوبی کی اجازت دے دی ہے لہذا مذکورہ تین صورتوں کے خلاف یہ جہاں کہیں چاہے جائیں، انہیں قتل کر دو۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا ۚ فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۖ وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۖ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿٩٢﴾

ترجمہ: اور نہیں لائق کسی مومن کے لیے کہ وہ قتل کرے کسی مومن کو مگر غلطی سے ۔ اور جس شخص نے قتل کر لیا، مومن کو غلطی سے (پس اس کے لیے کفارہ ہے) ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ، اور خون بہا جو پہنچایا جائے مقتول کے گھر والوں تک مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں ۔ اگر وہ (مقتول) اُس قوم سے ہے جو تمہاری دشمن ہے اور وہ (مقتول) مومن ہے (تو پھر بھی کفارہ یہ ہے) کہ ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ۔ اور اگر مقتول اُس قوم سے ہے کہ تمہارے اور اُن کے درمیان عہد و پیمان ہے ، تو خون بہا جو

پہنچایا جائے گا اُس کے گھر والوں تک اور ایک مومن غلام کا آزاد کرنا بھی (ضروری ہو گا کفارہ میں) پس جس نے نہ پایا (مومن غلام کو۔ تو اس کے لیے متبادل صورت یہ ہے) روزے رکھے دو مہینے کے مسلسل - یہ ہے توبہ اللہ کی جانب سے ۔ اور اللہ تعالیٰ جاننے والا اور حکمت والا ہے (۹۲)

ربطِ آیات

پہلی آیات میں جہاد کی ترغیب اور مجاہدین کی فضیلت کا ذکر تھا ۔ اور کوتاہی کرنے والوں کو منافقین کے زمرہ میں شمار کیا گیا تھا۔ اور اُن کی مذمت بیان کی گئی تھی اس کے علاوہ چاپلوسی کرنے والے مفاد پرست کافروں کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا حکم دیا گیا۔ اور اہل ایمان کو ہدایت کی گئی کہ وہ اِن کے بارے میں دو رائیں نہ رکھیں بلکہ اِن کو دشمن ہی سمجھیں جب تک کہ یہ ایمان قبول کر کے ہجرت نہ کر لیں ۔ یہ بھی فرمایا کہ اس قسم کے منافقین کے ساتھ کھُلے کافروں جیسا سلوک کیا جائے۔

یہ تو کفار کے ساتھ سختی کرنے کا حکم تھا، کہ انہیں جہاں بھی پاؤ، پکڑ لو اور مارو۔ اب اس کے بالمقابل اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی جان کی حفاظت کا حکم دیا ہے ۔ اور فرمایا کہ مومن کی جان و مال اور عزت محفوظ ہے جب کہ حربی کافر کو یہ رعایت حاصل نہیں۔ یہ تقابلی ربط ہے

مومن کے مال و جان کی حفاظت

اس آیت میں مومن کے مال و جان کی حفاظت کا قانون بتلایا گیا ہے ۔ اور اگر کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دیا جائے تو اس کی سزا کا ذکر ہے ۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ۔ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ کسی مومن کے لائق نہیں ہے أَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا کسی مومن کو قتل کرے ۔ یہ مومن کے قتلِ ناحق کی مطلقاً نفی ہے ۔ یہ بہت بڑی بات ہے ۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک بھی ہے اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے لَا يَخْذُلُهٗ وَلَا يَظْلِمُهٗ نہ اُسے رسوا کرتا ہے اور نہ اُس پر ظلم کرتا ہے ۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ تمام مومن آپس

ہیں کجسدِ واحدِ یعنی ایک جسم کی طرح ہیں۔ جب جسم کے ایک حصہ میں درد ہوتا ہے۔ تو سارا جسم درد محسوس کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا اَلْمُؤْمِنُ مِرْاٰۃُ الْمُؤْمِنِ ایک مومن دوسرے مومن کے لیے آئینہ ہوتا ہے۔ چنانچہ مومن ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنے عیوب کی اصلاح کرتے ہیں نبی علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے قِتَالُ الْمُؤْمِنِ کُفْرٌ وَسِبَابُہٗ فُسُوْقٌ مومن کو قتل کرنا کفر ہے اور اُسے گالی دینا فسق یا نافرمانی ہے۔ کفر اس لیے کہ کافر ہی مسلمان کا دشمن ہوتا ہے کوئی مومن کسی دوسرے مومن کا دشمن نہیں ہو سکتا۔ اس لیے وہ کافروں والے فعل کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔ کہ یہ بڑی ہی قبیح بات ہے۔ ترمذی شریف[1] کی روایت میں یہ بھی آتا ہے لَزَوَالُ الدُّنْیَا اَھْوَنُ مِنْ قَتْلِ رَجُلٍ مُسْلِمٍ کسی مسلمان آدمی کے قتل کے مقابلہ میں پوری دنیا کا نقصان کم ہے۔ حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ اگر ساری دنیا کے لوگ مل کر کسی شخص کو قتل کر دیں تو اللہ تعالیٰ سب کو جہنم میں ڈال دیگا۔ اور اگر ایسا فعل غلطی سے سرزد ہوا ہے اور اس کے احکام آگے بیان ہو رہے ہیں۔ بہر حال قتل ناحق بہت بڑا جرم ہے۔

قتل مومن کی تین صورتیں

حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے۔ کہ کسی مسلمان کی جان لینا روا نہیں بجز تین صورتوں کے۔ پہلی صورت یہ ہے زِنًا بَعْدَ اِحْصَانٍ اگر محصن یعنی شادی شدہ مرد یا عورت زنا کا ارتکاب کرے تو اس کو سنگسار کر دیا جائے یہ قتل حق ہے۔ دوسری صورت ہے اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ یعنی جان کے بدلے جان، اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو ناحق قتل کر دے تو قاتل کو قصاص میں قتل کر دینا بھی جائز ہے۔ اور تیسری صورت یہ ہے التارک لدینہ ومخالفہ للجماعۃ جو شخص دین کو ترک کر کے جماعت المسلمین کو چھوڑ جاتا ہے وہ بھی واجب القتل ہے۔ اس کے علاوہ کسی مسلمان کے قتل کی کوئی جائز صورت نہیں، جو کوئی ایسا کرے گا سخت گنہگار ہو گا۔ اور اُسے قصاص یا خون بہا دینا ہو گا۔

[1] ترمذی ص ۲۲۰ ج ۲ (فیاض)

جب باغیوں نے حضرت عثمانؓ کے گھر کا گھیراؤ کر لیا۔ تو آپ نے مکان کی چھت پر چڑھ کر باغیوں سے خطاب فرمایا کہ لوگو! تم میرے قتل کے کیسے درپے ہو۔ جب کہ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ اور بخدا میں نے کبھی زمانہ جاہلیت میں بھی زنا کا ارتکاب نہیں کیا۔ اور نہ میں نے دین کو چھوڑا ہے۔ میں نے جب سے حضور علیہ السلام کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسلام قبول کیا ہے، اس پر قائم ہوں لہٰذا تمہارے پاس مجھے قتل کرنے کے لیے کیا دلیل ہے۔

قتلِ خطا

تو فرمایا کسی مسلمان کے لیے روا نہیں کہ وہ کسی مسلمان کو قتل کرے اِلَّا خَطَأً مگر غلطی سے۔ قتلِ خطا کی صورت مثلاً یہ ہے۔ کہ کوئی شخص کسی شکاری جانور کو تیر یا بندوق کا نشانہ بناتا ہے مگر وہ غیر ارادی طور پر کسی مسلمان کو لگ جاتا ہے اور وہ ہلاک ہو جاتا ہے تو یہ قتلِ خطا ہوگا۔ ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختم نبوت کے دوران ڈسٹرکٹ جیل میں ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی جو قتل کے کیس میں ملوث تھا۔ دریافت کرنے پر اُس نے بتایا کہ قتل تو ضرور ہوا ہے مگر ایسے کہ میں نے ایک گڑھے کے کنارے بیٹھے ہوئے کبوتر کو بندوق کا نشانہ بنایا۔ میرے علم میں نہ تھا۔ کہ اُسی گڑھے میں کوئی شخص رفع حاجت کے لیے بیٹھا ہوا ہے جونہی میں نے گولی چلائی، تو گڑھے میں موجود آدمی اُٹھ کھڑا ہوا اور گولی کبوتر کی بجائے اُسے جا لگی، جس سے وہ ہلاک ہو گیا۔ میرا اس شخص سے کوئی تنازعہ نہیں تھا، نہ میں نے اُسے ارادتاً قتل کیا ہے۔ بہر حال ایسا غلطی سے ہو گیا ہے۔ یہی قتلِ خطا ہے۔

قتلِ عمد

اس آیت میں تو قتلِ خطا کا ذکر ہے تاہم قتل عمد کا بیان سورۃ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اگر کوئی شخص دوسرے کو قصداً قتل کر دے تو اس کا بدلہ قصاص کی صورت میں ہوتا ہے یعنی مقتول کے بدلے میں قاتل کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ البتہ اگر مقتول کے ورثا راضی ہو جائیں تو قصاص کی بجائے خون بہا بھی لے سکتے ہیں۔ یا چاہیں تو معاف بھی کر سکتے ہیں۔ اس کا قانون یہ ہے۔ کہ مقتول کے ورثا میں سے کوئی ایک وارث بھی اگر معاف کر دے تو قصاص نہیں لیا جائیگا بلکہ خون بہا ہوگا جو قاتل کے مال

میں سے ادا کیا جائے گا۔

قتلِ شبہ عمد

قتل کی ایک تیسری قسم قتل شبہ عمد ——— قتلِ عمد اور قتل خطا کے علاوہ بھی ہے جس کا ذکر حدیث میں ملتا ہے۔ یہ قتل عمد کے مشابہ ہوتا ہے۔ اور یہ اس طرح ہوتا ہے۔ کہ قتل ہوتا تو عمداً ہے مگر کسی ایسے آلہ کے ساتھ جس کے ساتھ عام طور پر قتل نہیں کیا جاتا۔ مثلاً کسی کو لاٹھی، پتھر، کلہاڑے کا دستہ وغیرہ مار دیا اور مضروب مر گیا حالانکہ ایسی ضربات سے عام طور پر ہلاکت واقع نہیں ہوتی۔ اگر چھرا، تلوار یا پستول وغیرہ استعمال کرنا تو یہ تو واقعی آلات قتل ہیں اور ایسا قتل عمد ہی شمار ہوتا ہے۔ مگر معمولی ضرب سے آدمی ہلاک ہو جائے تو وہ قتل شبہ عمد کہلاتا ہے قتل شبہ عمد اور قتل خطا میں قصاص نہیں لیا جاتا ہے، بلکہ اس میں خون بہا اور کفارہ ہوتا ہے، جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

قتل خطا کا کفارہ

فرمایا وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً جس نے کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دیا۔ ارادہ قتل نہیں تھا مگر غلطی سے ایسا ہو گیا تو اُسکے لیے دو سزائیں ہیں۔ ایک کفارہ اور دوسری خون بہا۔ چنانچہ فرمایا قتل خطا کا کفارہ یہ ہے۔ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ایک مومن غلام کا آزاد کرنا، غلام مرد ہو یا عورت بہر حال اُسے خرید کر آزاد کرنا ہو گا۔ اس کے ساتھ ایمان شرط ہے۔ صرف مومن غلام یا مومنہ لونڈی ہی کفارے میں قابلِ قبول ہے۔ اب تو دُنیا بھر میں غلامی کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ لہٰذا کفارے کی یہ شکل باقی نہیں رہی اب دوسری صورت باقی ہے جس کا ذکر آیت کے اگلے حصے میں آرہا ہے رقبہ دراصل گردن کو کہتے ہیں۔ اور گردن آزاد کرنے سے مراد غلام یا لونڈی کو آزاد کرنا ہے۔

دیت یا خون بہا

کفارہ یعنی غلام کی آزادی تو اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اب مقتول کے وارثوں کا حق یہ ہے وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ نہ مقتول کے گھر والوں کو نقدی یا مال کی صورت میں ادا کیا جائے گا۔ نقدی کی صورت میں ایک ہزار دینار یا دس ہزار درہم

ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اگر درہم چھوٹے سائز کا ہو تو بارہ ہزار دینا ہوگا۔ اور اگر دیت کے طور پر مال دینا ہو تو اس کی مقررہ مقدار ایک سو اونٹ ہیں۔ جو مختلف عمروں کے ہوں۔ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت کے مطابق سو اونٹوں کی تفصیل یہ ہے

(۱)	جذعہ	(عمر چار تا پانچ سال)	بیس اونٹ
(۲)	حقہ	(عمر تین تا چار سال)	بیس اونٹ
(۳)	ابن لبون	(عمر دو تا تین سال)	بیس اونٹ
(۴)	بنت لبون	(عمر دو تا تین سال)	بیس اونٹنیاں
(۵)	بنت مخاض	(عمر ایک تا دو سال)	بیس اونٹنیاں

فقہائے کرام کے نزدیک اونٹوں کی یہی تعداد راجح ہے۔ تاہم دیت مغلظہ یعنی سخت دیت کا ذکر بھی ملتا ہے جس کے مطابق پانچ قسم کی بجائے چار قسم کے اونٹ بھی دیت میں ادا ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ہر عمر میں بیس بیس کی بجائے پچیس پچیس فی قسم کے اونٹ آئیں گے۔ بعض روایات میں تین اقسام کے اونٹوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس کے مطابق تیس تیس اونٹ دو عمروں کے ہوں گے اور چالیس اونٹ تیسری عمر کے۔ موجودہ زمانے میں یا کسی آئندہ زمانے میں اگر دیت کا قانون نافذ ہو جائے تو سکہ رائج الوقت میں زرِ دیت کا تعین اونٹوں کی قیمت سے لگایا جائے گا یا دینار و درہم کے مبادلے کی مقدار کے مطابق۔

بہرحال قتل خطا میں مذکورہ کفارہ اور دیت ادا کرنا ہوگا۔ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا سوائے اس کے کہ مقتول کے وارثان دیت معاف کر دیں، ایسی صورت میں دیت ادا نہیں ہوگی۔ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ اور اگر مقتول تمہاری دشمن قوم سے ہے وَهُوَ مُؤْمِنٌ مگر ہے مومن، تو پھر خون بہا نہیں دیا جائے گا بلکہ صرف کفارہ ادا کرنا ہوگا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ یعنی ایک غلام کو آزاد کرنا۔ چونکہ مقتول کی قوم کافر ہے لہٰذا وہ خون بہا کے حقدار نہیں ہیں وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ

اور اگر مقتول کا تعلق ایسی قوم سے ہے کہ تمہارے اور اُن کے درمیان عہد و پیمان ہو چکا ہے۔ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ تو ایسی صورت میں مقتول کے وارثان کو مقررہ خون بہا ادا کرنا ہو گا کیونکہ معاہدہ قوم کا معاملہ آزاد قوم جیسا ہی ہوتا ہے۔ اور دیت کے علاوہ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ یعنی کفارے کے طور پر ایک غلام بھی آزاد کرنا ہو گا۔ جس قوم کے ساتھ معاہدہ ہو جائے اسکی جان، مال اور عزت بھی اسی طرح محفوظ ہوتی ہے جس طرح خود مسلمان ملک میں رہنے والوں کی۔ اس کی مثال گذشتہ درس میں بھی آچکی ہے إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ یعنی جن لوگوں کی تمہاری کسی معاہد قوم سے میل ملاقات ہے اُن کو قتل کرنے کی اجازت نہیں۔

بہر حال فرمایا کہ اگر مقتول معاہد قوم سے تعلق رکھتا ہے تو کفارہ اور دیت دونوں چیزیں ادا کرنی پڑیں گی۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ بعض مسلمانوں نے معاہد قوم کے دو آدمی قتل کر ڈالے۔ انہیں علم نہیں تھا کہ ان کے ساتھ معاہدہ ہو چکا ہے لہٰذا انہوں نے دشمن سمجھ کر مار دیا۔ حضور علیہ السلام کو اس حادثہ کا علم ہوا تو آپ نے افسوس کا اظہار کیا اور دیت بھی ادا کی۔

غلام کا بدل

فرمایا فَمَن لَّمْ يَجِدْ اگر کفارہ ادا کرنے کے لیے غلام میسر نہ ہو یعنی غلام نایاب ہے جیسا کہ آجکل کے زمانے میں قاتل غلام خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ تو اس کا بدل یہ ہے فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ پس دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے۔ یہ کفارے کی دوسری صورت ہے اور اس سے مقصود قاتل کی تنبیہ اور اصلاح ہے تاکہ وہ ایسا کام نہ کرے دیت کی ادائیگی مالی لحاظ سے اور دو ماہ کے مسلسل روزے جسمانی اعتبار سے بڑا مشکل کام ہے تاہم انسان کی بہیمیت کی اصلاح کے لیے کفارے کی ادائیگی ضروری قرار دی گئی ہے۔ دیت سارے خاندان، برادری، یا اہل دفتر و فیکٹری کو ادا کرنا ہو گی، کہ وہ اسکی غلط تربیت کے ذمہ دار ہیں اور روزے خود رکھنے ہوں گے تاکہ اُسے غلطی کا احساس ہو جائے

روزے مسلسل رکھنے کی پابندی ہے۔ اگر درمیان میں کوئی روزہ سہواً چھوٹ گیا یا آدمی بیمار ہو گیا جس کی وجہ سے روزہ رہ گیا، تو پھر نئے سرے سے روزے رکھنا ہوں گے۔ دو ماہ کا تسلسل کسی صورت میں منقطع نہیں ہونا چاہیئے، ورنہ کفارہ ادا نہیں ہو گا۔ تاہم دو ماہ کا شمار قمری مہینہ کے اعتبار سے ہو گا۔

اللہ کی طرف سے توبہ

فرمایا تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ کا قانون ہے اس نے قتل خطا کی سزا کے طور پہ کفارہ اور دیت دونوں مقرر کیے ہیں اور یہ توبہ کا ایک ذریعہ ہے۔ مومن کی جان کا اتلاف بہت بڑا جرم ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے توبہ کی یہ صورت بھی ساتھ رکھ دی ہے تاکہ انسان اس کے مطابق عمل کر کے اخروی سزا سے بچ جائے۔ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا اللہ تعالیٰ علیم کل ہے۔ وہ ہر چیز کو جانتا ہے اور وہ حکیم بھی ہے کہ اس نے اپنی کمال حکمت سے جس طرح مناسب سمجھا، انسانوں کے لیے احکام نازل فرمائے ہیں۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

ترجمہ :- اور جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے گا، پس اُس کی سزا جہنم ہے، اس میں ہمیشہ رہنے والا ہو گا۔ اور اُس پر اللہ کا غضب ہو گا اور اُس کی لعنت ہو گی۔ اور تیار کیا ہے اس کے لیے بہت بڑا عذاب ﴿۹۳﴾

ربطِ آیات

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کافروں کے ساتھ سختی کرنے اور اُن کے ساتھ قتال کا حکم دیا ہے اور اس کے بالمقابل اہل ایمان کی جانوں کی حفاظت کا حکم دیا ہے فرمایا کسی مُسلمان کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی دوسرے مُسلمان کو قتل کرے۔ اور اگر نیت اور ارادے کے بغیر محض غلطی سے قتل ہو جائے۔ تو قاتل کے لیے ضروری ہو گا، کہ وہ کفارہ کے طور پر ایک مُسلمان غلام کو آزاد کرے اور اگر غلام میسّر نہ ہو تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے۔ اس کے علاوہ مقتول کے ورثاء کو خون بہا بھی دینا ہو گا جو کہ سو اونٹوں یا سونے چاندی کی شکل میں ہو گا یا ان کی مساوی القیمت کوئی اور چیز بھی ہو سکتی ہے۔ قتل خطاء میں خون بہا کی ادائیگی کی ذمہ داری قاتل کے عاقلہ یعنی اس کے خاندان قبیلہ یا برادری پر ہوتی ہے۔ اسکے محکمہ، دفتر، فیکٹری یا ادارہ پر ہوتی ہے۔ جس کے ساتھ قاتل منسلک ہو، خون بہا یا دیت کی ادائیگی بالاقساط تین سال میں واجب الادا ہوتی ہے، جس کا انتظام حکومتِ وقت کے ذمہ ہوتا ہے۔ کہ وہ قاتل کے عاقلہ سے وصول کر کے مقتول کے ورثاء تک پہنچائے مفسر قرآن، قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اپنی تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں۔ کہ اگر قاتل کے عاقلہ

موجود نہ ہوں، تو دیت کی ادائیگی حکومت اپنے بیت المال سے ادا کریگی، کیونکہ کسی مومن کا خون رائیگاں نہیں جانے دیا جائے گا۔

قتلِ عمد

آج کی آیت کا موضوع قتل عمد یعنی جان بوجھ کر کسی کی جان کو تلف کرنا ہے اور یہاں پہ اللہ تعالیٰ نے اس جرم کے گناہ اور اسکی اُخروی سزا کے متعلق احکام نازل فرمائے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرتا ہے۔ کسی شخص کی جان قصداً تلف کرنا اکبر الکبائر یعنی سات بڑے گناہوں میں سے ایک ہے۔ ان کی تفصیل جو حضور علیہ السلام نے بیان فرمائی ہے اس کے مطابق پہلا بڑا گناہ شرک ہے اور دوسرا قتل نفس۔ اس کے متعلق قصاص کا قانون دوسرے پارے میں بیان ہو چکا ہے وہاں فرمایا کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى قتل ہو جانیکی صورت میں تم پر قصاص کو فرض کیا گیا ہے یہ قانون اگلی سورۃ مائدہ میں بھی آئے گا اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ.....الخ پوری جان کا بھی بدلہ ہے اور ہر عضو کا بھی قصاص ہے۔ جیسے آنکھ، ناک، کان، دانت وغیرہ، اور اگر کسی عضو کا قصاص بعینہٖ ممکن نہ ہو تو وہاں دیت ادا کرنا ہوگی۔ مثلاً ایک شخص نے دوسرے کو بندوق کا کندا اس کی ٹانگ پہ مارا جس سے ٹانگ درمیان سے ٹوٹ گئی۔ اب یہ ممکن نہیں کہ قصاص کے طور پر ملزم کو ویسے ہی کندا مارا جائے اور اس کی ٹانگ اُسی مقام سے اتنی ہی ٹوٹے، تو ایسی صورت میں حکومت وقت کا فیصلہ تسلیم کرنا ہوگا، تاوان یا ارش ادا کی جائیگی قتل عمد میں یہ قانون بھی ہے کہ اگر مقتول کے ورثاء میں سے تمام یا کوئی ایک راضی ہو جائے تو قصاص کی بجائے خون بہا ادا کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر ورثا بالکل معاف ہی کر دیں تو ان کو اجر عظیم حاصل ہوگا۔ قتل عمد میں دیت کی ادائیگی خود قاتل کے ذمہ ہوتی ہے، عاقلہ پہ یہ بار نہیں ہوتا، البتہ قتل خطا میں دیت کی ذمہ دار قاتل کی عاقلہ ہوتی ہے۔

قصاص میں زندگی ہے

قصاص اور دیت کا قانون بڑا اہم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے۔ "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ" اے عقل مندو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ اگر قصاص کا قانون صحیح طریقے سے نافذ کر دیا جائے تو لوگوں کی جانیں محفوظ ہو کر انہیں زندگی نصیب

ہو جائے۔ اس قانون کے تحت کسی کی رعایت نہیں کی جاتی ۔ قانون کے نزدیک چھوٹا بڑا اور امیر غریب سب برابر ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے بھائی داراشکوہ نے قتل عمد کا ارتکاب کیا تھا۔ اپنے باپ کی موجودگی میں تو وہ گرفت سے بچا رہا مگر جب مقتول کے باپ نے یہ مقدمہ عالمگیرؒ کی عدالت میں دائر کیا، گواہی کے ذریعے قتل کا ثبوت فراہم کیا تو قانون شریعت جاری ہو گیا اور داراشکوہ کو سزائے موت ہو گئی۔ انگریز تو اس معاملہ میں عالمگیر کو بدنام کرتے ہیں کہ اس نے اپنا راستہ صاف کرنے کے لیے بھائی کو مروا دیا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس نے قتل عمد کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیا تھا اور اپنے بھائی کے ساتھ رعایت نہیں برتی تھی۔

انگریزی قانون

ہمارے ہاں اب تک تعزیرات کا انگریزی قانون جاری ہے اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود پاکستان میں اسلامی قانون نافذ نہیں ہو سکا محض نام بدل کر اسے تعزیرات پاکستان کر دیا گیا ہے حقیقت میں یہ وہی انگریز کا جاری کردہ فوجداری قانون ہے یہ ایسا پیچیدہ قانون ہے جس میں صریح مجرم بھی سزا سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور کمزور آدمی پھنس جاتا ہے اس قانون کے تحت کسی کی رعایت نہیں کی جاتی ——— اس قانون میں فیصلہ حقائق کی بجائے وکلاء کی قانونی موشگافیوں پر ہوتا ہے۔ صاحب ثروت آدمی وکلا کی بھاری فیسیں اور رشوت دیکر اکثر بچ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قانون کی موجودگی میں کسی شخص کی جان محفوظ نہیں پاکستان میں بے دریغ قتل کیے جاتے ہیں مگر قاتل کا بال بیکا تک نہیں ہوتا اگر قانون قصاص و دیت نافذ کر دیا جائے تو ساری غنڈہ گردی ختم ہو جائے اور ملک میں لوگوں کو حقیقی زندگی نصیب ہو جائے۔ انگریزی قانون میں دیت کا مسئلہ تو بالکل ہی ناپید ہے۔ اگر عدالت جرمانہ عاید کرے تو وہ حکومت کے خزانے میں چلا جاتا ہے۔ اور مقتول کے ورثا کو کچھ نہیں ملتا۔ مگر شرعی قانون دیت کی بہت بڑی رقم مقتول کے ورثا کو دلاتا ہے۔

صدر ایوب کے زمانہ میں قتل ناحق کے متعلق ایک رپورٹ اسمبلی میں پیش ہو کر زیر بحث آئی تھی۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا۔ کہ مشترکہ پاکستان (مشرقی اور مغربی) میں تین سال کے عرصہ میں سولہ ہزار افراد قتل ہوئے۔ ایک

دوسری رپورٹ کے مطابق صرف ایک ضلع میں ایک سال میں قتل کے ایک ہزار واقعات پیش آئے۔ خون ناحق کی یہ ارزانی اس لیے ہے کہ یہاں شریعت کا تعزیراتی قانون جاری نہیں کیا گیا۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا، بے گناہ جانیں ضائع ہوتی رہیں گی۔ اگر قصاص اور دیت کا قانون جاری کر دیا جائے اور اسکی مناسب تشہیر بھی کی جائے جس سے لوگوں کو پتہ چل سکے کہ قتل کتنا بڑا جرم ہے اور اس کی کتنی بڑی سزا ہے، تو اس کا لازماً مثبت نتیجہ برآمد ہوگا اور قتل گری بند ہو جائے گی۔ قانون پر عمل درآمد کے لیے عملے کا انتخاب بھی نہایت چھان بین کے بعد ہونا چاہیئے اگر قانون نافذ کرنے والے افراد دیانتدار ہوں جو خود بھی اس پر عمل کریں اور دوسروں سے بھی عمل کرائیں تو ملک امن کا گہوارہ بن سکتا ہے ورنہ انگریزی قانون کے ذریعے تو یہی کچھ ہوتا ہے گا جو اب تک ہو رہا ہے۔

دیگر جرائم چوری، ڈاکہ وغیرہ بھی اسی قبیل سے ہیں۔ پورے فوجداری قانون میں نہ اسلامی تعزیرات کا نفاذ ہے اور نہ ان پر عملدرآمد۔ اسلامی قانون میں چوری ثابت ہو جانے کے بعد چور کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی جاسکتی اس کا ہاتھ کاٹنا ہی پڑے گا۔ ڈاکو دن رات سڑکوں پہ دندناتے پھرتے ہیں۔ ہر شخص کی زندگی غیر محفوظ ہو کر رہ گئی ہے۔ قرآن پاک نے ڈاکو کے لیے چار سزائیں مقرر کی ہیں اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ انہیں قتل کر دیا جائے یا سولی پر لٹکا دیا جائے یا ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں کاٹ دیا جائے یا ملک بدر کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب اس قسم کی سنگین سزا دی جائے گی تو پھر ڈکیتی کی کوشش کون کریگا۔ ہماری بہت سی مصیبتوں کا باعث شرعی تعزیرات کا عدم نفاذ ہے۔

ہمارا انگریزی دان طبقہ اسلامی تعزیرات سے بلاوجہ خوف زدہ ہے یہ ایک مکمل قانون ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے اور اس کی مکمل تشریح

احادیث میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ فقہائے کرام نے پوری ریسرچ کے بعد اس کی جزئیات کا فیصلہ کیا ہے اور یہ قانون ہر طرح سے قابلِ عمل ہے اس قانون کے ذریعے جہاں جرم ثابت ہونے پر سخت سزا ملتی ہے، وہاں شک کی بنا پر ملزم کو رعایت بھی ملتی ہے۔ حضور علیہ السلام کا واضح ارشاد ہے ادرءوا الحدود بالشبہات یعنی شک کی صورت میں ملزم پر حد جاری نہ کرو، اُسے شک کا فائدہ دو۔ غرضیکہ اسلامی تعزیراتی قانون ایک فطری قانون ہے جس میں کسی قسم کی زیادتی نہیں کی جاتی

قتل عمد کا گناہ اور سزا

فرمایا جو کوئی کسی مومن کو دانستہ قتل کرے گا فَجَزَآؤُہٗ جَھَنَّمُ تو اُس کے لیے اُخروی سزا دوزخ ہے خٰلِدًا فِیْھَا جس میں اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ قتل عمد کی توبہ نہیں اور قاتل کافروں کی طرح ابدی جہنمی ہے۔ البتہ جمہور صحابہؓ اور فقہائے کرامؒ فرماتے ہیں کہ قتل عمد کبیرہ گناہ ضرور ہے مگر اس کا مرتکب ابدی سزا کا مستحق نہیں ہے ابدی سزا صرف کفر اور شرک کے جرم پر ہے کیونکہ ان جرائم میں عقیدے کی خرابی پائی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ باقی جرائم میں اگر توبہ کرے تو جہنم سے بچ سکتا ہے۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ توبہ آخری دم تک قبول ہوتی ہے۔ ترمذی شریف کی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ یَقْبَلُ تَوْبَۃَ الْعَبْدِ مَالَمْ یُغَرْغِرْ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا ہے جب تک غرغرہ کی کیفیت نہ طاری ہو جائے۔ سورۃ فرقان میں موجود ہے۔ بعض لوگوں نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمارے ذمہ قتل اور زنا جیسے بڑے گناہ ہیں۔ اگر ایمان لانے سے یہ سب معاف ہو جائیں تو ہم ایمان لاتے ہیں ورنہ کیا فائدہ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنٰتٍ جو توبہ کرے گا۔ ایمان لائے گا اور نیک اعمال انجام دے گا، تو اللہ تعالیٰ تمام گناہ معاف فرما دیگا۔ اس لحاظ سے

قتلِ عمد بھی قابلِ معافی ہے۔ بشرطیکہ ایمان موجود ہو اور سچی توبہ کرلے۔ البتہ مَنِ اسۡتَحَلَّ حَرَامًا فَقَدۡ كَفَرَ جس نے حرام کو حلال سمجھ لیا، وہ کافر ہوگیا۔ اگر کوئی شخص قتلِ ناحق کو حلال سمجھتا ہے تو پھر وہ واقعی ابدی جہنمی ہے۔ ورگرنہ خٰلِدًا فِيهَا کا مطلب یہ ہوگا کہ اُسے بڑی دیر تک جہنم میں رہنا ہوگا، امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ابدی جہنمی نہیں بلکہ طویل مدت تک کے لیے سزا کا مستحق ہے دِل میں ایمان موجود ہے تو کسی نہ کسی وقت جہنم سے خلاصی پا لیگا۔

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں[1] کہ اس بات پر تمام اہلِ حق کا اتفاق ہے۔ اِنَّ اَهۡلَ التَّوۡحِيۡدِ لَا يُخَلَّدُوۡنَ فِي النَّارِ یعنی اللہ کی وحدانیت کو ماننے والے ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہینگے کیسا بھی بڑا جرم ہو، ایمان کی بدولت دوزخ سے چھٹکارا حاصل ہوجائے گا سوائے کفر اور شرک کے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان میں ایمان موجود ہے مگر غفلت کا پردہ پڑ جاتا ہے انسان قتلِ ناحق جیسا عظیم گناہ بھی کر بیٹھتا ہے تو وہ ابدی جہنمی نہیں ہوگا۔ بلکہ سزا کے طور پر دیر تک وہاں رہنا ہوگا۔

اسکے علاوہ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَلَعَنَهٗ اس پر اللہ کا غضب ہوگا اور اسکی لعنت ہوگی جس پر لعنت نازل ہوجائے وہ کتنا معتوب شخص ہوگا۔ یہود و نصاریٰ کے متعلق اللہ نے فرمایا یہ بدوضع لوگ ہیں، ان پر اللہ کا غضب ہے۔ یہ عنادی ہیں اور حق کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔ اسی طرح کفر و شرک والا آدمی بھی خدا کی لعنت اور غضب کا شکار ہوتا ہے۔ نیز فرمایا وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيۡمًا اللہ نے قاتل کے لیے بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے یہ اُس کے کیے کا وبال ہے۔ اس نے ایک مومن کی جان لے کر بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ حالانکہ کسی مومن کیلئے کسی مومن کی جان حلال نہیں۔ یہ آخری سزا کا ذکر ہے اور دنیا میں اگر اسلامی قانون نافذ ہوگا تو قصاص یا دیت بھی دینا ہوگی۔

---

[1] ترمذی صفحہ ۳۷۸ (فیاض)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾

ترجمہ :- اے ایمان والو ! جب تم سفر کرو اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کے لیے) پس پوری طرح تحقیق کر لیا کرو۔ اور نہ کہو اس شخص کے لیے جو تمہاری طرف سلام ڈالتا ہے کہ تو مومن نہیں ہے کیا تم تلاش کرتے ہو دنیا کی زندگی کا سامان۔ پس اللہ کے ہاں بہت سی غنیمتیں ہیں اس سے پہلے تم بھی اسی طرح تھے، پس اللہ نے تم پر احسان کیا، پس خوب تحقیق کر لیا کرو۔ بیشک اللہ تعالٰے جو کچھ تم کام کرتے ہو اس کی خبر رکھنے والا ہے ﴿۹۴﴾

ربطِ آیات

گذشتہ کئی دروس سے جہاد کا مسئلہ بیان ہو رہا ہے، اس ضمن میں ہجرت کا ذکر بھی ہوا، اللہ تعالیٰ نے جہاد سے گریز کرنے والے منافقین کی مذمت بیان فرمائی اور ان پر اعتماد نہ کرنے کا حکم دیا۔ دشمنوں کے متعلق فرمایا کہ جہاں بھی ملیں انہیں مار ڈالو، نہ اُن سے دوستانہ رکھو اور نہ اُن سے کوئی مدد حاصل کرو۔ اس کے برخلاف مومن کی حفاظتِ جان کے متعلق احکام نازل فرمائے اور ارشاد فرمایا کہ کسی مومن کے لیے یہ بات روا نہیں کہ وہ کسی دوسرے

مسلمان کی جان کے درپے ہو۔ اور اگر غلطی سے کوئی مسلمان کی جان کے درپے ہو۔ اور اگر غلطی سے کوئی مسلمان مارا جائے، تو اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے کفارے اور دیت کا قانون نازل کیا۔ قتل خطا کا کفارہ ایک غلام کی آزادی یا دو ماہ کے مسلسل روزے ہیں۔ اور اس کے علاوہ مقتول کے وارثان کو خون بہا بھی ادا کرنا ضروری ہے کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرنا بہت بڑا جرم اور قاتل پہ وبال ہے ایسا کرنے والا انسان جہنم کا مستحق ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کی لعنت کی زد میں آجاتا ہے۔ قتل عمد کے ضمن میں قصاص کا قانون دوسرے پارے میں پہلے ہی بیان ہو چکا ہے۔ اگر مقتول کے وارثان راضی ہو جائیں تو قصاص کی بجائے دیت پہ بھی تصفیہ ہو سکتا ہے۔ یا اگر وارثان بالکل معاف کر دیں تو ان کے لیے بہت بڑے اجر و ثواب کا ذریعہ ہے اگر کوئی شخص قتل ناحق کو جائز سمجھے تو وہ کافر اور مرتد ہو جائیگا اور ابدی جہنم کا حقدار ہوگا۔

آج کی آیت بھی مسلمان کی جان کی حفاظت کے متعلق ہی ہے۔ اس آیت میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے۔ کہ کسی شخص کے اسلام کے زبانی اظہار کے بعد اس کا خون حرام ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں کسی شک کی بنا پر خون بہانا ہرگز جائز نہیں۔ حضور علیہ السلام کے اپنے زمانہ مبارک میں بعض ایسے واقعات پیش آئے کہ صحابہؓ نے کسی مسلمان کو اس شبہ کی بنیاد پہ قتل کر دیا کہ اسلام نہیں لایا۔ حالانکہ وہ اسلام لا چکا تھا۔

عیاشؓ بن ابی ربیعہ کا واقعہ

امام بغویؒ اور بعض دوسرے مفسرین نے یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے۔ کہ ابوجہل، حارث ابن ہشام اور عیاش بن ابی ربیعہ مادرزاد بھائی تھے، عیاشؓ کو اللہ نے توفیق دی تو وہ اسلام قبول کر کے مدینہ طیبہ ہجرت کر گیا۔ اس کی کافرہ ماں کو اس بات کا رنج ہوا۔ اس نے اپنے دوسرے بیٹوں سے کہا کہ کسی طرح عیاش کو واپس لاؤ۔ جب تک وہ واپس نہیں آتا، میں نہ سائے میں بیٹھوں گی اور نہ کچھ کھاؤں گی اور اس طرح اس نے بھوک ہڑتال کر دی۔ چنانچہ باقی دونوں

بھائی عیاش کی تلاش میں مدینے پہنچے۔ اُسے کسی ٹیلے میں پا لیا اور اُس کی منت خوشامد کی کہ تم واپس چلے چلو، ورنہ تمہاری ماں بھوکی پیاسی جان دے دیگی۔ بہرحال اُسے واپس آنے پر آمادہ کر لیا۔ مدینے کی حدود سے باہر آکر اُسے خوب مارا پیٹا اور جکڑ کر واپس مکے لے آئے ابوجہل کی اسلام دشمنی تو پہلے ہی زبانِ زدِ عام تھی، اُس نے ساری کسر اپنے بھائی عیاش ابن ربیعہ پر نکال دی۔ بہرحال جب وہ ماں کے پاس پہنچے تو اُس نے کہا کہ جب تک عیاش اپنے سابقہ دین پر واپس نہیں آجاتا میں راضی نہ ہونگی۔ عیاش نے ہر چند انکار کیا اور اپنے بھائیوں کے مظالم برداشت کیے مگر بالآخر مجبور ہو کر اسلام چھوڑنے پر تیار ہو گیا۔

جب کوئی شخص سخت مجبور ہو جائے تو اضطراری حالت میں اُسے کلمہ کفر کہنے کی بھی اجازت ہوتی ہے تاکہ وہ اپنی جان کی حفاظت کر سکے۔ تاہم ایسا کرنا اس شرط کے ساتھ ہوتا ہے کہ اُس کے دل میں ایمان موجود ہو اور وہ ایسا بالکل مجبوری کے تحت کر رہا ہو۔ تاہم عزیمت کا تقاضا یہی ہے کہ انسان شہادت قبول کر لے مگر کلمہ کفر زبان پر نہ لائے۔

جب عیاش دینِ اسلام ترک کرنے پر تیار ہو گیا تو مکے کے ایک آدمی زید بن حارث نے اُسے طعنہ دیا اور کہا کہ عیاش! جس دین کو تم اب چھوڑ رہے ہو، اگر وہ واقعی گمراہی تھی، تو تم گمراہی میں مبتلا ہو گئے تھے اور اب واپس آکر اس گمراہی کا ازالہ کر دیا ہے۔ اور اگر دین اسلام سچا مذہب ہے۔ تو پھر اسے ترک کرنے کے لیے تم کیسے تیار ہو گئے ہو اس پر عیاش کو سخت غصہ آیا اور اس نے اپنے دِل میں فیصلہ کر لیا کہ جب بھی موقع ملے گا زید کو زندہ نہیں چھوڑونگا اسی عیاش ابن ابی ربیعہ کے متعلق بخاری شریف میں روایت آتی ہے۔ کہ حضور علیہ السلام اس کے لیے قنوتِ نازلہ پڑھتے تھے اور اللہ تعالیٰ سے اُسکی رہائی کے لیے دعائیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہوئی، عیاش رہا ہو کر پھر مدینے پہنچے۔ کچھ عرصہ بعد زیدؓ بن حارث بھی مسلمان ہو کر مدینہ طیبہ پہنچ گیا

اتفاق سے قبا کے قریب عیاش اور زید کا آمنا سامنا ہو گیا۔ عیاش کو زید کے اسلام لانے کا علم نہیں تھا اور اس کے دل میں پرانی رنجش بھی موجود تھی لہذا اس نے اسے وہیں قتل کر دیا۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ تو مسلمان ہو چکا تھا، تم نے اسے ناجائز قتل کیا ہے۔ چونکہ یہ لاعلمی کی بنا پر ایسا ہوا تھا لہذا اسے قتل خطا ہی شمار کیا گیا، جس کے قانون اور تعزیر کا ـــــ ذکر پہلے آچکا ہے۔

اسامہ بن زیدؓ کی لغزش

اسی طرح کا ایک واقعہ اسامہ بن زیدؓ کے متعلق بھی آتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے مسلمانوں کے ایک لشکر کو کفار کی طرف جہاد کے لیے روانہ کیا۔ اسامہ بن زیدؓ بھی اس لشکر میں شامل تھے۔ جب یہ لشکر اپنے ہدف پر پہنچا، تو وہاں کے سب لوگ بھاگ گئے اور صرف ایک شخص پہاڑ پر رہ گیا جو دراصل اسلام قبول کر چکا تھا۔ یہ شخص اپنی بکریوں سمیت پہاڑ سے اس خیال سے نیچے اتر آیا کہ میرے اسلامی بھائی آگئے ہیں، یہ میرے ساتھ تعرض نہیں کریں گے۔ اس نے آکر السلام علیکم اور کلمہ طیبہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ بھی پڑھا۔ اسامہ بن زیدؓ نے سمجھا کہ اس شخص نے محض جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھا ہے، لہذا اسے دشمن تصور کرتے ہوئے مار ڈالا اور اس کی بکریوں پر قبضہ کر لیا۔ جب یہ لشکر ـــــ مدینہ طیبہ واپس آیا تو مذکورہ واقعات کی اطلاع حضور علیہ السلام کو دی گئی۔ مسلم شریف کی روایت کے مطابق آپ علیہ السلام نے اسامہ کو طلب کیا اور ایک مسلمان کے قتل کی وجہ دریافت کی۔ اسامہ نے عرض کیا، حضور! اس نے محض جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھا تھا، وہ دراصل مسلمان نہیں تھا۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ھلا شققت عن قلبه تو نے اس کا دل چیر کر کیوں نہ دیکھا کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ اسامہ بہت نادم ہوئے اور حضور علیہ السلام سے التجا کی میری خطا کی معافی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا مَا تَصْنَعُ بِلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اِذَا جَآءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ جب وہ شخص کلمہ

لاالہ الا اللہ لے کر قیامت کے دن حاضر ہوگا، تو پھر تم کیا کرو گے۔ حضور یہ الفاظ بار بار دہراتے تھے۔ اس پر اسامہ نے تمنا کی کاش وہ آج کے دن مسلمان ہوتے اور ایمان قبول کرتے تاکہ اس قتل کا وبال ان کے سر پر نہ ہوتا۔ اس واقعہ کے بعد اسامہؓ بہت محتاط ہو گئے۔ اور صرف اسی شخص پر ہاتھ اٹھاتے جسکی اسلام دشمنی کی اچھی طرح تصدیق کر لیتے۔ حضرت سعدؓ کے متعلق بھی آتا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ میں بھی کسی شخص پر بغیر سوچے سمجھے تلوار نہیں اٹھاؤں گا۔ اور صرف اسی کے خلاف ہاتھ اٹھاؤں گا جس کے خلاف اسامہؓ کا ہاتھ اٹھے گا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو تنبیہ فرمائی کہ قتل جیسا انتہائی قدم پوری تحقیق کے بعد اٹھانا چاہیئے۔

تحقیق کا حکم

ارشاد ہوتا ہے۔ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے ایمان والو! اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ جب تم سفر کرو، اللہ کے راستے میں۔ ضرب کا لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ ضرب کا عام فہم معنی تو مارنا ہے اور اس کا معنی بیان کرنا بھی ہے جیسے قرآن پاک میں یَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ اللہ تعالیٰ مثالیں بیان کرتا ہے۔ اور ضرب کا معنی سفر کرنا بھی ہے جیسا کہ اس آیت میں آیا ہے۔ اور فی سبیل اللہ سے مراد جہاد کے لیے نکلنا ہے۔ اس کی تشریح گذشتہ دروس میں بھی کی جا چکی ہے۔ تو بہرحال مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! جب تم جہاد کے لیے سفر پر نکلو، یعنی تمہارا سفر محض اللہ کی رضا کے لیے ہو اس میں ملک گیری اور ہوس زر کو دخل نہ ہو۔ تو دوران سفر اگر کوئی ایسی صورت حال پیدا ہو جائے فَتَبَیَّنُوْا تو اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا اور جو شخص تمہیں اسلامی طریقے سے سلام کرے اس کے متعلق یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو۔ مقصد یہ کہ جو شخص ظاہری طور پر زبان سے کلمہ پڑھ لیتا ہے اور تمہیں سلام کہتا ہے اس کو مسلمان سمجھو اور اس کے ساتھ مسلمانوں جیسا سلوک کرو

اس کو قتل کرنا حرام ـــــ ہو جاتا ہے۔ اگر وہ تمہیں دھوکہ دینے کے لیے اسلام کا اقرار کر رہا ہے تو اس کا معاملہ اللہ کے پاس ہے۔ اگر وہ جھوٹا ہے تو اللہ تعالیٰ خود اُسے سزا دے گا۔ تمہیں اس پر شک نہیں کرنا چاہیئے۔

مال کی تمنا

چونکہ اسامہ رضؓ نے اُس مقتول کی بکریوں پر بھی قبضہ کر لیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اُسی طرف اشارہ فرمایا تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا تم دنیا کی زندگی کا سامان چاہتے ہو۔ عرض کا معنیٰ دنیا کا ساز و سامان ہے۔ اللہ نے فرمایا یہ تو حقیر مال و متاع ہے۔ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ مگر اللہ تعالیٰ کے پاس بہت زیادہ غنیمتیں ہیں۔ خدا تو خزانوں کا مالک ہے اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں۔ تمہیں ان بکریوں پر قبضہ کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کے خزانوں پر نظر رکھنی چاہیئے تھی۔ بعض روایات میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے وہ بکریاں مقتول کے خاندان والوں کو واپس بھجوا دی تھیں کیونکہ یہ مسلمانوں کے لیے جائز نہ تھیں۔

فرمایا كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ اس سے پہلے تم بھی اسی شخص کی طرح تھے۔ تم کفر پر تھے۔ جب تم نے کلمہ پڑھ لیا تو تم پر اعتبار کر لیا گیا۔ اب تمہیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا کہ جب اس شخص نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہہ دیا تھا تو اس پر اعتماد کرنا تھا۔ حضور علیہ السلام کا اپنا طریق کار بھی یہ تھا۔ کہ جب دشمن پر حملہ مطلوب ہوتا تو آپ رات کو طلوع فجر تک انتظار فرماتے اگر اس بستی سے اذانِ فجر کی آواز آجاتی تو سمجھتے کہ یہاں کچھ مسلمان بھی موجود ہیں۔ لہٰذا حملہ کا ارادہ ترک کر دیتے۔ اور اگر وہاں سے شعائر اسلام کی کوئی نشانی نہ ملتی تو حملہ کا حکم دے دیتے۔ بہر حال قانون یہی ہے کہ کوئی مسلمان کسی مسلمان کے ہاتھ سے نہ مارا جائے۔ فرمایا پہلے تم بھی ایسے ہی تھے فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ پھر اللہ نے تم پر احسان فرمایا، تم مسلمان ہو گئے فَتَبَيَّنُوْا اب لازم ہے کہ تحقیق کر لیا کرو۔

اسلامی مرکز کی ضرورت

اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ کہ مسلمانوں کی آپس میں خونریزی بالکل ممنوع ہے۔ مگر اس حکم پر عمل درآمد صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ مسلمانوں کی مرکزیت قائم ہو۔ خلافت کے خاتمہ کے بعد اہلِ اسلام کا مشترکہ مرکز باقی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ انارکی میں مبتلا ہے اور اس کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ اب مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ کہیں دو ملک آپس میں الجھے ہوئے ہیں اور کہیں دو پارٹیاں دست و گریباں ہیں جب تک مسلمانوں کی اجتماعیت قائم نہیں ہوگی مسلمانوں کی آپس کی خون ریزی نہیں رک سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے سختی سے منع فرمایا کہ ایک دوسرے کا خون بہایا جائے۔ یہ بڑی قبیح چیز ہے۔ اور یہ قانون بھی واضح ہوتا ہے۔ کہ جب کوئی ظاہراً اسلام کا اقرار کرتا ہے تو پھر اس کی جان، مال اور عزت مسلمانوں کے ہاتھوں محفوظ ہو جاتی ہے۔ اس کے خلاف ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں آپس کی قتل و غارت تو کافروں کا شیوہ ہے، مگر آج مسلمان اسے اختیار کر چکے ہیں۔ جو کہ نہایت ہی افسوس کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کوئی حتمی قدم اٹھانے سے پہلے اچھی طرح تحقیق کرنے کا حکم دیا ہے۔

ہر آن نگرانی

فرمایا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا تم جو کچھ بھی کرتے ہو، اللہ تعالیٰ ہر چیز کی خبر رکھتا ہے۔ وہ تمہارے ارادوں اور نیت سے واقف ہے تمہاری تمام کارگزاری پہ اللہ تعالیٰ ہر وقت نگاہ رکھے ہوئے ہے اور تم ہر آن اس کی نگرانی میں ہو دوسرے مقام پہ فرمایا "اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ" بیشک تمہارا رب گھات میں ہے۔ وہ تمہاری تمام حرکات کی نگرانی کر رہا ہے، لہٰذا کوئی ایسا بے احتیاطی کا کام نہ کرو جس سے کسی مسلمان کی جان تلف ہوتی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی حفاظتِ جان کا یہ قانون بھی بیان فرما دیا۔

درس پنجاہ و دو ۵۲ — آیت ۹۵ تا ۹۶

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ أُولِي
الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِهِمْ
وَأَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِأَمْوَالِهِمْ
وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ
اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى
الْقٰعِدِيْنَ أَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً
وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾ ع ۱۳/۵/۱۰

ترجمہ: نہیں برابر وہ لوگ جو پیچھے بیٹھنے والے ہیں ایمانداروں میں سے جن کو کوئی عذر نہیں اور وہ جو جہاد کرتے ہیں اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ (سوائے ان لوگوں کے جو عذر والے ہیں)۔ اللہ تعالیٰ نے فضیلت بخشی ہے جہاد کرنے والوں کو اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ بیٹھنے والوں کے مقابلہ میں درجے کے اعتبار سے اور ہر ایک سے وعدہ کیا ہے اللہ تعالیٰ نے بھلائی کا۔ اور اللہ تعالیٰ نے فضیلت دی ہے جہاد کرنیوالوں کو بیٹھنے والوں کے مقابلے میں بہت بڑے اجر کی ﴿۹۵﴾ یہ درجے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور بخشش اور مہربانی ہے اور اللہ تعالیٰ بہت بخشش کرنے والا اور مہربان ہے ﴿۹۶﴾

ربط آیات

گذشتہ درس میں مسلمانوں کی حفاظت جان کا قانون بتلایا گیا تھا اور اس

امر کی تنبیہ کی گئی تھی کہ بے احتیاطی کی وجہ سے کسی مسلمان کی جان ضائع نہ ہونے پائے ۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں جب لوگ جہاد کے لیے جاتے تھے تو بسا اوقات غلط فہمی کی بنا پر مسلمان کے ہاتھوں مسلمان قتل ہو جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے پہلے اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو۔ اس تنبیہ کی وجہ سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں لوگ جہاد میں شرکت سے محض اس لیے اعراض نہ کرنے لگیں کہ کوئی ایسی غلطی ہو جائے جس کی وجہ سے کسی مسلمان کی جان ناحق تلف ہو جائے۔ اس خدشے کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں اور واضح فرمایا کہ جہاد میں حصہ لینے والے گھر بیٹھ رہنے والوں سے بہر صورت اولیٰ اور افضل ہیں خواہ اُن کا پیچھے رہ جانا کسی بھی وجہ سے ہو ۔ اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کی فضیلت بیان فرما کر جہاد کی ترغیب دی ہے۔

قاعدین اور مجاہدین کا تقابل

ارشاد ہوتا ہے لَا يَسْتَوِى الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِى الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، بیٹھ رہنے والے مومن جن کو کوئی عذر نہیں اور اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے مجاہد برابر نہیں ہیں۔ اور مجاہدین بھی ایسے جو جہاد کرتے ہیں بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ یعنی جب اللہ کے راستے میں نکلتے ہیں تو پھر اپنا مال اور جان دونوں اثاثے اللہ کی راہ میں پیش کر دیتے ہیں۔ قٰعِدُوْنَ جمع ہے قَاعِدْ کی جس کا لغوی معنیٰ بیٹھنے والے ہیں اور مراد وہ لوگ ہیں جن کی ضرورت بوجوہ محاذِ جنگ پر نہیں ہوتی اور وہ پیچھے بیٹھے رہتے ہیں۔ تاہم حسب ضرورت جہاد میں بالفعل شمولیت کے لیے بھی ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ آج کی اصطلاح میں انہیں ریزرو فورس (RESERVE FORCE) کا نام دیا جا سکتا ہے۔ انہی لوگوں کے متعلق فرمایا کہ پیچھے بیٹھنے والے مومن اور آگے لڑنے والے مجاہد برابر نہیں ہیں۔ البتہ درمیان میں غَيْرُ اُولِى الضَّرَرِ کے الفاظ لا کر معذور لوگوں کو مستثنیٰ کر دیا کہ ان پر کچھ الزام نہیں۔ اور مطلب یہ ہوا کہ بغیر عذر پیچھے

بیٹھنے والے مومنین اور میدان جنگ میں
جانے والے مجاہدین برابر نہیں ہیں بلکہ مجاہدین کو قاعدین پہ ایک درجہ فضیلت حاصل ہے

شانِ نزول

اس آیت کی شانِ نزول کے متعلق احادیث اور تفاسیر میں مذکور ہے کہ اولاً آیت کا یہ حصہ نازل ہوا لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اس پہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو تشویش لاحق ہوئی آپ نابینا تھے مگر قدیم الاسلام صحابی اور مؤذن بھی تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ معذور ہونے کی وجہ سے وہ جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے اور پیچھے بیٹھے رہتے ہیں جب کہ مجاہدین جہاد میں بالفعل شریک ہو کر فضیلت میں بڑھ جاتے ہیں۔ انہوں نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا حضور! میں معذور ہوں، اگر بینا ہوتا تو ضرور جہاد میں شریک ہوتا۔ آپ کی اس خواہش اور حسرت کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ کے الفاظ نازل فرمائے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس مجلس میں یہ وحی نازل ہوئی، میں اس مجلس میں موجود تھا اور حضور علیہ السلام کی ران مبارک میری ران پر تھی۔ جب وحی نازل ہوئی تو میری ران پہ اس قدر بوجھ پڑا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری ران ٹوٹ رہی ہے یہ وحی کا بوجھ تھا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے جہاد میں عملی شرکت نہ کرنے والوں میں سے معذور افراد مثلاً لنگڑا، اندھا، اپاہج وغیرہ کو عذر کی بنا پر مستثنا قرار دے دیا۔ اور اعلان فرما دیا کہ بلا عذر پیچھے بیٹھنے والے اور جہاد میں بالفعل شریک ہونے والے برابر نہیں بلکہ مؤخر الذکر لوگ اول الذکر لوگوں پر فضیلت رکھتے ہیں۔

معذوروں کے لیے رعایت

معذوروں کا یہ استثنا ایک شرط کے ساتھ مشروط ہے جس کا ذکر سورۃ توبہ میں آتا ہے اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ یعنی ان کا عذر اس صورت میں قابل قبول ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے حق میں خیر خواہ ہوں۔ اور پیچھے بیٹھ کر مسلمانوں کی خیر خواہی کی باتیں کریں نہ کہ کوئی ایسا غلط پراپیگنڈا کریں

جس سے دشمن کو تقویت حاصل ہوتی ہو جنگی چالوں میں سے پراپیگنڈا بھی ایک مؤثر ہتھیار ہے اور ہر فریق اُسے دشمن کے خلاف استعمال کرتا ہے۔ تاکہ اس کے اعصاب کمزور ہوں تو اس شرط کا مطلب یہ ہے۔ کہ معذور لوگ دشمن کے پراپیگنڈا کا شکار ہو کر کوئی جھوٹی موٹی خبریں نہ پھیلانا شروع کر دیں جس سے عوام میں بددلی پیدا ہوتی ہو۔ یہ رعایت انہی معذوروں کو حاصل ہو گی جو اہل ایمان کے خیر خواہ ہوں گے اور کوئی ایسی بات نہیں کریں گے جس سے جماعت المسلمین میں ضعف پیدا ہونے کا خطرہ ہو۔ اہل اسلام کے بدخواہوں کو یہ رعایت حاصل نہیں ہو گی بلکہ وہ عنداللہ معتوب ہوں گے تو فرمایا پیچھے رہ جانے والے جہاد کرنے والے برابر نہیں ہیں، سوائے معذوروں کے۔

درجہ کے اعتبار سے فضیلت

فرمایا فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً اللہ تعالیٰ نے اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنیوالوں کو بیٹھنے والوں پر فضیلت بخشی ہے ایک درجہ کے اعتبار سے یعنی پیچھے رہنے والوں کو وہ درجہ کہاں حاصل ہو سکتا ہے جو مال و جان کی بازی لگانیوالوں کو اللہ کے ہاں حاصل ہے البتہ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى اللہ نے سب کے ساتھ بھلائی کا وعدہ کر رکھا ہے۔ مقصد یہ کہ درجات میں تو دونوں گروہ برابر نہیں مگر بھلائی اور نیکی دونوں گروہوں کو حاصل ہو گی بشرطیکہ گھر بیٹھنے والے اسلام کے باقی احکام نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ پر عمل پیرا ہوں۔ اِن لوگوں کو بھی نجات نصیب ہو گی، اللہ تعالیٰ نے اُن کے ساتھ بھی جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔ تاہم وہ مجاہدین کے درجے کو نہیں پہنچ سکتے کیونکہ انہوں نے سر دھڑ کی بازی لگا کر اپنی سب سے قیمتی متاع بھی اللہ کے حضور پیش کر دی ہے۔

جہاد فرض کفایہ ہے

آیت کے اس حصہ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے۔ امام ابوبکر جصاصؒ اور دیگر مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ جہاد میں حصے لینے والے اور نہ لینے والوں سب کے ساتھ بھلائی کا وعدہ

ہی اس بات کی دلیل ہے۔ کہ جہاد ہر کس و ناکس کے لیے فرض عین نہیں ہے لہذا جماعت المسلمین میں سے کچھ لوگ جہاد میں حصہ لیں تو پوری ملت اس فرض سے سبکدوش سمجھی جائے گی۔ اور اگر کوئی شخص بھی جہاد کے لیے تیار نہ ہو تو سب گنہگار ہوں گے۔ جہاد کا معاملہ بھی جنازہ اور کفن دفن والا ہے۔ کہ اگر بستی، گاؤں، محلہ یا شہر کے کچھ لوگ مرنے والے کے کفن دفن اور جنازہ کا انتظام کر دیں تو یہ فرض سب کی طرف سے ادا ہو جائیگا اور اگر کوئی شخص بھی یہ انتظام نہ کرے تو سارے کے سارے بستی والے گنہگار ہوں گے نماز جنازہ بھی فرض کفایہ ہے۔

البتہ بعض غیر معمولی حالات (ABNORMAL) میں جہاد فرض عین بھی ہو جاتا ہے۔ اگر دشمن مسلمانوں کی جماعت پہ حملہ کر دے، تو اس وقت ہر عاقل بالغ، مرد اور عورت پہ جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔ ملکی دفاع کے لیے ہر مسلمان کو اپنا حصہ ادا کرنا پڑیگا۔ اسی بنا پہ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اس قسم کے حالات میں عورت اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر دشمن کے خلاف تدبیر کے لیے جا سکتی ہے۔ اسی طرح غلام اپنے آقا کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک ہو سکتا ہے۔

قانون جہاد کی رو سے اب لوگ چار گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں پہلا گروہ منافقین کا ہے۔ ان کے متعلق لَيُبَطِّئَنَّ آچکا ہے۔ کہ وہ جان بوجھ کر بلا عذر جہاد سے گریز کرتے ہیں۔ اور گھر بیٹھے رہتے ہیں دوسرا قاعدین کا ہے جس کا ذکر آج کے درس میں آیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں۔ جو بالفعل جہاد میں شریک نہیں ہوتے مگر ضرورت پڑنے پہ محاذ جنگ پہ جانے کے لیے مستعد رہتے ہیں۔ تیسرا گروہ مجاہدین کا ہے۔ جو بالفعل جہاد میں شریک ہو کر مال و جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ اور چوتھا گروہ معذوروں کا ہے جو کسی عذر کی وجہ سے شریک جہاد نہیں ہو سکتے مگر اہل ایمان کے خیر خواہ چار گروہ

ہوتے ہیں ۔ ان چاروں گروہوں میں سے اللہ تعالیٰ نے منافقین کی مذمت بیان کی ہے ، قاعدین سے بھلائی کا وعدہ فرمایا ہے ، مجاہدین کو بلند درجات کی خوشخبری سنائی ہے اور معذورین کو مستثنیٰ کیا ہے ۔

جہاد باللسان

اس آیت کریمہ میں جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کا ذکر ہے ۔ تاہم ابوداؤد شریف اور ترمذی شریف کی روایت میں جہاد باللسان کا ذکر بھی آتا ہے اور جہاد بالسنان کا بھی ۔ یعنی جہاد زبان کے ساتھ بھی ہے اور اسلحہ کے ساتھ بھی ہے ۔ ابوداود شریف کی روایت میں اس طرح آتا ہے جَاهِدُوا الْكُفَّارَ وَالْمُشْرِكِينَ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَأَلْسِنَتِكُمْ یعنی کفار و مشرکین سے جہاد کرو اپنے مالوں ، جانوں اور زبانوں کے ساتھ تو گویا بوقت ضرورت لسانی جہاد بھی فرض ہو جاتا ہے ۔ دین اسلام کی تبلیغ یعنی اللہ کے احکام کو دوسروں تک پہنچانا لسانی جہاد ہے ۔ تقریر و بیان کے ذریعے اسلام کی تبلیغ یا اسلام کے متعلق کسی فرد یا جماعت کے شکوک و شبہات دور کرنا بھی زبانی جہاد کا حصہ ہیں ۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اسلام کی تعلیم ، اس کی اشاعت اور تبلیغ جہاد ہی کا ایک شعبہ ہے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اسی شعبے میں لگایا ہوا ہے اور میں اپنا فرض انجام دے رہا ہوں ۔ آپ نے بارہ سال تک دہلی میں تعلیم دی ، پھر حج کے لیے گئے ۔ وہاں سے استفادہ حاصل کیا اور پھر واپس آکر ساری عمر تبلیغ کے شعبے میں لگے رہے ۔ آپ بالفعل تو جہاد میں شریک نہیں ہو سکے تاہم آپ نے اسلامی تعلیمات کی ترویج کے لیے اپنا فرض احسن طریقے سے پورا کیا

جہاد بذریعہ تصنیف

تبلیغ اسلام کے لیے تصنیف و تالیف بھی جہاد میں داخل ہے میرے سامنے جو قرآن پاک ہے اس کا ترجمہ اور کچھ حاشیہ شیخ الہندؒ کا ہے اور یہ آپ نے مالٹا میں اسیری کے دوران لکھا تھا ۔ اور بقیہ حاشیہ آپ کے شاگرد حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے مکمل کیا تھا ۔ یہ بہترین ،

مستند اور مختصر حاشیہ ہے۔ آپ کے پاس جو قرآن کریم ہے اس کا ترجمہ اور مختصر حاشیہ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کا ہے۔ بڑا آسان اور عام فہم ترجمہ ہے۔ یہ بھی ایک عظیم جہاد ہے تصنیف و تالیف کے ذریعے جہالت کو مٹانا، علم کو پھیلانا، عدل و انصاف کو قائم کرنا ایمان اور توحید کو دنیا میں غالب کرنا معاصی اور فسق و فجور کا قلع قمع جہاد ہی کا حصہ ہے۔ بلکہ یہ جہاد کبیر ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔ یُوْزَنُ مِدَادُ الْعُلَمَاءِ بِدَمِ الشُّهَدَاءِ قیامت والے دن اللہ تعالیٰ تصنیف و تالیف کرنے والے علماء کی سیاہی کو شہیدوں کے خون کا درجہ عطا فرمائیں گے۔ تصنیف و تالیف کی اتنی بڑی فضیلت آئی ہے۔ گویا جہاد کی یہ چار شکلیں واضح ہوگئیں یعنی تصنیف و تالیف، تبلیغ، تعلیم اور جہاد بالفعل۔

جہاد بالمال

جن لوگوں کو اللہ نے توفیق بخشی ہے وہ اللہ کی راہ میں مال بھی لگاتے ہیں اور جان بھی پیش کر دیتے ہیں۔ تاہم بعض لوگ جسمانی لحاظ سے اس قابل نہیں ہوتے کہ جنگ میں بنفس نفیس شامل ہوسکیں۔ ایسے لوگوں کو اللہ نے توفیق دی ہے۔ تو وہ جہاد بالمال میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اللہ کے دین کے قیام اور غلبہ اسلام کے لیے جو مال خرچ کیا جائے اس کا درجہ عام صدقات و خیرات سے بہت بلند ہے۔ جہاد کا موقع تھا۔ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت میں ایک اونٹنی لایا، اس پہ کجاوہ اور پالان کسا ہوا تھا۔ عرض کیا، حضور! یہ اونٹنی پوری طرح تیار ہے، اسے کسی مجاہد کے سپرد فرما دیجئے۔ آپ نے فرمایا تم نے بہت اچھا کام کیا۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمہیں اس طرح کی سات سو اونٹنیاں عطا فرمائیگا۔ گویا جہاد کے لیے ایک پیسہ خرچ کرنے کا ادنیٰ درجہ سات سو گنا ہے۔ سورۃ انعام میں عام نیکی کا صلہ تو دس گنا بتایا ہے "مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا" مگر جہاد کے لیے اجر و ثواب سات سو گنا تک بڑھ جاتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا ذُرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ یعنی اسلام کی کوہان کی بلندی جہاد ہے۔ جہاد کی وجہ سے ملتِ اسلامیہ میں استحکام پیدا ہوتا

ہے۔ حدود اللہ جاری ہوتی ہیں، برائی کا خاتمہ ہوتا ہے، کفر کا غلبہ ٹوٹتا ہے اور زمین میں خلافت کا نظام قائم ہوتا ہے۔

ترکِ جہاد کا وبال

ایک عرصہ ہوا ملتِ اسلامیہ سے جہاد کا جذبہ ختم ہو چکا ہے۔ کفار نے اس جذبہ کو ختم کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے، ہندوستان میں مرزا قادیانی کو کھڑا کیا جس نے اعلان کیا اب جہاد منسوخ ہو چکا ہے۔ ایسا ہی کچھ پراپیگنڈا سر سیّد سے کروایا گیا۔ ایران میں یہ کام بہاء اللہ سے کروایا کہ نئی شریعت آ گئی ہے لہٰذا اب جہاد کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب انگریز کی خباثت ہے جس نے مسلمانوں میں بزدلی پیدا کرنے کے لیے جہاد سے پیچھے ہٹایا خلافت کو ختم کر کے انگریز نے ملتِ اسلامیہ کی مرکزیت کو ختم کر دیا۔ اسلامی خلافت اور یکجہتی کی وجہ سے انگریز اور جرمن وغیرہ مسلمانوں سے خوفزدہ تھے چنانچہ انہوں نے مِلی بھگت سے دنیا بھر میں مسلمانوں کو چھوٹے چھوٹے خطوں میں تقسیم کر دیا ہے تاکہ ان کی اجتماعیت ختم ہو، اور کسی مشکل کے وقت یہ ایک دوسرے کی مدد بھی نہ کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں مسلمانوں کو کہیں بھی عزت کی زندگی نصیب نہیں۔ فلسطین اور افغانستان کے مسلمان بے یار و مددگار ہیں۔ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ انگریز نے ایسی پابندیاں لگا دی ہیں کہ چاہنے کے باوجود کوئی مسلمان اپنے بھائیوں کی مدد کو نہیں پہنچ سکتا۔ یہ سب غیر اقوام کی سازش کا نتیجہ ہے۔

فضول خرچی

اللہ تعالیٰ کا حکم تو یہ ہے۔ کہ اپنا مال جہاد میں لگاؤ مگر آج مسلمانوں کا مال تعیش کے کاموں میں صرف ہو رہا ہے۔ آج مسلمانوں کی دولت کا رُخ کھیل تماشے، عیاشی، فحاشی، مشرکانہ رسومات، اور بدعات کی طرف ہے۔ اسلام کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے کتنا روپیہ صرف ہو رہا ہے۔ عالیشان عمارتیں ضرور بن رہی ہیں مگر دین کی تبلیغ کی طرف کوئی توجہ نہیں۔ ہر شخص راتوں رات دنیا بھر کے خزانوں کا مالک بن جانا چاہتا ہے اور اُسے اس بات کی کچھ پروا نہیں کہ ذرائع آمدن حلال ہیں یا حرام حالانکہ حکم یہ ہے اَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ

جائز ذرائع سے کماؤ اور جائز امور پر خرچ کرو۔ جو کوئی حرام کاموں پر مال خرچ کریگا۔ عنداللہ ماخوذ ہوگا۔ آج صرف دس فیصدی لوگ دولتمند ہیں اور باقی نوے فیصدی سخت تکلیف میں مبتلا ہیں۔ آج کون ہے جو غریبوں کو بھی اپنا بھائی سمجھ کر اُن کے دکھ درد میں شریک ہو۔ آج کس کو احساس ہے۔ کہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ سب کا نظریہ حیات (IDOLOGY) ایک ہے لہذا ایک بھائی کو دوسرے بھائی کی ضروریات کا بھی خیال ہونا چاہیئے۔

ملّی جذبہ

وہ لوگ کہاں گئے جن کے دلوں میں ملی جذبہ موجود تھا اور وہ اپنے بھائیوں کے لیے جذبہ ہمدردی رکھتے تھے۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ سحری کے وقت کھانا نہیں کھاتے تھے۔ لوگوں نے کہا آپ جسمانی طور پر کمزور ہیں اور روزہ بھی رکھتے ہیں، کچھ کھا پی لیا کریں۔ فرمایا مجھے اُن غریب مسلمانوں کا خیال آجاتا ہے، جن کے پاس سحری کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ جب اُن کا تصور آتا ہے۔ تو حلق سے لقمہ نیچے نہیں جاتا۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اگر مغرب میں کوئی مسلمان عورت اغوا ہو جائے تو مشرق کے مسلمانوں پر اس کی امداد فرض ہو جاتی ہے فرماتے ہیں اگر مشرق کے رہنے والے کسی مومن کے پاؤں میں کانٹا چبھتا ہے تو مغرب والے مسلمان اس کی چبھن محسوس کرتے ہیں۔ یہ تھا وہ جذبہ جس کی وجہ سے مسلمانوں کو دنیا میں عزت نصیب تھی اور اغیار اُن سے دہشت کھاتے تھے

اجرِ عظیم

فرمایا وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو فضیلت بخشی ہے پیچھے بیٹھنے والوں پر اور اجرِ عظیم بھی، فرمایا دَرَجٰتٍ مِّنْهُ یہ درجے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے صحیحین کی روایت میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کے لیے جنت میں سو درجے تیار کر رکھے ہیں اور ہر درجے میں اتنا فرق ہے جتنا آسمان اور زمین کے درمیان۔ فرمایا اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی وَمَغْفِرَةً بخشش بھی ہے جو انہیں نصیب ہوگی۔

جہاد میں بعض کوتاہیاں ہو جاتی ہیں۔ کوئی مسلمان غلطی سے مارا جاتا ہے۔ تو اس قسم کی لغزشوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی بخشش حاصل ہو گی وَرَحْمَةً اور اللہ تعالےٰ مجاہدین کو اپنی آغوش رحمت میں جگہ دے گا۔ اس کی مہربانی شامل حال ہو گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفت یہ ہے وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ وہ بخشنے والا ہے۔ انسان کا اعتقاد صحیح ہو، جذبہ اور طلب صادق ہو تو اللہ تعالےٰ بخشنے والا ہے۔ وہ ضرور معاف کر دے گا۔ اور رحیم ہے، اس کی مہربانی بڑی وسیع ہے۔ جب کوئی شخص اللہ کے دین، اسکی کتاب اور نبی کے مشن کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے مال و جان کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی بخشش و رحمت جوش میں آکر اسکی تمام کوتاہیاں معاف فرما دیتی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيٓ أَنْفُسِهِمْ قَالُوا
فِيمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ؕ
قَالُوٓا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ؕ
فَأُولٰٓئِكَ مَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيرًا ﴿۹۷﴾
إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا
يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَّلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ﴿۹۸﴾
فَأُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ
عَفُوًّا غَفُورًا ﴿۹۹﴾ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ يَجِدْ
فِي الْأَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ
يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهٖ
ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهٗ عَلَى
اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿۱۰۰﴾ ع ۱۴

ترجمہ: بیشک وہ لوگ جن کو فرشتے وفات دیتے ہیں اس حال میں کہ وہ اپنی جانوں پر زیادتی کرتے ہیں (فرشتے) کہتے ہیں کہ تم کس بات میں تھے۔ وہ کہتے ہیں، ہم زمین میں کمزور تھے (فرشتے) کہتے ہیں کیا اللہ کی زمین کشادہ نہیں تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے۔ پس یہی لوگ ہیں کہ جن کا ٹھکانا

جہنم ہے اور بہت بُری جگہ ہے لوٹنے کی (۹۷) مگر وہ لوگ جو
کمزور ہیں مردوں، عورتوں اور بچوں میں سے، جو نہیں طاقت
رکھتے کسی تدبیر کی اور وہ نہیں راہ پاتے (۹۸) پس یہ لوگ
ہیں۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو معاف کر دے گا، اور اللہ تعالیٰ
بہت معاف کرنے والا اور بخشش کرنے والا ہے (۹۹) اور جو شخص
ہجرت کریگا اللہ کی راہ میں، وہ پائے گا زمین میں بہت سی جگہ
اور وسعت۔ اور جو شخص نکلے گا اپنے گھر سے ہجرت کرتے ہوئے
اللہ اور اس کے رسول کی طرف، پھر پا لے اُس کو موت
پس بیشک واقع ہو گیا اللہ پر اُس کا اجر۔ اور اللہ تعالیٰ
بہت بخشنے والا اور مہربان ہے (۱۰۰)

ہجرت کی فرضیت

گذشتہ درس میں مجاہدین اور قاعدین کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا تھا اور مجاہدین کی فضیلت اور اجرِ عظیم کا ذکر تھا۔ اب جہاد کے ساتھ ساتھ ہجرت کی ضرورت اور اسکی فرضیت کا تذکرہ ہے۔ اور بوقت ضرورت ہجرت نہ کرنے والوں کی سزا کا بیان ہے۔ جس طرح بعض حالات میں جہاد فرض کفایہ سے فرض عین بن جاتا ہے اسی طرح بعض اوقات ہجرت بھی فرض عین کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔ جب کسی مقام میں کفار کو اس قدر غلبہ حاصل ہو جائے کہ مومن اپنے دین کے شعار پر عمل نہ کر سکے، تو مومن پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے گھر بار، کاروبار، وطن، عزیز و اقارب وغیرہ کو اللہ کی رضا کی خاطر چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جائے جہاں وہ دین کے احکام پر آسانی سے عمل پیرا ہو سکے۔ چنانچہ مکہ مکرمہ میں ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے۔ کہ کفار نہ تو مسلمانوں کو نماز پڑھنے دیتے تھے۔ اور نہ ہی اسلام کے کسی دیگر شعار کو انجام دینے کی اجازت دیتے۔ اس کے علاوہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین کو طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے۔ اِن حالات میں اہلِ اسلام نے مکہ سے ہجرت کر جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ چنانچہ نبوت کے چھٹے سال مسلمانوں کا

ایک گروہ حبشہ کی طرف ہجرت کر گیا۔ وہ سنتے تھے کہ حبشہ کا بادشاہ رحم دل ہے اور وہ تعرض نہیں کرے گا، اس لیے اُمید کرتے تھے کہ وہاں جا کر مسلمان سکھ کا سانس لے سکیں گے۔ اس کے بعد پھر دوسرا قافلہ بھی حبشہ چلا گیا، مگر وہاں جا کر بھی اسلام کی پوری طرح آبیاری نہ ہو سکی۔ آخر مکی دور کے تقریباً تیرہ[۱۳] سال پورے ہونے پر اللہ تعالیٰ کا حکم آ گیا کہ پیغمبر علیہ السلام اور آپ کے ماننے والے مدینہ کی طرف ہجرت کر جائیں۔ اس حکم کی تعمیل میں کئی جماعتیں مدینہ منورہ روانہ ہوئیں اور پھر خود حضور علیہ السلام بھی حضرت صدیق اکبرؓ کی معیت میں مدینہ پہنچ گئے آپ کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور وقتاً فوقتاً چھوٹی چھوٹی جماعتیں مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچتی رہیں۔ اس طرح جب آدمی کو موقع ملتا وہ کفار کے حصار کو توڑ کر مدینہ منورہ پہنچ جاتا۔ اور اس طرح کفار کے ظلم و ستم سے بچ جاتا۔ حضرت عمرؓ نے حضور علیہ السلام سے پہلے بیس آدمیوں کی جماعت کے ساتھ ہجرت کی تھی۔

کوتاہی کی سزا

جب ہجرت فرض ہو جاتی ہے تو پھر صاحب استطاعت کو دارالکفر میں ٹھہرے رہنے کی اجازت نہیں ہوتی اور اگر وہ جان بوجھ کر بلا عذر ہجرت نہیں کرتا تو جہنم کا مستحق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس ضمن میں سخت وعید فرمائی ہے۔ البتہ بعض کمزور طبقوں کو ہجرت سے اس بناء پر مستثنا قرار دیا گیا ہے۔ کہ سفر ہجرت ان کے بس میں نہیں ہوتا بعض جسمانی طور پر اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ سواری پر بھی سفر نہیں کر سکتے۔ بعض کے پاس زادِ راہ نہیں ہوتا اور بعض راستے سے ناواقف ہوتے ہیں اور اس معاملہ میں انہیں کسی کا تعاون بھی حاصل نہیں ہوتا ایسے لوگ معذور سمجھے جاتے ہیں اور عنداللہ ماخوذ نہیں ہوتے بہر حال بلا عذر ہجرت سے گریز کرنے والوں کو سخت وعید سنائی گئی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ بیشک وہ لوگ جن کی جان فرشتے نکالتے ہیں ان حالات میں ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ

کہ وہ اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے ہوں۔ توفی کا معنی کسی چیز کو پورے طریقے سے قبض کر لینا ہوتا ہے۔ یہ لفظ موت پر بھی بولا جاتا ہے اور اس کے بعض دیگر معانی بھی ہیں۔ اپنی جانوں پر ظلم کا مطلب یہ ہے کہ ان پر ہجرت فرض ہو چکی تھی۔ مگر وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے عاید کردہ فرائض مثلاً نماز، روزہ حج، زکوٰۃ وغیرہ ادا نہیں کرتا، وہ اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔ اسی طرح ہجرت بھی فرض تھی مگر اس فرض کو انجام نہ دینے والا ظالموں کی فہرست میں آ گیا۔ تو فرمایا اس قسم کے مجرم لوگوں کی جب فرشتے روح قبض کرتے ہیں قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ تو ان سے کہتے ہیں، تم کس حال میں تھے۔ تم پر ہجرت فرض ہو چکی تھی، مگر تم نے دار الکفر کو کیوں نہ چھوڑا۔ تو وہ لوگ جواب دیتے ہیں قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ہم زمین میں کمزور خیال کیے جاتے تھے۔ فرشتے پھر سوال کرتے ہیں قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً کیا اللہ کی زمین وسیع نہیں تھی فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے۔ یہ درست ہے کہ تم کفار کے مقابلے میں کمزور تھے مگر کیا چلنے پھرنے سے بھی معذور تھے۔ تم میں اتنی ہمت تو تھی کہ اس مقام سے چلے جاتے، پھر تم نے اللہ کے حکم کے مطابق ہجرت کیوں نہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ کہ ان کا ٹھکانا جہنم ہے وَسَآءَتْ مَصِيْرًا اور وہ لوٹ کر جانے کی بہت بری جگہ ہے۔ غرضیکہ فرض عین کے ہر تارک کے لیے یہی حکم ہے۔

معذوروں کے لیے رعایت

فرمایا اس حکم سے یہ لوگ مستثنیٰ ہیں اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ مردوں، عورتوں اور بچوں میں سے کمزور طبقہ، بعض اتنے معمر ہوتے ہیں کہ چلنے پھرنے سے معذور ہوتے ہیں اور بعض عورتیں بچوں کے ساتھ جانے والا کوئی نہیں ہوتا یا راستے کا علم نہیں ہوتا

فرمایا لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَةً ایسے کمزور لوگ ہجرت کر جانے کی کوئی تدبیر نہیں پاتے۔ ان کے پاس ہجرت کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا وَلَا یَهْتَدُوْنَ سَبِیْلًا انہیں راستے کا علم بھی نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ اللہ کے ہاں معذور تصور ہوں گے اور ان پر ہجرت نہ کرنے کی صورت میں کوئی گناہ نہیں ہوگا البتہ استطاعت رکھنے کے باوجود ہجرت سے گریز کرنے والا کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوگا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ ان معذور اور کمزور لوگوں کے متعلق فرمایا فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْهُمْ امید ہے کہ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ معاف فرمادے گا۔ کیونکہ وہ مجبور ہیں۔ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا۔ اللہ تعالیٰ بہت زیادہ معاف کرنے والا اور بہت زیادہ بخشش کرنے والا ہے۔

ہجرت کی برکات

فرمایا وَمَنْ یُّهَاجِرْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ جو شخص اللہ کے راستے میں ہجرت کرے گا یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِیْرًا وہ زمین میں بہت جگہ پائے گا۔ مُرٰغَمًا اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی بھاگ کر چلا جائے اور رُغام مٹی کو بھی کہتے ہیں۔ اور رغم کہتے ہیں کہ کوئی شخص اپنے مخالف کی ناک پر مٹی مل کر چلا جائے بہرحال مراغم کا معنیٰ جائے ہجرت ہے کہ جو شخص ہجرت کے ارادے سے نکلے گا وہ ضرور مناسب جگہ تلاش کرلے گا۔ اس کے علاوہ وَّسَعَةً اسے وسعت بھی میسر آجائے گی یعنی اللہ تعالیٰ اس کے رزق میں کشادگی پیدا فرمادیں گے، گویا اللہ تعالیٰ ہجرت کے نتیجہ میں ممکنہ تکالیف کو دور فرمادیگا۔

ہجرت کا معاملہ بڑا دشوار ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے، شَانُ الْهِجْرَةِ لَشَدِیْدٌ جب آدمی اپنا کاروبار، زمین، مکان وغیرہ چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو بعض اوقات نئی جگہ پر اسے آب و ہوا موافق نہیں آتی اور انسان طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ مکے سے مدینے جانے

والے بہت سے مہاجرین بخار میں مبتلا ہو گئے تھے۔ بعض اوقات غذا موافق نہیں آتی، زبان کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور دیگر کئی قسم کی پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں اس لیے ہجرت کا معاملہ بڑا دشوار ہے مگر اس کا اجر بھی بہت بڑا ہے۔

مقاصدِ ہجرت

ہجرت دو مقاصد کے لیے ہوتی ہے۔ پہلا مقصد یہ ہے کہ مسلمان ایسے دارالکفر میں ہیں جہاں وہ دین کے شعار پورے نہیں کر سکتے، اس لیے انہیں ایسی جگہ پر ہجرت کرنا فرض عین ہو جاتا ہے۔ جہاں مسلمانوں کی مرکزی قوت موجود ہو اور وہ اپنے دینی فرائض آزادی کیساتھ پورے کر سکیں۔ حضور علیہ السلام کے مدینہ طیبہ پہنچنے پر وہاں مرکزی قوت میسر آگئی تھی وہ دارالہجرت قرار پایا۔ چنانچہ اس دور میں مسلمانوں کا مرکزی مقام پر پہنچنا ضروری ہو گیا تھا۔ اسی مشن کے تحت صحابہ کرامؓ اور خود حضور علیہ السلام نے بھی ہجرت کی۔ اس سے پہلے جد الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی عراق سے ہجرت کی تھی۔

اگر کسی مقام پر اسلام کی مرکزی قوت ضائع ہو جائے تو اسکی بحالی کے لیے بھی ہجرت ناگزیر ہو جاتی ہے، یہ ہجرت کا دوسرا مقصد ہے۔ قریبی زمانہ میں اس کی مثال حضرت سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی ہجرت ہے۔ یہ بزرگ دہلی سے ہجرت کر کے سرحد پہنچے تاکہ وہاں مرکز اسلام قائم کر کے ہندوستان میں اپنی کھوئی ہوئی طاقت بحال کر سکیں۔ انہوں نے ہجرت کے لیے بڑا طویل اور کٹھن راستہ اختیار کیا۔ رائے بریلی سے دہلی پہنچے وہاں سے کلکتہ، پھر مدراس اور پھر سندھ سے ہوتے ہوئے قندھار گئے، قندھار سے پشاور آئے اور اس طرح انہوں نے تقریباً اڑھائی تین ہزار میل کا سفر طے کیا، یہاں سے وہ کشمیر جا کر اُسے مرکز بنانا چاہتے تھے مگر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ انہوں نے چار سال تک انتھک جدوجہد کی مگر مسلمانوں کی بدبختی اور ان کی نالائقی اور جاسوسی کی وجہ سے کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکے اور جام شہادت نوش فرما گئے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے زمانے میں جب انگریز نے

ہندوستان میں غلبہ حاصل کر لیا تو شاہ صاحب نے اپنے فتویٰ کے ذریعے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے دیا تھا۔ بہرحال یہ وہ مقاصد ہیں جن کے حصول کے لیے ہجرت ضروری ہو جاتی ہے۔

مہاجر کے لیے اجر و ثواب

آیت کے اگلے حصے میں مہاجر کی فضیلت اور اس کے لیے اجر و ثواب کا ذکر ہے۔ وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف اپنے گھر سے مہاجر بن کر نکلا ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ پھر راستے میں اس کو موت نے پا لیا۔ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ پس اس کا اجر اللہ پہ واقع ہو گیا۔ یعنی مہاجر گھر سے چل کر اگر جائے ہجرت پر نہ بھی پہنچ سکے تو اسے ہجرت کا ثواب حاصل ہو جائے گا۔ مکی دور میں جب ہجرت کا اعلان ہوا۔ تو ایک ضعیف اور بیمار شخص بھی ہجرت کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ خود تو چل پھر نہیں سکتا تھا، اس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ مجھے کسی طرح یہاں سے نکال کر لے چلو۔ انہوں نے ہر چند کہا کہ تم سفر کے قابل نہیں ہو، لہٰذا تم ہجرت سے مستثنیٰ ہو، مگر بوڑھا بضد تھا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف ضرور ہجرت کریگا۔ بالآخر اس کے بیٹے اسے اٹھا کر چل پڑے۔ ابھی مکے سے چند میل دور تنعیم کے مقام پر آئے تھے کہ بوڑھے کا انتقال ہو گیا۔ کافروں نے خوب تمسخر اڑایا مگر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی کہ جو کوئی ہجرت کے لیے چل نکلے، پھر اسے راستے میں موت آ جائے، تو اس کا اجر و ثواب اللہ پہ واقع ہو گیا۔ یعنی خداوند کریم اُسے ہجرت کا پورا پورا بدلہ عطا فرما دیں گے۔ البتہ یہ بات یاد رہے۔ کہ ہجرت کے ثواب کا حقدار وہی شخص ہے، جو خالص نیت سے اللہ کی رضا، اس کے رسول کے اتباع اور دین کی بلندی کے لیے ہجرت کرتا ہے۔ جو شخص کسی دیگر نیت سے ہجرت کریگا، اللہ تعالیٰ اسکی کوئی ذمہ داری قبول نہیں کریگا۔ بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ مکے سے ایک شخص عورت

کی خاطر ہجرت کر کے گیا حضور علیہ السلام نے فرمایا جو شخص دنیا یا عورت کی خاطر ہجرت کر کے جائے گا اُسے وہی کچھ ملیگا۔ وہ آخرت میں اجر و ثواب کا مستحق نہیں ہوگا۔

ہجرت وسیع معنوں میں

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ہر مقدس سفر کا حکم ہجرت کے سفر کا ہی ہے جو شخص خالص نیت سے حج کے سفر پر روانہ ہوتا ہے، جہاد کے لیے نکلتا ہے یا دین کی تعلیم کی خاطر گھر سے چلتا ہے، پھر راستے میں اس کی موت واقع ہو جاتی ہے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ واقع ہو گیا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ ہجرت بعض دیگر وجوہات سے بھی فرض ہو جاتی ہے۔ مثلاً کوئی مسلمان کسی مقام میں گناہ میں مبتلا ہے اور اس سے بچ نہیں سکتا۔ تو اس کے لیے لازم ہے کہ اس جگہ کو چھوڑ جائے تاکہ وہ گناہ سے بچ جائے۔ یا کسی جگہ مسلمان کو رزق حلال نصیب نہیں، وہ ایسی جگہ پھنسا ہوا ہے۔ جہاں اُسے سو فیصدی حرام رزق حاصل ہوتا ہے تو ایسے شخص کے لیے بھی ہجرت فرض ہو جاتی ہے آپ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص دنیاوی اشغال میں اس قدر منہمک ہو کہ خدا کی طرف توجہ دینا نصیب نہیں ہوتا، تو اُسے چاہیئے کہ مسجد میں اعتکاف بیٹھے تاکہ اپنے رب سے تعلق پیدا کر سکے۔

بہرحال فرمایا جو کوئی شخص اپنے گھر سے ہجرت کے لیے نکلے گا تاکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف جائے اور پھر اُسے راستے میں موت آجائے گی تو اسے اللہ تعالیٰ ہجرت کا پورا ثواب عطا کریں گے وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا اللہ تعالیٰ بہت زیادہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ وہ ایسے لوگوں پر خاص مہربانی فرمائے گا۔

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ إِنَّ الْكٰفِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِينًا ﴿۱۰۱﴾

ترجمہ : اور جب تم زمین میں سفر کرو ، پس تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ کم کر دو نماز میں سے ۔ اگر تمہیں خوف ہو کہ تمہیں فتنہ میں ڈالیں گے ، کفر کرنے والے لوگ بیشک کفر کرنے والے تمہارے کھلے دشمن ہیں ﴿۱۰۱﴾

ربط آیات

گذشتہ آیات میں جہاد اور مجاہدین کی فضیلت کا بیان تھا ، پھر ہجرت کی فرضیت اور اس میں کوتاہی کرنے والوں کے لیے وعید کا تذکرہ تھا ، ہجرت اور جہاد کے لیے دور دراز کا سفر اختیار کرنا پڑتا ہے ۔ جہاد میں خاص طور پر دشمن کے ساتھ مقابلے یا اُس کے تعاقب میں بہت دُور تک جانا پڑتا ہے ۔ بہرحال ان دونوں امور کے لیے سفر کا اختیار کرنا ضروری ہو جاتا ہے ۔ اب اس رکوع میں دورانِ سفر نماز کا حکم بیان کیا گیا ہے پہلی دو آیات کا تعلق اسی موضوع سے ہے ۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ پہلی آیات کا تعلق مطلقاً سفر کے ساتھ ہے ، خواہ وہ سفر کسی بھی نوعیت کا ہو ، اور دوسری آیت کا تعلق خوف کی حالت میں نماز پڑھنے سے ہے ۔

سفر اور اس کے اثرات

سفر ایک دشوار چیز ہے ۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے اَلسَّفَرُ قِطْعَةٌ مِّنَ الْعَذَابِ يَمْنَعُ أَحَدَكُمْ نَوْمَهٗ الخ یعنی سفر عذاب کا ٹکڑا ہے جو تمہاری نیند میں بھی خلل کا باعث بنتا ہے ۔ دورانِ سفر انسان آرام و راحت سے محروم ہو جاتا ہے ۔ کھانے پینے کا نظام متاثر ہوتا ہے ، گھر بار سے دُور

ہو جاتا ہے - اسی لیے ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ تم میں جب کوئی سفر کرتا ہے تو کسی ضرورت کے تحت ہی کرتا ہے، لہذا جب ضرورت پوری ہو جائے فَلْیُعَجِّلْ اِلٰی اَھْلِہٖ تو فوراً اپنے گھر کی طرف واپس آجانا چاہیئے۔ سفر بہرحال کلفت کا باعث ہے۔

سفر کی حالت میں بعض شرعی احکام بدل جاتے ہیں اور مسافر کو بعض رعائتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً روزہ افطار کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ اور چار رکعت والی نماز نصف رہ جاتی ہے۔ یعنی چار رکعت کی بجائے صرف دو رکعت پڑھی جاتی ہے ——— البتہ دو یا تین رکعت والی نماز پوری پڑھی جاتی ہے۔ کیونکہ تین کا نصف ڈیڑھ ہے اور ڈیڑھ رکعت کی کوئی نماز نہیں ہے۔ لہذا یہ اپنی جگہ پہ قائم رہتی ہے۔ تاہم ظہر، عصر اور عشاء کی نمازوں میں دو رکعت کی تخفیف ہو جاتی ہے - ان میں قصر کرنے کا حکم ہے

شرعی سفر کی مسافت

قرآن پاک یا فرمانِ رسول علیہ السلام میں شرعی سفر کو صراحت کے ساتھ متعین نہیں کیا گیا جس پہ نماز قصر ہو جائے یا روزہ افطار کرنے کی اجازت ہو۔ اسی لیے شاہ ولی اللہ محدث ——— دہلویؒ فرماتے ہیں۔ کہ شرعی سفر کے تعین کے لیے کئی عوامل کو دیکھنا پڑتا ہے۔ لہذا اس میں غور وفکر کی ضرورت ہے اس ضمن میں جو کچھ اخذ کیا گیا ہے اس کا دارومدار صحابہ کرامؓ کے عمل پر ہے۔ چنانچہ شرعی مسافت کے مسئلہ میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اہل ظواہر، تین یا نو میل تک کی مسافت کو بھی شرعی سفر شمار کرتے ہیں حالانکہ چار، پانچ یا چھ میل تو انسان اپنے گھر سے اپنے کھیت، فیکٹری یا دفتر وغیرہ کے لیے بھی چلے جاتے ہیں۔ بعض اوقات آدمی حفظانِ صحت کی خاطر چار پانچ میل کی سیر کر لیتا ہے۔ تو اتنی قلیل مسافت کا سفر شرعی نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے کسی معتدبہ مسافت کا تعین کرنا پڑے گا۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ چار برد کو شرعی سفر تسلیم کرتے ہیں ایک برد بارہ میل کا ہوتا ہے اور اس طرح شرعی سفر کی کم از کم مسافت ۴۸ میل بنتی ہے۔ بعض

علمائے کرام تین بہ یدیعنی ۳٦ میل کو شرعی سفر مانتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک شرعی سفر دراصل تین دن کی مسافت ہے۔ اوسط رفتار سے کوئی شخص پیدل یا اونٹ پر جتنا سفر تین دن میں طے کرتا ہے، وہی شرعی سفر ہے۔ یہ عام طور پہ بارہ تا سولہ میل یومیہ ہوتا ہے کیونکہ مسافر کو آرام بھی کرنا ہوتا اور دیگر ضروریاتِ زندگی کو بھی پورا کرنا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے امام صاحب نے شرعی سفر کی مسافت چار بہ ید یعنی اڑتالیس میل مقرر کی ہے اور اسی پہ زیادہ علمائے حنفیہ کا اتفاق ہے۔ تاہم استاذ الاساتذہ مولانا عبدالحی لکھنویؒ، امام اہل سنت والجماعت مولانا عبدالشکور لکھنویؒ اور مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ وغیرہم تین بہ ید یعنی ۳٦ میل کے قائل ہیں۔

سمندری سفر کے لیے بھی امام ابوحنیفہؒ تین دن مسافت ہی متعین کرتے ہیں۔ بادبانی کشتی تین دن میں اوسط رفتار سے جتنا سفر کرتی ہے، وہی سفر ہے۔ خشکی کی نسبت آبی راستہ کے ذریعہ نسبتاً کم سفر طے ہوتا ہے جو کہ تقریباً بیس۲۰ میل کے قریب بنتا ہے۔ لہٰذا دریائی یا سمندری شرعی سفر بیس میل ہوگا اس سے کم شرعی سفر شمار نہیں ہوگا۔

نماز میں قصر

ارشاد ہوتا ہے وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ جب تم زمین میں سفر کرو فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ تو تم پہ کوئی گناہ نہیں کہ تم نمازیں سے کچھ کم کر دو۔ اس کمی سے مراد تعداد رکعت کی کمی ہے نہ کہ کسی ایک رکعت میں مطلوبہ قرأت میں کمی۔ اس طرح چار رکعت والی نماز کی صرف دو رکعت ادا کی جائیں گی۔ حضرت عائشہؓ کی روایت میں آتا ہے کہ اصل نماز دو رکعت ہی تھی مگر اقامت کی صورت میں اسے چار کر دیا گیا۔ چنانچہ سفر کی حالت میں اسے اپنی اصل حالت دو رکعت پہ برقرار رکھا گیا ہے۔ مسند احمد کی روایت میں یہ بھی آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کی نماز بھی دو دو رکعت ہے اور جمعہ کی نماز بھی دو رکعت ہے اور مسافر کی نماز بھی دو ہی رکعت ہے۔ یہ مکمل نماز ہے کیونکہ سفر میں اتنی ہی پڑھنے کا حکم ہے۔

اگر کوئی مسافر شخص اکیلا نماز پڑھ رہا ہے یا امامت کرا رہا ہے تو وہ چار کی بجائے دو رکعت پڑھے گا اور اگر مقیم امام کے پیچھے نماز ادا کر رہا ہے تو پھر اُسے چار رکعت پوری کرنا ہوں گی، حتیٰ کہ امام کے پیچھے اگر چوتھی رکعت میں آکر شامل ہوا تو پھر بھی اُسے چار رکعت ہی پوری کرنا ہوں گی۔ خود امام ہونے کی صورت میں حضور علیہ السلام نے منیٰ اور عرفات میں دو دو رکعت ہی پڑھائیں اور مسافر امام کے لیے یہ بھی حکم ہے، کہ وہ بلند آواز سے اعلان کر دے کہ ہم مسافر ہیں اَتِمُّوا الصَّلٰوۃ تم اپنی نماز پوری کر لو۔ چنانچہ حضور علیہ السلام نے دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیا، مسافر نمازیوں نے بھی ایسا ہی کیا البتہ مقیم نمازیوں کے لیے چار رکعت مکمل کرنے کا حکم تھا۔

قصر کی شرعی حیثیت

اب یہ مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ سفر میں قصر کرنا واجب ہے یا مستحب۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ اُسے وجوب کا درجہ دیتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ کہ قصر نہ کرنے والا مسافر گنہگار ہو گا۔ البتہ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ یہ مستحب ہے۔ گویا سفر میں قصر کرنا افضل ہے۔ اگر پوری نماز پڑھ لے تو گنہگار نہیں ہو گا۔ حضرت عمرؓ کی روایت میں آتا ہے۔ کہ قصر کرنا صَدَقَۃٌ تَصَدَّقَ اللّٰہُ بِھَا عَلَیْکُمْ فَاقْبَلُوا صَدَقَتَہٗ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صدقہ ہے، اس صدقہ کو قبول کرنا چاہیئے اور آدھی نماز پڑھنا چاہیئے۔ اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت یعلی ابن امیہؓ نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا کہ اس آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں قصر کا حکم صرف خوف کی حالت میں ہے جب کہ حضور علیہ السلام نے امن کی حالت میں بھی قصر نماز پڑھی، فتح مکہ کے بعد مسلمانوں کو پورے عرب میں غلبہ حاصل ہو گیا تھا مگر آپ نے دو سال بعد یعنی حجۃ الوداع کے موقع پر بھی نماز دو رکعت ہی ادا فرمائی اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے کہا، بھائی! میں نے بھی حضور علیہ السلام سے سنا ہے کہ بظاہر یہ آیت خوف کی حالت کے متعلق ہی ہے مگر درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے معافی

اور صدقہ ہے اور اس کا قانون یہ ہے کہ صدقہ ہمیشہ کے لیے ہوتا ہے ایک دفعہ دے کر دے واپس نہیں لیا جاتا کہ یہ ایک کمینہ حرکت ہے۔ اللہ تعالیٰ تو سب کریموں کا کریم ہے لہٰذا اس کی طرف سے سفر میں دو رکعت کی معافی کا صدقہ قبول کرنا چاہیئے۔

وطنِ اصلی اور وطنِ اقامت

کسی شخص کا وطنِ اصلی وہ مقام ہے، جہاں وہ پیدا ہوا، اس کا گھر بار، بیوی بچے مکان، زمین، دکان، فیکٹری، دفتر وغیرہ ہے اور وطنِ اقامت وہ جگہ ہے جہاں کوئی شخص شرعی سفر کر کے پندرہ دن یا زیادہ مدت کے لیے عارضی طور پر مقیم ہوتا ہے۔ نماز سے متعلق وطنِ اصلی اور وطنِ اقامت کا حکم یکساں ہے ہر دو مقامات پر انسان پوری ہی نماز ادا کرے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور بعض دوسرے صحابہ سے ثابت ہے کہ اگر کوئی آدمی اپنے اصلی وطن سے اڑتالیس میل یا زیادہ دور جا کر پندرہ دن سے کم مدت ٹھہرنے کا ارادہ کرے تو وہ مسافر شمار ہوگا اور نماز قصر ادا کرے گا۔

حضرت عثمانؓ حج کے لیے مکہ مکرمہ آئے تو انہوں نے منیٰ اور عرفات وغیرہ میں پوری نماز ادا کی، تو لوگوں نے اعتراض کیا کہ باقی صحابہؓ نے ان مقامات پر نماز قصر ادا کی ہے، مگر آپ پوری نماز پڑھتے ہیں اس معاملہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بہت ناراض ہوئے کیونکہ مسافر کے لیے نماز قصر واجب ہے نہ کہ محض مستحب۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے جواب دیا کہ لوگو! اِنِّی تَاَهَّلْتُ بِمَكَّةَ مُنْذُ قَدِمْتُ میں نے مکہ میں نکاح کر لیا ہے اور میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ نے فرمایا مَنْ تَاَهَّلَ بِبَلْدَةٍ فَلْيُصَلِّ صَلٰوةَ الْمُقِيْمِ جو شخص کسی شہر میں نکاح کر لیتا ہے تو اسے وہاں پر مقیم کی نماز پڑھنی چاہیئے چنانچہ یہ مسئلہ بھی واضح ہو گیا کہ سسرال میں جا کر پوری نماز ادا کرنی چاہیئے۔

سنتوں کا مسئلہ

یہ مسئلہ تو واضح ہو گیا کہ شرعی سفر کے دوران نماز قصر پڑھی جائے گی یعنی

چار فرض کی بجائے صرف دو ادا ہوں گے۔ اب رہا سنتوں کا مسئلہ کہ کیا یہ بھی پڑھی جائیں گی یا نہیں۔ یہ مسئلہ فتاویٰ عالمگیری میں بھی موجود ہے۔ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے شرح موطا میں بھی لکھا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ سفر کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔ جب کوئی شخص فی الواقع سفر کر رہا ہوتا ہے تو وہ سفر جاری کہلاتا ہے اور جب دوران سفر کسی مقام پر قیام کرتا ہے تو وہ نزول ہوتا ہے۔ سفر جاری میں سنتوں کو ترک کر دینا چاہیئے۔ اور نزول کی حالت میں اگر سنتیں پڑھ لے تو بہتر ہے، ضروری نہیں۔ اگر نہ پڑھیگا تو کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ البتہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فجر کی سنتیں سفر و حضر ہر حالت میں ادا فرماتے تھے۔ اور وتر چونکہ واجب ہیں، آپ وہ بھی ضرور پڑھتے تھے

قصر لازم ہے

یہاں پر فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ کے الفاظ خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ کہ نماز قصر کرنے میں تم پر کوئی حرج نہیں۔ دوران سفر نماز کم ہو جانے سے بعض اذہان میں یہ خیال آسکتا تھا۔ کہ رکعتوں کی کمی کی وجہ سے شاید ثواب میں بھی کمی واقع ہو جائیگی۔ تو اس شبہ کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نماز کو کم کرنے میں کوئی حرج نہیں، یہ تو میری طرف سے رعایت ہے، لہذا اس سے ضرور فائدہ اٹھاؤ۔ اس قسم کا طرز تخاطب دوران حج صفا مروہ کی سعی میں بھی آیا ہے۔ "فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا" یعنی صفا اور مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں۔ جب تم حج یا عمرہ کے لیے جاؤ تو ان دونوں کی سعی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ وہاں بھی لوگوں کو شبہ پیدا ہوا تھا کہ صفا و مروہ کی سعی شاید زمانہ جاہلیت کی کوئی رسم ہے۔ مگر اللہ تعالےٰ نے فَلَا جُنَاحَ کے الفاظ استعمال کر کے سعی کا حکم دیا۔ بہر حال فرمایا نماز میں کمی ہو جانے سے کوئی حرج محسوس نہ کرو، کیونکہ جس طرح عزیمت پر عمل در آمد باعثِ ثواب ہوتا ہے اسی طرح بعض اوقات رخصت پر عمل کرنا بھی ویسے ہی باعثِ اجر ہوتا ہے۔

خوف کی شرط

آگے فرمایا اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا
یعنی اگر تمہیں خوف ہو کہ کافر تمہیں فتنے میں مبتلا کر دیں گے۔ اگر اس حصہ آیت کو پچھلے حصے کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو یہ پہلے حصہ کی شرط بن جاتا ہے اور مطلب یہ ہو گا۔ کہ نماز قصر کی اجازت صرف اُس صورت میں ہے جب کہ تمہیں کفار کی طرف سے خطرہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ جب خوف کی شرط نہ پائی جائیگی تو رعایت ختم ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ شرط اتفاقی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ مبارک میں کفار کی طرف سے عموماً خطرہ رہتا تھا کہ کہیں وہ مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچائیں چنانچہ اس بات کا ذکر اگلی آیتوں میں آرہا ہے اور وہاں یہ بھی حکم ہے کہ اس قسم کے حالات میں ہمیشہ ہتھیار بند رہو، حالانکہ صحابہ کرامؓ بعض اوقات ہتھیار اتار کر آرام بھی کرنا چاہتے تھے۔ بہر حال مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ خِفْتُمْ کا لفظ اتفاقی ہے۔ ضروری نہیں۔ لہٰذا جب خطرہ ٹل جائے اور امن و امان قائم ہو جائے، تو قصر کرنا اُس وقت بھی روا ہے۔

مفسرین کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ وَاِذَا ضَرَبْتُمْ سے مِنَ الصَّلٰوۃِ تک جملہ مکمل ہو جاتا ہے اور اس میں نماز قصر کا واضح حکم موجود ہے۔ البتہ خوف کا تعلق اگلے جملہ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کے ساتھ ہے اور آخر میں فَاحْتَاطُوْا کا لفظ محذوف ہے۔ اس طرح جملہ کا معنی یہ ہو گا کہ اگر تمہیں کفار کی طرف سے فتنہ میں ڈالے جانے کا خوف ہو تو محتاط رہو اور ان کی ہر ممکنہ جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہو۔ لہٰذا آیت کے اس حصے کا قصر کے ساتھ تعلق باقی نہیں رہتا۔ قصر کا ذکر پہلے حصے میں مکمل ہو چکا ہے۔

فرمایا اِنَّ الْکٰفِرِیْنَ کَانُوْا لَکُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا
بلاشبہ کافر تمہارے صریح دشمن ہیں۔ ان سے بچاؤ کی تدابیر کرنا تمہارے لیے

ہر حالت میں ضروری ہے۔ بہر حال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے عمل سے واضح کر دیا کہ دشمنانِ دین کے خلاف ہمیشہ مستعد رہنا ہے اور صلوٰۃ قصر ہر حالت میں ضروری ہے خواہ سفر امن کا ہو یا خوف کا۔

وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ
فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوا
أَسْلِحَتَهُمْ قف فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِن وَّرَآئِكُمْ ص
وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا
مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ج
وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَ
أَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ط
وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّن
مَّطَرٍ أَوْ كُنتُم مَّرْضٰى أَن تَضَعُوا أَسْلِحَتَكُمْ ج
وَخُذُوا حِذْرَكُمْ ط إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكٰفِرِينَ عَذَابًا
مُّهِينًا ﴿۱۰۲﴾

ترجمہ: اور جب آپ اُن میں موجود ہوں اور آپ اُن کے لیے نماز قائم کریں، تو چاہیئے کہ اُن میں سے ایک گروہ آپ کے ساتھ کھڑا ہو جائے اور وہ اپنے ہتھیار لے لیں۔ پس جب وہ سجدہ کریں تو آپ کے پیچھے ہو جائیں اور دوسرا گروہ آجائے جنہوں نے نماز نہیں پڑھی۔ پس وہ آپ کے ساتھ نماز پڑھیں اور لے لیں اپنے بچاؤ کا سامان اور

اپنے ہتھیار۔ پسند کرتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ کسی طرح تم کو غافل پائیں اپنے اسلحہ اور سامان سے پس حملہ کر دیں تم پر یکبارگی حملہ کرنا۔ اور تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اگر تمہیں تکلیف ہو بارش کی وجہ سے یا تم بیمار ہو، کہ تم اپنے ہتھیار اتار دو اور (ہر حالت میں) اپنے بچاؤ کا سامان اختیار کرو بیشک اللہ تعالیٰ نے کفر کرنے والوں کے لیے ذلت ناک عذاب تیار کر رکھا ہے ﴿۱۰۲﴾

ربط آیات

اس رکوع کی پہلی آیت میں سفر کی حالت میں نماز کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شرعی سفر میں چار رکعت والی نماز میں تخفیف کر کے اسے دو رکعت بنا دیا ہے۔ اس ضمن میں دیگر ضروری مسائل بھی گذشتہ درس میں بیان کر دیے گئے تھے۔ تاہم سفر ہی سے متعلق دو مسائل باقی رہ گئے تھے۔ پہلا مسئلہ یہ کہ نماز قصر کہاں سے شروع کرنی چاہیئے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مزعومہ سفر کی نصف منزل طے کر لینے کے بعد نمازِ قصر شروع ہوتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ مسافر اپنی منزل پہ پہنچ کر نماز قصر کرے۔ بعض دیگر حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ جب سفر کی نیت کر لے تو گھر سے ہی قصر شروع کر سکتا ہے۔ مگر صحیح بات یہ ہے۔ کہ جب مسافر اپنی لبتی، گاؤں یا شہر کی حدود سے نکل جائے تو قصر شروع کر دے۔ شہر کی حدود سے مراد یہ ہے کہ مثلاً چونگی سے باہر نکل جائے تو نماز کا وقت ہو جائے تو قصر پڑھے گا۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا معصیت کے سفر میں بھی قصر کی اجازت ہے یا نہیں۔ امام شافعیؒ اور بعض دیگر ائمہ معصیت کے سفر پہ نماز میں قصر کی اجازت کے قائل نہیں اگر کوئی شخص چوری، ڈاکے، قتل، کھیل تماشے یا دیگر حرام امور کے ارتکاب کے لیے سفر کرتا ہے تو اُسے دو رکعت کی معافی حاصل نہیں ہوگی، کیونکہ ایسا شخص گنہگار ہے اس کے برخلاف امام ابُو حنیفہؒ کا فتویٰ یہ ہے کہ سفر کی نوعیت خواہ کیسی ہی ہو، قصر کی

اجازت ہے، کیونکہ قصر کا تعلق سفر سے ہے نہ کہ اطاعت یا معصیت سے، البتہ جس غلط ارادے سے کوئی شخص جا رہا ہے اس کی معصیت کا گناہ اس پہ الگ ہوگا۔ نماز بہر حال قصر ہی کرے گا۔

نماز خوف

آج کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے خوف کی حالت میں نماز پڑھنے کا طریقہ بیان فرمایا ہے۔ خوف عام طور پہ دشمن کی طرف سے ہوتا ہے۔ ابتدائے اسلام کے زمانہ میں اہلِ اسلام اکثر دشمن کی طرف سے خوف میں مبتلا رہے۔ مسلمانوں کو دشمنوں کی طرف سے کسی ممکنہ حملہ کا ہمیشہ خوف رہتا تھا اور بعض اوقات کفار اور اہل ایمان کے درمیان جنگ جاری ہوتی تھی۔ چنانچہ ترمذی شریف کی روایت کے مطابق یہ آیات ایک لڑائی کے متعلق ہی نازل ہوئیں۔ حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ قبیلہ جہینہ کے کفار کے ساتھ جنگ جاری تھی۔ ہم لوگ ظہر کی نماز پڑھ چکے تھے کہ کفار نے آپس میں مشورہ کیا سَتَاْتِیْھِمْ صَلٰوۃٌ ھِیَ اَحَبُّ اِلَیْھِمْ مِنَ الْاَوْلَادِ مسلمانوں کی ایک اور نماز (عصر) آرہی ہے جو انہیں اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ لہٰذا جب یہ لوگ نماز کے لیے کھڑے ہوں تو ان پہ یکبارگی حملہ کر کے انہیں نیست و نابود کر دیا جائے۔

بہر حال حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہؓ نے متعدد بار صلوٰۃ خوف پڑھی ہے اور اس کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے ہیں۔ یہاں پہ اس کا اجمالی طریقہ اور قانون بیان کر دیا گیا ہے، تاہم اسکی تشریح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات مبارکہ اور عمل سے واضح ہوتی ہے۔ اور اس کا ذکر احادیث کی تمام کتابوں میں موجود ہے۔ یہ نماز سفر میں بھی پڑھی جا سکتی ہے اور اقامت میں بھی ادا ہو سکتی ہے

نماز خوف کے متعلق سورۃ بقرہ میں بھی کچھ بیان آچکا ہے۔ وہاں صرف اس قدر تذکرہ آیا ہے کہ جب خوف کی شدت ہو تو "فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا" پاؤں پہ کھڑے ہو یا سواری پہ ہو تو وہیں اشارے سے نماز پڑھ لو۔ ایسی حالت میں رکوع و سجود کی ضرورت بھی نہیں۔ البتہ اس معاملہ میں فقہائے کرام کا اختلاف

ہے کہ کیا چلتے پھرتے بھی نماز ادا ہو جاتی ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ایک جگہ کھڑے کھڑے تو نماز ہو جاتی ہے، مگر چلتے پھرتے نماز پڑھنا جائز نہ ہے۔

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ جنگ کے علاوہ اگر کسی موذی جانور یا درندے کا خوف ہو تو پھر بھی نماز خوف ادا کی جا سکتی ہے۔ کہیں سے شیر یا اژدھا کا خطرہ ہے اور اسکی نگرانی ضروری ہے۔ تو اس صورت میں بھی صلوٰۃ خوف پڑھی جا سکتی ہے تاہم ان تمام حالات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ نماز ایسا اہم فریضہ ہے۔ کہ یہ کسی بھی حالت میں ترک نہیں کی جا سکتی۔

حکم عام یا حکم خاص

اس آیت میں نماز خوف سے متعلق وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ کے الفاظ آتے ہیں۔ اور بظاہر معنیٰ یہ ہے کہ نماز خوف اس وقت ادا کی جائیگی جب آپ ان کے درمیان موجود ہوں۔ گویا نماز خوف حضور علیہ السلام کی حیات طیبہ میں ہی روا تھی۔ حنفی اماموں میں سے امام ابو یوسفؒ، اور امام ابو حنیفہؒ کے دوسرے شاگرد حسنؒ اسی کے قائل ہیں۔ مالکی مسلک کے امام ابن ماجشونؒ کا ذکر بھی ملتا ہے کہ یہ نماز حضور نبی کریم علیہ السلام کے ساتھ خاص تھی۔ مگر جمہور ائمہ کرام (چاروں امام) اور جمہور محدثین اور فقہائے کرام متفق ہیں کہ صلوٰۃ خوف حضور علیہ السلام کی حیات طیبہ کے بعد بھی جاری ہے۔ لہٰذا یہ حکم عام ہے۔ آپ کے بعد یہ نماز صحابہ کرامؓ نے مختلف مقامات پہ ادا کی۔ حضرات ابو بکر، عمر اور عثمان رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانوں میں بھی یہ نماز پڑھی جاتی رہی۔ گویا حکم منسوخ نہیں۔ اگرچہ یہ خطاب حضور کو ہے مگر حکم عام ہے اس کی مثال فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ میں بھی ملتی ہے۔ کہ اگرچہ یہ بھی خطاب نبی علیہ السلام کو ہی ہے مگر نماز اور قربانی کا حکم ہر مکان و زمان کے لیے عام ہے۔

نماز خوف کب اور کیوں

نماز خوف اس وقت ادا کی جاتی ہے۔ جب تمام لوگ ایک ہی امام کے پیچھے نماز پڑھنا چاہتے ہوں اور دشمن یا دیگر خطرے کی نگرانی بھی ضروری ہو۔ اگر سب لوگ بیک وقت نماز میں مشغول ہو جائیں تو دشمن کی طرف سے حملہ کا

خطرہ ہوتا ہے۔

لہذا یہ نماز ایک امام کے پیچھے دو مختلف گروہوں کی صورت میں پڑھی جاتی ہے۔ حضور علیہ السلام کی حیاتِ مبارکہ میں جب آپ بنفس نفیس محاذ جنگ پر موجود ہوتے تھے، تو سب کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ حضور علیہ السلام کے پیچھے ہی نماز ادا کریں۔ تاہم آپ کے بعد بھی اگر جماعت میں کوئی ایسی بزرگ ہستی موجود رہے کہ سب لوگ اسی کی اقتداء میں نماز پڑھنا چاہتے ہوں تو پھر نماز خوف کا طریقہ اختیار کیا جائیگا۔ اگر کسی خاص امام کے پیچھے نماز پڑھنا ضروری نہ ہو۔ تو پھر صلوٰۃ خوف پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ جماعت کے مختلف گروہ یا سیکشن بنا دیے جائیں جو اپنے اپنے امام کے پیچھے یکے بعد دیگرے نماز ادا کرلیں۔

نمازِ خوف کا طریقہ

فرمایا وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَوٰةَ جب آپ ان میں موجود ہوں اور انہیں نماز پڑھائیں فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ تو چاہیئے کہ ان میں سے ایک گروہ آپ کے پیچھے (نماز کے لیے) کھڑا ہو جائے وَلْيَأْخُذُوٓا أَسْلِحَتَهُمْ اور وہ اپنا اسلحہ بھی اپنے ساتھ رکھیں۔ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِن وَرَآئِكُمْ پھر جب یہ سجدہ کرلیں تو آپ کے پیچھے چلے جائیں وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا پھر دوسرا گروہ آجائے جس نے نماز نہیں پڑھی فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ پھر وہ بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھیں وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ اور اپنے دفاع کا سامان اور اسلحہ اپنے ساتھ رکھیں۔

مطلب یہ ہوا کہ اگر نمازِ خوف سفر کی حالت میں ادا کی جارہی ہے، تو ایک گروہ بمعہ اسلحہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز میں شامل ہو جائے گا۔ جب یہ لوگ ایک رکعت مکمل کرلیں تو اپنے اسلحہ سمیت واپس اپنے محاذ پر چلے جائیں گے اور دوسرا گروہ آکر حضور علیہ السلام کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائے گا

اور ایک رکعت آپ کے ساتھ ادا کریگا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دو رکعت پوری کر کے سلام پھیر دیں گے جب کہ یہ دونوں گروہ ایک ایک رکعت اپنے طور پہ ادا کریں گے۔

اب بقیہ ایک رکعت ادا کرنے کے مختلف طریقے وارد ہوئے ہیں مثلاً یہ کہ پہلا گروہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھ کر واپس محاذ پہ جائے اور وہیں اپنی دوسری رکعت پوری کر لے۔ اسی طرح جب دوسرا گروہ ایک رکعت امام کے ساتھ ادا کر لے تو اپنی دوسری رکعت واپس جا کر الگ پڑھ کر سلام پھیر دے احادیث میں یہ طریقہ بھی آتا ہے۔ کہ پہلا گروہ ایک رکعت پڑھ کر محاذ پہ چلا جائے اور دوسرا گروہ آجائے، وہ بھی ایک رکعت پڑھ کر محاذ پہ چلا جائے تو پہلا گروہ واپس آکر اسی جگہ اپنی دوسری رکعت مکمل کر لے۔ یہ پھر اپنے محاذ پہ چلا جائے تو دوسرا گروہ پھر واپس آکر اپنی دوسری رکعت مکمل کر لیں۔ اور اگر اقامت کی حالت میں چار رکعت نماز ادا کرنا ہے۔ تو ایک کی بجائے دو دو رکعت امام کے ساتھ ادا کی جائیں گی اور دو دو رکعت مقتدی علیحدہ ادا کریں گے۔ اس طرح نماز میں دونوں گروہوں نے آنے جانے میں جو حرکات کی ہیں، وہ جائز ہیں۔ نماز خوف کے لیے یہ خاص حکم ہے، ورنہ عام حالات میں اگر کوئی نمازی نماز کے دوران کوئی ایسی حرکت کرتا ہے تو اس کی نماز ٹوٹ جاتی ہے۔

صلوٰۃ خوف کا ایک طریقہ یہ بھی آیا ہے۔ کہ پہلا گروہ ایک یا دو رکعت امام کے ساتھ ادا کرنے کے بعد اپنی بقیہ ایک یا دو رکعتیں وہیں پوری کر کے محاذ پہ آجائے اور دوسرا گروہ آکر ایک یا دو رکعت امام کے ساتھ ادا کر لے۔ امام سلام پھیر دے تو یہ گروہ وہیں پہ اپنی بقیہ ایک یا دو رکعت ادا کرنے کے بعد محاذ پہ واپس جائے یہ سب طریقے روا ہیں۔ اور مغرب کی نماز ادا کرنا مقصود ہو تو پہلا گروہ دو رکعت امام کے ساتھ پڑھے گا اور بقیہ ایک رکعت علیحٰدہ ادا کرے گا پھر دوسرا گروہ آکر ایک رکعت امام کے ساتھ پڑھیگا۔ اور دو رکعت علیحدہ ادا کرے گا۔

یہ تمام طریقے اس صورت میں اختیار کیے جائیں گے جب کہ دشمن قبلہ کی طرف نہیں ہے بلکہ الٹی طرف ہے یا کسی دوسری سائڈ میں ہے۔ اور اگر دشمن قبلہ کی سمت میں صف آرا ہے۔ تو ایسی صورت میں حضور علیہ السلام نے تمام مجاہدین کی دو صفیں بنائیں۔ اور سب نے بیک وقت نماز شروع کی۔ دونوں صفوں نے قیام اور رکوع اکٹھا کیا، پھر حضور علیہ السلام سجدہ میں گئے تو پہلی صف والے آپ کے ساتھ سجدہ میں شریک ہوئے جب کہ دوسری صف والے دشمن کی نگرانی کے لیے کھڑے رہے۔ جب اگلی صف سجدے سے فارغ ہو گئی تو پچھلی صف والوں نے بھی سجدہ کیا۔ جب دوسری رکعت شروع ہوئی تو اگلی صف پیچھے چلی گئی اور پچھلی صف آگے آگئی ہے۔ پھر سب نے رکوع اکٹھا کیا۔ پھر اگلی صف نے حضور کے ساتھ سجدہ کیا اور پچھلی صف والے کھڑے رہے اس کے بعد پچھلی صف والوں نے سجدہ کیا۔ اور پھر تشہد کے بعد سب نے نماز اکٹھے مکمل کی۔

دشمن کا منصوبہ

فرمایا نماز خوف کا یہ طریقہ دشمن سے حفاظت کے لیے اختیار کیا گیا ہے کیونکہ وَدَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ کفار کا منصوبہ تو یہ ہے۔ کہ وہ چاہتے ہیں کہ تم اپنے اسلحہ اور سامان سے غافل ہو جاؤ۔ فَیَمِیْلُوْنَ عَلَیْكُمْ مَّیْلَةً وَّاحِدَةً اور وہ تم پر یکبارگی حملہ کر دیں۔ ترمذی شریف کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار نے اس بات کا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ کہ جب مسلمان نماز میں مشغول ہوں تو ان پر ٹوٹ پڑیں۔ مگر بیشتر اس کے کہ وہ اپنے منصوبے کی تکمیل کرتے اللہ تعالیٰ نے نماز خوف کا طریقہ بتلا کر دشمنوں کے منصوبہ کو خاک میں ملا دیا۔ بہر حال یہ سب طریقے اسی صورت میں اختیار کیے جائیں گے جب دوران جنگ کچھ تھوڑا بہت موقع مل جائے جس کے دوران مذکورہ طریقہ سے نماز ادا کی جا سکے۔ اور اگر حالات ایسے ہوں کہ ایک لمحہ کے لیے بھی دشمن سے غافل ہونا باعث نقصان ہو سکتا ہے، تو پھر نماز کو قضا کرنے کی بھی اجازت ہے۔ جنگ خندق

کے موقع پر مسلمانوں کی چار نمازیں فوت ہوگئی تھیں جن کی قضا رات کو بعد از نماز عشاء دی گئی۔

حضرت انسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک کے بعد مسلمانوں نے ایران کے قلعہ تستر پہ سحری کے وقت حملہ کیا اور اس دوران نماز فجر ادا کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ مسلمان صلوٰۃ خوف بھی ادا نہ کر سکے اور جنگ جاری رکھی۔ اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال ہوئی اور قلعہ فتح ہوگیا۔ مسلمانوں نے نماز فجر سورج نکلنے کے بعد ادا کی۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ اس قضا کی ادائیگی میں مجھے اس قدر خوشی ہوئی کہ دنیا و مافیہا کے خزانے مل جانے سے بھی اتنی خوشی نہ ہوتی۔ اس طرح قلعہ بھی فتح ہوگیا اور نماز بھی ادا ہوگئی اگرچہ بعد از وقت بہر حال اس قسم کی صورت حال بھی واقع ہو سکتی ہے اور یہ طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

عذر میں رخصت

فرمایا وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اگر تم بارش کی وجہ سے تکلیف میں ہو یا بیمار ہو جاؤ۔ اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ کہ تم اپنے ہتھیار اتار دو۔ آیت کے پہلے حصہ میں ہر وقت ہتھیار بند رہنے کا حکم تھا حتیٰ کہ نماز کے وقت بھی ہتھیار ساتھ رکھنا ضروری فرمایا تھا۔ اب فرمایا کہ اگر کوئی معقول عذر ہو، یعنی بارش ہو جائے یا تم میں سے کوئی مجاہد بیمار ہو جائے تو اپنے ہتھیار اتار لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ایسا کر سکتے ہو مگر یاد رکھو وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ اپنے بچاؤ کا سامان ہر حالت میں اختیار کرو۔ اپنے دفاع سے کبھی غافل نہ ہو۔ مقصد یہ ہے کہ اسلحہ اتار کر کسی ایسی جگہ نہ رکھو جہاں سے بوقت ضرورت فوری طور پر دستیاب نہ ہو، بلکہ اپنے قریب اور نگرانی میں رکھو تاکہ بوقت ضرورت فوراً اس سے لیس ہو سکو۔

ناکامی کے اسباب

آج مسلمانوں کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے پاس اپنے بچاؤ کا

سامان نہیں ہے۔ اور دشمن ان پہ غالب آرہا ہے گذشتہ چار سو سال سے یہی حالت ہے۔ دشمن ہر محاذ پہ مسلمانوں کو ناکام بنا رہا ہے۔ مسلمان سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں بالکل پسپا ہو رہے ہیں۔ اِن کے پاس اپنے بچاؤ کا کوئی سامان نہیں۔ پہاڑوں سے معدنیات نکالنا ہو یا تیل کے لیے کنواں کھودنا ہو۔ مسلمانوں کے پاس کوئی انتظام نہیں۔ نہ اوزار ہیں اور نہ ٹیکنالوجی۔ ماہرین بھی باہر سے منگوانا پڑتے ہیں اور مشینری بھی باہر سے درآمد کرنا پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہر محاذ پہ شکست کھا رہے ہیں۔ مسلمانوں کے پاس وسائل کی کمی نہیں مگر اغیار نے ان کے دماغ اس قدر ماؤف کر دیے ہیں کہ یہ اپنے وسائل سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ حدیث شریف میں آتا ہے لِكُلِّ حَالٍ عِنْدَهُ عَتَادٌ" حضور علیہ السلام ہر موقع و ہر حالت کے لیے سامان تیار رکھتے تھے، مگر آج مسلمان بہت پیچھے رہ گئے ہیں جس کی وجہ سے ناکام ہو رہے ہیں۔ سائنس، ٹیکنالوجی، صنعت و حرفت، تجارت، جنگ غرضیکہ ہر میدان میں آج مسلمان دوسروں کا دستِ نگر ہے لہذا دشمن کی زد میں ہے۔

فرمایا اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کے لیے ذلت ناک عذاب تیار کر رکھا ہے اگر تم مستعد ہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے ہی دشمن کو سزا دلوا دے گا۔ ورنہ اپنے قانون مکافات کے مطابق اُن کو آخرت میں تو سزا مل کر رہے گی۔ تم اپنے بچاؤ کا سامان بہر حال تیار رکھو۔

درسِ پنجاہ وشش ۵۶ — آیت ۱۰۳ تا ۱۰۴

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا
وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ
إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾
وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَاۗءِ الْقَوْمِ ۭ إِنْ تَكُوْنُوْا تَأْلَمُوْنَ
فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُوْنَ كَمَا تَأْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ
ع ۱۵ / ۱۲ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾

ترجمہ :- پھر جب تم پورا کر چکو نماز کو، تو اللہ کا ذکر کرو کھڑے ہونیکی حالت میں اور بیٹھنے کی حالت میں اور اپنی کروٹوں کے بل پھر جب تم اطمینان کی حالت میں ہو جاؤ تو نماز کو قائم کرو (دستور کے مطابق) بیشک نماز ایمان والوں پر فرض کی ہوئی ہے بقید وقت ﴿۱۰۳﴾ اور مت سستی کرو دشمن کا تعاقب کرنے میں اگر تم درد پاتے ہو، پس بیشک وہ بھی درد پاتے ہیں جیسا کہ تم درد پاتے ہو، اور تم امید رکھتے ہو، اللہ سے اس چیز کی، جس کی وہ امید نہیں رکھتے، اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے ﴿۱۰۴﴾

ربطِ آیات

اس رکوع کی پہلی دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے سفر کی حالت میں اور خوف کی حالت میں نماز ادا کرنے کا طریقہ بیان فرمایا۔ دورانِ سفر بعض نمازوں کی رکعتوں کی تعداد میں کمی ہو جاتی ہے اور سنّت اور نوافل وغیرہ بھی ضروری نہیں رہتے۔ اور جب کسی دشمن کا خوف

ہو یا کسی موذی جانور کی طرف سے خطرہ لاحق ہو، تو اس موقع پر نماز خوف ادا کی جا سکتی ہے، جس کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا۔ کہ ایک گروہ امام کے ساتھ نصف نماز پڑھے اور دوسرا گروہ دشمن کے بالمقابل کھڑا رہے۔ پھر دوسرا گروہ آکر امام کے ساتھ مل جائے اور نصف نماز ادا کرے۔ ہر دو گروہ اپنی اپنی بقیہ نصف نماز علیحدہ ادا کریں۔ اس طرح نماز کی حالت میں چلنا پھرنا ہتھیار اٹھانا سمت تبدیل کرنا وغیرہ جائز قرار دے دیا گیا حالانکہ عام حالات میں یہ چیزیں ناقص نماز ہوتی ہیں۔

ذکر پر مداومت

اب اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز کے بعد ذکر کرنے کی ترغیب دی ہے۔ نماز خواہ سفر کی ہو یا خوف کی یا عام نماز، اس کے بعد ذکر الٰہی پر مداومت اور اوقات نماز کا بیان ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ جب تم نماز پوری کر چکو۔ یعنی نماز کے لیے تو وقت مقرر ہے، اس مقررہ وقت میں جب نماز سے فارغ ہو جاؤ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ تو اللہ کا ذکر کرو اور ذکر کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں، ہر وقت اور ہر حالت میں روا ہے۔ قِيٰمًا کھڑے ہو وَقُعُوْدًا بیٹھے ہو وَعَلٰى جُنُوْبِكُمْ یا اپنی کروٹوں کے بل یعنی لیٹے ہو، ذکر الٰہی ہر حالت میں جاری رہے گا۔ مفسرین کرام اس جملے کی تفسیر یوں بیان کرتے ہیں کہ جب نماز پوری کر چکو تو دَاوِمُوْا عَلَى الذِّكْرِ تو اللہ کے ذکر پر مداومت اختیار کرو۔ چنانچہ صحیح حدیث میں ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے[1] كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ اللّٰهَ فِيْ كُلِّ اَحْيَانِهٖ یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ آپ کا کوئی وقت ذکر سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ جب آپ کسی مجلس میں تشریف لاتے تو مجلس کی ابتدا بھی اللہ کے ذکر سے کرتے اور اس کی انتہا بھی ذکر الٰہی سے ہوتی۔

[1] ابوداؤد ص۱۷ (فیاض)

قلبی ذکر

زبانی ذکر کے لیے طہارت ضروری ہے مگر قلبی اذکار طہارت سے مستثنیٰ ہیں مثلاً کوئی شخص رفع حاجت کے لیے گیا ہے۔ تو ایسی حالت میں زبانی ذکر تو نہیں کر سکتا مگر قلبی ذکر روا ہے۔ امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں کہ قلب یا روح کے ساتھ ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور و فکر کرے، اس کے انعامات اور نشانیوں کو یاد کرے، جب ایسا کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو گی، اس کی وحدانیت، قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ اور اسکی صفات کو پہچانے گا، یہی قلبی ذکر اور عبادت ہے۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ قلبی ذکر کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے اندر موجود لطائف باطنیہ کو بیدار کرے، انسانی جسم میں انیس لطائف باطنیہ یا مرکز ہیں، جن کا تعلق اس کے قلب اور روح کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب انسان خوب محنت کرتا ہے تو اس کے لطائف بیدار ہو کر ذکر الٰہی میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

امام ابوبکر جصاص نے قلبی ذکر کے یہ دو طریقے بتائے ہیں۔

ہر سانس کے ساتھ ذکر

بزرگان دین یہ بھی فرماتے ہیں۔ کہ انسان کا کوئی سانس ذکر الٰہی سے خالی نہیں ہونا چاہیئے۔ نفی اثبات کا ذکر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے ذریعے کرے یا صرف ذکر جلالہ اللہ کرے۔ آدھا ذکر سانس لیتے وقت ہو اور آدھا سانس ختم ہوتے وقت۔ اس ذکر کے لیے کوئی پابندی نہیں، یہ ہر حالت میں روا ہے جو لوگ اس کی مشق کر لیتے ہیں، وہ نیند کی حالت میں بھی اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں سوئے ہوئے ہیں مگر ہر سانس کے ساتھ اللہ کا ذکر جاری ہے۔ نقشبندی حضرات کسی سانس کو ضائع نہیں ہونے دیتے۔ چلتے وقت ان کا کوئی قدم بھی ذکر الٰہی سے خالی نہیں ہوتا، بلکہ ہر قدم پہ اللہ کا ذکر کرتے ہیں

لامحدود ذکر

اللہ کا ذکر ایک ایسی عبادت ہے جس کی کوئی حد (LIMIT) نہیں قرآن پاک میں موجود ہے۔ "وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ" اللہ تعالیٰ کو خوب یاد کرو تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔ زبان کے ساتھ

ذکر ہر شخص کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تکبیر بیان کرے، اس کی حمد و ثنا بیان کرے عظمت کے کلمات دہرائے، استغفار کے کلمات کہتا ہے یا قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول ہے۔ بہر حال ہر قسم کی نماز کی ادائیگی کے بعد ذکر الٰہی پر مداومت کا حکم دیا گیا ہے اور ذکر کھڑے بھی ہوتا ہے، بیٹھ کر بھی اور کروٹ کے بل لیٹ کر بھی جاری رہتا ہے

نماز بھی ذکر ہے

امام بیضاویؒ آٹھویں صدی ہجری کے عظیم مفسر ہوئے ہیں۔ آپ ایران کے ایک گاؤں بیضا کے رہنے والے تھے۔ بڑے عالم، فاضل اور صالح آدمی تھے جج کے عہدہ پر فائز تھے۔ آپ امام شافعیؒ کے پیروکاروں میں سے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ذکر الٰہی سے مراد نماز ہی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ جنگ کے دوران پاؤں پہ کھڑے کھڑے، دوڑتے ہوئے یا لیٹے لیٹے بھی نماز ادا ہو سکتی ہے۔ مگر امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ سواری پر بیٹھے بیٹھے تو نماز ہو سکتی ہے مگر پیدل چلتے وقت نماز ادا نہیں ہوتی، البتہ پاؤں پر کھڑے کھڑے پڑھ سکتا ہے اگرچہ رکوع سجود اشارے سے ہی کرے اور بیٹھ کر پڑھنے کا تو قانون موجود ہے فَاِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِدًا یعنی اگر کھڑا ہونے کی طاقت نہیں تو بیٹھ کر نماز پڑھ لے۔ اور اگر بیٹھ کر بھی نہیں پڑھ سکتا فَعَلٰی جَنْۢبٍ تو پہلو کے بل لیٹ کر یہ فریضہ ادا کر سکتا ہے۔

لیکن بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ ذکر الٰہی صلوٰۃ خوف اور صلوٰۃ سفر پر تبصرہ ہے یعنی جب نماز ادا کر لی، خواہ وہ سفر کی حالت میں ہو یا خوف کی حالت میں، تو پھر کثرت سے اللہ کا ذکر کرو۔ چنانچہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس مجاہد اور غازی کی تعریف کی ہے جو دشمن کے ساتھ نبرد آزما ہے اور ساتھ اللہ کا ذکر بھی کر رہا ہے۔ بہر حال فرمایا کہ اللہ کے ذکر پر مداومت اختیار کرو، اس کے ذکر سے کوئی لمحہ خالی نہیں ہونا چاہیئے، ایک دوسری حدیث میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے مَا مِنْ

شَیْءٌ اَنْجٰی مِنْ عَذَابِ اللّٰہِ مِنْ ذِکْرِ اللّٰہِ اللہ کے ذکر سے بڑھ کر عذاب سے بچانے والی کوئی چیز نہیں۔ لہٰذا کثرتِ ذکر ذریعہ نجات ہے۔

نماز بعد از رفع عذر

آگے فرمایا فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ جب تم اطمینان کی حالت میں ہو جاؤ تو (دستور کے مطابق) نماز قائم کرو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس حصہ آیت کا تعلق نمازِ سفر اور نمازِ خوف کے ساتھ ہے۔ سفر کے دوران نماز میں کمی آگئی تھی اور خوف کی حالت میں نماز کا طریقہ بدل گیا تھا۔ اب فرمایا کہ جب تمہیں اطمینان حاصل ہو جائے یعنی سفر سے واپس آجاؤ یا خوف کی حالت زائل ہو جائے، تو پھر اسی طریقے سے نماز ادا کرو جس طرح عام حالات میں کرتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ آدھی کی بجائے پوری نماز پڑھو اور پھر اس میں رکوع، سجود، قومہ، قعدہ پوری طرح ادا کرو، استقبال قبلہ بھی ضرور ہو۔ غرضیکہ نماز کی تمام شرائط پوری کرو۔ کیونکہ اب عذر رفع ہو چکا ہے۔

نماز بقید وقت

فرمایا اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا بیشک نماز مومنوں پہ بقید وقت فرض کی گئی ہے۔ پانچوں نمازوں کے اوقات مقرر ہیں جن کے اندر ہر نماز ادا کی جائیگی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اِنَّ لِلصَّلٰوۃِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا بیشک ہر نماز کے لیے وقت کی ابتداء اور انتہا ہے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام نے اول اور آخر اوقات میں خود نمازیں ادا کر کے اوقات نماز کی عملاً تعلیم دی۔ اور ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو بھیج کر نمازوں کے اوقات بتلائے۔ جبریل علیہ السلام نے دو دن آپ کو نماز پڑھائی۔ پہلے دن اول اوقات میں اور دوسرے دن آخر اوقات میں تاکہ اوقات نماز کا تعین ہو سکے۔ بہرحال اوقات نماز کا تعین اسی دنیا میں ممکن ہے جہاں نظام شمسی کے تحت دن رات کا نظام موجود ہے۔

نماز فجر کا وقت طلوع فجر سے لے کر طلوع شمس تک ہے۔ وقت ظہر کے متعلق سورۃ بنی اسرائیل میں آتا ہے "اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ

الشَّمْسُ" یعنی یہ نماز سورج کے ڈھلنے کے وقت ادا کریں۔ ظہر کے منتہائے وقت میں آئمہ کا کچھ اختلاف ہے۔ اکثر ائمہ کرام فرماتے ہیں کہ ظہر کا وقت سورج ڈھلنے کے بعد سے لیکر کسی چیز کے ایک مثل سایہ تک رہتا ہے جب کہ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں، کہ ہر چیز کا سایہ دو مثل ہونے تک ظہر کا وقت ہوتا ہے۔ سایہ مثل معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے۔ کہ کوئی چھڑی وغیرہ دھوپ میں کھڑی کر دی جائیگی۔ عین زوال کے وقت اُس چھڑی کا جتنا سایہ ہو اُس پہ نشان لگا دیا جائے۔ اُس کے آگے جب سایہ بڑھتے بڑھتے اُس چھڑی کی لمبائی کے برابر ہو جائے تو وہ ایک مثل ہو گا۔

عصر کا وقت دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اس کی ابتداء بعض آئمہ کے نزدیک ایک مثل اور بعض کے نزدیک دو مثل سایہ کے بعد ہوتی ہے، اور غروب آفتاب تک نماز کا وقت رہتا ہے۔ تاہم جب سورج میں زردی آ جائے تو نماز کے لیے وقت مکروہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا زردی آنے سے پہلے پہلے عصر کی نماز ادا کر لینی چاہیئے۔ نماز مغرب کا وقت غروب آفتاب کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے۔ البتہ اس کے انتہائی وقت میں بھی قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ نماز مغرب کا وقت شفق یعنی سُرخی کے غائب ہونے تک ہے جو کہ زیادہ سے زیادہ بیس پچیس منٹ کا وقفہ ہوتا ہے۔ البتہ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ سُرخی ختم ہونے کے بعد سفیدی کے اختتام تک نماز مغرب کا وقت باقی رہتا ہے۔ اور یہ وقت ایک گھنٹہ یا سوا گھنٹہ بنتا ہے۔ بہر حال شفق کی تعریف میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض لوگ سے سرخی پر محمول کرتے ہیں اور بعض سفیدی پر۔

نماز عشاء کا وقت تین حیثیت سے ہے۔ اس کا اول وقت غروب شفق سے لیکر ایک تہائی رات تک ہے۔ مستحب یہ ہے کہ نماز کو ایک تہائی رات تک مؤخر کرے اور اگر لوگوں کو وقت ہو تو ابتدائی وقت میں بھی

پڑھی جاسکتی ہے۔ عشاء کا دوسرا وقت تہائی رات سے نصف شب تک ہے اور صحیح وقت یہی ہے۔ تیسرا وقت نصف رات کے بعد ہے۔ اگرچہ نماز تو اُس وقت بھی ادا ہو جائیگی مگر اُس میں کراہت پائی جاتی ہے۔ لہذا اتنی تاخیر نہیں کرنی چاہیئے۔ بہرحال تیسرے وقت کی انتہا طلوع فجر تک ہے تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں پہ پانچ نمازیں بقید وقت فرض کی ہیں۔

نظام الاوقات کی عدم موجودگی میں نماز

جیسا کہ پہلے عرض کیا، اوقاتِ نماز کا تعین اُسی خطہ ارض میں کیا جاسکتا ہے۔ جہاں نظام الاوقات میں باقاعدگی پائی جاتی ہے البتہ جن مقامات پر یہ نظام ہی موجود نہ ہو، یا جہاں اس میں معتدبہ تبدیلی آجائے، وہاں اوقات نماز کے تعین میں دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ مثال کے طور پہ کوئی شخص ہوائی جہاز کے ذریعے مغرب کی طرف مسلسل بیس گھنٹے سفر کرتا ہے تو اس کے لیے تو سورج غروب ہی نہیں ہوگا بلکہ ایک ہی حالت پہ قائم رہے گا۔ تو ایسی صورت میں نماز ظہر اور عصر کیسے ادا کی جائیگی؟ قطبِ شمالی یا قطبِ جنوبی جہاں پہ دن رات چھ ماہ یا کم و بیش عرصہ کے ہوتے ہیں، وہاں پہ بھی نماز پنجگانہ کے اوقات کا تعین کسی دوسرے طریقے سے کرنا ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان چاند یا کسی دوسرے سیارے پہ پہنچ جائے جہاں اِس زمین کا نظامِ شب و روز موجود نہیں، تو وہ کیسے نمازیں ادا کریگا؟ دنیا میں بعض مقامات ایسے ہیں جہاں صرف چار نمازوں کا وقت ملتا ہے یعنی مغرب کی غروبِ شفق سے پہلے فجر طلوع ہو جاتی ہے اور اس طرح نمازِ عشاء کے لیے وقت نہیں ملتا۔ تو اس صورت میں کیا طریقہ اختیار کیا جائیگا۔

اس ضمن میں حضور علیہ السلام نے قاعدے کے طور پہ یہ بات سمجھادی کہ جب دجال کا ظہور ہوگا تو ایک دِن ایک سال کے برابر طویل ہو جائے گا۔ ایک صحابی نے عرض کیا، حضور! کیا اتنے لمبے عرصہ میں پانچ ہی نمازیں ادا کرنا ہوں گی؟ آپ نے فرمایا، نہیں بلکہ ہر چوبیس گھنٹے میں پانچ نمازیں

ادا کرنی ہوں گی اور اس کے لیے اوقات کا تعین خود حساب لگا کر کرنا ہوگا۔ تو مطلب یہ ہوا کہ ہر وہ مقام جہاں نظام الاوقات معمول کے مطابق جاری نہیں یا کسی دوسرے سیارے میں جہاں زمین کا نظامِ لیل و نہار موجود نہیں، وہاں اوقاتِ نماز کا تعلق خود حساب لگا کر کرنا پڑے گا۔ اور ہر چوبیس گھنٹے میں پانچ نمازیں پڑھنا ہوں گی۔ غیر معمولی حالات میں بھی نماز ترک نہیں کی جاسکتی، کیونکہ نماز میں دو چیزیں ایسی ہیں جنہیں کسی صورت میں بھی چھوڑا نہیں جاسکتا پہلی چیز تہذیب نفس ہے۔ کہ نماز کے ذریعے انسان میں شائستگی پیدا ہوتی ہے اور دوسری چیز یہ ہے کہ نماز کے ذریعے انسان تعلق باللہ قائم کرتا ہے یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں لہٰذا نماز پنج وقتہ بھی لازمی ہے۔ فرضیت نماز بقید وقت کا یہی مطلب ہے۔

دشمن کا تعاقب

نمازِ سفر اور نمازِ خوف اور پھر اس کے بعد اوقاتِ نماز کا ذکر ہوا۔ اب اگلی آیت پھر اسی جہاد کے سلسلہ ہی کی کڑی ہے جو کہ پانچ چھ رکوع تک چلے گا۔ فرمایا وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ دشمن کا تعاقب کرنے میں سستی نہ کرو۔ یہاں پر قوم سے مراد دشمن ہے۔ جس طرح نماز میں سستی کرنا منع ہے، اسی طرح دشمن کے تعاقب میں بھی سستی کی ممانعت ہے۔ گذشتہ سورۃ میں گزر چکا ہے۔ کہ احد کے موقع پر زخم خوردگی کے باوجود صحابہ کرامؓ نے کئی میل تک دشمن کا تعاقب کیا تاکہ وہ دوبارہ حملہ آور نہ ہو سکے۔ فرمایا اپنی تکالیف کے باوجود دشمن کا تعاقب کرو اِنْ تَكُونُوا تَأْلَمُونَ اگر تم تکلیف میں مبتلا ہو فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ تو وہ کفار بھی تمہاری طرح تکلیف میں مبتلا ہیں۔ اُن کے اور تمہارے اجسام کی ساخت میں کوئی فرق نہیں نہ وہ زیادہ مضبوط ہیں اور نہ تم کمزور۔ جس طرح تمہیں دکھ درد آتا ہے اسی طرح انہیں بھی آتا ہے۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ کافر تو شیطانی پروگرام کے لیے تکالیف برداشت کرتے ہیں جب کہ تم اللہ کے دین کی خاطر نکلے ہو لہٰذا تمہیں بطریق اولیٰ مشقت برداشت کرنی چاہیئے اور دشمن کا تعاقب

کر کے اس پر کاری ضرب لگانی چاہیئے۔

اجر کی امید

فرمایا اس تمام جد وجہد کے نتیجے میں وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ تم اللہ تعالیٰ سے اُس اجر کی اُمید رکھتے ہو، جو کافر نہیں رکھتے۔ کفار و مشرکین جہنم رسید ہوں گے جب تم میں سے ہر زخمی اور شہید اللہ تعالےٰ سے عظیم بدلا پائے گا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں درجات عالیہ پہ فائز فرمائیں گے۔ اس دنیا میں بھی تمہارا مطمح نظر یہ ہے کہ اللہ کا دین غالب ہو۔ پیغمبر آخر الزمان کی بعثت کا مقصد ہی "لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دین اسلام کو تمام ادیان پر غالب کرنا چاہتا ہے اور اس کا صلہ تم اس دنیا میں بھی پالو گے اور آخرت میں بھی درجات عالیہ کے مستحق ہو گے۔ لہٰذا دشمن کے تعاقب میں سستی نہ دکھانا۔

فرمایا وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہے۔ وہ ہر ایک کی نیت اور ارادے سے واقف ہے۔ ہر شخص کا خلوص اس کی نگاہ میں ہے اور وہ کمال حکمت کا مالک ہے۔ اس کے تمام احکام نسل انسانی کی فلاح کے لیے ہیں۔ لہٰذا انسانوں کا فرض ہے کہ وہ بلاشک شبہ ان احکام پہ کماحقہ، عمل پیرا ہو کر ہمیشہ کی کامیابی حاصل کر لیں۔

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ
بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا ﴿١٠٥﴾
وَٱسْتَغْفِرِ ٱللَّهَ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٠٦﴾
وَلَا تُجَٰدِلْ عَنِ ٱلَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ
لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ﴿١٠٧﴾ يَسْتَخْفُونَ
مِنَ ٱلنَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ ٱللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ
إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ ٱلْقَوْلِ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ بِمَا
يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ﴿١٠٨﴾ هَٰٓأَنتُمْ هَٰٓؤُلَآءِ جَٰدَلْتُمْ
عَنْهُمْ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا فَمَن يُجَٰدِلُ ٱللَّهَ
عَنْهُمْ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ أَم مَّن يَكُونُ عَلَيْهِمْ
وَكِيلًا ﴿١٠٩﴾

ترجمہ: بیشک ہم نے اتاری ہے آپ کی طرف کتاب حق کے ساتھ تاکہ آپ فیصلہ کریں لوگوں کے درمیان اس کے مطابق جو اللہ نے آپ کو بات سمجھائی ہے اور نہ ہوں آپ خیانت کرنے والوں کی طرف سے جھگڑا کرنے والے ﴿١٠٥﴾ اور اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا اور مہربان ہے ﴿١٠٦﴾ اور نہ جھگڑا کریں آپ اُن لوگوں کی

طرف سے جو اپنے نفسوں سے خیانت کرتے ہیں بیشک اللہ تعالےٰ
نہیں پسند کرتا اُس شخص کو جو خیانت کرنیوالا اور گنہگار ہو ﴿۱۰۷﴾
یہ لوگ چھُپتے ہیں لوگوں سے اور نہیں چھپتے اللہ سے حالانکہ وہ
ان کے ساتھ ہی ہوتا ہے جب کہ وہ رات کو مشورہ کرتے
اس بات کا جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔ اور اللہ تعالےٰ
جو کچھ بھی یہ کام کرتے ہیں، اس کا احاطہ کرنے والا ہے ﴿۱۰۸﴾
ہاں سنو اے لوگو! تم جھگڑتے ہو اُن کی طرف سے دنیا
کی زندگی میں۔ پس کون جھگڑے گا، اللہ تعالےٰ کے سامنے
اُن کی طرف سے قیامت والے دِن۔ یاکون ہو گا اُن کی طرف
سے وکیل ﴿۱۰۹﴾

ربطِ آیات

گذشتہ دروس میں سفر اور خوف کی حالتوں میں نماز کا بیان تھا۔ اس کے بعد امن کی حالت میں دستور کے مطابق نماز پڑھنے کا حکم ہوا۔ پھر جہاد کے ضمن میں دشمن کا تعاقب کرنیکی تلقین کی گئی ہے اور اس معاملہ میں سستی کا اظہار کرنے سے منع فرمایا گیا۔ اہلِ ایمان کو یاد دلایا کہ کافر باطل پروگرام رکھنے کے باوجود بڑے مستعد ہیں۔ جب کہ مسلمانوں کے پاس تو اللہ اور اس کے رسول کا دین برحق ہے لہذا انہیں دشمن کے مقابلہ میں زیادہ مستعد ہونا چاہیئے۔ انہیں اللہ تعالیٰ سے وہ کچھ اُمید ہے جو کفار کو نہیں ہو سکتی۔

اُس سے پہلے منافقین کا تذکرہ تھا کہ وہ جہاد سے پیچھے رہ جاتے ہیں اور اس میں شمولیت کے خلاف حیلے بہانے تلاش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جہاد کی فضیلت بیان فرمائی اور اس ضمن میں بہت سے دیگر احکام بھی نازل فرمائے۔ اب آج کے درس میں منافقین کی اُن کارگزاریوں کا ذکر ہے جنکی وجہ سے وہ قابلِ مذمت ہیں اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ ایسے لوگوں کی طرفداری نہ کریں، یہ

بڑے بد باطن لوگ ہیں اور اسلام کو ہمیشہ نقصان پہنچانے کی تدابیر سوچتے ہیں۔

شانِ نزول

ترمذی شریف کی کتاب التفسیر، مستدرک حاکم اور حدیث کی بعض دوسری کتب میں ۴ھ کا یہ واقعہ مذکور ہے۔ کہ مدینہ میں بنو ابیرق کا ایک خاندان آباد تھا۔ منافقین کا یہ خاندان تین بھائیوں بشر، بشیر اور مبشر پر مشتمل تھا۔ بشیر کو طعمہ بھی کہتے تھے۔ یہ شاعر تھا اور اپنے اشعار میں حضور علیہ السلام اور صحابہ کرامؓ کی ہجو کرتا تھا۔ چونکہ منافق تھا، اس لیے ایسے اشعار وہ کسی دوسرے کی طرف منسوب کر دیتا تھا تاکہ اُس کا نفاق نہ ظاہر ہو جائے۔ صحابہ کرامؓ اس شخص کے متعلق دو مختلف رائیں رکھتے تھے۔ بعض کا خیال تھا کہ یہ بدبخت خود اشعار کہتا ہے، اور دوسروں کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ جب کہ بعض دوسرے صحابہؓ کو تردد تھا۔ کہ ہو سکتا ہے یہ کسی اور شخص کی کرتوت ہو۔ بہر حال یہ اس قسم کا بدکردار آدمی تھا۔

حضرت رفاعہ بن زیدؓ حضور کے ایک کھاتے پیتے آسودہ حال صحابی تھے۔ ان کے بالاخانے میں گندم کے آٹے کی بوری تھی، اُس زمانہ میں گندم کا آٹا تو کسی خوشحال آدمی ہی کی خوراک ہوتا تھا، وگرنہ عام لوگ جَو اور کھجوروں پر گزارہ کرتے تھے اس آٹے کی بوری پر کچھ ہتھیار بھی رکھے تھے۔ رات کو مکان میں نقب زنی ہوئی اور چور آٹے کی بوری اور ہتھیار اُٹھا لے گئے۔ صبح رفاعہؓ کو پتہ چلا تو انہوں نے اپنے بھتیجے قتادہؓ سے ذکر کیا۔ تفتیش شروع ہوئی تو بنو ابیرق پر شک کیا گیا۔ اُن کے آس پاس سے پتہ چلا کہ رات ان کے ہاں چولہا جلا ہے اور روٹی پکی ہے، حالانکہ یہ خاندان مالی طور پر کمزور ہے جنہیں آٹے کی روٹی میسر نہیں۔ جب بنو ابیرق کو علم ہوا۔ کہ چوری میں اُن کا نام لیا جا رہا ہے تو انہوں نے بھی اپنے دفاع کے لیے اپنے حمائتی جمع کیے اور چوری کا الزام حضرت لبید بن سہلؓ پر لگا دیا۔ جب انہیں اس بات کا علم ہوا، تو وہ تلوار نکال لائے اور بنو ابیرق سے کہا کہ یا تو چوری ثابت کرو، ورنہ یہ تلوار تمہارا کام تمام کر دے گی۔ اس پر وہ ڈر گئے اور اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اُن سے جان چھڑا لی۔

جب بنو ابیرق کا یہ منصوبہ ناکام ہو گیا تو انہوں نے اپنی صفائی کے لیے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اپنے خاندان کے بعض معتبرین کو حضور علیہ السلام کی خدمت میں بھیجا۔ اس وفد میں خاندان کا بڑا چوہدری بھی شامل تھا جو مخلص مسلمان تھا مگر اپنی برادری کے کہنے پہ اُن کی سفارش کے لیے چلا گیا۔ اِن لوگوں نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت رفاعہؓ اور اُن کے بھتیجے قتادہؓ انہیں خواہ مخواہ بدنام کر رہے ہیں حالانکہ وہ چور نہیں ہیں۔ حضور علیہ السلام نے دیکھا کہ بعض شریف آدمی اِن کی صفائی پیش کر رہے ہیں، لہٰذا ہو سکتا ہے یہ بیگناہ ہوں اور اِن پہ غلط الزام لگایا جا رہا ہو۔ اُس وقت تک آیات نازل نہیں ہوئی تھیں لہٰذا حضور علیہ السلام نے ان کی بات پہ یقین کر لیا۔

اسی دوران حضرت رفاعہؓ نے حضرت قتادہؓ کو کہا کہ تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا کر چوری کا واقعہ بیان کرو اور آپ کو یہ بھی بتاؤ کہ قرائن بتا رہے ہیں کہ چور بنو ابیرق ہیں۔ جب حضرت قتادہؓ حضور کی خدمت میں پہنچے تو وہ مخالفین کی بات کو پہلے ہی صحیح سمجھ چکے تھے۔ آپ نے حضرت قتادہؓ کو ڈانٹا کہ تم خواہ مخواہ بے گناہوں پہ الزام لگا رہے ہو جبکہ اتنے آدمی اُن کی صفائی پیش کر چکے ہیں۔ حضرت قتادہؓ کو اس بات کا سخت صدمہ ہوا کہ اُن کی چوری بھی ہو گئی ہے اور اُلٹا انہی کو ڈانٹ ڈپٹ بھی ہو گئی۔ انہوں نے واپس آ کر ساری بات حضرت رفاعہؓ کے گوش گذار کر دی کہ یہ تو معاملہ ہی اُلٹا ہو گیا ہے، اُن لوگوں نے حضور علیہ السلام کے پاس وفد بھیج کر اپنی صفائی پیش کر دی ہے اور آپ نے مجھے ڈانٹا ہے کہ تمہارا الزام غلط ہے اس پہ حضرت رفاعہؓ نے کہا کوئی بات نہیں، اللہ تعالیٰ تو سب کچھ جانتا ہے۔ اس پہ دو رکوع پہ مشتمل یہ آیات نازل ہوئیں اور منافقین کی سازش کو ظاہر کر دیا۔

بعض تفاسیر میں یہ بھی آتا ہے کہ بشیر ابن ابیرق نے آٹے کی بوری

ایک شخص زید بن سمین یہودی کے گھر میں امانت کے طور پر رکھ دی، جب
مسروقہ مال کی تلاش شروع ہوئی تو وہ بشیر کی بجائے زید یہودی کے گھر سے
برآمد ہوا۔ جب اُس سے دریافت کیا گیا کہ آٹے کی بوری تمہارے گھر کیسے
پہنچی تو اس نے بشیر کا نام لیا کہ اس نے امانت کے طور پر رکھی تھی۔ مگر بشیر نے
انکار کیا۔ اور قسم اٹھا کر کہا کہ چور وہ ہے جس کے گھر سے مال برآمد ہُوا ہے
اس واقعہ پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ منافقوں کا راز فاش ہو گیا حضرت لبیدؓ اور یہودی
بے گناہ ثابت ہوئے اور بنو ابیرق پر چوری ثابت ہو گئی۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے
ان آیات میں منافقین کی کارگزاری کی طرف اشارہ کر کے اُن کی مذمت بیان کی ہے

منافق کا انجام

جب مسروقہ مال مِل گیا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت رفاعہؓ اور قتادہؓ
کو بلا کر اُن کے سپرد کر دیا۔ اور منافق اپنی جان بچانے کے لیے وہاں سے بھاگ
گیا۔ ایماندار ہوتا تو اقرارِ جرم کر کے حد سرقہ برداشت کرتا، اور آخرت خراب
نہ کرتا، مگر وہ صریحًا مرتد ہو کر مشرکین مکہ سے جا ملا۔ اور ایک عورت سلافہ بنت
سعد کے پاس جا ٹھہرا۔ اُدھر حضرت حسانؓ کو علم ہُوا تو انہوں نے اپنے اشعار میں
بشیر اور سلافہ دونوں کی مذمت بیان کی۔ جب اُس عورت کی بدنامی ہوئی تو
وہ سخت سیخ پا ہوئی اور اُس نے بشیر کا سامان اٹھا کر باہر بطحا میں پھینک دیا
اُسے اپنے گھر سے نکال دیا۔ مفسرین فرماتے ہیں، کہ یہ شخص سخت ذلیل و خوار ہوا
اور پھر اس کی موت بھی اس طرح واقع ہوئی کہ یہ ایک زیر تعمیر دیوار کے نیچے
آ کر واصل بہ جہنم ہوا۔

اللہ کی طرف سے وعید

اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے اُن مسلمانوں کو تنبیہ کی ہے جنہوں نے بنو ابیرق
کی باتوں میں آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اُن کی صفائی پیش کی تھی حضور علیہ السلام
نے بھی ظاہری حالات کے مطابق منافقین کو بے گناہ سمجھ کر حضرت قتادہؓ کو ڈانٹا
تھا، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو تنبیہ فرمائی ہے۔ اور تمام اہلِ ایمان کو یہ بات اصولاً
سمجھا دی ہے کہ خائن لوگوں کی طرفداری نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ ہمیشہ پوری تحقیق

کے بعد کسی نتیجے پہ پہنچنا چاہیئے اور حق کی حمایت کرنی چاہیئے۔

ارشاد ہوتا ہے إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ بیشک ہم نے یہ کتاب (قرآن مجید) آپ کی طرف حق کے ساتھ اتاری ہے۔ اس کتاب کے اصول، ضوابط احکام اور فرامین سب برحق ہیں۔ اور اسے نازل کرنے کا مقصد یہ ہے لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس چیز کے ساتھ فیصلہ کریں، جو اللہ نے آپ کو سمجھائی ہے اَرَاكَ بمعنی رؤیت یعنی دیکھنا ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ آپ اس چیز کے ساتھ فیصلہ کریں جو چیز اللہ نے آپ کو دکھائی ہے یا سمجھائی ہے، اور ظاہر ہے کہ اس روایت یا فقاہت کا ذریعہ اللہ کی وحی ہے۔ تو فرمایا وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا آپ خیانت کرنے والوں کی طرف سے جھگڑا نہ کریں۔ یعنی ان منافقین نے اپنی صفائی کے لیے جو ماحول پیدا کر دیا ہے، ان سے متاثرہ ہو کر آپ انکی حمایت نہ کریں۔

استغفار کی تلقین

فرمایا منافقوں کو بے گناہ سمجھنے میں جو لغزش ہوئی ہے اس کے لیے وَاسْتَغْفِرِ اللَّهَ آپ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں، اس کی بخشش کے طلبگار ہوں۔ اور ساتھ ساتھ تمام اہل اسلام کو بھی یہ بات سمجھا دی کہ جب بھی کوئی ایسی غلطی ہو جائے۔ فوراً اللہ تعالےٰ سے معافی طلب کرنی چاہیئے۔ اللہ تعالےٰ کا قانون حق و انصاف پہ مبنی ہے۔ اس کے مطابق اپنے تنازعات نپٹائے جائیں۔ رشتہ داری، خویش پروری اور اقربا نوازی نہیں ہونی چاہیئے۔ ایسی خطا پر جب معافی طلب کریں گے إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا تو اللہ تعالیٰ بھی بخشش کرنے والا اور مہربان ہے۔ وہ ضرور معاف فرمائے گا۔ لہٰذا غلطی پہ معافی مانگنے میں تامل نہیں کرنا چاہیئے۔

خائنوں کی مذمت

فرمایا وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ اور آپ ان لوگوں کی طرف سے جھگڑا نہ کریں جو اپنے نفسوں کے ساتھ

خیانت کرنے والے ہیں۔ جو شخص چوری کرتا ہے، وہ ظاہر ہے کہ اپنے ہی نفس سے خیانت کرتا ہے۔ اس کا وبال اُسی پر پڑے گا، دُنیا و آخرت میں اُسی سے باز پرس ہو گی اور اُسے اِس کا بدلہ چکانا ہو گا۔ فرمایا خائنوں کی حمایت نہ کریں، کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ خَوَّانًا اَثِیْمًا بیشک اللہ تعالیٰ خائن اور گنہگار آدمی کو پسند نہیں کرتا۔ وہ تو عدل و انصاف کا حامی ہے اور اطاعت گزار کو پسند فرماتا ہے۔ دھوکہ باز اور خیانت کرنے والوں سے وہ بیزار ہے۔ پھر دیکھو! یہ لوگ کیا کرتے ہیں یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ لوگوں سے چھپ چھپا کر معصیت کا ارتکاب کرتے ہیں چوری کرتے ہیں خفیہ سازش کرتے ہیں مگر انہیں علم ہونا چاہیئے وَلَا یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰہِ اللہ تعالیٰ سے کچھ نہیں چھپا سکتے۔ وہ تو ہر آن ہر چیز کو دیکھ رہا ہے، وہ کونسا کہاں پائیں گے جہاں اللہ تعالیٰ کی نظر نہ پہنچتی ہو یَسْتَخْفُوْنَ کا معنیٰ شرمانا بھی ہو سکتا ہے۔ اور مطلب یہ ہو گا۔ کہ منافقین لوگوں سے شرما کر چوری چھپے غلط کام کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ جو حاضر ناظر ہے اُس سے نہیں شرماتے، یہ اس قدر ڈھیٹ واقع ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہے

فرمایا وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ یُبَیِّتُوْنَ جب یہ لوگ رات کو مشورہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُس وقت بھی اُن کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور بات بھی ایسی کرتے ہیں مَا لَا یَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ ایک تو چوری کی اور دوسرا الزام بے گناہوں پر لگایا اور اپنی جھوٹی صفائی پیش کر دی یہ سب چیزیں منشائے ایزدی کے خلاف ہیں۔ اور یہ اس قدر جاہل لوگ ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف اس کی موجودگی میں اس قسم کے مشورے کرتے ہیں

فرمایا وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطًا منافقین جو کچھ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُس کا احاطہ کرنے والا ہے۔ وہ محیط کل ہے

کوئی چیز اُس کے علم اور احاطہ قدرت سے باہر نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے منافقین کی تمام چالوں سے اپنے نبی کو بذریعہ وحی آگاہ کر دیا اور اس طرح ان کی سازش کو بے نقاب کر دیا۔

مجرمین کی بے بسی

آگے فرمایا ھَاَنْتُمْ ھَا حرف تنبیہ ہے۔ یعنی تم غور سے سنو! ھٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا یہی وہ لوگ ہیں جنکی طرف سے تم دنیا کی زندگی میں جھگڑا کرتے ہو۔ اِن خائنوں اور گنہگاروں کی طرفداری کرتے ہو، اُن کی سفارش کرتے ہو اور اُن کی صفائی پیش کرتے ہو۔ اِس دُنیا میں تو ایسا کر رہے ہو۔ فَمَنْ یُّجَادِلُ اللّٰہَ عَنْھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ مگر قیامت کے دِن اللہ کے سامنے ان کی طرف سے کون جھگڑا کریگا۔ اُس دِن تمام راز فاش ہو جائیں "فَمَالَہٗ مِنْ قُوَّۃٍ وَّلَا نَاصِرٍ" تو اُس دِن اُن کا کوئی حامی و مددگار نہیں ہوگا۔ تو فرمایا اَمْ مَّنْ یَّکُوْنُ عَلَیْھِمْ وَکِیْلًا اُس دن گنہگاروں کی کون وکالت کریگا، یہ لوگ اس دنیا میں تو چرب زبانی کر کے غلط سفارش کرا لیتے ہیں مگر قیامت کے دِن اللہ کے ہاں کون سا ایڈووکیٹ یا بیرسٹر پیش کریں گے۔ وہاں کوئی کسی کے کام نہ آسکے گا گویا اہل ایمان کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ آئندہ ایسے دھوکہ بازوں کی طرفداری نہ کریں اور ہمیشہ حق کی حمایت کریں اب اگلی آیات میں اس بات کا تذکرہ ہے۔ کہ اگر کوئی جرم مجرم کی بجائے کسی بے گناہ پہ ڈال دیا جائے تو اس کا کتنا بڑا وبال ہے۔

درس پنجاہ وہشت ۵۸ آیت ۱۱۰ تا ۱۱۳

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ
اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ
اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ
اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً
اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ
ع ۱۶/۱۴ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾ ع وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ
وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ
وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ
شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ
الثلثۃ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ
عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾

ترجمہ : اور جو شخص بُرائی کرے یا ظلم کرے اپنی جان
پر پھر وہ اللہ سے بخشش طلب کرے تو پائیگا اللہ تعالیٰ کو
بخشش کرنے والا اور مہربان ﴿۱۱۰﴾ اور جو شخص گناہ کمائے گا ،
بیشک وہ کمائے گا اُسکو اپنی جان پر ، اور اللہ تعالیٰ جاننے والا اور
حکمت والا ہے ﴿۱۱۱﴾ اور جو شخص کوئی خطا یا گناہ کریگا ، پھر وہ
اسے کسی بری شخص پر لگائے گا ، بیشک اُس نے اٹھایا بہتان

اور صریح گناہ (۱۱۲) اور اگر آپ پر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا اور اسکی رحمت، تو البتہ ارادہ کیا تھا ایک گروہ نے ان میں سے، کہ آپ کو بہکا دیں، اور وہ نہیں بہکاتے مگر اپنی جانوں کو اور وہ نہیں نقصان پہنچا سکتے آپ کو کسی قسم کا۔ اور اتاری ہے اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور حکمت۔ اور سکھلایا ہے آپ کو وہ کچھ جو آپ نہیں جانتے تھے۔ اور آپ پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے (۱۱۳)

ربط آیات

اس سورۃ میں منافقین کا تذکرہ اور اُن کی مذمت مختلف مقامات پر ہوتی رہی ہے۔ گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے اُن کی اس کارگزاری کا تذکرہ فرمایا کہ جرم کا ارتکاب خود کر کے اس کا الزام دوسروں پہ لگا دیتے ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا تھا، کہ منافقین نے حضرت رفاعہؓ کے گھر چوری کر کے اس کا اتہام پہلے ایک مسلمان پر لگایا اور پھر یہودی پہ۔ اس کے علاوہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس اپنی بریت کی سفارش بھی بہم پہنچائی، ظاہری حالات دیکھ کر نبی علیہ السلام نے بھی ایسا ہی خیال کیا، مگر اللہ تعالیٰ نے آیات نازل فرما کر اصل صورتِ حال سے مطلع فرما دیا اور منافقوں کی سخت مذمت بیان کی۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ اگر اس قسم کی غلطی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لینی چاہیئے اور مجرموں کی طرفداری نہیں کرنی چاہیئے۔ فرمایا ایسے لوگ دنیا میں تو اپنا حمایتی پیدا کر لیتے ہیں مگر کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں کونسا وکیل پیش کریں گے جو ان کی وکالت کر سکے۔ فرمایا اگر وہ منافق چور ارتکابِ جرم کے بعد اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیتا تو اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا، مگر اُلٹا بھاگ گیا اور مرتد ہو کر کفار کے ساتھ جا ملا اور نہایت بُری موت مرا۔

گناہ کے بعد استغفار

اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے اصول کے طور پر یہ ارشاد فرمایا وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا جو شخص برائی کا ارتکاب کرے گا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ یا اپنے نفس پہ زیادتی کرے گا سوء اور ظلم بر نفس تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں اور بُرائی یا گناہ پر محمول کیے جاتے ہیں تاہم سوء

سے مراد وہ گناہ ہے جو متعدی ہو۔ یعنی خود گناہ کر کے الزام دوسرے پہ لگا دیا جائے یا بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر براہِ راست دوسروں پر پڑتا ہے، جیسے کسی کو قتل یا زخمی کر دیا جائے، کسی کی بے عزتی کی جائے یا مال چوری کر لیا جائے اور ظلم وہ گناہ ہے جس کا اثر مرتکب کی اپنی ذات تک محدود رہتا ہے، جیسے نماز، روزہ وغیرہ کا تارک یا حلال و حرام سے بے نیاز۔ تو فرمایا کسی قسم کا گناہ کیا ہے، اس کے بعد ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ پھر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لے تو يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا یقیناً اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا، کیونکہ اس زندگی میں بڑے سے بڑے گناہ کفر اور شرک سے بھی توبہ ہو سکتی ہے۔ البتہ حقوق العباد میں یہ شرط ہے۔ کہ توبہ کے ساتھ وَاَصْلَحَ یعنی جس شخص کا حق تلف کیا ہے، اُسے ادا کرے یا اُس سے معاف کرالے۔ اگر متعلقہ شخص معاف کر دے تو بھی مجرم بری الذمہ ہو گیا بہرحال اللہ نے یہ توبہ کا قانون بھی بتا دیا کہ التَّوْبَةُ مَعْرُوْضَةٌ مَالَمْ يُغَرْغِرْ انسان کی توبہ اس وقت تک قابلِ قبول ہے۔ جب تک زندگی کے آخری لمحات میں غرغرے کی حالت طاری نہ ہو جائے۔ جب اُس کی جان لبوں پہ آجاتی ہے اور عالمِ غیب کا پردہ اُٹھ جاتا ہے، فرشتے اور برزخ کی چیزیں نظر آنے لگتی ہیں، تو اُس وقت توبہ کی قبولیت کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے پہلے تندرستی ہو، بیماری ہو، ہر حالت میں توبہ قبول ہوتی ہے۔

آگے فرمایا وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا جو کوئی شخص گناہ کمائے گا۔ فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ تو یقیناً وہ اپنے نفس پر ہی کمائے گا۔ یعنی جو آدمی قصداً برائی کا ارتکاب کرتا ہے اُس کا وبال اُسی کی جان پر پڑے گا۔ ایسے جرم میں وہ خود ہی ماخوذ ہو گا۔ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا اللہ تعالیٰ علیم ہے۔ کہ ہر چیز سے واقف ہے اور حکیم ہے کہ اُس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ وہ گناہ کرنے والے کے گناہ اور

اسکی سزا کو جانتا ہے اور اُس کا ہر فیصلہ پُر از حکمت ہے۔

بہتان طرازی

فرمایا وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا جس شخص نے کوئی خطا کی یا گناہ کا ارتکاب کیا۔ خطا سے مراد صغیرہ گناہ جو بغیر ارادے کے سہواً سرزد ہو گیا۔ اور اثم وہ بڑا گناہ ہے جو نیت اور ارادے سے کیا جائے نیکی اور بدی وہی مؤثر ہوتی ہے جو قصداً کی جائے۔ تو فرمایا جس شخص نے چھوٹا گناہ کیا یا بڑا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا پھر اسکی تہمت کسی بیگناہ پر لگا دی جیسا کہ اُس منافق نے چوری کا ارتکاب کر کے دوسروں کو ملوث کرنے کی کوشش کی تھی، تو فرمایا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ایسے شخص نے بہت بڑا افترا اور گناہ اٹھا لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خبردار کر دیا کہ کسی بیگناہ پر اتہام لگانا بہت بڑا جرم ہے۔ اس سے بچتے رہنا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ منافقین کی مذمت بھی بیان فرما دی۔

عصمت انبیاء علیہم السلام

اللہ تعالیٰ نے یاد دلایا کہ منافقین حضور علیہ السلام کو اپنے ساتھ شامل کر کے آپ کو بھی ملوث کرنا چاہتے تھے، اس سلسلہ میں انہوں نے سفارش بھی بہم پہنچائی اور دوسروں پر بھی الزام لگایا تاکہ وہ خود بری قرار پائیں مگر اللہ تعالیٰ نے ساری صورتِ حال سے بذریعہ وحی مطلع فرما دیا اور اس طرح آپ کو غلطی سے بچا کر عصمتِ انبیاء کو برقرار رکھا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ اگر اس کا نبی بعض ظاہری حالات کو دیکھ کر یا کسی قرینے کی بنیاد پر کوئی خلافِ معمول رائے قائم کر لے یا حکم جاری کر دے تو اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے اپنے نبی کو مطلع کر دیتا ہے اور اُسے اپنی خلافِ حقیقت رائے پر قائم نہیں رہنے دیتا۔ اگر نبی غلطی پر قائم رہے تو یہ اُس کی عصمت کے خلاف ہوتا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ اُسے ایسی حالت پر نہیں چھوڑتا۔

نبی اور مجتہد میں یہ بنیادی فرق ہے۔ کہ مجتہد جب اپنے اجتہاد اور غور و فکر سے کوئی غلط فیصلہ کرتا ہے تو اُس کا اجر تو بہر حال اس کو مل جاتا ہے مگر یہ

ضروری نہیں ہوتا کہ اُسے اسکی غلطی سے مطلع کر کے اصلاح کر دی جائے۔ اس کے برخلاف اگر نبی سے کسی فیصلہ میں کوئی لغزش ہو جائے تو اُسے فوراً بذریعہ وحی مطلع کر دیا جاتا ہے اور ایسی خطا سے بچا لیا جاتا ہے۔ عصمت کا یہی معنی ہے جس کی حفاظت اللہ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔

حفاظتِ خداوندی

اللہ نے ارشاد فرمایا وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ اور اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت آپ پر نہ ہوتی۔ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ تو اُن میں سے ایک گروہ نے ارادہ کر رکھا تھا کہ آپ کو بھی بہکا دیں۔ اور اپنا طرفدار بنا لیں۔ منافقین نے اس مقصد کے لیے بھرپور کوشش کی تھی اور معززین کا ایک وفد لیکر حضور علیہ السلام کے پاس گئے۔ آپ نے بھی ظاہری حالات کے مطابق اُن کو بیگناہ سمجھا، اور حضرت قتادہؓ کو فرمایا کہ تم ایسے باصلاحیت اور نیک لوگوں پر کیوں شبہ کرتے ہو۔ قریب تھا کہ حضور علیہ السلام ان کی باتوں میں آکر اُن کے طرفدار بن جاتے مگر اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آپ کو متنبہ کر دیا۔

فرمایا حقیقت یہ ہے کہ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ یہ لوگ اپنے آپ کو ہی بہکا رہے ہیں۔ اور وہ نہیں نقصان پہنچا سکتے آپ کو کسی قسم کا۔ اب بھی اگر کوئی ایسی حرکت کرے گا تو مجرم ٹھہرے گا۔ اگر کوئی دوسرا شخص بہکاوے میں آکر غلط طور پر طرفدار بن جائے گا تو اس سے اس کام کا محرک بری الذمہ نہیں ہوگا، نہ اس کا گناہ کم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں اُسے جواب دینا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ ظاہری حالات سے متاثر ہو جانے کی وجہ سے آپ پر تو کوئی الزام نہیں آتا۔ کیونکہ بسا اوقات ایسے حالات میں کوئی شخص ایسی رائے قائم کر لیتا ہے مگر جن لوگوں نے یہ ساری کارروائی کی ہے، وہ نقصان سے نہیں بچ سکیں گے۔ اور اس گناہ کا وبال انہی پر پڑے گا۔

کتاب حکمت

فرمایا وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ اللہ تعالیٰ نے

نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی ہے۔ کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے۔ اور بقول امام مالکؒ حکمت سے مراد سنت ہے۔ حکمت کی تفسیر میں اور بھی کئی اقوال آئے ہیں۔ سورۃ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کی فضیلت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے۔ "وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِىْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ" اور اس بات کو یاد کرو جو اللہ کی آیتیں اور حکمت تمہارے گھروں میں پڑھی جاتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ آیات اللہ سے مراد قرآن پاک اور حکمت سے مراد آپ کے اقوال اور اعمال ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب نازل فرمائی جو وحی جلی ہے اور جس کے الفاظ منجانب اللہ ہیں۔ اور حکمت وحی خفی ہے جس کے الفاظ اللہ کی جانب سے نہیں ہیں مگر مضمون اللہ تعالیٰ کا ہی القا کردہ ہے۔ جو باتیں حضور علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہیں، وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے القا شدہ ہیں۔ حضور علیہ السلام نے اپنی زبان مبارک سے قرآن پاک کی تشریح کی ہے اور یہی حکمت ہے۔

کلی اور جزوی علم

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا، آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ اور آپ کو وہ کچھ سکھایا جو آپ نہیں جانتے تھے یہی مضمون دوسرے مقام پر اس طرح آیا ہے "مَاكُنْتَ تَدْرِىْ مَاالْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ" (الشوریٰ) آپ کتاب اور ایمان کی تفصیلات نہیں جانتے تھے، اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرما کر آپ کو آگاہ کیا بعض چیزیں وحی جلی کے ذریعہ بتائیں اور بعض وحی خفی کے ذریعے۔

بعض اہلِ بدعت آیت کے اس ٹکڑے سے حضور علیہ السلام کا کلی علم ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو نبوت سے متعلقہ تمام چیزیں سکھا دیں، اور جن کا تعلق منصب نبوت کے ساتھ نہیں ہے ان میں سے بھی بہت سی چیزوں کا علم دیدیا مگر ذرے ذرے کا علم نہیں دیا۔ اگر اس آیت کے ذریعے اللہ نے سب کچھ

آپ کو بتا دیا تھا تو یہ آیت تو ۴ھ یا ۵ھ میں نازل ہوئی اس کے بعد باقی سورتوں کے نزول کی کیا ضرورت تھی۔ اور واقعہ یہ ہے۔ کہ اس سورۃ کے بعد سورۃ مائدہ، سورۃ توبہ، سورۃ احزاب اور بہت سی سورتیں نازل ہوئیں۔ جب ایک چیز سکھا دی تھی تو دوبارہ نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ اس آیت کا صحیح مطلب نہیں سمجھ سکے۔ اللہ تعالیٰ نے جتنا علم حضور علیہ السلام کو دیا وہ سب سے زیادہ تھا جیسا فرمایا اُوْتِیْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ مجھے پہلوں اور پچھلوں کا علم دیا گیا، بیشک اللہ تعالیٰ نے آپکو پہلی امتوں کے حالات بتائے۔ قرآن پاک میں قصص کا ایک معتد بہ حصہ موجود ہے اور بعد میں پیش آنیوالے بہت سے واقعات سے بھی آپ کو آگاہ کیا۔ جن کا ذکر قرآن و سنت میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے، اس کے باوجود آپ علم محیط کے مالک نہیں ہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے۔ عالم الغیب والشہادت صرف وہی ذات ہے۔ اللہ نے اپنے انبیاء اور رسل کو دین اور شریعت کا مکمل علم دیا مگر ذرے ذرے کا علم نہیں دیا، کیونکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ اب اگر کوئی کہے کہ حضور علیہ السلام فلاں مشینری جوڑنا یا ہوائی جہاز بنانا نہیں جانتے تھے، تو اس سے آپ کی ذات پہ کیا فرق پڑتا ہے؟ اور آپ کی شان میں کیا کمی آتی ہے؟ یہ تو ایسی چیزیں ہیں جن کا تعلق کائنات سے ہے اور ان کا جاننا آپ کے لیے ضروری نہیں تھا۔ ہاں! اگر کوئی یہ کہے کہ حضور علیہ السلام دین کی فلاں بات یا حلال و حرام کا فلاں مسئلہ نہیں جانتے تھے، تو یقیناً یہ کلمہ کفر ہے۔ مگر دنیا کی عام چیزیں تو انسان اپنے مشاہدے اور عقل سے سیکھتے ہیں اور اپنے تجربات کو بروئے کار لاتے ہیں۔ البتہ بعض علم مضر ہیں وہ اللہ نے اپنے نبی کو نہیں سکھائے اور نہ وہ آپکی شان کے لائق ہیں۔ سحر، کہانت، نجوم آپ کے منصب کے شایان شان نہیں اور اللہ نے آپ کو نہیں سکھائے۔ اسی شعر و شاعری کے متعلق فرمایا "وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ" ہم نے اپنے نبی کو شعر کا علم نہیں سکھایا، نہ وہ اس کی شان کے لائق ہے۔ اگر

ایسی چیزیں آپ نہیں جانتے تو آپ کی شان میں ذرا برابر فرق نہیں آتا، مزید برآں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی آپ سے نفی کرنی ضروری ہے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تفہیمات الٰہیہ میں فرماتے ہیں کہ آپ کے واجب الوجود ہونے کی نفی کرنا ضروری ہے، ورنہ انسان ایماندار نہیں ہوگا۔ واجب الوجود، قادر مطلق اور علیم کل تو صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے حضور علیہ السلام کی ذات سے ان سب کی نفی لازم ہے۔ اس کے باوجود یہ کہنا کہ حضور کو ذرے ذرے کا علم دیا گیا، درست نہیں ہے

فضلِ عظیم

فرمایا وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا اور آپ پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کا سب سے بڑا فضل یہ ہے کہ آپ کو نبوت عطا فرمائی، پھر آپ کو ختم نبوت کا تاج پہنایا۔ آپ کو جو کتاب دی گئی وہ سب کتابوں سے افضل۔ آپ کی امت بھی تمام امتوں سے افضل۔ آپ کے متبعین بھی سب سے زیادہ۔ آپ کو معجزات بھی دوسرے انبیاء سے زیادہ دیے گیے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ظاہری اور معنوی اولاد بھی سب سے زیادہ بنائی۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم ہے۔

اگلی آیات میں منافقوں کی بعض مزید سازشوں اور ان کے مشوروں کا تذکرہ بیان کیا گیا ہے اور ان کی مذمت بھی کی گئی ہے۔

درسِ پنجاہ و نہ ۵۹ آیت ۱۱۴

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾

ترجمہ: کچھ بہتری نہیں ان کے بہت سے پوشیدہ مشوروں میں مگر وہ شخص کہ جس نے حکم دیا صدقہ کرنے کا یا نیک کام کرنے کا یا لوگوں کے درمیان اصلاح کا اور جو شخص یہ کام کرے گا اللہ کی خوشنودی کی تلاش کے لیے، پس ہم عنقریب دیں گے اس کو بہت بڑا اجر ﴿۱۱۴﴾

ربطِ آیات

گذشتہ رکوع میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی کارگزاری بیان فرمائی کہ انہوں نے خود چوری کر کے موردِ الزام دوسروں کو ٹھہرایا۔ اور حضور علیہ السلام کو بھی باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ چور نہیں ہیں بلکہ اُن پر الزام لگانے والے زیادتی کے مرتکب ہیں۔ انہوں نے برادری کے معززین کے ذریعے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی صفائی بھی پیش کی مگر اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے اُن کی سازش کا پردہ چاک کر دیا اور اپنے نبی کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔

اس کے بعد حضور علیہ السلام کی عصمت کا مسئلہ بھی آگیا۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا۔ تو یہ لوگ آپ کو غلط بات کا طرفدار بنا دیتے، اللہ نے فرمایا کہ خائن لوگوں کی حمایت نہیں کرنی چاہیئے، اللہ تعالیٰ خائنوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ اور جن مخلص مسلمانوں نے محض برادری کی وجہ سے حضور علیہ السلام کے پاس منافقوں کی سفارش کی تھی۔ اللہ نے ان کو سخت تنبیہ فرمائی

کہ اس دنیا میں تو تم نے اُن کی وکالت کا حق ادا کر دیا مگر کل قیامت کے دن وہ اللہ کی بارگاہ میں کونسا وکیل پیش کریں گے جو ان کی حمایت کر سکے۔ بہر حال اللہ نے فرمایا کہ کسی بے گناہ پر الزام لگانا بہت بری بات ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔

اسی ضمن میں اللہ تعالیٰ نے یہ واضح فرمایا کہ جب منافق نے چوری کا ارتکاب کیا تھا، اُس نے صحیح راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ چوری کا راز کھل گیا، پھر وہ ہتھیار بھی واپس ہوئے جو اصل مالکان نے اللہ کی راہ میں وقف کر دیے۔ چور کے متعلق فرمایا کہ اگر وہ اقرار جرم کر کے دنیا میں سزا پا لیتا تو اُس کی آخرت برباد نہ ہوتی مگر اُس نے غلط راستہ اختیار کیا۔ مرتد ہو کر کافروں سے جا ملا، اور پھر ایک دیوار کے نیچے آکر مر گیا اور ہمیشہ کے لیے ناکام ہو گیا۔

خفیہ مشورے

اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے برادری کے لوگوں کی مذمت بیان فرمائی ہے جو اپنے آدمی کی بریت کے لیے خفیہ مشورے کرتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے اجتماعی مسائل کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اہل ایمان کی بہتری کے لیے پوشیدہ مشورے یا میٹنگیں کرنا بالکل درست ہے اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اُن اُمور کی نشاندھی بھی کی ہے۔ جن کے متعلق مشورہ کرنا برحق ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ ان کے بہت سے پوشیدہ مشوروں میں کوئی بہتری نہیں ہے۔ نجوٰی سرگوشی یا کانا پھوسی کو کہتے ہیں اور اس سے مراد خفیہ میٹنگ ہے جس میں صلاح مشورہ کیا جائے۔ تو فرمایا کہ یہ لوگ بشیر منافق کی صفائی کے لیے اور دوسروں پر الزام لگانے کے لیے جو خفیہ میٹنگیں یا مشورے کرتے ہیں اور مشورے بھی ایسے کہ "لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ" جو منشائے الٰہی کے خلاف ہیں، فرمایا ایسے مشوروں کا کچھ فائدہ نہیں ہے۔

صدقہ کا حکم

فرمایا بعض خفیہ مشورے مفید بھی ہیں مثلاً اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَۃٍ یہ کہ کوئی شخص صدقہ کرنے کا حکم دے تاکہ غریبوں اور محتاجوں کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ اس قسم کا مشورہ کرنا تو بڑی خوبی کی بات ہے کہ کسی کی حاجت براری بھی ہو سکے اور اسکی عزت نفس بھی برقرار رہے قرآن پاک میں صدقہ کی بڑی اہمیت بیان ہوئی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے "یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ" اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ تاکہ سوسائٹی کو امن و سکون حاصل ہو۔ محتاجوں کو اپنا بھائی سمجھنا اور اللہ کے عطا کردہ وسائل سے ان کی مدد کرنا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے عاید کردہ فرائض میں سے ہے۔ اور اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ صدقہ سے انسان میں تذکیہ نفس پیدا ہوتا ہے بخل ختم ہو کر فیاضی جیسی اعلیٰ اقدار پیدا ہوتی ہیں۔

صدقہ کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کُلُّ مَعْرُوْفٍ صَدَقَۃٌ یعنی ہر نیکی صدقہ کے حکم میں آتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ انسانی جسم کے تین سو ساٹھ ۳۶۰ اعضا (جوڑ) ہیں۔ جب انسان صبح نیند سے صحیح سلامت بیدار ہوتا ہے۔ تو اُس پر لازم ہوتا ہے کہ ہر عضو کے بدلے صدقہ کرے۔ عرض کیا گیا، حضور! یہ تو بہت بڑا بوجھ ہے۔ اگر کوئی شخص ہر جوڑ کے بدلے ایک ایک پیسہ بھی صدقہ کرے تو سارے جسم کے لیے کافی رقم کی ضرورت ہوگی، اور ہر ایک کے پاس اتنی گنجائش نہیں ہوتی۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ کوئی شخص جو بھی اچھا کلمہ اپنی زبان سے نکالتا ہے وہ اس کے لیے صدقہ بن جاتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص سبحان اللہ، یا الحمدللہ یا لاالہ الا اللہ یا اللہ اکبر کہتا ہے۔ درود شریف پڑھتا ہے یا استغفار کے کلمات ادا کرتا ہے، تو یہ سب اُس کے لیے صدقہ بن جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی کو نیکی کی بات بتا دینا یا برائی سے روک دینا بھی صدقہ ہے، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص راستے سے کانٹا یا پتھر ہٹا دیتا ہے کہ کسی کو تکلیف نہ ہو، تو وہ بھی اُس کے لیے صدقہ

ہوتا ہے۔ فرمایا اگر کسی کو کوئی چیز بھی میسّر نہ ہو تو چاشت کے وقت دو رکعت نفل ادا کرے تو یہ سب اعضا کی طرف سے کفایت کر جائیں گے بہر حال صدقے کا عام فہم معنیٰ اللہ کے راستہ میں مال خرچ کرنا ہے۔ کسی حاجت مند کی مالی اعانت کر دی جائے، زکوٰۃ بھی اسی میں آتی ہے کہ یہ واجب ہے۔ اس کے علاوہ کسی کو کپڑا پہنا دینا، کھانا کھلا دینا، عید الاضحیٰ پر قربانی کر دینا اور عید الفطر کو فطرانہ ادا کرنا سب صدقات میں آتے ہیں بشرطیکہ یہ سب کچھ خالص اللہ کی رضا کیلئے کیا جائے

سود خوری صدقہ کی ضد سود ہے جس سے سوسائٹی میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ کسی ضرورت مند کی اعانت کرنے کی بجائے اُسے رقم دے کر اس پہ سود وصول کرنا نہایت ہی قبیح حرکت ہے۔ جس سوسائٹی میں سود کی لعنت آجاتی ہے وہ سوسائٹی پست سے پست تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ سود حرص اور لالچ کو جنم دیتا ہے، انسان میں تنگدلی پیدا ہوتی ہے، انسانی ہمدردی کا جذبہ ختم ہو کر خود غرضی پیدا ہوتی ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ سود خور قوم یہودی ہیں۔ بنکاری کا پورا نظام سود کی بنیاد پر ہی قائم ہے۔ یہودیوں کے بعد دوسرے نمبر پر سود خور ہندو مہاجن ہیں جن کی سنگدلی کے واقعات مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں۔ انہی کی دیکھا دیکھی سود خوری کی لعنت پٹھانوں اور عربوں میں بھی آگئی ہے اور پھر بعض دوسرے لوگ بھی سود خوری کرنے لگے ہیں۔ فرمایا مشورہ وہ اچھا ہے جو کہ صدقہ کی ترویج کی خاطر کیا جائے۔

نیک عمل فرمایا اچھا مشورہ صدقہ کے حکم میں ہے یا پھر اَوْ مَعْرُوْفٍ نیکی کا حکم کرتے ہیں۔ کسی سوسائٹی میں نیکی پھیلانے اور بُرائی کو مٹانے کی خاطر جو مشورہ کیا جائے وہ بھی اللہ کے ہاں مقبول ہے۔ نیکی کے صرف بڑے بڑے کام ہی قابل توجہ نہیں ہیں بلکہ معمولی سے معمولی نیکی پہ بھی عند اللہ ماجور ہوتا ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوْفِ کسی بھی نیک کام کو حقیر نہ سمجھو وَلَوْ اَنْ تَلْقَى اَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلِيْقٍ خواہ اتنی سی بات ہو کہ تم اپنے بھائی کو ہنس مکھ چہرے کے ساتھ ملو یہ بھی نیکی ہے

کسی بھائی کے برتن میں پانی ڈال دینا بھی نیکی ہے۔ غرضیکہ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی نیکیاں اکٹھی ہو کر قیامت کو پہاڑ بن جائیں گی اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پہ ثمرہ مرتب ہوگا۔ فرمایا زبانی نیکی یہ بھی ہے کہ کسی کو نیکی کی تلقین کر دی یا برائی سے منع کر دیا۔ اور فعلی نیکی یہ ہے کہ کسی مظلوم کی مدد کر دی جائے اور کسی مصیبت زدہ کی مصیبت کو رفع کر دیا جائے یہ قولی اور فعلی معروف باتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر نیکی کے کاموں کے لیے مشورہ کیا جائے، میٹنگ کی جائے یا کوئی اجلاس بلایا جائے تو یہ بہت اچھی بات ہے۔

اسی لیے فرمایا کہ منافقوں کی بہت سی پوشیدہ میٹنگوں کا کوئی فائدہ نہیں البتہ فائدہ اُس غرضیہ مشورے کا ہے جو صدقہ کے متعلق ہو یا نیکی کو پھیلانے کے لیے کیا جائے، وگرنہ اکثر مشورے اور میٹنگیں فضول ہی ہوتی ہیں، جن کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ابو داؤد شریف اور بعض دوسری کتابوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان موجود ہے مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَا لَا یَعْنِیْہِ یعنی کسی انسان کی اسلام کی خوبی میں سے ہے کہ وہ لایعنی اور فضول باتوں کو ترک کر دے۔ اور اس کے بجائے اچھی باتوں کو اختیار کرے، تو اس سے انسان میں طہارت اور سماحت جیسی پاکیزہ چیزیں پیدا ہوں گی۔

اصلاح ذات البین

فرمایا تیسری چیز جس کے لیے مشاورت جائز ہے، وہ ہے۔ اَوْ اِصْلَاحٍ بَیْنَ النَّاسِ لوگوں کے درمیان اصلاح کرنا یعنی افراد یا جماعتوں کے درمیان تنازعہ پیدا ہو جاتا ہے، ان کی اصلاح کرنے کے لیے جھگڑے کو مٹانے کے لیے اگر میٹنگیں اور مشورے کیے جائیں تو بہت اچھی بات ہے اسے اصلاح ذات البین کہتے ہیں۔ دوسرے مقام پر ہے اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِکُمْ اللہ تعالیٰ نے اپنے حالات اچھے رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے برخلاف فساد ذات البین بہت بری بات ہے

مسلمانوں کا آپس میں جھگڑا و فساد مختلف وجوہات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جھگڑا معاملات میں ہوتا ہے اور اخلاق میں بھی، حتیٰ کہ لبا اوقات فساد و عقیدے کے بارے میں بھی ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فساد ذات البین کے متعلق فرمایا ھِیَ حَالِقَۃٌ یہ مونڈنے والی چیز ہے۔ پھر فرمایا کہ میں نہیں کہتا کہ فساد بالوں کو مونڈتا ہے بلکہ یہ دین کو مونڈ کر رکھ دیتا ہے۔ آپس کا فساد دین کو ایسے برباد کر دیتا ہے۔ جیسے استرا بالوں کی بیخ کنی کر دیتا ہے۔

جھگڑا پارٹیوں کے درمیان بھی ہو سکتا ہے اور ملکوں کے درمیان بھی۔ لہذا جھگڑے کو مٹانے کے سلسلے میں جو کوشش، محنت، مشورہ اور میٹنگ کی جائے وہی بہتر ہے۔ فضول کاموں کے لیے مشورہ کرنا لایعنی ہے، اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، بلکہ برائی کو تقویت حاصل ہوگی۔ الغرض! یہ تین چیزیں بیان کی گئی ہیں جن کے لیے باہمی مشاورت بالکل درست ہے یعنی صدقہ، نیکی اور اصلاح ذات البین۔ اور ان تمام امور کا مقصد ایک ہی ہے۔ کہ لوگوں کے حالات اچھے ہو جائیں۔ برائی کا خاتمہ ہو جائے۔ فاسد رسومات سے جان چھوٹ جائے اور ان کی بجائے سنت رائج ہو۔ لوگوں میں اسلام اور شریعت کے لیے محبت پیدا ہو جائے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں جو اصلاح ذات البین کے لیے کوشش کرتا ہے، ملاءِ اعلیٰ کے فرشتے اس کے حق میں بہتری کی دعا کرتے ہیں۔ ایسا انسان اللہ کے ہاں پسندیدہ انسان ہوتا ہے کہ وہ فرشتوں کی دعاؤں کا مستحق بنتا ہے۔

جائز اور ناجائز مشورے

مشورے افراد کے درمیان بھی ہوتے ہیں اور مقامی اور ملکی سطح پر جماعتوں کے درمیان بھی۔ میونسپل کمیٹی کے ممبران بھی میٹنگ کرتے ہیں اور شہر کی اصلاح کے لیے مشورے کرتے ہیں۔ اسی طرح صوبائی اور ملکی سطح پر ممبران صوبائی و قومی اسمبلی اجلاس کر کے صوبائی اور ملکی بہبود کے لیے مشورے کرتے ہیں اور پھر بڑے بڑے منصوبے معرض وجود میں آتے ہیں مگر سوال تو یہ ہے کہ کیا یہ سب لوگ قوم و ملت

کی اصلاحِ احوال کے لیے مشورے کرتے ہیں یا کھیل تماشے اور دیگر فضول باتوں کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں تین چیزوں کا ذکر کیا ہے یعنی صدقہ، نیکی اور اصلاح ذات البین۔ کیا ہمارے شہر، صوبے یا ملک کے نمائندگان کو کبھی یہ توفیق حاصل ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ مذکورہ بالا تین آئٹمز (ITEMS) کو بھی زیرِ بحث لائیں؟ کیا ان امور کی انجام دہی کے لیے بھی قانون سازی ہوتی ہے۔؟ کیا غریبوں کی بہبود کے لیے کبھی مشورہ ہوا ہے؟ وہاں تو فضول چیزوں کے لیے قانون بنتے ہیں۔ وہاں تو فلموں اور ٹیلیویژن کی ترقی کی باتیں ہوتی ہیں۔ کرکٹ اور ٹینس کے لیے مشورے ہوتے ہیں۔ چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ لوگوں کی تعلیم و تربیت کی باتیں ہوتیں؟ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ پیش ہوتا۔ محتاجوں کی عزتِ نفس کے لیے کوئی منصوبہ بنتا، غربت دور ہو کر لوگوں کی بنیادی ضروریات کا اہتمام ہوتا مگر ایسی چیزیں انہیں کہاں نصیب ہیں

یہاں پر اختلاف دور کرنے کی بجائے افراد اور پارٹیوں کے درمیان اختلافات بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ انگریز کا پرانا اصول ہے کہ اختلاف بڑھاؤ اور حکومت کرو (DIVIDE AND RULE) کیونکہ اگر لوگ اچھی بات پہ متفق ہو جائیں تو انہیں حکومت کرنے کا موقع کیسے مل سکتا ہے۔ یہاں تو سیاسی پارٹیوں میں رسہ کشی کو ہوا دی جاتی ہے۔ شیعہ سنی کا فساد کرایا جاتا ہے۔ مقلد غیر مقلد کا مسئلہ پیدا کیا جاتا ہے، دیوبندی اور بریلوی کو لڑایا جاتا ہے اور یہی ایک اصول ہے جس کے ذریعے اپنی حکومت کو طول دے سکتے ہیں۔ اقتدار پر قبضہ جما سکتے ہیں۔ بھائی تمہارے ذمے تو لازم تھا کہ نیکی کا نظام قائم کرتے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پہ عمل کرتے برائی کا قلع قمع طاقت کے ساتھ کرتے عریانی اور فحاشی کے خلاف جہاد کرتے، نظامِ صلوٰۃ قائم ہوتا، ہر شخص کی عزت آبرو، مال اور جان محفوظ ہوتی۔ اگر تم برائی ختم نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ کی پیش کردہ باتوں پہ عمل نہیں کرتے تو تمہاری ممبریاں کسی کام کی نہیں ہیں۔ تم اپنے فرائض کو

کما حقہٗ ادا نہیں کر رہے۔ اقتدار کی امانت اللہ تعالیٰ نے تمہارے سپرد کی ہے اسے محض تنخواہ اور بھتہ وصول کرنے تک محدود نہ رکھو بلکہ عوام کی خدمت کر کے نہ صرف دنیا میں سرخروئی حاصل کرو بلکہ آخرت کے لیے ذریعہ نجات بھی پیدا کر لو۔

اہل ایمان کی چار صفات

امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اہل ایمان کی تمام امتوں کے لیے چار صفات کا ہونا ضروری ہے (۱) طہارت (۲) اخبات یعنی خدا تعالیٰ کے سامنے عاجزی (۳) سماحت یعنی فیاضی اور رذیل چیزوں سے پرہیز اور (۴) عدالت۔
عدل و انصاف کا تقاضا ہے کہ لوگوں کے جھگڑے مٹ جائیں۔ تمام لوگ صلح و صفائی سے رہیں۔ اختلاف اپنوں میں ہو یا بیگانوں میں، افراد میں ہو یا پارٹیوں میں، خاندان میں ہو یا ممالک میں، صلح کرا دینا بہت بڑی نیکی ہے سورۃ حجرات میں بھی آتا ہے۔ کہ مومنوں کے دو گروہوں کے درمیان اگر جھگڑا ہو جائے۔ "فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا" تو ان کے درمیان صلح کرا دو، تو اللہ تعالیٰ نے تین چیزوں کا ایجنڈا دے کر فرمایا کہ اگر میٹنگ کرنی ہے، کوئی مشورہ کرنا ہے تو ان چیزوں کے متعلق کرو۔ صدقہ کا حکم دو تاکہ محتاجوں کی ضروریات پوری ہوں۔ نیکی کا حکم دو تاکہ برائی کا خاتمہ ہو جائے اور لوگوں کے درمیان اصلاح کرو تاکہ تمام جھگڑے اور تنازعے مٹ جائیں۔ اگر تمہارے اپنے جھگڑے ختم ہو جائیں تو کوئی غیر تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکیگا۔ برخلاف اس کے اگر تم آپس میں الجھتے رہے تو تمہاری ہوا اکھڑ جائیگی اور تم ذلیل و خوار ہو کر رہ جاؤ گے۔

رضائے الٰہی

فرمایا وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ جو شخص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی تلاش میں ایسا کریگا، صدقہ یا نیکی کا حکم کریگا یا لوگوں کے درمیان صلح کرا دے گا یا ان مقاصد کے حصول کے لیے مشورہ کریگا اور اس کی مراد رضائے الٰہی ہو، اپنی نیک نامی، ریاکاری یا ووٹ حاصل کرنے کے لیے ایسا نہیں کرتا، فرمایا فَسَوْفَ نُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا

عنقریب ہم اُسے بہت بڑا اجر عطا کریں گے نیکی دراصل وہی ہے جو صرف خدا کی رضا کے لیے ہو۔ اور ہر اُس شخص کے ساتھ کی جائے جو اس کا مستحق ہو۔ مگر آج حالت یہ ہے کہ زکوٰۃ و خیرات اُس شخص کو دی جاتی ہے جو اپنی پارٹی کا آدمی ہو سفارش اُس کی کی جاتی ہے، جس نے ووٹ دیا تھا یا آئندہ دیگا یا پھر نیکی اس لیے کی جاتی ہے کہ اپنے فرقے کو عروج حاصل ہو۔ حکومت بھی انعامات سے اُسی شخص کو نوازتی ہے جسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا مطلوب ہو۔ یہ تمام چیزیں نیکی کی روح کے خلاف ہیں۔ نیکی جب تک محض اللہ کی رضا کے لیے نہیں ہو گی، اس کا کچھ فائدہ نہیں، ابتغاء مرضات اللہ سے یہی بات سمجھائی گئی ہے۔ اور اللہ کی خوشنودی کے لیے وہی نیکی کرے گا جس کا نظریہ یعنی (IDEOLOGY) صحیح ہو گی۔ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کا بھی محبوب ہو گا اور ملاءِ اعلیٰ کی دعاؤں کا مستحق بھی۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى
وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى
وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾ ع ۱۷

ترجمہ: اور جو شخص مخالفت کریگا اللہ کے رسول کی اُس کے بعد کہ اس شخص کے لیے ہدایت واضح ہو چکی ہے۔ اور وہ شخص پیروی کرتا ہے مؤمنین کے راستے کے علاوہ، ہم اُس کو پھیر دیں گے اُسی طرف جس طرف اُس نے رُخ کیا ہے اور ہم اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بہت بُری جگہ ہے لوٹ کر جانے کی ﴿۱۱۵﴾

ربط آیات

گذشتہ آیات میں منافقین کی مذمت بیان ہوتی رہی ہے اللہ تعالیٰ نے اُن کی خیانت، بُرائی، خفیہ مشوروں اور میٹنگوں کا ذکر فرمایا۔ گذشتہ اور اس سے پیوستہ دروس میں منافقین کے ایک خاندان بنو ابیرق کا ذکر تھا کہ اُن کے ایک آدمی بشیر ابن ابیرق نے چوری کا ارتکاب کیا۔ مگر خود کو اُس سے بری الذمہ ثابت کرنے کے لیے چوری کا الزام ایک مخلص مسلمان لبید ابن سہیل رضؓ پہ اور پھر ایک یہودی پر لگایا اس کے علاوہ معززین قبیلہ کا ایک وفد بھی حضور علیہ السلام کی خدمت میں بھیجا، جس میں مخلص مسلمان بھی شامل تھے۔ اس وفد نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو باور کرانے کی کوشش کی کہ اُن کا آدمی بے گناہ ہے، اور رفاعہؓ اور قتادہؓ نے اس پہ غلط الزام لگایا ہے حضور علیہ السلام نے بھی ظاہری حالات کے مطابق بشیر منافق کو بے گناہ سمجھا اور حضرت قتادہؓ کو ڈانٹ دیا کہ انہوں نے غلط الزام لگایا ہے تاہم اللہ تعالیٰ نے آیات نازل فرما کر اس سازش کو بے نقاب کر دیا چور پکڑا گیا اور اس

سے مال بھی برآمد ہو گیا۔ پھر وہ منافق خفت کے مارے مدینہ سے بھاگ گیا اور مرتد ہو کر کفار مکہ سے جا ملا۔ حضرت حسان بن ثابتؓ نے اس کی ہجو کہی، جب اُس کا چرچا ہوا۔ تو بدنامی کے ڈر سے اُس عورت نے بھی بشیر کو گھر سے نکال دیا جس کے پاس وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ مفسرین بیان فرماتے ہیں کہ وہ کسی دیوار کے نیچے آکر مر گیا۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کے حوالہ سے منافقین کی مذمت بیان کی۔ کہ اگر اس شخص میں انصاف کا مادہ ہوتا تو اپنے جرم کا اقرار کر کے حد سرقہ قبول کر لیتا اور آخرت کے دائمی عذاب سے بچ جاتا مگر اُس نے غلط راستہ اختیار کیا۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے سفارشی مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی کہ وہ ایسے غلط لوگوں کی حمایت کیا کریں۔ خود حضور نبی کریم علیہ السلام کے متعلق فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل نہ ہوتا تو یہ لوگ غلط طور پر آپ کو بھی اپنا طرفدار بنا لیتے ــــ مگر اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرما کر منافقین کی شقاوت کو ظاہر فرما دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کے بعد آج کی آیت میں مومنوں کو خبردار کیا ہے کہ وہ منافقوں کی چالوں میں آنے کی بجائے مومنین کے راستہ پر چلیں اور مومنین کے راستہ کے خلاف نہ کریں۔

رسول کی مخالفت

چنانچہ اسی پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ جو کوئی اللہ کے رسول کی مخالفت کرتا ہے۔ مشاقت دشمنی ضد، عناد، یا پارٹی بازی کو کہتے ہیں۔ یہ تمام قبیح صفات بشیر بن ابیرق پر صادق آتی ہیں اور اسی کی طرف اشارہ ہے کہ اُس شخص نے خود چوری کی، پھر دوسروں پر اتہام لگایا اور آخر میں اللہ کے رسول کی نافرمانی کا مرتکب ہو کر کفار مکہ سے جا ملا۔ اسی لیے فرمایا کہ جو شخص اللہ کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے، مخالفت کرتا ہے مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى بعد اس کے کہ اس پر ہدایت واضح ہو چکی تھی۔ اور ہدایت کا راستہ وہی ہے جس پر اللہ کا رسول اور اس کے متبعین چل رہے ہیں اور جس کی طرف دوسروں کو بھی دعوت دے رہے ہیں۔ یہ وہی ہدایت کا پروگرام ہے۔ جو اللہ جل شانہٗ نے اپنی آخری

کتاب قرآنِ مجید میں نازل فرمایا ہے۔ اور حضور علیہ السلام جس کی تشریح وتوضیح بیان فرماتے ہیں۔ اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ میں اس طرح بیان فرمایا "قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ" یعنی ہدایت کا راستہ گمراہی کے راستے سے بالکل واضح ہو گیا ہے، اس کے باوجود اگر کوئی شخص اللہ کے رسول اور اس کے لائے ہوئے دین کی مخالفت کرتا ہے۔ تو پھر اس کی سزا وہی ہے جو آیت کے اگلے حصے میں بیان ہو رہی ہے۔

سزا کی وجوہات

امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ کہ نبی ہمیشہ اپنی قوم کی زبان میں ان کو دین کی دعوت دیتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا قانون ہے "وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِہٖ لِیُبَیِّنَ لَھُمْ" ہم نے ہر رسول کو اس کی قوم کی زبان کے ساتھ بھیجا تاکہ کسی کو کوئی اشتباہ نہ رہے کہ اللہ کا نبی کس چیز کی طرف دعوت دے رہا ہے۔ لہٰذا جب کوئی نبی اپنی قوم کو انہی کی زبان میں سمجھائے، پھر قوم کا کوئی آدمی دعوت کو سن کر اس کا انکار کرے، تو وہ قطعی طور پر سزا کا مستحق ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ چار چیزیں انسان کو سزا کا مستحق بناتی ہیں۔ پہلی چیز پیدائشی فطرت ہے کہ اس اعتبار سے بھی کوئی انسان سزا یا جزا کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ دوسری چیز ملاءِ اعلیٰ کے فرشتے ہیں جو اچھا کام کرنے والوں کے لیے دعا اور بُرا کام کرنے والوں کے لیے بددُعا کرتے ہیں لہٰذا یہ فرشتے بھی جزا و سزا کا سبب بنتے ہیں۔ فرمایا تیسری چیز شریعت مطہرہ ہے۔ جب یہ نازل ہوتی ہے تو اس پر عمل کرنے والے جزا پاتے ہیں اور انکار کرنے والے سزا پاتے ہیں۔ پھر چوتھے درجے میں اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو بھیج کر ہدایت کا راستہ واضح کرتا ہے۔ اس حجت کے اتمام پر بھی اللہ تعالیٰ جزا و سزا کا فیصلہ کرتا ہے۔

اتباع کے درجات

فرمایا کہ جو شخص ہدایت واضح ہو جانے کے بعد اللہ کے رسول کی مخالفت کریگا۔ "وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ" اور مومنین کے راستے

کے علاوہ کسی دوسرے راستے پر چلیگا۔ جیسا کہ بشیر منافق مومنوں کا راستہ چھوڑ کر مشرکوں کے ساتھ جا ملا، تو فرمایا ہم اس کو وہ سزا دیں گے جس کا ذکر آگے آرہا ہے اور یہ اس لیے کہ اس نے نبی کی اتباع چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کیا، حالانکہ نبی کا اتباع فرض ہے۔ اس سورۃ میں پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اس لحاظ سے فرض ہے کہ وہ خالق اور مالک ہے۔ اور نبی کی اطاعت اس کی رسالت کی وجہ سے لازم ہے۔ اور اس آیت کی رو سے تیسری چیز یہ آگئی کہ مومنین کے راستے پر چلنا بھی فرض ہے۔ اور مومنین وہ جو اللہ اور اس کے رسول کے راستے پر چلنے والے ہیں اور جن کا اعتقاد اور عمل بالکل صحیح ہے۔ یہ تینوں چیزیں درجہ بدرجہ آتی ہیں۔

دلائل شرعیہ

امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ کہ مومنین سے مراد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہ کرامؓ ہیں، جو آپ پر ایمان لائے، آپ کی زیارت کی اور آپ کا اتباع کیا۔ پھر ان کا کسی بات پر اتفاق ہو جائے تو وہ دلیل شرعی بن جاتی ہے۔ گویا اجماع امت میں سب سے پہلے صحابہؓ کی جماعت آتی ہے اور جو کوئی اُن کے طریقے کے خلاف کریگا، تو وہ قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ صحیحین میں حضور علیہ السلام کے ارشاد مبارک کی شرح میں محدثین کرام فرماتے ہیں مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ اَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ جس شخص نے کوئی ایسا کام کیا جو ہمارے طریقے کے مطابق نہیں ہے تو وہ مردود ہے اس طریقے کے متعلق محدثین کرام فرماتے ہیں کہ دلائل شرعیہ چار ہیں اور کسی معاملہ کو سمجھنے کے لیے اِن چاروں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ سب سے پہلے کتاب اللہ ہے، دوسرے نمبر پہ سنت رسول اللہ تیسرا اجماع صحابہؓ اور چوتھا قیاس ہے۔ اگر کوئی چیز پہلے تین دلائل سے ثابت نہ ہو، تو پھر چوتھی دلیل کو بروئے کار لایا جائیگا۔ ظاہر ہے کہ تمام چیزوں کی تفصیل قرآنِ پاک میں تو نہیں ہے، وہاں تو اصول وضوابط ہیں۔ پھر ان اصولوں کی بہت حد تک تشریح وتفسیر حضور علیہ السلام کے قول، فعل یا تقریر سے ملے

گی مگر تمام مسائل وہاں سے بھی حل نہیں ہوں گے۔ پھر اس مسئلہ کو امت کے بہترین لوگوں یعنی صحابہؓ پہ پیش کیا جائیگا۔ اگر وہ کسی نتیجہ پر متفق ہیں تو وہ حل ساری امت کے لیے واجب العمل ہے ورنہ ایسی بات میں مجتہدین اجتہاد کرکے مسئلہ کا حل نکالیں گے، چنانچہ یہ اجتہاد یا قیاس بھی شرعی دلیل ہے۔ دنیا میں ہر روز نئے نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کا حکم واضح طور پہ قرآن، سنت، اور اجماع صحابہؓ میں نہیں ملتا، تو پھر ایسے مسائل قیاس واجتہاد کے ذریعے ہی حل کیے جائیں گے اور ان پر عمل کرنا عام لوگوں کے لیے ضروری ہو گا۔ فرماتے ہیں کہ ان چار دلائل شرعیہ میں سے دو مثبت ہیں یعنی قرآن و سنت ایسے دلائل ہیں جنکے ذریعے مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ لہذا یہ مثبت دلائل ہیں۔ اور دو دلائل مظہر ہیں کہ ان کے ذریعے مسائل کا حل ظاہر ہوتا ہے۔ اور یہ ہیں اجماع اور قیاس۔ ظاہر ہے کہ جس چیز پہ صحابہ کرامؓ کا اجماع ہو گا، اس کی ضرور کوئی نہ کوئی بنیاد ہو گی۔ اور جو بات کوئی مجتہد بتلاتا ہے وہ بھی کسی دلیل کی بنیاد پہ ہی ہوتی ہے۔ مجتہد مطلوبہ مسئلہ کے لیے پہلے علت (CAUSE) دریافت کرتا ہے اور پھر اس علت کی بنیاد پہ مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے، لہذا یہ بھی شرعی دلیل کا درجہ رکھتی ہے۔

امام شافعیؒ نے اسی آیت سے اجماع کو ثابت کیا۔ بعض کتب میں لکھا ہے۔ کہ امام شافعیؒ کو اس معاملہ میں تردد تھا کہ اجماع کا ثبوت قرآن پاک کی کس آیت سے ہوتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے قرآن کریم کی تلاوت شروع کی آپ نے ایک دن میں تین دفعہ پورے قرآن پاک کی تلاوت کی مگر آپ کی تسلی نہ ہوئی۔ آپ متواتر تین دن تک تین تین مرتبہ اول سے آخر تک قرآن پاک کی تلاوت کرتے رہے اور آخر کار اسی آیت پہ آکر اٹک گئے وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ۔ اب آپ کی تشفی ہو گئی کہ اجماع بھی قطعی دلیل شرعی ہے۔

کثرت تلاوت قرآن

چوبیس ۲۴ گھنٹے میں دو مرتبہ قرآن پاک کی تلاوت کرنا تو بہت سے صالحین امت کا معمول رہا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ رمضان المبارک کے دوران ایک مرتبہ دن کو اور ایک مرتبہ رات کو مکمل قرآن پاک پڑھتے تھے۔ امام بخاریؒ یحییٰ بن معینؒ اور یحییٰ بن سعید قطانؒ بھی ایسا ہی کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے دن رات میں دو مرتبہ قرآن پاک ختم کرتے تھے۔ بعض صاحب کرامت بزرگوں نے اس سے بھی کم وقت میں قرآن حکیم کی تلاوت مکمل کی ہے خواجہ نظام الدینؒ نے اپنے ملفوظات میں لکھا ہے کہ خواجہ بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ کے ایک مرید حسن افغانؒ ہر روز سات سو مرتبہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے۔ لوگوں نے خواجہ صاحب نظام الدینؒ سے دریافت کیا کہ سات سو مرتبہ تلاوت تو پھر تصور ہی میں کرتے ہوں گے۔ آپ نے فرمایا ایسا نہیں ہے بلکہ آپ پورے الفاظ کے ساتھ تلاوت قرآن پاک کرتے تھے۔ حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ جو ہمارے اکابرین میں سے ہیں فرماتے ہیں کہ آنکھیں بند کر کے مان لو کہ کرامت کے طور پر سات سو مرتبہ قرآن پاک کی تلاوت ممکن ہے۔ امام رازیؒ نے امام شافعیؒ کے بارہ میں جو تین سو مرتبہ قرآن پاک کی تلاوت کی روایت بیان کی ہے۔ وہ درست معلوم نہیں ہوتی۔ تین دن تین تین مرتبہ والی روایت صحیح ہے

امام محمدؒ کا معمول تھا کہ آپ ہر روز دس پارے تلاوت فرماتے تھے مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ اور مولانا شیخ الہندؒ بھی دس پارے تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ ہمارے استاذ اور شیخ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ بہت مصروف آدمی تھے مگر سات پارے روزانہ آپ بھی پڑھ لیا کرتے تھے۔ امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ وتر کی ایک رکعت میں پورا قرآن پاک پڑھ جاتے تھے۔ ترمذی شریف میں موجود ہے کہ حضرت سعید بن جبیر تابعیؒ بھی ایک رکعت میں پورا قرآن تلاوت کرتے تھے

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ دو رکعت میں پورا قرآن اور مزید چار پارے پڑھتے تھے حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ عصر اور مغرب کے درمیان پورا قرآن تلاوت کر لیتے یا پھر آپ صبح کی نماز کے بعد بیٹھتے اور طلوعِ شمس تک قرآن پاک پڑھ جاتے۔ یہ لوگ صاحبِ کرامت تھے۔ ہر آدمی کے بس کی یہ بات نہیں ہے۔ عام لوگوں کے لیے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ تین دن سے کم عرصہ میں تلاوتِ قرآن مکمل نہ کی جائے ایسا کرو گے تو سمجھ نہیں سکو گے مگر خاص لوگوں کا معاملہ اور ہے، وہ الفاظ اور مضامین کی تفہیم کے ساتھ کم سے کم عرصہ میں قرآنِ کریم کی تلاوت مکمل کر لیتے تھے۔

مسلک امام ابوحنیفہؒ

اجماع کے متعلق امام ابوحنیفہؒ کا مسلک بھی یہ ہے۔ کہ جس مسئلہ پر امت کا پہلا طبقہ خصوصاً صحابہ کرامؓ متفق ہوں، اُس کو ماننا ضروری ہے اور اس کے خلاف چلنا گمراہی۔ امام طحاویؒ نے اپنی کتاب کی ابتدا میں لکھا ہے کہ ہمارے امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ آپ سب سے پہلے اللہ کی کتاب قرآن پاک کو لیتے ہیں، اس کے بعد نبی علیہ السلام کی سنت کی طرف رجوع کرتے ہیں پھر اجماعِ صحابہؓ میں سے متفق علیہ مسئلہ پر عمل کرتے ہیں۔ اور اگر صحابہ میں اختلاف پایا جائے۔ وہاں امام صاحب کسی قول کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں اور اس کے بعد جب تابعین کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو فرماتے ہیں نَحْنُ رِجَالٌ وَهُمْ رِجَالٌ یعنی وہ بھی تحقیق کے شاہسوار ہیں، ہم بھی تحقیق کرتے ہیں اور جو بات ہمیں کتاب و سنت اور اجماع کے مطابق معلوم ہوگی، اُس کو اختیار کریں گے۔ آپ صحابہ رضؓ کے اجماع تک ہر فیصلہ شدہ مسئلہ کو تسلیم کرتے ہیں، اگر وہاں تک کوئی حکم معلوم نہ ہو تو پھر اجتہاد کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ کا مسلک

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی معرکۃ الآرا کتاب حجۃ اللہ البالغہ قوانینِ اسلام کی تشریح ہے اس کے دو حصے ہیں۔ ایک حصے میں حدیث کی شرح بیان کی گئی

ہے اور دوسرے میں کلی قوانین بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں اسلام کا مکمل نظام پیش کیا گیا ہے۔ گذشتہ بارہ سو[12] سال میں ایسی بلند پایہ کتاب نہیں لکھی گئی۔ آپ بارھویں صدی کے مجدد، محدث عصر اور صاحب طریقت بزرگ ہوئے ہیں۔ چار پانچ پشتوں تک آپ کا سارا خاندان اسی پایہ کا ہوا ہے۔ آپ کے والد، بیٹے اور پوتے دین کے شیدائی ہوئے ہیں۔ انہوں نے اسلام کی خاطر پوری قوتیں صرف کر دیں اور پوری دنیا خصوصاً برصغیر میں دین کی بے پایاں خدمت انجام دی۔ آپ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں۔ کہ اگر ہماری کوئی تحریر کتاب اللہ کے خلاف ہو یا سنت رسول کے خلاف ہو یا اجماع قرون مشہود لہا بالخیر کے خلاف ہو فَاِنَّہٗ خَطَاءٌ تو سمجھ لینا کہ یہ غلطی ہے رَحِمَ اللّٰہُ مَنْ اَیقَظَنَا مِنْ سِنَتِنَا اللہ تعالیٰ اس شخص پہ رحم کرے جو ہمیں ہماری غلطی سے آگاہ کرے گا۔

قرون مشہود لہا بالخیر سے آپکی مراد وہ زمانہ ہے جسکی بہتری کی گواہی دی گئی ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم یعنی بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے پھر جو ان کے ساتھ ملنے والے ہیں اور پھر جو ان کے ساتھ ملنے والے ہیں۔ غرضیکہ آپ بھی اجماع صحابہؓ کو حجت تسلیم کرتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ ہمارا مذہب یہ ہے کہ سب سے پہلے کتاب اللہ پھر سنت رسول اللہ پھر اجماع اور پھر اجتہاد۔ اگر ہمارے اجتہاد میں کوئی غلطی ہو جائے تو وہ ہمارا مذہب نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ ایک تحقیقی بات ہوگی۔ اس سے روشنی تو حاصل ہوتی رہے گی۔ مگر اسے بطور عقیدہ اور عمل نہیں اپنایا جا سکتا۔

فرقہ بندی کی وجہ

فرماتے ہیں کہ اجماع امت کا ماننا اس لیے ضروری ہے کہ یہ مومنین کا راستہ ہے۔ وہ مومنین جو اللہ کی وحدانیت پہ یقین رکھتے ہیں اور اس کے رسول کا اتباع کرتے ہیں۔ جو شخص ان کے راستے کو چھوڑ دیگا وہ یقیناً گمراہ ہو جائے گا۔ تمام

فرقے اسی لیے وجود میں آئے ہیں کہ یہ قرآن وسنت کے مرکز سے ہٹ گئے۔ اگر یہ لوگ یَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِيْنَ کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے مرکز پر قائم رہتے تو گمراہ نہ ہوتے، فکری عملی اور اخلاقی گمراہی مرکز سے ہٹنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، مرزا قادیانی اسی مرکز سے ہٹ کر گمراہ ہوا۔ سرسید نے من مانی تاویلیں کیں معجزات کا انکار کیا تو گمراہ ہوا۔ علامہ مشرقی نے بھی یہیں سے ٹھوکر کھائی۔ پرویز نے قرآن پاک کے نئے نئے معانی بنائے اور اسی وجہ سے گمراہ ہوا۔ غرضیکہ جتنے بھی فرقے ہیں وہ سب اسی نقطے پر آکر بھٹکتے ہیں۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ میرے ذہن میں بہت سی باتیں آتی ہیں مگر جہاں عقیدے کا معاملہ آتا ہے، میں کہتا ہوں کہ ان کو نہیں مانوں گا۔ میں تو وہی بات مانوں گا جو جمہور نے تسلیم کی ہے۔ اور جس پر صحابہ کرامؓ کا اتفاق ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے ذہن میں بڑے بڑے نکات آتے ہیں، مگر جب تک کتاب وسنت کے دو گواہ موجود نہ ہوں، میں کسی چیز کو نہیں مانوں گا۔ غرضیکہ دلائل شرعیہ میں تیسرا نمبر اجماع امت کا ہے اس میں صحابہ کرامؓ کا اجماع اوّل درجہ میں ہے۔ جس معاملہ میں ان کا اتفاق ہو، اس کے خلاف چلنا گمراہی ہے۔

توفیق خداوندی

فرمایا جو اللہ کے رسول کی مخالفت کرے گا اس کے بعد کہ اس کے لیے ہدایت واضح ہو گئی۔ اور مومنین کے راستے کے علاوہ کسی دوسرے طریقے کی پیروی کرے گا۔ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی تو ہم پھیر دیں گے اُس کو اُسی طرف جس طرف اُس نے رُخ کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہر نیک و بد کام کے لیے توفیق دینا خدا تعالیٰ کا کام ہے۔ جب کوئی شخص برائی کرنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ ہم تمہاری توفیق سلب نہیں کرتے اگر اسی راستے پر جانا چاہتے ہو تو جاؤ، اس معاملہ میں تم اپنے فعل میں مختار ہو۔ نیک کام کرنا چاہو تو اس کی توفیق بھی دیتے ہیں اور کفر شرک میں مبتلا ہونا چاہو تو اس سے

بھی ہم روکتے نہیں۔ البتہ یہ ہے کہ ہم قیامت کے دن اس کا حساب کتاب تم سے لے لیں گے۔ اس وقت جدھر جانا چاہو ہم اُسی طرف پھیر دیں گے۔

اجتماعیت کی اہمیت

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ یعنی جماعت کو لازم پکڑو۔ جماعت سے علیحدگی اختیار نہ کرو کیونکہ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ ترمذی شریف کی روایت ہے کہ جو جماعت سے الگ ہوا وہ جہنم میں جا پڑا۔ فرمایا جب تک کوئی شخص جماعت کے ساتھ منسلک رہے گا شیطان کے حملہ سے محفوظ رہیگا۔ جو بکری ریوڑ کے اندر رہتی ہے وہ بھیڑیے کے حملے سے بچ جاتی ہے اور جو ریوڑ سے الگ ہو جاتی ہے وہ درندوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح شیطان بھی اس شخص پہ مسلط ہوتا ہے جو جماعت سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ مسلمانوں کی اجتماعیت کے خلاف چلنے والا آدمی شیطان کا شکار ہو کر گمراہ ہو جائے گا۔ افسوس کا مقام ہے کہ اہل اسلام کی اجتماعیت ایک زمانہ سے بگڑ چکی ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کے عقیدے اور عمل بگڑ چکے ہیں۔

فرمایا ہم ایسے شخص کو اس کی خواہش کے مطابق پھیر دیں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ آخر کار ہم اُسے جہنم میں داخل کرینگے کیونکہ ہدایت کے واضح ہونے کے بعد جماعت کے راستہ سے الگ ہو گیا اس نے اللہ کے رسول کی مخالفت کی۔ اور جو شخص جہنم میں پہنچ گیا وَسَاءَتْ مَصِيرًا وہ تو لوٹ کر جانے کی بہت ہی بُری جگہ ہے۔ ایسا شخص ہمیشہ کے لیے ناکام ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کی مذمت کے ساتھ ساتھ اجماع امت کا مسئلہ بھی سمجھا دیا کہ ہمیشہ جماعت کو لازم پکڑو، سلف صالحین کے مسلک پہ قائم رہو، اس کے خلاف چلنے والا گمراہ ہو کر جہنم میں داخل ہوگا۔

درس شصت ویک ۶۱ — آیت ۱۱۶ تا ۱۱۷

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ
ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ
ضَلٰلًا ۢ بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾ إِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ إِلَّآ إِنٰثًا ۚ
وَإِنْ يَّدْعُوْنَ إِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ﴿۱۱۷﴾ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ

وقف لازم

ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ نہیں معاف کرتا اس بات کو کہ اُس کے ساتھ شرک کیا جائے، اور بخشتا ہے اُس کے سوا جس کو چاہے اور جس شخص نے شرک کیا اللہ کے ساتھ پس بیشک وہ گمراہ ہو گیا اور گمراہی میں دُور جا پڑا ﴿۱۱۶﴾ (شرک کرنیوالے) نہیں پکارتے اللہ کے سوا مگر عورتوں کو، اور نہیں پکارتے یہ مگر شیطان سرکش کو ﴿۱۱۷﴾ جس پر اللہ نے لعنت کی ہے

ربطِ آیات

گذشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے اجماع کے خلاف چلنے والے شخص کے متعلق فرمایا کہ جو شخص ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد اللہ کے رسول کی مخالفت کرے گا اور مومنین کے راستے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کریگا، تو اللہ تعالیٰ اسکی توفیق کو سلب نہیں کریگا، بلکہ جس طرف وہ جانا چاہتا ہے، اُسے جانے دے گا، اور پھر اُس کا انجام جہنم ہوگا، مومنین کے راستے کی مخالفت کا نتیجہ گمراہی ہوتا ہے، اور انسان شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ گذشتہ دروس میں جس منافق بُشیر کا واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ مومنین کا راستہ چھوڑ کر مشرکین کے راستے پر چل نکلا اور پھر وہاں جہنم رسید ہو گیا۔ اُس شخص نے چوری کی تھی، اگر وہ تائب ہو جاتا تو اللہ تعالےٰ ———

اُسے معاف کر دیتا ہے مگر وہ مرتد ہو کر کفر، شرک میں ملوث ہو کر مر گیا تو اس کی بخشش کا کوئی امکان باقی نہ رہا۔ شرک کے علاوہ باقی تمام گناہ قابلِ معافی ہیں، چنانچہ آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہی بات بیان فرمائی ہے۔

شرک ناقابلِ معافی ہے

ارشاد ہوتا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اُس کے ساتھ شرک کیا جائے شرک اللہ تعالیٰ کے حق میں بغاوت ہے۔ اگر مرنے سے پہلے پہلے اس دنیا میں تائب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ یقیناً معاف فرما دیگا۔ ورنہ موت کے بعد شرک کی معافی کا کوئی قانون نہیں۔ چنانچہ سورۃ مائدہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی لوگوں کو یہی تبلیغ مذکور ہے۔ "اُعۡبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیۡ وَرَبَّکُمۡ" لوگو! اللہ کی عبادت کرو، جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ "اِنَّہٗ مَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ فَقَدۡ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ الۡجَنَّۃَ وَمَاۡوٰىہُ النَّارُ" یاد رکھو! جس شخص نے اللہ کے ساتھ شرک کیا اور اسی حالت میں مر گیا، اُس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اُس کا ٹھکانا دوزخ ہو گا، ایسا شخص ابدالآباد تک جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ وہ ہمیشہ کے لیے بدبختی میں مبتلا ہو گیا دوسرے مقام پر کفار کے متعلق فرمایا "لَا تُفَتَّحُ لَہُمۡ اَبۡوَابُ السَّمَآءِ وَلَا یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّۃَ حَتّٰی یَلِجَ الۡجَمَلُ فِیۡ سَمِّ الۡخِیَاطِ" ایسے لوگوں کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھلتے حتیٰ کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے گزر جائے۔ جس طرح اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزرنا ناممکن ہے اسی طرح کافروں کے لیے رحمت کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔ کہ مشرک اور دہریہ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی جانور کو ایسے پنجرے میں بند کر دیا جائے، جس میں سوئے کے ناکے جتنا بھی سوراخ نہ ہو۔ اور اُسے کوئی چیز نظر نہ آتی ہو، اسی طرح کافروں کو بھی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ تو فرمایا!

بیشک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس بات کو کہ اُس کے ساتھ شرک کیا جائے۔
وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ اور اس کے سوا، اس کے ورے یا نیچے جس کو چاہے بخشتا ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو بغیر توبہ کے بھی معاف کر دے۔ مگر توبہ کرنے پر تو وہ بخش ہی دیتا ہے۔ مگر شرک کی معافی کا کوئی امکان نہیں۔ عام طور پر مشرک زندگی میں توبہ نہیں کرتا، لہٰذا اس کی معافی بھی معدوم ہوتی ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ گناہ کے تین دفتر ہیں۔ پہلا دفتر کفر و شرک کا ہے جس کی معافی کا کوئی امکان نہیں۔ دوسرا دفتر باقی کبائر کا ہے، جن کی معافی ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ معاف کرنا چاہے تو بڑے سے بڑا گناہ ماسوائے شرک کے معاف کر دے۔ اور گناہ کا تیسرا دفتر وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ دیے بغیر نہیں چھوڑیگا۔ یہ حقوق العباد ہیں۔ جس شخص نے کسی دوسرے کا حق تلف کیا ہوگا، اللہ تعالیٰ اُس کا حق ضرور دلائیں گے اور جب تک بندہ اپنا حق معاف نہیں کریگا، اللہ تعالیٰ بھی معاف نہیں دیں گے۔

شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ شرک صرف بتوں کی پوجا کا نام نہیں بلکہ اللہ کے مقابلے میں کسی دوسرے کا حکم مان لینا یا کسی دوسرے دین کو تسلیم کر لینا بھی شرک میں داخل ہے۔ بشیر منافق نے یہی کیا تھا۔ کہ اللہ کا حکم ماننے کی بجائے مشرکین کی بات کو تسلیم کیا۔ یہ اللہ کے حکم میں شرک ہے چنانچہ حضرت مولانا شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ جب منافق رسول کے حکم کے خلاف کر کے مشرکین سے جا ملا تو اس کی مغفرت کا کوئی امکان باقی نہ رہا۔ یہاں شرک سے مراد شرک فی الحکم ہے۔

صفات شرک

مولانا شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ نے قرآن پاک کا پہلا بامحاورہ اُردو ترجمہ آج سے تقریباً دو سو سال پہلے ۱۲۰۵ھ میں لکھا تھا۔ یہ ترجمہ آپ نے دہلی کی اکبری مسجد میں بارہ سالہ اعتکاف کے دوران کیا تھا۔ یہ اُردو کا ابتدائی زمانہ تھا مگر آپ نے

بامحاورہ ترجمہ لکھ کر دین کی بہت بڑی خدمت انجام دی۔ اکبری مسجد دہلی میں لنک ایڈورڈ روڈ پر واقع تھی جسے انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران گرادیا تھا۔ اب یہ مسجد نہیں ہے تو شاہ صاحبؒ سورۃ بقرہ کی آیت "وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ..... وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا" کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کی صفتِ مختصہ کسی دوسری ذات میں مانی جائے تو یہ شرک ہوگیا۔ مثلاً کوئی شخص یہ اعتقاد رکھے کہ فلاں شخص ہماری ہر بات کو جانتا ہے، تو وہ مشرک ہوگیا۔ کیونکہ اس نے اللہ کی صفت غیر میں مانی۔ اسی طرح قدرت تامہ خدا تعالیٰ کی صفت ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہے جو چاہے سو کرے، اس کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں۔ اگر یہی صفت کسی دوسرے میں مانے گا تو شرک کا مرتکب ہوگیا۔ مختار مطلق بھی اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے، اگر کوئی شخص غیر اللہ کو مختار مطلق جان کر کچھ طلب کرتا ہے، تو بھی مشرک ٹھہرا۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو خالق سمجھنا بھی شرک کے مترادف ہے کیونکہ خالق کوئی دوسرا نہیں اور اس بات کو دہریوں کے سوا مشرک بھی تسلیم کرتے ہیں۔ غرضیکہ شرک کی مختلف قسمیں ہیں۔ جن کے ذریعے اس قبیح فعل کا ارتکاب ہوتا ہے

عبادت میں شرک

عبادت سے مراد انتہائی درجے کی تعظیم ہے۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے۔ سجدہ اور رکوع وغیرہ عبادت ہی کے مظہر ہیں۔ اگر کوئی شخص اللہ کے علاوہ کسی دوسری ہستی کے ساتھ یہی معاملہ کریگا، تو مشرک بن جائیگا غیر اللہ کو نافع اور ضار سمجھ کر نذر و نیاز پیش کرنا بھی شرک ہے۔ کیونکہ نافع اور ضار بھی فقط خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ اپنی مخلوقات کے نفع و نقصان کا مالک صرف خدا ہے۔ کسی نبی، ولی، فرشتہ یا بزرگ کے نام کی نیاز دے گا تو مشرک بن جائے گا۔

قسم میں شرک

شرک قسم میں بھی ہوتا ہے، مسند احمد اور ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے مَنْ اَقْسَمَ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ اَشْرَكَ جس نے

غیر اللہ کے نام کی قسم اٹھائی، اس نے شرک کا ارتکاب کیا۔ محدثین کرام فرماتے ہیں کہ اگر ایسی بات روا روی میں نکل گئی تو شرک تو نہیں ہو گا مگر سخت مکروہ بات ہو گی، اور اگر ذہن میں وہی تعظیم ہے جو اللہ کے ساتھ مخصوص ہے تو قسم اٹھانے میں بھی شرک ہو گیا۔ کسی موقع پر حضرت عمرؓ نے باپ کے نام کی قسم اٹھائی، حضور نے سن کر فرمایا لَا تَحْلِفُوْا بِآبَاءِکُمْ وَلَا بِالطَّوَاغِیْتِ نہ باپ کے نام کی قسم اٹھاؤ اور نہ طاغوت کے نام کی۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد نہ میں نے خود کبھی ایسی قسم اٹھائی اور نہ کسی دوسرے کی نقل کی کہ فلاں شخص ایسی قسم اٹھاتا ہے، مجھے اس سے ایسی نفرت ہو گئی۔

بعض اوقات بسم اللہ میں بھی شرک ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص جانور ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ غیر اللہ کا نام بھی لے گا، تو شرک کا مرتکب ہو جائے گا، جیسے کوئی کہے باسم اللہ واسم محمد یا پیر دستگیر کا نام لے لے۔ ایسی صورت میں جانور مردار ہو گا اور کہنے والا مشرک۔ صحیح ذبح صرف اللہ کا نام لینے سے ہوتا ہے۔

دیگر اقسام شرک

شاہ عبد العزیزؒ اور شاہ اسحاقؒ کے شاگرد مولانا حافظ احمد الدینؒ بگا کے رہنے والے انہوں نے دلیل المشرکین کے نام سے عربی زبان میں کتاب لکھی ہے جس کا اردو ترجمہ اس فقیر نے کیا ہے۔ اور اسی ادارہ سے شائع ہوا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے شرک کی بیس ۲۰ قسمیں بیان کی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ شرک تصرف میں بھی ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ سے مخصوص تصرف کسی غیر میں مانے گا تو مشرک ہو جائے گا، خواہ یہ تصرف کسی نبی یا ولی یا پیر میں مانا جائے۔ اسی طرح مشیت میں بھی شرک ہوتا ہے۔ ایک شخص نے حضور علیہ السلام کے سامنے عرض کیا مَا شَآءَ اللّٰہُ وَشِئْتَ یعنی جو آپ چاہیں اور اللہ چاہے۔ آپ ناراض ہو گئے۔ مسند احمد کی روایت میں موجود ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اَجَعَلْتَنِیْ لِلّٰہِ نِدًّا کیا تو نے مجھے اللہ کا شریک بنا لیا ہے۔

یوں کہو، مَا شَاءَ اللّٰہُ وَحْدَہٗ جو صرف اللہ چاہے۔ ہر کام اللہ کی مشیت پر منحصر ہے۔ لہٰذا یوں مت کہو کہ اللہ چاہے اور فلاں چاہے ایسا کہنا شرک ہو گا۔

غیر اللہ کی رضا کے لیے جانور ذبح کرنے میں بھی شرک ہے۔ بعض لوگ عمارت تعمیر کرتے وقت اس کی بنیادوں میں خون گراتے ہیں، اور اس سے مقصود جنات کی نیاز ہوتی ہے تاکہ وہ کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائیں۔ آگے سورۃ انعام میں اللہ تعالیٰ نے شرک کی بہت سی قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ مجوسی ذات میں شرک کرتے ہیں اور ایک کی بجائے دو خدا مانتے ہیں۔ یہ ثنوی فرقہ ہے بعض شرک قولی ہوتے ہیں کہ انسان زبان سے شرکیہ کلمات ادا کرتا ہے۔ اور بعض فعلی شرک ہوتے ہیں۔ زبان سے تو کچھ نہیں کہا جاتا مگر عملاً نیاز دی جاتی ہے۔ چڑھاوا چڑھایا جاتا ہے، سجدہ کیا جاتا ہے۔ چادر پوشی ہوتی ہے رکوع و سجود ہوتا ہے یا طواف کیا جاتا ہے۔ یہ سب فعلی شرک ہیں۔

شرک گمراہی ہے

فرمایا وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ جس شخص نے اللہ کے ساتھ شرک کیا خواہ یہ ذات میں ہو، صفات میں ہو، نذر و نیاز میں ہو یا عبادت میں ہو، کسی طرح کا بھی شرک کیا فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا تو ایسا شخص گمراہ ہو کر دور جا پڑا۔ اس کی معافی کا کوئی قانون نہیں۔ مولانا ابو الکلام آزادؒ اس آیت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ قادر مطلق، سلطانِ محبت اور ودود ہے۔ وہ تو مخلوق سے محبت کرتا ہے، مگر مخلوق ہی بگڑ گئی ہے، جو خدا تعالیٰ سے بیزار ہو کر شرک کا ارتکاب کرتی ہے۔ اور محبت کے مقام وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ کو ضائع کرتی ہے۔ مومن کی شان تو یہ ہے "يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ" کہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں، مگر لوگ محبت کے تقاضے کو پورا نہیں کرتے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ "سلطان محبت سے امید ہے کہ وہ ہر جرم کو

معاف کر دے مگر اس کی عدالت میں دل کی تقسیم کا کوئی قانون موجود نہیں" جب کوئی شخص شرک کا ارتکاب کرتا ہے، تو اس کا دل تقسیم ہو جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے۔ "مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ" میں نے کسی سینے میں دو دل نہیں رکھے۔ عقیدہ ایک ہی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا شرک کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ یہ قبیح بیماری ہے۔

عورتوں کے نام کی دیویاں

فرمایا اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ج یہ لوگ نہیں پکارتے مگر عورتوں کو عرب کے مشرک لات، منات اور عزیٰ کی پرستش کرتے تھے، جو سب عورتوں کے نام ہیں۔ عزیٰ عزیز کی مؤنث ہے اور لات الٰہ کی مونث ہے۔ اس طرح منات منان کی مؤنث ہے۔ انہوں نے اپنے معبودوں کے زنانہ نام رکھے ہوئے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں سواع نامی بت تھا۔ یہ بھی عورت کی شکل کا تھا اور اس کا معنیٰ استقرار یا انتظام کی دیوی ہے۔ جس طرح گھر کا انتظام عورت کے ہاتھ میں ہوتا ہے اسی طرح کائنات کے نظام کے لیے۔ ہندوؤں نے وشنو دیوی بنا رکھی ہے اس کی اور بھی بہت سی دیویاں ہیں۔ ایک درگا دیوی ہے۔ ایک کالی ماتا کلکتے والی ہے جو آفتوں اور مصیبتوں کی دیوی سمجھی جاتی ہے اس کے سامنے بچوں کو ذبح کیا جاتا ہے، تاکہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو۔ اُن کے ہاں ایک سرسوتی دیوی ہے۔ اسی نام کی بہار میں ایک ندی بھی ہے۔ یہ طوفانوں اور سیلابوں کی دیوی ہے۔ لکشمی دیوی دھن دولت کی دیوی ہے۔ مال و دولت میں اضافہ کے لیے اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ یونانیوں کے ہاں زہرہ دیوی کے مندر تھے وہاں نیازیں دی جاتی تھیں۔ اس دیوی کی چوکھٹ پر دو قارورے یعنی شیشے کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں جن میں سے ایک خیر کے لیے اور دوسری شر کی طرف منسوب تھی۔ ؎

فَبِاَعْتَابِ زُفْتٍ قَارُوْرَتَانِ
ذِیْ لِلْخَیْرِ وَذِیْ لِلشَّرِّ الْھَوَانِ

عربوں میں نائلہ نامی عورت کے نام کا بت تھا۔ محدثین فرماتے ہیں کہ اساف اور نائلہ مرد اور عورت تھے جنہوں نے کعبہ میں زنا کا ارتکاب کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں مسخ کر کے پتھر بنا دیا، لوگوں نے عبرت کے لیے انہیں بیت اللہ کے سامنے رکھ دیا، پھر آہستہ آہستہ ان کی پوجا شروع ہو گئی، فتح مکہ کے موقع پر نبی علیہ السلام نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو مامور کیا کہ طائف والے جس عزیٰ دیوی کی پوجا کرتے ہیں، اس کو مٹا دو۔ آپ گئے اور دیکھا کہ وہاں کچھ درخت ہیں جو آپ نے کاٹ دیے، ایک کوٹھا تھا جسے آپ نے گرا دیا۔ وہاں پر کچھ مجاور بیٹھے تھے جو بھاگ گئے۔ واپس آکر آپ نے اس کارروائی کی رپورٹ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں پیش کی تو آپ نے فرمایا، وہاں دیوی تو ابھی زندہ ہے، دوبارہ جاکر اُسے ختم کرو۔ چنانچہ آپ دوبارہ وہاں گئے۔ تلاش کرنے پر تہ خانے سے ایک عورت برآمد ہوئی جس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ حضرت خالدؓ پر دہشت ڈالنے کے لیے اُن پر حملہ آور بھی ہوئی مگر آپ نے اپنی تلوار سے اس کا کام تمام کر دیا۔ واپس آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صورتِ حال سے آگاہ کیا تو آپ نے فرمایا، یہ عزیٰ تھی جس کی لوگ پرستش کرتے تھے۔ اب آج کے بعد اس کی پوجا نہیں ہو گی۔ غرضیکہ عورتوں کے نام پر اس قسم کی دیویاں دنیا بھر میں موجود تھیں۔

شیطان کی پوجا

فرمایا حقیقت یہ ہے وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا وہ نہیں پوجا کرتے مگر شیطان کی۔ انسان کے وہم پر شیطان غالب آکر اُس سے غیر اللہ کی پرستش کروانے لگتا ہے۔ وہ انسان کے ذہن میں ایسی باتیں ڈالتا ہے جس سے وہ نذر و نیاز دینے لگتا ہے، کہیں ندا کرتا ہے یا علی مدد، یا پیر دستگیر وغیرہ۔ گاڑیوں پر اس قسم کے کلمات لکھے ہیں" المدد یا غوث " گویا اب گاڑی کی حفاظت غوث کے ذمے واجب ہو گئی حالانکہ لکھیں یا نہ لکھیں، مدد تو ہر حالت میں اللہ ہی کرتا ہے۔ بعض موحد لوگ یا اللہ مدد بھی لکھتے ہیں۔ مدد تو کسی غیر کے اختیار میں نہیں ہے۔ غرضیکہ شیطان انسان کے

وہم پہچا کہ اس سے شرکیہ افعال کراتا ہے۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے دُعا میں سکھایا اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ الشَّیْطٰنِ وَشِرْکِہٖ اے پروردگار! میں تیری ذات کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں شیطان سے اور اس کے شرک سے۔ بہرحال یہ شرکیہ رسومات شیطان ہی سکھاتا ہے کہ چادر چڑھاؤ، اس میں یہ فائدہ ہے۔ بکرے چڑھاؤ، سجدہ کرو، غیر اللہ کی دہائی دو، وغیرہ وغیرہ۔ بعض مجسموں پر سرخ رنگ کی چادر چڑھاتے تھے، جس کا مطلب یہ ہوتا تھا۔ کہ عورت کا مجسمہ ہے اور اسے سرخ رنگ پسند ہے۔

فرمایا نہیں پکارتے مگر شیطان کو جو مَرِیْدًا سرکش ہے جو شخص غیر اللہ کی پوجا کرتا ہے، شرک جیسے قبیح فعل کا ارتکاب کرتا ہے وہ دراصل شیطان ہی کی پوجا کرتا ہے۔ اُسی کے کہنے پر چلتا ہے۔ اُس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں فرمایا لَعَنَہُ اللّٰہُ اللہ نے اُس پر لعنت بھیجی ہے۔ شیطان کو اپنی رحمت سے دُور کر دیا ہے۔

یہاں تک شرک کی بنیادی حقیقت اور اس کی مذمت بیان کی گئی ہے اس کے بعد شیطان کی کارگزاری کا ذکر ہے کہ وہ کس کس طریقے سے شرک کراتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی مختلف صورتیں بیان فرمائی ہیں۔

وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴿١١٨﴾
وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ
اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۚ
وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ
خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِينًا ﴿١١٩﴾ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا
يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُورًا ﴿١٢٠﴾ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ
جَهَنَّمُ ۙ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيصًا ﴿١٢١﴾ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَآ اَبَدًا ۖ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۚ
وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيلًا ﴿١٢٢﴾

ترجمہ :- اور کہا (شیطان نے) البتہ میں بناؤں گا تیرے
بندوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہوا ﴿١١٨﴾ اور میں ضرور اُن کو
گمراہ کروں گا اور اُن کو باطل آرزوئیں دلاؤں گا اور اُن کو
حکم دونگا پس وہ چیریں گے جانوروں کے کان اور میں اُن کو
حکم دونگا پھر وہ تبدیل کریں گے اللہ کی بنائی ہوئی چیز کو اور
جو شخص بنائے گا شیطان کو دوست اللہ کو چھوڑ کر، پس
بیشک وہ نقصان میں پڑا صریح طور پر ﴿١١٩﴾ شیطان لوگوں کو
وعدہ دیتا ہے اور باطل اُمیدیں دلاتا ہے اور نہیں وعدہ دیتا ان

کو شیطان مگر فریب کا (۱۲۰) یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے
اور نہ پائیں گے یہ اس سے کہیں بھی بھاگنے کی جگہ (۱۲۱) اور
وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے ، ہم
ضرور اُن کو داخل کریں گے ایسے باغات میں جن کے نیچے
نہریں بہتی ہیں ، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اُن میں ۔ یہ اللہ
کا سچا وعدہ ہے اور کون زیادہ سچا ہے اللہ تعالیٰ سے بات
کے اعتبار سے (۱۲۲)

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے شرک کی تردید فرمائی تھی اور ساتھ یہ بات بھی سمجھائی تھی کہ کہ جو لوگ اللہ کے علاوہ غیروں کی پرستش کرتے ہیں ۔ انہوں نے زنانہ ناموں سے دیویاں بنا رکھی ہیں اور در اصل وہ شیطان کی پوجا کرتے ہیں ۔ شیطان اُن کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے اور اُن کے تخیلات پہ غالب آکر اُن کو شرک پر آمادہ کرتا ہے حدیث شریف میں شیطان سے پناہ پکڑنے کے لیے اس دُعا کا ذکر آتا ہے ۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ الشَّیْطٰنِ وَشِرْکِہٖ اے اللہ! میں شیطان کے شر اور اس کے شرک سے تیری پناہ پکڑتا ہوں ۔ اس لفظ کو شِرک اور شَرک دونوں طرح سے پڑھا گیا ہے ۔ شَرک کا معنیٰ جال ہوتا ہے تو اگر ایسا ہے تو معنیٰ ہو گا ، اے اللہ ! میں شیطان کے جال سے پناہ مانگتا ہوں ۔ اور شِرک کا معنیٰ تو ظاہر ہے کہ شیطان لوگوں کو بہکا کر شرک میں مبتلا کرتا ہے ۔ سورۃ نحل میں موجود ہے کہ شیطان کا غلبہ اُن لوگوں پر ہوتا ہے جو اس سے دوستی کرتے ہیں " وَالَّذِیْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ " اور وہ لوگ جو اُس کے ساتھ شرک کرتے ہیں ۔ گویا شیطان ان لوگوں کے لیے شرک کا ذریعہ اور سبب بنتا ہے ۔ بہرحال یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ تمام نیکیوں کی اصل الاصول توحید ہے اور تمام برائیوں کی جڑ بنیاد شرک ہے ۔ جو شخص شرک میں مبتلا ہو گیا ، اُس کی بنیاد خراب ہو گئی اور بنیاد کی خرابی کی وجہ سے دین کی پوری عمارت

ہی بگڑ گئی۔ اسی لیے شرک کو اکبر الکبائر یعنی سب سے بڑا گناہ کہا گیا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھا دیا گیا کہ شرک کے ارتکاب میں شیطان کو بہت کچھ دخل حاصل ہے۔ چنانچہ اگلی آیت میں شیطان کی کارگزاری کا ذکر ہے کہ وہ انسانوں کو کس طریقے سے شرک اور برائی کے راستے پر ڈالتا ہے۔

شیطان بمقابلہ انسان

جب اللہ تعالیٰ نے شیطان کو حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ" تو اُس نے انکار کر دیا اور وہ کفر کرنے والوں میں ہو گیا۔ تمام فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی جب کہ شیطان اکڑ گیا اور پھر حجت بازی شروع کر دی کہ میں انسان سے افضل ہوں، اس لیے کہ "خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ" اے اللہ! تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور انسان کو مٹی سے۔ یہ تو ظاہر ہے۔ کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق شیطان کے سامنے ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کا مجسمہ بنا کر رکھا تو شیطان نے گھوم پھر کر بڑے غور سے دیکھا، انسان کا پیٹ خالی دیکھ کر شیطان نے اندازہ لگایا کہ اس خالی جگہ میں وسوسہ ڈالنے کی گنجائش موجود ہے کیونکہ ٹھوس چیز میں تو کچھ داخل نہیں ہو سکتا مگر انسانی جسم اس قابل ہے کہ اس میں ایسی ویسی چیز داخل کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے انسان کو بہکانے کا پروگرام بنا لیا۔ یہ حدیث کا مضمون ہے۔ بہر حال شیطان نے مٹی کو حقیر جانا۔ اسی سلسلے میں بشار ابن برد کا شعر ہے۔

ابلیس افضل من ابیکم آدم
فتبینوا یا معشر الاشرار

اے اشرار کے گروہ! یاد رکھو، ابلیس تمہارے جد امجد آدم علیہ السلام سے افضل ہے

النار عنصرہ و آدم طینۃ — والطین لا یسمو سمو النار

ابلیس کا عنصر آگ ہے جو افضل ہے۔ اور آدم مٹی سے اور مٹی آگ کی بلندی تو حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ شیطان کا فلسفہ ہے۔ کہ آدم مٹی ہے اور مٹی مخذول ہے۔ لہٰذا میں

بلند ہو کر ایک پست کے سامنے کیسے جھک سکتا ہوں۔ مگر شیطان کو دھوکا ہوا۔ مٹی میں عاجزی ضرور ہے مگر اس خاکی عنصر میں جو بہتری پائی جاتی ہے وہ کسی دوسرے عنصر (ELEMENT) میں نہیں پائی جاتی۔ امام ابن قیمؒ نے اپنی ایک کتاب میں پندرہ ۱۵ وجوہات بیان کی ہیں جن کی بناء پر مٹی کو آگ پر فوقیت حاصل ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ خاکی انسان میں اللہ تعالیٰ نے ایسی صلاحیت رکھی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذاتی تجلیات سے مستفید ہو سکتا ہے جب کہ ملائکہ بھی اللہ کی ذاتی تجلیات سے نہیں بلکہ اسکی صفاتی تجلیات سے ہی مستفید ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں اس قدر کمال رکھا ہے مگر شیطان نے اس کی عظمت کو نہ پہچانا، لہٰذا اللہ کی بارگاہ سے مردود اور ملعون ٹھہرا۔ اُس نے اُسی وقت سے کہ دیا "فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِیْ" تو نے مجھے گمراہ ٹھہرا دیا ہے۔

"لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ"

میں ان کے لیے دنیا کو مزین کر کے دکھاؤنگا اور ان سب کو گمراہ کروں گا۔

اور دوسری آیت میں ہے "ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ"

یعنی اے اللہ! میں تیری مخلوق کے آگے، پیچھے دائیں اور بائیں سے آؤں گا۔ یعنی ہر طرف سے آ کر گمراہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں آگے سے مراد دنیا اور پیچھے سے مراد عقبیٰ ہے اسی طرح دائیں سے مراد دین کا راستہ ہے اور بائیں سے مراد خواہشات کا راستہ ہے۔ مقصد یہ کہ میں ہر طرح سے اسے گمراہ کرنے کی کوشش کرونگا یہ بات شیطان نے قسم اٹھا کر کہی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے سمجھا دیا کہ شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے۔

بعض دوسری سورتوں میں بھی اس مضمون کی وضاحت کی گئی ہے۔ سورۃ یٰس میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مخاطب کر کے فرمایا "اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ" اے بنی آدم! کیا میں نے تم سے یہ عہد

نہیں لیا تھا کہ شیطان کی پوجا نہ کرنا، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے؟ سورۃ فاطر میں فرمایا "اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا" شیطان تمہارا دشمن ہے، لہذا اُسے دشمن ہی سمجھو۔ یہ بڑا خطرناک دشمن ہے جو نظر بھی نہیں آتا۔ نظر آنے والے دشمن سے تو بچاؤ کیا جا سکتا ہے مگر نظر نہ آنے والا زیادہ خطرناک ہوتا ہے کہ نامعلوم کس طرف سے حملہ کر دے شیطان اور اس کی ذریت تو تمہیں دیکھ رہی ہے مگر "مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَھُمْ" تم انہیں نہیں دیکھ سکتے، اللہ تعالیٰ نے ایسا غیب کا پردہ رکھ دیا ہے۔

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام مسجد میں اعتکاف فرما رہے تھے آپ کی زوجہ محترمہ حضرت صفیہؓ آپ سے ملاقات کے لیے مسجد میں آئیں کچھ دیر آپ سے باتیں ہوئیں جب واپس جانے لگیں تو حضور علیہ السلام انہیں چھوڑنے کے لیے مسجد کے دروازے تک آئے۔ سامنے سے دو آدمی آ رہے تھے، انہوں نے جلدی جلدی قدم اٹھانے شروع کیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آواز دے کر ٹھہرایا اور پوچھا تم کون ہو، وہ ٹھہر گئے اور اپنے نام بتائے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا، جان لو! یہ میری بیوی صفیہؓ ہے، کسی کام سے آئی تھی۔ انہوں نے عرض کیا حضور! ہمارے دل میں تو کوئی ایسی بات نہیں آئی فرمایا تم نہیں جانتے ان الشیطٰن یجری من الانسان مجری الدم شیطان انسان کے اندر وہاں تک گھس جاتا ہے جہاں تک خون پہنچتا ہے۔ مجھے خطرہ ہوا کہ یہ تمہارے دلوں میں کوئی وہم ڈال دے گا کہ رات کا وقت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف فرما رہے ہیں اور یہ عورت کون ہے اور کیسے آئی؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شیطان کی شیطنت سے آگاہ کر دیا کہ یہ انسان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے یہ خون کی طرح باریک سے باریک نسوں تک بھی پہنچ جاتا ہے اور پھر وسوسے ڈالتا ہے یہ ایسا خطرناک دشمن ہے۔

شیطان کا حصہ

جب اللہ تعالیٰ نے شیطان کو اپنی بارگاہ سے مردود کر دیا تو اس نے اسی وقت کہہ دیا تھا۔ "وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِکَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا" میں تیرے بندوں میں سے ایک اچھے خاصے حصے کو گمراہ کر دوں گا۔

بلکہ اکثریت میرے ساتھ ہوگی۔ اور تیرے فرمانبردار بندے اقلیت میں ہوں گے چنانچہ ابتداء سے لے کر قیامت تک لوگوں کی اکثریت شیطان کے ساتھ رہیگی۔ اس وقت بھی دنیا کی پانچ ارب کی آبادی میں سے سوا چار ارب لوگ کفر و شرک میں مبتلا ہیں اور پانچویں حصہ سے بھی کم انسان خدا تعالیٰ کی وحدانیت پر یقین رکھتے ہیں اور پھر اس تعداد میں سے بھی ٹھیک طور پر ماننے والے بہت کم لوگ ہیں۔

شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا کا مطلب یہ ہے کہ شیطان نے کہا کہ میں انسانوں کی کمائی میں سے ایک حصہ اپنے لیے ٹھہراؤں گا۔ یعنی پیداوار کا جو حصہ غیر اللہ کی نذر و نیاز میں صرف ہوگا وہ میرا حصہ ہوگا۔ سورۃ انعام میں تفصیل کے ساتھ یہ ذکر موجود ہے۔ کہ مشرکین کھیتوں کی پیداوار اور مویشیوں میں سے ایک حصہ اللہ کا ٹھہراتے تھے اور ایک حصہ اپنے شرکاء کے لیے مقرر کرتے تھے، اور ان کی نذر و نیاز کرتے تھے۔ پھر یہ بھی کہ اللہ کا حصہ ادا کرنے میں احتیاط نہیں کرتے تھے مگر غیر اللہ کی نیاز میں سے ایک دانہ کی کمی بھی برداشت نہیں کرتے تھے، اُن کا حصہ پورا پورا ادا کرتے تھے اور کہتے تھے "هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا" گویا ان مشرکوں کے گمان کے مطابق یہ حصہ اللہ کا ہے اور یہ ان کے شریکوں کا۔

آج بھی لوگ شرکیہ رسومات بڑے اہتمام سے ادا کرتے ہیں، فرائض سنن اور نوافل عبادات کی چنداں پروا نہیں کرتے، زکوٰۃ و صدقات کا فکر نہیں کرتے مگر گیارھویں بڑے اہتمام سے دیتے ہیں۔ یہ وہی ذہنیت کارفرما ہے تو شیطان نے یہی کیا ہے۔ کہ انسان کی کمائی میں سے میں ایک حصہ اپنے لیے ٹھہرا لیتا ہوں۔ تو گویا نذر و نیاز میں بھی شرک ہوتا ہے۔ اللہ کے علاوہ غیروں کے تقرب اور خوشنودی کے لیے جو نیاز دی جاتی ہے وہ فعلی شرک ہوتا ہے کسی قبر والے، کسی بزرگ، پیر، جن یا فرشتے کو نافع اور ضار سمجھ کر اس کے نام

کی جو نذر و نیاز دی جاتی ہے، وہ شیطان کا حصہ ہے۔ انسان سمجھتا ہے کہ اگر غیراللہ کا حصہ نہ نکالا تو نقصان ہو جائیگا، فصل ٹھیک نہیں پکے گی، پھل پورا نہیں آئے گا یا گائے بھینس کے دودھ میں برکت نہیں ہوگی، اس قسم کا اعتقاد ہی شرکیہ عقیدہ ہے۔

شیطانی فلسفہ

شیطان نے اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ بھی کہا وَلَاُضِلَّنَّهُمْ میں انہیں گمراہ کروں گا، تیرے بندوں کو بہکاؤں گا وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ اُن کو باطل آرزوئیں دلاؤں گا۔ شیطان نے ہر شرکیہ فعل کا کوئی نہ کوئی فلسفہ بنا رکھا ہے جس کی بنیاد پر وہ انسانوں کو ورغلاتا ہے۔ اُن کے اذہان میں ڈالتا ہے کہ یہ رسم ادا کر لو، تو تمہاری بڑی عزت ہوگی۔ گنبد بنا لو، جلوس نکالو، جھنڈیاں لگاؤ، تمہارا نام ہوگا، لوگ تمہیں یاد رکھیں گے۔ طرح طرح کی باتیں بتا کر انہیں غلط راستے پر چلاتا ہے۔ جب کوئی آدمی کوئی الٹا سیدھا کام کرنے لگتا ہے تو پھر اس کے لیے جواز بھی خود ہی ڈھونڈ لیتا ہے۔ ایک بڑا تعلیم یافتہ آدمی جو ہندوستان کا وزیرِ اعظم بھی رہا ہے، صبح اٹھ کر اپنا پیشاب پیتا ہے۔ اور اس کے لیے اس نے یہ فلسفہ گھڑا ہے کہ اس سے اُسے صحت حاصل ہوتی ہے۔ حالانکہ پیشاب ہضم کا فضلہ اور گندی چیز ہے، میڈیکل سائنس والے، یونانی طبیب اور ایلوپیتھک والے سب کے سب پیشاب کو مضرِ صحت بتاتے ہیں مگر پینے والے کا اپنا فلسفہ ہے۔

جلال الدین اکبر ہندوستان کا بادشاہ تھا اور اس نے بھی ایک فلسفہ گھڑا تھا وہ صاحبِ علم نہیں تھا مگر ذہین تھا۔ سفر کے دوران پیدا ہوا۔ بارہ تیرہ سال گردشِ زمانہ کا شکار رہا، اس لیے تعلیم حاصل نہ کر سکا، ملا مبارک اور اس کے بیٹے ابوالفضل اور فیضی اس کے مشیر تھے۔ یہ گمراہ مولوی تھے۔ اکبر ان کے اشارے پر چلتا تھا۔ آخر گمراہی میں پڑ گیا اپنے آپ کو خدا اور رسول سمجھتا تھا۔ نیا دین ایجاد کیا۔ داڑھی منڈوانے کا فلسفہ جواریوں نے یہ سمجھایا کہ یہ فوطوں

کی رطوبت کو جذب کر لیتی ہے جس سے قوتِ مردمی گھٹ جاتی ہے، لہٰذا داڑھی نہیں رکھنی چاہیئے۔ یہ شیطانی فلسفہ تھا، طب کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں مگر شیطان نے اس طرف لگا دیا۔ بادشاہ نے داڑھی صاف کرائی تو باقی لوگ بھی ایسا ہی کرنے لگے۔

غیر اللہ کے ساتھ نسبت

انسان کی گمراہی کے لیے شیطان نے یہ منصوبہ بھی بنایا وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ میں انہیں جانوروں کے کان کاٹنے کا حکم کرونگا۔ زمانہ جاہلیت میں بھی جانوروں کے کان چھید کر انہیں آزاد کر دیا جاتا تھا۔ اُسے کسی بت کے نام پر منسوب کر دیا جاتا اور اس کا دودھ وغیرہ استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ اگلی سورۃ میں اسی ضمن میں بحیرہ کا لفظ آئیگا۔ تو یہ شیطان نے اللہ کے حضور اُسی وقت کہہ دیا تھا کہ تیرے بندوں کو اس طریقے سے بھی گمراہ کروں گا کہ وہ جانوروں کو غیر اللہ کے نام سے منسوب کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہوتا رہا۔ آج بھی لوگ سر کے اگلے یا پچھلے حصے میں کسی بزرگ کے نام کی چوٹی رکھتے ہیں۔ کوئی ہاتھ یا پاؤں میں کسی بزرگ کی نشانی کے طور پر لوہے کا کڑا ڈال لیتا ہے۔ کہ یہ فلاں بزرگ نے دیا تھا۔

تغیرِ فطرت

شیطان نے یہ بھی کہا وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ میں انہیں حکم دوں گا یعنی ورغلاؤں گا اور وہ اللہ کی بنائی ہوئی چیز کو تبدیل کریں گے فطرت کی تبدیلی میں بھی شیطانی فلسفہ کارفرما ہے، جس سے وہ لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔ ملوکیت کے زمانے میں بادشاہ جن لوگوں کو گھر میں رکھتے تھے انہیں خصی بنا دیتے تھے۔ یہ فطرت کی تبدیلی اور حرام ہے۔ اسی طرح لواطت بھی غیر فطری چیز ہے مگر شیطان اس پر بھی آمادہ کرتا ہے۔ عورتوں کا آپس میں جنسی التفات بھی شیطانی امور سے ہے۔ اسی طرح جانوروں کے ساتھ غیر فطری فعل ہے۔ آج سے تیس سال پہلے اخبار میں پڑھا تھا، کہ ڈنمارک کے ایک چھبیس ۲۶ سالہ نوجوان نے جنس تبدیل کرنے کے لیے کئی اپریشن

کرائے، کم وبیش دو ہزار انجکشن لگوائے اور آخر کار وہ مرد سے عورت بننے میں کامیاب ہو گیا۔ بعض عورتوں کو مرد بننے کا خبط ہوتا ہے۔ یہ سب غیر فطری باتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان مردوں اور عورتوں پر لعنت بھیجی ہے جو ایک دوسرے کی وضع قطع، چال ڈھال، لباس اور سٹائل اپناتے ہیں۔ لَعَنَ اللّٰہُ الْمُتَشَبِّهِیْنَ بِالنِّسَآءِ وَالْمُتَشَبِّهَاتِ بِالرِّجَالِ مردوں پر خدا کی لعنت ہو کہ وہ عورتوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں۔ اور وہ عورتیں ملعون ہیں جو مردوں کا سٹائل اپناتی ہیں۔ امام رازیؒ داڑھی منڈوانے کو بھی اسی میں شمار کرتے ہیں۔ عورت کا سر کے بال منڈوانا اور مرد کا داڑھی منڈوانا ایک ہی قبیل سے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان کہ یہود، ہنود اور مجوس کے ساتھ مشابہت نہ رکھو۔ ڈاڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں کٹواؤ۔ مگر شیطان نے الٹا سبق سکھلایا ہے۔ اب ڈاڑھی منڈائی جاتی ہے اور مونچھیں بڑھائی جاتی ہیں حضور علیہ السلام نے فرمایا لَعَنَ اللّٰہُ الْوَاصِلَةَ وَالْمُسْتَوْصِلَةَ جو عورت اپنے سر کے بال دوسری عورت کو دیتی ہے تاکہ اس کے بال بھی لمبے نظر آئیں، اللہ نے دونوں پر لعنت بھیجی ہے، سرمہ، کنگھی، ریشمی پراندہ وغیرہ تو جائز ہیں۔ عورتوں کو رنگین اور منقش لباس پہننا بھی درست ہے، مگر غیر فطری زیبائش کی اجازت نہیں۔ اسی طرح بالوں کو چن کر باریک ابرو بنانا، اس پر بھی لعنت کی گئی ہے دانتوں کے درمیان مصنوعی فاصلہ بنانا، ہاتھوں، پاؤں، ٹانگوں یا پیشانی پر نقش ونگار بنانا سب غیر فطری چیزیں ہیں۔ یہی تغیر فطرت ہے، شیطان نے کہا تھا کہ اے اللہ! میں تیرے بندوں کو ورغلا کر ایسی چیزوں پر آمادہ کروں گا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ ہر مولود فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی یا مشرک بنا دیتے ہیں، جس قسم کا ماحول ہوتا ہے، اس کے مطابق انسان ڈھل جاتا ہے۔ جب کوئی شخص

اپنی فطرتِ سلیمہ سے ہٹ گیا تو اس کی فطرت میں تغیر آگیا۔ اللہ تعالیٰ کے احکام میں تبدیلی بھی تغیرِ فطرت ہے۔ حلال کو حرام یا حرام کو حلال قرار دینا فطرت کو تبدیل کرنے کے مترادف ہے۔ بعض مشرک لوگ اللہ کے حلال کردہ جانوروں کو حرام قرار دیتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ کس دین اور شریعت سے انہیں حرام کیا ہے؟ اسی طرح شرک کی تمام قسمیں خلافِ فطرت ہیں یہ احکام کو بگاڑنے کے مترادف ہے۔ انسانی فطرت تو یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لائے مگر مشرک لوگ شرک کا ارتکاب کر کے انسانی فطرت کو تبدیل کر دیتے ہیں، یہی وہ تغیرِ فطرت ہے جس کا اعلان شیطان نے روزِ اول کیا تھا کہ وہ انسانوں کو گمراہ کر کے اس پر آمادہ کریگا۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ فرماتے ہیں۔ کہ دیکھو شیطان نے کس طرح کہا کہ جو لوگ میرے حصے میں آئیں گے، میں انہیں طریقِ حق سے گمراہ کروں گا۔ انہیں دنیا کی خواہشات کا گرویدہ بنا دوں گا اور روزِ قیامت اور جزا سزا سے بے نیاز کر دوں گا۔ میں لوگوں کو اس بات کی تعلیم دوں گا کہ وہ جانوروں کو کاٹ چیر کر غیر اللہ کی طرف منسوب کریں اور انہیں معبودانِ باطلہ کے نام پر چھوڑ دیں۔ میں انہیں اس بات پر بھی آمادہ کروں گا کہ وہ فطرت کو بدل ڈالیں اللہ کی پیدا کی ہوئی صورتوں میں تغیر و تبدل کریں، غیر اللہ کی نشانی کے طور پر کڑا وغیرہ پہنیں اور سر پہ چوٹی رکھیں۔ میں لوگوں کو غلط ملط آرزوئیں دلاؤں گا جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو پس پشت ڈال دیں گے اور میرے پیچھے لگ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جو کوئی شیطان کا اتباع کریگا، وہ اس کے حصے میں آگیا۔

شیطان کی دوستی

فرمایا وَمَن يَتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّن دُونِ اللّٰهِ جس نے اللہ کے علاوہ شیطان کو دوست بنایا فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا بیشک وہ صریح خسارے میں جا پڑا۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کی عاقبت خراب

ہوگئی۔ وہ ابد الآباد تک جہنم میں رہے گا اور وہاں سے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی
فرمایا یَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ شیطان انہیں جھوٹے وعدے اور جھوٹی
آرزوئیں دلاتا ہے۔ وہ گناہ کو مزین کر کے دکھاتا ہے۔ کہ اس میں بڑا فائدہ ہے
اُسے اختیار کر لو۔ کفر، شرک، بدعات اور غلط رسومات کی ترغیب دے کر انہیں
اپنا دوست بناتا ہے۔ فرمایا وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا
شیطان تو انہیں محض دھوکے اور فریب کا وعدہ دیتا ہے وہ جو کچھ لوگوں
کو دکھاتا ہے، سب سراب ہوتا ہے۔ جب انسان آخرت میں پہنچے گا،
تو پتہ چلے گا، کہ اس کے اعمال میں کچھ بھی نہیں۔ وہ جو کچھ کرتا رہا، شیطان
کے بہکاوے میں آ کر کرتا رہا اور اللہ کے پاس ایسے اعمال کا کچھ اجر نہیں
اس دھوکے کا نتیجہ یہ ہوگا اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ایسے لوگوں
کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا پھر جہنم سے خلاصی
کی کوئی جگہ نہ پائیں گے۔ شیطان کی دوستی کرنے والوں کے لیے جہنم سے
رہائی کی کوئی صورت نہیں ہوگی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اُس میں رہیں گے۔

جماعتِ حقہ کے لیے انعام

شیطانی گروہ کے بالمقابل اللہ تعالیٰ نے جماعت حقہ کا ذکر بھی فرمایا ہے
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت
اس کے رسولوں، کتابوں، ملائکہ، جنت، دوزخ اور اس کی نازل کردہ شریعت
پر ایمان لائے اور ساتھ ساتھ اچھے اعمال منجملہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، خیرات
جہاد، انسانی ہمدردی وغیرہ بھی انجام دیے۔ فرمایا یہی جماعت حقہ ہے۔
سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ ہم انہیں ایسے باغوں میں داخل کریں گے
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ جن کے سامنے نہریں بہتی ہونگی۔
خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا وہ ان باغات میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور وہاں
سے کبھی نکالے نہیں جائیں گے۔ فرمایا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا یہ اللہ تعالیٰ
کا پکا سچا وعدہ ہے۔ کہ نیک اعمال کرنے والا اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت

پہ ایمان لانے والا جنت میں داخل ہوگا۔ اور کفر و شرک کا مرتکب جہنم میں جائیگا۔
وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ
سچی بات کس کی ہوسکتی ہے وہ احکم الحاکمین ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ اللہ کے
وعدے پر یقین کرتے ہوئے ایمان، توحید اور نیکی کو اختیار کرے تاکہ اُسے
ہمیشہ کے لیے فلاح حاصل ہو جائے۔ اور اللہ نے جن باتوں سے منع کیا ہے
انہیں نقصان کا باعث کہا ہے اُن سے باز آجائے۔ اور اللہ کے سچے
وعدے کے مطابق اپنا ٹھکانا بہشت میں بنالے۔

لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَآ أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ
سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا
نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ
أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ
وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾ وَمَنْ أَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ
أَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرٰهِيْمَ
حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ إِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾ وَلِلّٰهِ
مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ
۱۸ ع ۱۱ ۱۵ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾ ع

ترجمہ: نہیں ہے تمہاری آرزوؤں کے ساتھ اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں کے ساتھ بلکہ جو شخص بُرا عمل کریگا اس کو بدلہ دیا جائے گا اس کا، اور نہ پائے گا وہ اپنے لیے اللہ کے سوا کسی کو کار ساز اور نہ کوئی مددگار ﴿۱۲۳﴾ اور جو شخص بھی عمل کریگا نیک اعمال میں سے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ ایمان رکھتا ہو، پس یہی لوگ داخل ہوں گے جنت میں اور نہیں ظلم کیا جائے گا اُن پر ایک تِل کے برابر بھی ﴿۱۲۴﴾ اور کون شخص زیادہ بہتر ہے دین کے اعتبار سے اُس شخص سے جس نے تابع کر دیا ہے

اپنے چہرے کو اللہ کے لیے اور وہ نیکی کرنے والا ہے اور اُس نے تابعداری کی ہے ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی، جو حنیف تھے اور بنا لیا اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل (۱۲۵) اور اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز کو گھیرنے والا ہے (۱۲۶)

ربطِ آیات — گذشتہ درس میں شرک کی مذمت اور شیطان کی دشمنی، کارگزاری اور بہکاوے کے مختلف طریقوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ شرک تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ اور شیطان انسان کو گمراہ کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتا ہے۔ شیطان کے اتباع میں شرک کرنے والے لوگ دائمی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ اس سے پہلے منافقین اور اُن کی حمایت کرنے والوں کی مذمت بھی بیان ہو چکی ہے اہلِ کتاب گمراہ ہو کر غلط راستے پر چل نکلے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو بھی متنبہ کیا کہ اگر اُن میں بھی اہلِ کتاب جیسی خرابیاں پیدا ہو گئیں تو وہ بھی ناکام رہیں گے۔ اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ کسی جماعت یا فرقے کے ساتھ خالی نسبت کچھ کام نہ آئیگی بلکہ اصل چیز نیک اعمال ہیں، جو ان کو انجام دیگا وہ کامیاب ہو گا۔

خالی نسبت — ارشاد ہوتا ہے لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ اے اہل ایمان! کامیابی کا دار و مدار تمہاری ارزوں پر نہیں ہے۔ تمہاری خواہش کا پورا ہونا ضروری نہیں ہے وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ اور نہ اہل کتاب کی تمناؤں پر نیکی یا بدی کا انحصار ہے۔ کہ جیسا وہ آرزو کرتے ہیں، ویسا ہی ہو گا۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جزا اور سزا کا مدار اچھے اور بُرے کام پر ہے مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا جو کوئی بُرا عمل کریگا يُّجْزَ بِهٖ اُسے اس کا بدلہ ضرور ملے گا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے کوئی شخص اُسکی پکڑ سے بچ نہیں سکتا بلکہ اُسے برائی کا صلہ ضرور ملے گا۔ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا پھر وہ اپنے لیے اللہ کے سوا کوئی کارساز اور مددگار نہیں پائے گا۔ لہٰذا قانون یہی ہے کہ جب تک

حقیقت موجود نہ ہو محض خالی نسبت قطعاً مفید نہیں ہو سکتی۔

یہود و ہنود کا گمان

یہودی اپنی نسبت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف کرتے ہیں مگر وہ نہ تورات پر عمل کرتے ہیں اور نہ ہی موسیٰ علیہ السلام کی لائی ہوئی شریعت پر۔ انہوں نے تو الٹا کتاب و شریعت کو بگاڑ دیا ہے، ان میں تحریف کے مرتکب ہوئے ہیں اور اب اُن کی خالی خولی آرزوئیں ہی رہ گئی ہیں کہ "لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى" یعنی جنت میں جانے کا حق اسی کو ہے جو یہودی ہے یا عیسائی ہے۔ یہودی کہتے ہیں ہمارے بغیر جنت میں کوئی نہیں داخل ہو سکتا اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہ ہمارا حق ہے بعض یہودی یہ بھی کہتے تھے کہ اگر ہم دوزخ میں گئے بھی تو صرف اتنے دِن جتنے دنوں ہمارے بڑوں نے بچھڑے کی پوجا کی تھی یعنی چالیس دن۔ اور دوسری بات یہ کہ ہم نبیوں کی اولاد ہیں۔ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہما السلام کے خاندان سے ہیں اس لیے "نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ" ہم اللہ کے فرزند اور اس کے محبوب ہیں، ہم جو چاہیں کرتے پھریں، ہم سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی اور نہ ہمیں کوئی سزا ملیگی۔ ہم تو جنت کے ٹھیکیدار ہیں۔ اللہ نے جنت ہمارے لیے ہی تیار کی ہے۔ یہی ان کا زعم باطل تھا

ہنود کا بھی یہی حال ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ برہمن اللہ کے گھر اور نجات کے مالک ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو چار قوموں میں تقسیم کر لیا ہے یعنی برہمن کشتری، دلیش اور شودر۔ وہ کہتے ہیں کہ نجات یافتہ یہی چار قومیں ہیں، باقی سب ملیچھ یعنی نجس ہیں اور اِن کو کبھی نجات حاصل نہیں ہوگی۔ غرضیکہ ہندو بھی اسی نادانی کا شکار ہیں۔

نصاریٰ کی خوش فہمی

اُدھر نصاریٰ بھی اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ جنت صرف انہی کے لیے ہے۔ وہ بھی اپنے آپ کو انبیاء کی اولاد اور اللہ کے محبوب تصور کرتے ہیں۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اپنی نسبت تو جوڑتے ہیں مگر نہ اُن کی

انجیل پر عمل ہے اور اُن کی شریعت پر۔ وہ بھی اللہ کی کتاب میں تحریف کے مرتکب ہوئے۔ عیسائی ایک مزید خوش فہمی کا شکار ہیں، کہتے ہیں کہ عیسٰی علیہ السلام نے صلیب پر چڑھ کر ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے، اب ہم کچھ بھی کرتے پھریں، ہم سے مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ یہ سب اُن کی آرزوئیں اور خام خیالیاں ہیں جنہیں سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ حالانکہ نجات کا دارو مدار اس خالی نسبت سے نہیں بلکہ ایمان اور اعمال صالحہ پر ہے۔

مسلمان فرقے

حضرت مولانا شاہ عبدالقادرؒ نے اپنے ترجمہ قرآن پاک کے حاشیے میں ایک فقرہ لکھا ہے کہ جس طرح یہود و نصاریٰ انبیاء کے ساتھ نسبت کی بنا پر خوش فہمی میں مبتلا ہیں اسی طرح اکثر مسلمان بھی اسی زعم میں مبتلا ہیں کہ ہم افضل الانبیاء حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں۔ لہٰذا ہم کچھ بھی کریں حضور علیہ السلام ہماری سفارش کر کے ہمیں جنت میں لے جائیں گے اور پھر مسلمانوں میں جو چھوٹے چھوٹے فرقے اور گروہ ہیں، اُن میں سے ہر ایک محض اس لیے جنت کا دعویدار ہے کہ وہ فلاں فرقے یا گروہ کا رکن ہے۔ شیعہ حضرات کا ایمان یہ ہے کہ امام حسینؓ کے ساتھ نسبت ہی مدار فلاح ہے۔ محرم میں ماتمی لباس پہن لیا، تعزیہ نکال دیا مجلس کرا دی، ماتم کر لیا تو بس نجات حاصل ہو گئی۔ علیٰ ہذا القیاس دوسرے فرقے بھی اس قسم کا دعویٰ کرتے ہیں اس کے بعد جو چھوٹے چھوٹے گروہ ہیں جیسے چشتی، قادری، نقشبندی اور سہروردی سب اسی قسم کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ حنفی، بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث بھی محض اپنے اپنے فرقہ سے منسلک ہونے کی بنا پر جنت میں جانا چاہتے ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک فرقہ اپنے سوا کسی دوسرے کی نجات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اصول کے طور پر یہ بات سمجھا دی کہ محض نسبت سے کبھی فائدہ نہیں ہوگا جب تک کہ ایمان اور نیکی کی حقیقت موجود نہ ہو ایک شخص چشتی کہلاتا ہے، اپنے نام کے ساتھ بڑے بڑے القاب لکھتا ہے

مگر مشائخ اہل چشت کا اتباع نہیں کرتا تو اُسے خالی نسبت کیا فائدہ دیگی۔ نقشبندی حضرات بھی بڑے کاملین بزرگ تھے مگر ان کے نام لیوا اُن کے رستہ پہ کہاں تک چل رہے ہیں اب گور پرستی، عرس بازی، قوالی اور رسومات باطلہ کا نام قادریت رکھ دیا گیا ہے، جب تک شیخ عبدالقادر جیلانی رح کے طریقے پر نہیں چلیں گے، محض نام قادری رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح شہاب الدین سہروردیؒ کے طریقے پہ چلنا کامل درجے کا اخلاص اور اتباعِ شریعت وسنت ہے۔ مگر اِن کے نام لیوا اپنے دعوی میں کہاں تک سچے ہیں۔ غرضیکہ عمل کے بغیر خالی نسبت محض خام خیالی ہے

خاندانی تفوق

یہودیوں میں خاندانی تفوق کا زعم تھا۔ اُن کا دعوی تھا کہ ان کے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام دوزخ کے دروازے پر کھڑے ہوں گے اور کسی ختنہ شدہ اسرائیلی کو دوزخ میں نہیں جانے دیں گے اس قسم کی خاندانی نسبت بعض مسلمانوں میں بھی پائی جاتی ہے بعض لوگ سادات کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں۔ اور بعض دیگر بزرگوں کی طرف علالانکہ خالی نسبت کچھ کام نہ آئے گی، گولڑا شریف والے بزرگ خود سادات خاندان سے تعلق رکھتے ہیں مگر انہوں نے یہ عجیب وغریب مسئلہ بیان کر دیا کہ کسی سیّد زادی کا نکاح امتی کے ساتھ نہیں ہو سکتا، حالانکہ یہ سو فیصد غلط مسئلہ ہے۔ اسی طرح بعض لوگ پیرزادے اور بزرگ زادے ہونے کی بنا پر اپنا تفوق جتلاتے ہیں اور دعوی کرتے ہیں کہ وہ کچھ بھی کرتے رہیں، بزرگ اُن کا ہاتھ پکڑ کر جنت میں داخل کر دیں گے، یہ سب لوگوں کی آرزوئیں اور خواہشات ہیں، حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ جب تک کوئی شخص اللہ اور اس کے رسول کے احکام پہ نہیں چلے گا۔ خالی نسبت سے کام نہیں چلے گا۔

یہودی ہوں یا نصرانی یا نادان مسلمان اس قسم کے تصورات محض خام خیالی ہے۔ کوئی شخص اپنے آپ کو سو مرتبہ حنفی کہے، جب تک امام ابو حنیفہؒ اور اُن

کے شاگردان رشید کے طریقے پر نہیں چلے گا، اس کا دعویٰ باطل ہے کوئی لاکھ اہلحدیث یا سلفی ہونے کا دعویٰ کرے جب تک محدثین کے نقش قدم پر نہیں چلتا، اہل حدیث نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی شافعی ہونے کا دعویدار ہے یا مالکی اور حنبلی کہلاتا ہے۔ تو اُسے اپنے عمل کے ذریعے اپنے دعویٰ کا ثبوت پیش کرنا ہوگا، ورنہ یہ خالی نسبتیں کسی کام نہ آئیں گی۔

اس نسبت کو ذرا وسیع کریں تو کئی لوگ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے گرویدہ نظر آئیں گے، وہ اُن کے نام پر ہی پل رہے ہیں۔ بعض مسٹر محمد علی جناح مرحوم کے نام لیوا ہیں۔ اُن کا نام تو بڑے زور شور سے لیتے ہیں مگر طور طریقہ اُن کے خلاف ہے۔ نہ اُن ہستیوں جیسا خلوص ہے، نہ عمل اور نہ بے غرضی، مگر نام لے کر زندہ ہیں۔ بعض لوگ شاہ اسماعیل شہیدؒ کا نام بڑی عقیدت سے لیتے ہیں، اُن کے نام پہ کانفرنسیں کرتے ہیں مگر اپنا عمل اُن سے مطابقت نہیں رکھتا۔ غرض یہ سب جھوٹے دعاوی اور آرزوئیں ہیں جن کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مدارِ فلاح نہ تمہاری تمناؤں پہ ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پہ، بلکہ جو کوئی برائی کا ارتکاب کریگا اُسے اُس کا بدلہ ضرور دیا جائیگا۔

شاہ ولی اللہؒ کا فلسفہ

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا قانون یہ ہے۔ لَا يَدَعُ عَاصِيًا وہ کسی مجرم کو دنیا اور آخرت میں سزا دیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ دنیا کی سزا اسباب کو معطل کیے بغیر دی جاتی ہے یعنی دنیا میں اسباب کے دوران ہی سزا دی جاتی ہے۔ اور پھر اگلے جہان میں جب اسباب کا سلسلہ منقطع ہو جائیگا تو پھر قطعی اور اٹل سزا ملیگی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ بات سمجھا دی ہے۔ کہ خالی نسبت قطعاً مفید نہیں ہوگی۔ نجات کا دارومدار عمل پہ ہے لہٰذا جو کوئی برا عمل کریگا اُس کا بدلہ پائیگا۔

نیکی کی جزا

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ اور جو کوئی اچھا عمل کرے گا۔ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى خواہ وہ مرد ہو یا عورت وَهُوَ مُؤْمِنٌ بشرطیکہ وہ مومن ہو، کیونکہ ایمان ہی اصل الاصول ہے۔ نیکیوں کی جڑ اور بنیاد ایمان ہے

اگر نیکی کے ساتھ اعمال صالحہ انجام دیتا ہے فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ
تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا
اور اُن کے ساتھ ایک تل کے برابر بھی زیادتی نہیں کی جائیگی۔ بات وہی ہے
کہ نجات کا مدار نیکی، ایمان اور عمل پر ہے۔

اس آیت کریمہ میں جزائے عمل کے سلسلہ میں مردوں اور عورتوں کو یکساں حیثیت دی گئی ہے۔ شریعت کے احکام محض مردوں کے لیے نہیں بلکہ عورتوں پر اُسی طرح لازم ہیں، لہٰذا شریعت اور قانون سب کے لیے یکساں ہے اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔ البتہ مرد و زن کے دائرہ کار میں اللہ تعالیٰ نے فرق رکھا ہے۔ عورتیں اپنے فرائض گھر کے اندر انجام دینے کی پابند ہیں جب کہ مرد باہر کے امور سے عہدہ برا ہوتے ہیں۔ باقی فرائض، واجبات وغیرہ جس طرح مرد پر لاگو ہیں اسی طرح عورت بھی اُنکی مکلف ہے۔

بہترین دین

اس کے بعد فرمایا وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ اُس شخص سے اچھا دین کس کا ہو سکتا ہے، جس نے اپنے چہرے کو اللہ تعالیٰ کے تابع کر دیا۔ چہرہ چونکہ انسانی جسم میں معزز ترین حصہ ہوتا ہے اس لیے چہرہ کا نام لیا گیا ہے۔ تاہم اس سے مراد پورا جسم انسانی ہے۔ اور مقصد یہ ہے کہ انسان مکمل طور پر اللہ کی رضا کے تابع ہو جائے اور اپنے آپ کو ہمہ تن خدا تعالیٰ کی طرف جھکا دے۔ چہرے کو تابع کرنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسان میں غایت درجے کا اخلاص پایا جائے۔ اور اخلاص کا معنی یہ ہے کہ بندہ ہر کام خدا تعالےٰ کی رضا کے لیے انجام دے اور رضائے الٰہی سے مراد یہ ہے کہ اس کا عقیدہ پاک ہو۔ خدا کی وحدانیت پر صحیح ایمان ہو گا تو اخلاص بھی پیدا ہو گا۔ اخلاص اور توحید کے مسائل حوامیم میں سمجھائے گئے ہیں۔ "فَاعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" کا کیا مطلب ہے؟ یعنی خالص اُسی وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرو

اس میں کسی قولی فعلی شرک کی ملاوٹ نہیں ہونی چاہیے اخلاص توحید سے آتا ہے اگر اخلاص نہیں ہوگا تو نہ عبادت قبول ہے اور نہ فلاح نصیب ہوگی۔

فرمایا۔ بہترین دین کی ایک صفت تو اخلاص ہے اور دوسری وَھُوَ مُحْسِنٌ انسان نیکی کرنے والا ہو اور محسن کا مطلب یہ بھی ہے کہ عامل کا طریق کار درست ہو۔ جب تک عمل حضور علیہ السلام کی سنت اور شریعت کے مطابق نہیں ہوگا۔ مقبول نہیں ہوگا ——— کیونکہ ارشاد مبارک ہے مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَیْسَ عَلَیْہِ اَمْرُنَا فَھُوَ رَدٌّ یعنی جو عمل ہمارے طریقے کے مطابق نہیں وہ مردود ہے۔

اتباع ملتِ ابراہیم خلیل اللہ

فرمایا بہترین دیندار وہ ہے جس میں اخلاص پایا جائے اور اس کا عمل سنت نبوی کے مطابق ہو۔ اور تیسری چیز یہ کہ وَاتَّبَعَ مِلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا وہ ملّتِ ابراہیمی کا پیروکار ہو۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صفت یہ ہے کہ وہ حنیف یعنی ہر طرف سے کٹ کر ایک طرف لگنے والے ہیں۔ حنیف وہ ہے، جو اللہ کی توحید پر ایمان رکھتا ہے، نماز میں خانہ کعبہ کی طرف رُخ کرتا ہے۔ ختنہ کرتا ہے، قربانی کرتا ہے اور شرک سے بیزار ہے۔ یہ تمام صفات ابراہیم علیہ السلام میں پائی جاتی تھیں، اس لیے اللہ نے اُن کی مّلت کے اتباع کا حکم دیا اور فرمایا" وَمَآ اُمِرُوْآ اِلاَّ لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ ۵ حُنَفَآءَ" اور ان لوگوں کو یہی حکم دیا گیا کہ وہ خالص اللہ کی عبادت کریں۔ اور حنیف بن جائیں۔ حنفاء کا معنیٰ ہے حُنَفَآءَ لِلّٰہِ غَیْرَ مُشْرِکِیْنَ بِہٖ یعنی سب کے سب حنیف بن جاؤ اور شرک کرنے والے نہ بنو اللہ نے یہی بات تمام انبیاء کی زبان کے ذریعے تمام لوگوں تک پہنچائی کہ عبادت خالص اللہ کی کرو۔ غرضیکہ ابراہیم علیہ السلام سب سے بڑے موحد اور حنیف تھے لہٰذا اللہ نے اُن کی ملت کی پیروی کا حکم دیا۔

ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حنیفیت کا ثمرہ یہ دیا

وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبْرٰھِیْمَ خَلِیْلًا کہ انہیں اپنا خلیل بنا لیا اور خلیل کا معنیٰ دوست ہے۔ اور فلاح اُس کو نصیب ہوگی جو یا تو خود خلیل ہو جیسے ابراہیم علیہ السلام یا پھر خلیل کے طریقے پر ہو۔ اسی لیے ملّتِ ابراہیمی کے اتباع کا حکم دیا گیا مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اِتَّخَذَ اللّٰہُ صَاحِبَکُمْ خَلِیْلًا اللہ نے تمہارے صاحب یعنی خود مجھے اپنا خلیل بنا لیا ہے اور ترمذی شریف میں حبیب کا لفظ بھی آتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا یاد رکھو! میں کہتا ہوں کہ میں اللہ کا حبیب ہوں۔ میں یہ فخر سے نہیں کہتا، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اس نے مجھے اپنا حبیب یعنی پیارا بنایا۔

یہاں پر خلت دو معنوں میں استعمال ہوئی ہے۔ اس کا عام فہم معنیٰ تو دوستی ہے جس کا تعلق دل کی انتہائی محبت کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام اس لحاظ سے خلیل ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ سے غایت درجہ کی محبت تھی۔ جس کی وجہ سے وہ تعمیل حکم میں ہمیشہ مستعد رہتے تھے۔ اور خلیل کا دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ آپ نے اپنی کسی حاجت کو اللہ کے سوا کسی دوسرے کے سامنے پیش نہیں کیا۔ چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ جب آپؑ کو آگ میں ڈالا جا رہا تھا تو امتحان کے لیے فرشتے آئے اور عرض کیا، کہ ضرورت ہو تو ہم آپ کی مدد کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے صاف فرما دیا، کہ مجھے اللہ کے سوا کسی کی مدد درکار نہیں۔ فرشتے نے کہا، پھر اللہ ہی سے مدد کے لیے دُعا کریں، تو آپؑ نے فرمایا، میرے سوال سے اللہ کا علم زیادہ وسیع ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں کس حال میں ہوں، لہٰذا مجھے بتلانے کی کبھی ضرورت نہیں۔ گویا آپ "اُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ" کے پورے پورے مصداق تھے۔ غرضیکہ ابراہیم علیہ السلام کی خلت اس وجہ سے ہے کہ آپ کے دل میں اللہ کی انتہائی محبت اور تعظیم تھی اور دوسرے یہ کہ انہوں نے تمام حاجات صرف اللہ کے سامنے پیش کیں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ کے خلیل ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر میں کسی انسان کو اپنا خلیل بناتا تو حضرت ابوبکر صدیق کو بناتا، مگر تمہارے صاحب کو اللہ نے اپنا خلیل بنا لیا ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ دل کا خانہ خاص صرف خدا تعالیٰ کے لیے ہے۔ اور حبیب کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصی محبت ہے جس کی وجہ سے آپ حبیب اللہ بھی ہیں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ جو خلیل کے راستے پر ہوگا، وہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہوگا۔ ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ ہیں۔ اُن کی ملّت حقیقت میں ملّتِ اسلامیہ ہے یا ملّتِ محمدیہ ہے معنیٰ ایک ہی ہے۔ لہٰذا اللہ کے نزدیک دین اس شخص کا پسندیدہ ہوگا جس میں اخلاص پایا جائے اور اس کا عمل شریعت کے مطابق ہو، ایسا شخص ملّتِ ابراہیمی کا پیروکار سمجھا جائے گا۔

تصرف اور احاطہ

فرمایا یاد رکھو وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا اور اللہ ہر چیز کا محیط یعنی احاطہ کرنے والا ہے۔ اللہ کی اِن دو صفات میں اکثر لوگ بہک جاتے ہیں۔ ایک تصرف ہے کہ جب زمین و آسمان کی ہر چیز کا مالک خدا ہے تو پھر کائنات میں تصرف بھی اُسی کا ہے مگر اکثر لوگ اللہ کی صفت تصرف میں شرک کا ارتکاب کرتے ہیں اور تصرف میں قبر والوں، فرشتوں یا جنوں کو بھی شریک کرتے ہیں۔ حالانکہ متصرف فی الامور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

اللہ کی دوسری صفت یہاں پر محیط بیان کی گئی ہے یعنی ہر چیز کا احاطہ کرنا اور انہیں قابو میں رکھنا، اللہ ہی کے ساتھ خاص ہے۔ احاطہ علم کے ساتھ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ "بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ" ہے۔ ذرے ذرے کا علم اُسی کے پاس ہے اور قدرت کے اعتبار سے بھی ہر چیز پر قبضہ اللہ ہی

کا ہے۔ اُس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوتا، لہٰذا محیط بھی وہی ہے۔ اور متصرف بھی وہی ہے۔

اب جدید سائنس دانوں نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ سبب اور مسبب کا علاقہ قطعی نہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر ہر ذرہ اپنے مالک کے حکم کا منتظر رہتا ہے۔ جس وقت جو حکم ہو اُسی کی تعمیل کرتا ہے۔ پہلے تو سائنسدان اسے خلافِ عقل سمجھتے تھے مگر اب مان گئے ہیں کہ کسی چیز کا سبب قطعی نہیں۔ یعنی یہ ضروری نہیں کہ ہر سبب ہمیشہ ایک ہی نتیجہ پیدا کرے بلکہ ایک سبب کے مختلف مواقع پر مختلف نتائج بھی ہو سکتے ہیں۔

امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے سبب اور مسبب (CAUSE AND EFFECT) کو قائم رکھا ہے اور عام طور پر اس اصول کو نہیں توڑتا مگر جب چاہے اس کو توڑ بھی دیتا ہے۔ آگ کا کام جلانا ہے مگر بعض اوقات نہیں جلاتی، پانی پیاس نہیں بجھاتا، تلوار نہیں کاٹتی، گولی اپنا اثر نہیں دکھاتی وغیرہ وغیرہ۔ تو معلوم ہوا کہ تصرف اللہ کے قبضے میں ہے اور وہی احاطہ کرنے والا ہے۔ چونکہ اکثر لوگ انہی صفات میں شرک کرتے ہیں۔ لہٰذا اللہ نے آخر میں انہی دو صفات کا ذکر کر کے لوگوں کو توحید کا درس یاد کرایا ہے۔

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾

ترجمہ: اور لوگ آپ سے فتویٰ طلب کرتے ہیں عورتوں کے بارے میں آپ کہہ دیجئے، اللہ تعالیٰ تم کو فتوی دیتا ہے اُن کے متعلق اور وہ جو تلاوت کی جاتی ہیں تم پر کتاب میں یتیم عورتوں کے بارے میں کہ تم نہیں دیتے اُن کو وہ چیز جو اُن کے لیے مقرر کی گئی ہے اور تم رغبت رکھتے ہو کہ اُن سے نکاح کرو، اور کمزور بچوں کے بارے میں، اور یہ کہ تم قائم رہو یتیموں کے حق میں انصاف کے ساتھ۔ اور جو کچھ تم بھلائی کرو گے، پس بیشک اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والا ہے ﴿۱۲۷﴾

ربط آیات

گذشتہ رکوعات میں جہاد کا ذکر اور منافقین کی مذمت بیان ہوتی رہی ہے۔ اب آج کی آیت میں عورتوں اور یتیم بچوں کے حقوق کا تذکرہ ہے۔ سورۃ ہذا کی ابتدا بھی انہی موضوعات سے ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یتیموں کے مال میں ناجائز تصرف سے منع فرمایا تھا اور یتیم لڑکیوں کے متعلق حکم تھا کہ اگر تمہیں ان کے ساتھ ناانصافی کا خدشہ

ہو، تو پھر اُن کے ساتھ نکاح نہ کرو۔ اور جن عورتوں سے نکاح کرو، اُن کے مہر خوشی خاطر سے ادا کرو، ہاں اگر وہ از خود مہر کا کچھ حصہ واپس کر دیں یا معاف کر دیں تو تمہارے لیے مباح ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ نے یتیموں کے مال کی حفاظت کے بھی مفصل احکام نازل فرمائے۔ وراثت کے احکام تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے جن میں اللہ نے واضح کیا کہ وراثت میں عورتوں کا بھی اسی طرح حق ہے جس طرح مردوں کا۔ اللہ تعالیٰ نے نکاح کے مسائل بھی بیان فرمائے اور واضح کیا کہ نہ تو عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ اور نہ انہیں نکاح ثانی سے روک رکھو۔

پھر اللہ نے محرمات نکاح کا ذکر کیا اور وہ تمام رشتے گنوائے جن کے ساتھ نکاح حرام ہے۔ معاشرتی مسائل میں عورتوں پر مردوں کی فوقیت، دونوں کے دائرہ ہائے کار اور ایک دوسرے کے حقوق و فرائض کا تذکرہ ہوا، اور ساتھ ساتھ دین کے بنیادی مسائل توحید و رسالت کا بیان بھی ہوا۔

عورتوں کے مسائل

اَب آج کی آیت کا تعلق بھی سورۃ کے ابتدائی حصے میں مذکور یتیموں اور عورتوں کے مسائل سے ہے۔ حضور علیہ السلام سے یتیم لڑکیوں کے نکاح سے متعلق سوال کیا گیا، جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ارشاد ہوتا ہے وَيَسْتَفْتُونَكَ اے پیغمبر علیہ السلام! لوگ آپ سے فتویٰ پوچھتے ہیں۔ استفتاء کسی معاملے میں حکم طلب کرنے کو کہتے ہیں۔ اس کا مادہ فتیٰ ہے جس کا معنی اجوان ہوتا ہے۔ کسی معاملہ میں جو فتویٰ دیا جاتا ہے اس کی وجہ سے قوت پیدا ہوتی ہے، لہٰذا اسے استفتاء کا نام دیا گیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا، لوگ آپ سے فتویٰ طلب کرتے ہیں فِي النِّسَاءِ عورتوں کے بارے میں۔ اللہ تعالیٰ نے اس سوال کے جواب میں فرمایا قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ آپ فرما دیجئے عورتوں کے بارے میں اللہ تم کو فتویٰ دیتا ہے۔ اور اس کے علاوہ وَمَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اور اس ضمن میں کتاب یعنی قرآن پاک کی وہ آیات بھی تمہاری

راہنمائی کرتی ہیں، جو تم پہ پڑھی جاتی ہیں، اور وہ اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں اور بہت سی آیات اس کے بعد بھی حسب ضرورت نازل ہوں گی، لہٰذا اپنے معاملات ان احکام کی روشنی میں طے کیا کرو۔

یتیم لڑکیوں کے حقوق

اور خاص طور پہ فِي يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِي لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ اُن یتیم عورتوں کے معاملات کہ جنہیں تم وہ چیز ادا نہیں کرتے جو اُن کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ سوال کی نوعیت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے مجملاً یہ جواب ارشاد فرمایا کہ یتیم بچیوں کے متعلق تو ابتدائے سورۃ میں یہ احکام دیے جا چکے ہیں۔ کہ اگر ان سے نکاح کرو تو اُن کا حق مہر پورا ادا کرو، اور اگر تم انصاف کے تقاضے پورے نہ کر سکو تو اُن کے علاوہ دوسری عورتوں سے نکاح کرو۔

زمانۂ جاہلیت میں یتیم بچیوں سے دو طرح کی زیادتی ہوتی تھی۔ لڑکیوں کے یتیم ہو جانے کی صورت میں اُن کے سرپرست کے تقرر کا مسئلہ پیدا ہوتا تھا، اور عام طور پہ سرپرست چچا یا بھائی مقرر ہوتے تھے اور اگر ان میں سے کوئی موجود نہ ہو تو عصبہ کی صورت میں بعض اوقات چچا زاد بھائی بھی وارث بن جاتے تھے اور لڑکی کے ساتھ اس کا مال بھی سرپرست کی تحویل میں چلا جاتا تھا۔ چونکہ چچا زاد کے ساتھ نکاح جائز ہے اس لیے اگر لڑکی خوبصورت ہوتی تو سرپرست خود اُس سے نکاح کر لیتا مگر دستور کے مطابق اُسے حق مہر پورا ادا نہ کرتا۔ کیونکہ اس سلسلے میں اُسے کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا تھا، اور اگر لڑکی شکل وصورت کے لحاظ سے سرپرست کو ناپسند ہوتی، تو نہ وہ خود نکاح کرتا اور نہ کسی دوسری جگہ نکاح کرنے کی اجازت دیتا۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکی کے ساتھ اس کے حصے کا مال بھی جائیگا اور وہ خود اُس سے محروم ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں پہ ان ہی زیادتیوں کی طرف توجہ دلا کر فرمایا کہ اس ضمن میں جو احکام نازل ہو چکے ہیں، وہی تمہارے لیے کافی ہیں۔ لہٰذا اُن کے مطابق عمل کرو۔

فرمایا وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اگر تم اُن سے نکاح کرنے

کی رغبت رکھتے ہو تو پھر اُن کا مہر پورا پورا ادا کرو۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ اس حصۂ آیت میں تَرْغَبُوْنَ کے بعد عَنْ یا فِیْ محذوف ہے۔ اور ان کے داخل ہونے پر دو متضاد معنی نکلتے ہیں۔ اگر تَرْغَبُوْنَ عَنْ پڑھا جائے تو اس کا معنی ہو گا کہ تم نکاح سے اعراض کرتے ہو۔ جیسا کہ سورۃ بقرہ میں آتا ہے "وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهِیْمَ" اور کون ہے جو ملت ابراہیمی سے اعراض کرتا ہے مگر جو بیوقوف ہے۔ اور اگر تَرْغَبُوْنَ فِیْ پڑھا جائے تو مطلب ہو گا کہ تم نکاح میں رغبت رکھتے ہو۔ تو ہر دو صورتوں میں مطلب یہ ہو گا کہ اگر تم شکل وصورت کی ناپسندیدگی کی وجہ سے نکاح سے اعراض کرتے ہو، تو پھر اُن یتیم لڑکیوں کو دوسری جگہ نکاح کرنے کی اجازت دو۔ اور اگر وہ تمہارے لیے قبول صورت ہیں تو پھر اُن سے نکاح کر کے اُن کے مہر وغیرہ کے حقوق بھی پورے کرو۔ یتیم لڑکیوں سے کسی قسم کی زیادتی نہیں ہونی چاہیئے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت کے مطابق انہی عورتوں میں یتیم لڑکیوں کے ساتھ زیادتی ہوتی تھی جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا۔

کمزور طبقات کے ساتھ انصاف

عورتوں کے ساتھ مذکورہ زیادتی کے علاوہ دیگر کمزور طبقات کے ساتھ بھی انصاف کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کا مفصل بیان بھی سورۃ کی ابتداء میں آچکا ہے۔ جو کہ یہاں پر اشارتاً دہرایا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ کمزور اور یتیم بچوں کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ اُن کی پرورش نیک نیتی سے کرو اور ان کے مال کی حفاظت کرو، جیسا کہ ابتدائے سورۃ میں مفصل احکام نازل کیے جا چکے ہیں۔ یتیم بچوں کے ساتھ بھی دو طرح کی زیادتی ہوتی تھی۔ ایک تو انہیں وراثت سے محروم رکھا جاتا تھا اور اگر اُن کے حصے میں کچھ مال آ جائے تو بچے کے سرپرست حیلے بہانے سے وہ مال ہضم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ تو اللہ نے فرمایا کہ یتیم کا مال کھانا اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ بھرنے کے مترادف ہے، لہٰذا اس ضمن

میں اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کی سختی سے پابندی کرو، یتیموں کو وراثت میں حصہ دو اور اُن کے مال کی حفاظت بھی کرو۔ نیز یہ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْیَتٰمٰی بِالْقِسْطِ یتیموں کے بارے میں انصاف کے ساتھ قائم رہو۔ اِن آیات کا مرکزی مضمون یہی ہے کہ کمزور طبقات کے ساتھ انصاف ہونا چاہیئے۔ عورتیں، چھوٹے بچے یتیم لڑکے اور لڑکیاں سب ضعفا میں شمار ہوتے ہیں جن کے ساتھ اللہ نے انصاف کرنے کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا یہ حکم مسلمانوں کے ہر صاحب اقتدار طبقہ کے لیے ہے خواہ وہ خاندان یا قبیلے کا سربراہ ہو یا وقت کا حاکم، جو بھی کسی معاملہ میں صاحب اختیار ہے، اس کے لیے لازم ہے کہ وہ کمزور طبقات کے معاملات میں انصاف کی بالا دستی کو قائم رکھے، ظاہر ہے کہ اگر ان طبقوں کے ساتھ انصاف کے تقاضے پورے کیے جائیں گے تو دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی انصاف بطریق اولیٰ ہو گا۔ اور اگر کمزور طبقے ظلم کی چکی میں پس گئے تو دوسروں کے ساتھ بھی انصاف کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ لہٰذا کمزور طبقات کے ساتھ انصاف کرنے کی بطور خاص تاکید کی گئی ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اپنی کتاب[1] غنیۃ الطالبین میں لکھتے ہیں۔ کہ عدل و انصاف کا قیام تقویٰ کی علامت ہے اور تقویٰ کا خلاصہ اور لُب لباب اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے "اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ" (سورۃ نحل) بیشک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل اور احسان کا۔ اور قرابتداروں کے حق ادا کرنیکا، اور منع کرتا ہے بے حیائی اور سرکشی سے فرماتے ہیں، تقویٰ کا لب لباب اور مرکزی نقطہ عدل ہے۔ جس قوم میں عدل نہیں وہ فاسق قوم ہے۔ جس سوسائٹی میں خلاف شرع اور خلاف عقل باتیں رائج ہیں وہ گندی سوسائٹی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ یتیموں کے ساتھ عدل قائم کرو، اُن کا مال تلف نہ کرو، اُن کے حقوق ادا کرو۔ عدل، طہارت، خشوع و خضوع،

---

[1] غنیۃ الطالبین صفحہ ۱۴۲ ج ۱ مطبوعہ مصر (فیاضی)

اخبات اور فیاضی مسلمان کا ورثہ ہیں، انہیں کوئی مسلمان ضائع نہیں کرتا۔

حرفِ آخر
نیک نیتی

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مخلص صحابہؓ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی تعمیل بسروچشم کرتے تھے۔ جب یتیم لڑکیوں کے متعلق آیات نازل ہوئیں تو صحابہ کرامؓ کو خیال ہوا کہ اتنے سخت احکام کا مطلب یہ ہے کہ یتیم لڑکیوں سے نکاح کرنا ہی نہیں چاہیئے مبادا کہ اُن کے ساتھ کوئی ناانصافی ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہ خیال درست نہیں ہے۔ بطور سرپرست تمہیں خود بھی نکاح کرنے کی اجازت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تمہیں انصاف کے تقاضے بھی پورے کرنا ہوں گے۔ بعض اوقات حالات اس قسم کا رُخ اختیار کر لیتے ہیں کہ اگر یتیم لڑکی کا نکاح کسی دوسری جگہ کر دیا تو اُس بیچاری کو تکلیف پہنچنے کا خطرہ ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں تم خود نکاح کرسکتے ہو بشرطیکہ اُس کا مہر پورا ادا کرو، اور اُس کے مال کی حفاظت کرو۔ اور اس کا دارومدار تمہاری نیت پر ہے۔ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِهِ عَلِيمًا اگر تم بھلائی کا ارادہ رکھتے ہو۔ تو اللہ تعالیٰ اس سے خوب واقف ہے۔ اگر تم خود نیک نیتی کے ساتھ نکاح پر آمادہ ہو تو ایسا کرلو اور اُن کے حقوق کا خیال رکھو

اور اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یتیم لڑکی کا فائدہ کسی دوسری جگہ نکاح کرنے میں ہے۔ تو پھر وہاں نکاح کردو۔ اُس کو بلا وجہ نکاح سے نہ روکو اور نہ ہی اس کے مال میں ناجائز تصرف کرو۔ فرمایا تم اس معاملہ میں جو بھی فیصلہ کرو نیک نیتی کے ساتھ کرو، اللہ تعالیٰ تمہاری نیت اور ارادے سے بھی واقف ہے۔ اس کا علم ذرے ذرے پر محیط ہے۔ اگر تمہارا ارادہ بھلائی کا ہے تو عنداللہ ماجور ہوگے اور اگر نیت میں فتور ہے، تو پھر انصاف نہیں ہوسکتا اور اللہ تعالیٰ ناانصافی کی سزا ضرور دیگا۔

وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِن بَعْلِهَا نُشُوزًا أَوْ إِعْرَاضًا
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَن يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۚ
وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۗ وَأُحْضِرَتِ الْأَنفُسُ الشُّحَّ ۚ وَإِن
تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ
خَبِيرًا ﴿١٢٨﴾ وَلَن تَسْتَطِيعُوا أَن تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ
وَلَوْ حَرَصْتُمْ ۖ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ
فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۚ وَإِن تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا
فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٢٩﴾ وَإِن يَتَفَرَّقَا
يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِّن سَعَتِهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا
حَكِيمًا ﴿١٣٠﴾

ترجمہ: اگر کوئی عورت خوف کھائے اپنے خاوند کی طرف سے نافرمانی یا اعراض کا، تو اِن دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ آپس میں صلح کر لیں اور صلح ہی بہتر ہے اور حاضر کیا گیا ہے جانوں کے پاس بخل کو اور اگر تم نیکی کرو اور تقویٰ کی راہ اختیار کرو پس بیشک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کام کرتے ہو اس کی خبر رکھنے والا ہے ﴿۱۲۸﴾ اور تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے کہ انصاف کر سکو عورتوں کے درمیان، اگرچہ تم حرص کرو۔ پس تم نہ مائل ہو پوری

طرح ایک طرف مائل ہونا۔ پس چھوڑ دو اس عورت کو معلق
(ٹنکی ہوئی) چیز کی طرح۔ اور اگر تم اصلاح کرو گے اور تقویٰ کی
راہ اختیار کرو گے تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے ﴿۱۲۹﴾
اور اگر وہ دونوں آپس میں جدا ہو جائیں تو مستغنی بنائے گا
اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اپنی وسعت سے اور ہے اللہ تعالےٰ
بڑی وسعت والا اور حکمت والا ﴿۱۳۰﴾

ربطِ آیات

گذشتہ دروس میں بعض معاشرتی مسائل کا تذکرہ تھا، عورتوں، یتیم بچیوں اور دیگر کمزور طبقات کے متعلق حکم دیا گیا تھا کہ ان کے حقوق ادا کرو اور اس ضمن میں اس سورۃ کی ابتداء میں اسی موضوع پہ نازل ہونے والی آیات کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔ کہ ان طبقات پر وہی احکام لاگو ہیں اور انہی سے راہنمائی حاصل کرنی چاہیئے۔ عورتوں کے نکاح اور مہر کا خصوصی ذکر تھا کہ اُن کے مقررہ مہر ادا کرو۔ یتیم بچیوں کے متعلق سرپرستوں کو تنبیہ تھی کہ اگر اُن سے خود نکاح کرنا چاہو، تو اُن کا مہر پورا ادا کرو، اور باقی حقوق بھی بطریق احسن پورے کرو اور اگر خود نکاح نہ کرنا چاہو، تو انہیں دوسری جگہ نکاح کرنے سے نہ روکو اور نہ اُن کے مال پہ ناجائز تصرف رکھو۔ ان کمزور طبقات کو اللہ نے باقی لوگوں کے لیے بطور معیار مقرر فرمایا۔ کہ اگر ان طبقات کے ساتھ انصاف کرو گے تو باقی لوگوں کے ساتھ بھی انصاف کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اور اگر یہی طبقہ انصاف سے محروم رہا تو پھر باقیوں کے ساتھ بھی عدل نہیں ہوگا، اور اسی طرح پوری سوسائٹی جائز حقوق سے محروم ہو جائے گی۔

میاں بیوی میں مخاصمت

کمزور طبقات کے حقوق کے تحفظ کے بعد آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے درمیان پیدا ہونے والے کسی ممکنہ اختلاف اور پھر اُس کے تصفیہ کے متعلق ہدایات دی ہیں۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے اور قریب ترین تعلقات قائم ہوتے ہوئے زوجین کے درمیان مخاصمت کا پیدا ہو جانا بعید از قیاس نہیں کسی ایسی صورتِ حال کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا

نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا اور اگر عورت خوف کھاتی ہے اپنے شوہر کی طرف سے اختلاف کا یا اعراض کا۔ دراصل نشز کا لغوی معنیٰ ابھار ہوتا ہے ، جیسے عربی شاعر کہتا ہے

فقد نشز الشرسوف والتصق المعا۔

یعنی پسلیاں فاقے کی وجہ سے اُبھر گئیں اور آنتیں ساتھ مل گئیں۔ تو اس نشوز کے لفظ میں لڑائی جھگڑا۔ اختلاف رائے ، نفرت ، ایذا رسانی ، تحقیر وغیرہ ساری چیزیں آتی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اگر عورت کو اپنے خاوند کی طرف سے کسی قسم کی زیادتی کا ڈر ہو دونوں کے مزاجوں میں موافقت موجود نہیں یا خاوند اعراض کرتا ہے ، بیوی کی طرف پوری توجہ نہیں دیتا ، تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا اُن دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ آپس میں صلح کرلیں۔ کیونکہ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ صلح بہر صورت بہتر ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب نکاح ہو ہی گیا ہے۔ تو اب کوشش یہی کریں کہ یہ رشتہ ازدواج قائم رہے اور علیحدگی کی نوبت نہ آئے تو بہتر ہے۔

صلح وسیع تر مفہوم میں

مفسرین کرام اور فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ یہ آیت بنیادی طور پر تو میاں بیوی کے درمیان مخاصمت اور پھر اس کی اصلاح کے متعلق ہے مگر اپنے وسیع تر مفہوم کے پیش نظر یہ آیت بڑی بڑی پارٹیوں ، گروہوں اور ملکوں کے درمیان تنازعات اور ان کے تصفیہ کے لیے بھی راہنمائی کرتی ہے۔ جھگڑا دو افراد کے درمیان ہو یا دو خاندانوں کے درمیان دو پارٹیاں ہوں یا دو سلطنتیں اختلافات ہر جگہ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ اصول بیان فرمادیا ہے کہ اگر کوئی تنازعہ پیدا ہو جائے تو فریقین کو آپس میں صلح کر لینی چاہیے اور نتائج کے اعتبار سے ہر متعلقہ فریق کے لیے صلح ہی بہتر ہے۔ یہی بات سورۃ حجرات میں اس طرح بیان کی گئی ہے " وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا " اگر مومنوں کے دو گروہوں کے درمیان جھگڑا ہو جائے تو اُن میں صلح کرا دیا کرو۔ اور جو پارٹی سرکشی اختیار کرے ، اُس پر دباؤ ڈال کر صلح پر مجبور کرنا چاہیے کہ اسی میں اُن کی بہتری ہے اور یہی اللہ تعالےٰ

کافرمان ہے۔

ہماری ملت کی مشکلات کی وجہ احکام الٰہی سے روگردانی ہے۔ آج ملتِ اسلامیہ کے کتنے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قوانین پر عمل پیرا ہیں۔ جھگڑے سے متعلق اِن واضح احکام کے باوجود دو مسلمان ملکوں کے درمیان کئی سال سے جنگ جاری ہے مگر مصالحت کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس معاملہ میں اپنا کردار ادا کریں اور ایران عراق کے درمیان تصفیہ کرائیں۔ اور پھر اگر ان میں سے کوئی فریق ناجائز طور پر اپنی بات پر اڑا ہوا ہے اور مصالحت پر آمادہ نہیں ہوتا، تو سورۃ حجرات کے احکام کے مطابق باقی عالمِ اسلام کو اُسے مجبور کرنا چاہیئے کہ وہ ہٹ دھرمی سے باز آجائے افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان ممالک اور دیگر عالمی اداروں کی کوشش کے باوجود یہ جنگ ختم ہوتی نظر نہیں آتی۔ اگر فریقین قرآنی احکام پر عمل کرتے تو اتنا جانی اور مالی نقصان نہ اٹھاتے اس ضمن میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی ہے جو ترمذی شریف اور دیگر کتب میں موجود ہے کہ اہل اسلام کے درمیان ہر صلح جائز ہے اِلَّا صُلحاً اَحَلَّ حَرَاماً اَوْحَرَّمَ حَلَالاً سوائے اس صلح کے جس کی بنیاد حرام کو حلال یا حلال کو حرام بنانا ہو۔ اس کے علاوہ ہر طرح کی صلح جائز اور باعثِ برکت ہے۔

صلح کی اقسام اور شرائط

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ صلح کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی قسم اقرار، دوسری سکوت اور تیسری انکار ہے۔ پہلی قسم کے متعلق فرمایا کہ اگر کوئی فریق دعویٰ کرے اور دوسرا فریق اس کو تسلیم کرے، اپنی غلطی کا اقرار کرلے تو صلح کرانا آسان ہو جاتا ہے دوسری صورت میں اگر کوئی فریق اپنے خلاف لگائے گئے الزام کی نہ تصدیق کرتا ہے اور نہ تکذیب ——— بلکہ سکوت اختیار کرتا ہے۔ تو بھی مصالحت کی بنیاد موجود ہوتی ہے اور اسے بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ باقی رہی تیسری قسم جس میں فریق ثانی دعویٰ کا انکار کرتا ہے تو اس معاملہ میں فقہائے کرام کے درمیان

۵ درس کے وقت عراق ایران جنگ جاری تھی لیکن درس کی طباعت کے وقت ختم ہو چکی ہے۔ (فیاض)

اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ انکار کی صورت میں صلح جائز نہیں البتہ باقی ائمہ کرام فرماتے ہیں کہ صلح اس صورت میں بھی جائز ہے اور مقصد جھگڑے کو ختم کرنا ہے۔ اور جیساکہ اس آیت میں اللہ نے فرمایا ہے صلح ہی بہتر ہے۔

جب صلح کے لیے گفت وشنید ہوتی ہے تو ظاہر ہے کہ فریقین کو اپنے اپنے مؤقف میں لچک پیدا کرنی ہوگی۔ اور اس کی صورت یہی ہوتی ہے۔ کہ ہر فریق اپنے حق میں کمی کر کے دوسرے کے حق کو تسلیم کرے اور اس طرح کچھ لے کر اور کچھ دے کر معاملہ کو ختم کیا جاسکتا ہے میاں بیوی کا معاملہ اس آیت کا اصل موضوع ہے۔ تو یہاں پر بھی اگر عورت سمجھتی ہے کہ خاوند کا دل اُس سے بھر گیا یا وہ اُس سے خوش نہیں ہے، تو اُسے چاہیئے کہ وہ خاوند کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اپنے مؤقف میں لچک پیدا کرے، اپنے کسی حق میں کمی کر دے، مثلاً اگر پہلے دو سو روپے خرچہ مقرر ہے تو اسے کم کر کے سو روپے کر دے۔ یا مہر کا کچھ حصہ معاف کر دے، یا کوئی دیگر مالی فائدہ پہنچائے جس سے خاوند کو بیوی کی وفاداری کا یقین دلایا جاسکے تو یہی چیز صلح کی بنیاد بن سکتی ہے اور فریقین کے درمیان جھگڑے کو ختم کیا جاسکتا ہے

صلح کی مثال

حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد حضور علیہ السلام نے حضرت سودہ رضؓ سے نکاح کیا۔ چونکہ آپ زیادہ معمر تھیں کچھ عرصہ بعد حضور علیہ السلام نے اُن کو علیحدہ کر دینے کا ارادہ کیا۔ جب ام المؤمنین کو پتہ چلا تو انہوں نے عرض کیا حضور! مجھے تو دنیا داری کی چنداں رغبت نہیں، مجھے آپ طلاق نہ دیں، میں اپنی باری کے متعلق اپنا حق حضرت عائشہؓ کو دیتی ہوں، آپ میری بجائے بھی اُس کے ہاں ٹھہرا کریں۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ قیامت کے دن میرا نام آپ کی ازواج میں شامل ہو۔ حضور علیہ السلام نے اس پیشکش کو قبول فرمایا۔ چنانچہ آپ باقی بیویوں کے ہاں ایک ایک دن قیام فرماتے تھے اور حضرت عائشہؓ کے ہاں دو دن۔ بہرحال یہ میاں بیوی کے درمیان مصالحت کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔

یہاں پر یہ اصول مدنظر رہنا چاہیئے۔ کہ اگر عورت اپنا حق کسی وقت

چھوڑتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس حق سے دست بردار ہوگئی ہے۔ عورت مناسب وقت پر اپنے حق کو بحال کرنے کی بھی مجاز ہے۔ اگر کسی عورت نے کسی وقت اپنی باری کی قربانی دی ہے، تو وہ اس کی بحالی کا مطالبہ بھی کر سکتی ہے۔ بہر حال فرمایا کہ صلح ہی بہتر ہے اور علیحدگی کی نوبت نہیں آنی چاہیئے۔

حرص اور بخل

عام طور پر جھگڑے کی بنیاد مالی معاملات ہوتے ہیں۔ ایک فریق دوسرے کا حق غصب کرتا ہے، یا اس کے حق میں کمی کرتا ہے تو دوسرے فریق کا رنجیدہ خاطر ہونا ایک فطری امر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے "اِنَّہٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ" یعنی مال کی محبت میں انسان بڑا پکا ہے۔ نیز یہ بھی فرمایا "وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا" تم مال کے ساتھ پوری پوری محبت کرتے ہو۔ یہی محبت حرص پیدا کرتی ہے اور پھر اگر یہ شدید تر ہو جائے تو بخل کو جنم دیتی ہے انسان مال اکٹھا کرنا تو اپنا حق سمجھتا ہے۔ مگر اُسے خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صلح کی بنیاد عموماً مالی حقوق میں کمی یا دستبرداری ہوتی ہے مگر "وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ" حاضر کی گئی ہے نفسوں کے پاس حرص اور بخل، یعنی انسان فطری طور پر حریص اور بخیل واقع ہوا ہے۔ یہ مال سے محبت کرتا ہے لہٰذا اپنے حق میں کمی یا اس سے دست برداری کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس طرف توجہ دلائی ہے۔ کہ مال سے اس قدر محبت نہ کرو کہ صلح کی بنیاد ہی ختم ہو جائے اگر ضرورت ہو تو مالی قربانی سے بھی دریغ نہ کرو کیونکہ مال آنی جانی چیز ہے اور اس کے مقابلے میں صلح اور حسنِ معاشرت بیش قیمت ہے۔ لہٰذا اپنے حقوق کی قربانی دے کر بھی اگر صلح کرنی پڑے۔ تو اس سے دریغ نہ کرو۔

مال کی محبت

مال کی فطری محبت کے باوجود بزرگانِ دین اپنی تربیت کے ذریعے

اس مادہ کو کم سے کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ زکوٰۃ اور صدقات وخیرات کی ادائیگی مال کی محبت میں کمی کا ایک ذریعہ ہے۔ اور جس شخص نے مال کی محبت پر قابو پالیا، وہ کامیاب ہوگیا قرآن پاک میں موجود ہے "وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" جو شخص بخل سے بچا لیا گیا، وہ کامیابی سے ہمکنار ہوگیا۔ حضور علیہ السلام کے سامنے ایک شخص نے دوسرے کی تعریف کی کہ وہ نیک آدمی ہے، نماز روزے کا بڑا خیال رکھتا ہے۔ نوافل ادا کرتا ہے، مگر اس میں بخل کا مادہ پایا جاتا ہے۔ تو نبی علیہ السلام نے فرمایا اَیُّ دَاءٍ اَدْوَءُ مِنَ الْبُخْلِ بخل سے بڑھ کر کون سی بیماری ہو سکتی ہے۔ یہ بہت بری خصلت ہے مومن کے ساتھ اس کی کوئی مناسبت نہیں۔

بہر حال فرمایا کہ انسان میں حرص اتنی زیادہ نہیں ہونی چاہیئے۔ کہ وہ اللہ کے دین اور آخرت سے غافل ہو جائے۔ مال بلاشبہ انسان کی مجبوری ہے اس کی اپنی ترغیبات ہوتی ہیں۔ مگر اللہ کے بعض بندوں کی تربیت کی وجہ سے حرص کا مادہ بہت حد تک کم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ امام اوزاعیؒ کا مقولہ ہے۔ کہ میرے سامنے سونے کی ڈلی بھی رکھی ہو تو مجھے اس میں کچھ رغبت نہیں ہوتی۔ یہ اللہ کے خاص بندے ہوتے ہیں مگر فرمایا کہ عام طور پر انسان حرص اور بخل میں مبتلا ہوتے ہیں جو کہ ان کی فطری کمزوری ہے۔

نیکی اور تقویٰ

فرمایا اگر کچھ لے دے کر صلح کی صورت پیدا ہو جائے تو یہ بھی درست ہے تاکہ زندگی کے دن خوش اسلوبی سے گزر جائیں۔ تاہم وَاِنْ تُحْسِنُوْا اگر تم نیکی کرو وَتَتَّقُوْا اور تقویٰ کی راہ اختیار کرو۔ کسی قسم کی زیادتی نہ کرو دوسرے فریق پر ناجائز دباؤ نہ ڈالو اور جس قدر ممکن ہو، عورت کو سہولت بہم پہنچاؤ۔ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا تو اللہ تعالیٰ تمہارے امور سے باخبر ہے۔ اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ تمہاری صلح و مخاصمت نیکی اور پرہیز گاری اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے

وہ تمہارے کوائف سے بھی واقف ہے اور تمہاری ضرورتوں کو بھی جانتا ہے۔ اگر تم اپنی طرف سے دوسرے فریق کو رعایت دو گے، تو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے فضل سے بہت کچھ عطا کرے گا اور پھر آخرت میں اس کا اجر تو بہت وسیع ہے۔ لہٰذا دوسرے کے ساتھ حتی الامکان حسنِ سلوک کی کوشش کیا کرو۔ اسی لیے فرمایا کہ خود نقصان اٹھا کر بھی اگر دوسرے کے ساتھ نیکی کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو گے، تو اللہ تعالیٰ سے بہتر اجر پاؤ گے۔

فطری میلان

متعدد ازواج میں سے کسی ایک طرف زیادہ میلان بھی فطری امر ہے اور عام طور پر انسان خواہش کے باوجود اس کے خلاف نہیں جا سکتا۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اسی بات کو بھی دہرایا ہے۔ وَلَنْ تَسْتَطِيعُوٓا اَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ اور تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے کہ عورتوں کے درمیان پورے طریقے سے انصاف کر سکو، اگرچہ تم کتنی ہی حرص کرو۔ چاہنے کے باوجود عورتوں کے درمیان مکمل انصاف بڑا مشکل کام ہے۔ چنانچہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کے قانون کے مطابق ظاہری طور پر اپنی بیویوں کی رہائش، کھانے، لباس اور لین دین میں برابری کی کوشش کرو۔ حضور علیہ السلام خود بھی اس پر عمل کرتے ہیں مگر ساتھ یہ دعا بھی فرمایا کرتے تھے۔ کہ اے مولا کریم! میں یہ کام اپنی طاقت کے مطابق انجام دے رہا ہوں، اور جس معاملہ میں استطاعت نہیں رکھتا یعنی جو چیز میرے بس میں نہیں ہے اس میں میرا مؤاخذہ نہ کرنا کیونکہ ہو سکتا ہے۔ کہ طبعی میلان کسی ایک طرف ہو جسے میں تقسیم نہ کر سکوں۔ اسی لیے فرمایا کہ تم خواہش کے باوجود عورتوں کے درمیان مکمل انصاف نہ کر سکو گے۔ مگر یاد رکھو! خدا تعالیٰ کا قانون یہ ہے فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ کسی ایک طرف مکمل طور پر نہ جھک جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ کہ دوسری بیوی کو درمیان میں لٹکتا چھوڑ دو۔ نہیں، بلکہ اس کے ساتھ تعلقات کو قائم رکھو اور اس کا حق

بھی ادا کرو۔ ایک طرف بہت زیادہ رغبت ہو اور دوسری طرف بالکل نہ ہو۔ یہ عدل کے خلاف ہے، اگر تھوڑا بہت فرق ہو گا تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیگا۔

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جس شخص کی دو بیویاں ہوں۔ اور اُس نے ایک کے ساتھ التفات کیا اور دوسری کو نظر انداز کر دیا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس حالت میں پیش ہو گا کہ اُس کا آدھا جسم فالج زدہ ہو گا۔ وہ گھسٹتا ہوا اللہ کی عدالت میں پیش ہو گا۔ کیونکہ اُس نے بیویوں کے درمیان انصاف نہیں کیا۔ حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کی دو بیویاں تھیں مگر اولاد سے محروم رہے۔ تاہم آپ بیویوں کے ساتھ سلوک میں نہایت محتاط تھے۔ جب کوئی چیز باہر سے آتی تو آپ ترازو سے تول کر برابر برابر تقسیم کرتے کہ کسی کے حصے میں کمی بیشی نہ ہو جائے۔

فرمایا عورتوں کے درمیان حتی الامکان عدل قائم کرنے کی کوشش کرو وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا پھر اگر تم صلح کرو اور تقویٰ کی راہ اختیار کرو فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا تو بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ وہ چھوٹی موٹی غلطیوں کو معاف فرمادے گا۔ تم بہرحال اصلاح کی پوری پوری کوشش کرو۔

علیحدگی کی صورت

فرمایا اگر مصالحت کے تمام راستے مسدود ہو جائیں اور اکٹھا رہنے میں حدود اللہ کی خلاف ورزی کا احتمال ہو، تو پھر علیحدگی بہتر ہے وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا اگر میاں بیوی جدا ہو جائیں، طلاق کی نوبت آجائے تو شریعت محمدی میں یہ بھی روا ہے۔ طلاق کو اس قدر انا کا مسئلہ نہ بنا لیا جائے کہ ایک دوسرے کی جان کے درپے ہو جاؤ، بلکہ اسے بھی اللہ کی مشیت سمجھ کر قبول کر لو۔ اللہ تعالےٰ اس میں بھی بہتری پیدا کر دیں گے فرمایا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ اللہ تعالیٰ فریقین کو اپنی وسعت سے مستغنی کر دیگا۔ اگر علیحدگی نیک نیتی اور اصلاح کے ارادے سے ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ عورت اور مرد ہر دو کے لیے کوئی

دوسرا راستہ پیدا فرمادے گا جس سے اِن دونوں کی زندگی بہتر طور پہ بسر ہوسکے۔ لہٰذا علیحدگی کی صورت میں بالکل بددِل نہیں ہوجانا چاہیے۔ بلکہ اپنی اصلاح کرنی چاہیئے اور آئندہ زندگی کے لیے بہتر لائحہ عمل تجویز کرنا چاہیئے وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيمًا اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا حکمت والا ہے۔ وہ مسبب الاسباب ہے۔ تمام اسباب اُس کے قبضہ قدرت میں ہیں، وہ تمہارے لیے کوئی بہتر صورت پیدا کردے گا

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ؕ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا
الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَإِيَّاكُمْ أَنِ
اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَإِنْ تَكْفُرُوْا فَإِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِي الْأَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَلِلّٰهِ
مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ
وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾ إِنْ يَّشَأْ يُذْهِبْكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ
وَيَأْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾
مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ
الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا
بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾ ع ۱۹/۸/۱۶

ترجمہ :- اور اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور البتہ تحقیق ہم نے تاکیدی حکم دیا ہے اُن لوگوں کو جن کو کتاب دی گئی ہے تم سے پہلے اور تم کو بھی یہی حکم دیا جاتا ہے کہ ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اور اگر تم کفر کرو گے پس بیشک اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ غنی (بے پروا) ہے اور تعریفوں والا ہے ﴿۱۳۱﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کے

لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور
کافی ہے اللہ تعالیٰ کارساز (۱۳۲) اگر چاہے تو لے جائے تم کو
(یعنی فنا کر دے) اے لوگو! اور لائے دوسروں کو۔ اور اللہ تعالیٰ
اس پر قدرت رکھتا ہے (۱۳۳) جو شخص چاہتا ہے تم میں سے دنیا
کا ثواب۔ پس اللہ کے نزدیک ہے ثواب دنیا کا اور آخرت
کا۔ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا اور ہر چیز کو دیکھنے والا ہے (۱۳۴)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں، یتیم بچیوں اور کمزور طبقات کے حقوق کا ذکر فرمایا، پھر میاں بیوی کے درمیان نزاع کی صورت میں صلح کرنے کا حکم دیا۔ پھر فرمایا کہ اگر عورت سمجھتی ہے۔ کہ خاوند اعراض کر رہا ہے تو وہ اپنے حقوق میں کمی کر کے خاوند کو صلح پر آمادہ کر سکتی ہے تاکہ اُن کے درمیان نباہ کی صورت پیدا ہو سکے۔ متعدد بیویوں کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ہر طرح سے انصاف قائم رکھنے کی تاکید فرمائی، اللہ نے اس بات سے منع فرمایا کہ کسی ایک عورت کی طرف مکمل جھکاؤ ہو۔ اور دوسری کو لٹکتا ہوا چھوڑ دیا جائے، فرمایا قانون کے مطابق ہر ایک کے ساتھ عدل قائم کرنا چاہیئے۔ اس کے باوجود اگر کوئی خامی رہ جائے تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے۔

فرمایا اگر میاں بیوی میں نباہ کی کوئی صورت نظر نہ آئے اور علیحدگی تک نوبت آجائے تو وہ بھی خوش اسلوبی سے انجام پانی چاہیئے۔ طلاق کو ایک مستقل دشمنی کی صورت نہیں دینی چاہیئے بلکہ عورت اور مرد اُسی معاشرے کے افراد ہیں ہر ایک کے کچھ حقوق و فرائض ہیں جنہیں ادا کرنا چاہیے۔ اگر علیحدگی نیک نیتی اور اصلاح کی خاطر ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ دونوں کے لیے وسعت پیدا فرما دیگا۔ اور باقی ماندہ زندگی کے گزران کیلئے بہتر وسائل پیدا کر دیگا۔

تقویٰ کی تاکید

آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اختیار کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ قرآن پاک کا یہ اسلوبِ بیان ہے کہ جہاں بھی احکام، اصول اور قوانین کا ذکر آتا ہے اس کے بعد تقویٰ جیسی بنیادی چیز کی تاکید کی جاتی ہے اس قسم کی ترغیب سے انسان میں تعمیلِ حکم

کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کے لیے احکام شریعت پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ دوسری چیز جو اللہ تعالیٰ ایسے مواقع پر دہراتے ہیں وہ اس کی صفات ہیں ——— اور ان کے بیان سے مقصود یہ ہوتا ہے۔ کہ اگر تعمیلِ حکم میں کوئی کوتاہی رہ گئی تو اللہ تعالیٰ ان صفات کا مالک ہے وہ تمہیں سزا دینے پر قادر ہے، لہٰذا اس کے احکام کی تعمیل میں کسی قسم کی حجت بازی نہیں ہونی چاہیے انسان میں احساسِ ذمہ داری پیدا کرنے کا یہ بھی ایک ذریعہ ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے تقویٰ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اگر انسان میں تقویٰ پیدا ہو جائے، تو اس کے لیے حکم کی تعمیل نہایت آسان ہو جاتی ہے۔ لہٰذا تمام چیزوں کا اصل الاصول تقویٰ ہے۔

سورۃ نساء کی ابتداء میں عورتوں اور دیگر کمزور طبقات یتیموں وغیرہ کے حقوق کا ذکر ہے، لہٰذا وہاں بھی مضمون کی ابتدا اسی لفظ تقویٰ سے ہوتی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ اے لوگو! اپنے رب سے ڈر جاؤ۔ اب آج کی آیات میں بھی تخلیق کائنات کا بار بار ذکر کرنے کے ساتھ تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ فرمایا وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ درحقیقت تمام چیزوں کا مالک اور متصرف اللہ تعالیٰ ہے ارض و سما کی ہر چیز اسی کی پیدا کردہ ہے۔ لہٰذا یاد رکھو وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ہم نے تاکیدی طور پر حکم دیا تھا ان لوگوں کو جنہیں کتاب دی گئی مِنْ قَبْلِكُمْ تم سے پہلے یعنی یہود و نصاریٰ۔ ان کو بھی یہی حکم تھا وَاِيَّاكُمْ اور تمہیں بھی یہی حکم دیا جا رہا ہے اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ اللہ سے ڈرتے رہو۔ اگر تم میں خوفِ خدا پیدا ہو جائے گا تو اس مالک الملک کے احکام کی خلاف ورزی نہیں ہوگی، تم کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کر سکو گے، کسی کا حق تلف نہیں کرو گے اور کسی پر زیادتی نہیں کرو گے۔

تقویٰ سے مراد خوفِ خدا ہے اور جب یہ چیز پیدا ہو جاتی ہے تو انسان کفر، شرک، الحاد اور دیگر تمام گندے عقیدوں سے متنفر ہو کر معاصی سے بچ جاتا ہے کامل تقویٰ کا حامل انسان کبائر کے علاوہ صغائر اور مشتبہ چیزوں سے بھی بچتا رہتا ہے۔ حرام سے بچنا تو بہر صورت لازم ہے ورنہ تقویٰ حاصل نہیں ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر معاملہ میں شرعی حدود قائم کر دیے ہیں۔ جو شخص ان حدود کی حفاظت کرے گا، وہی منصب تقویٰ پر فائز ہو گا۔ آخرت میں اچھے ثمرات کا انحصار تقویٰ پر ہے۔ اگر انسان متقی ہے۔ تو اس کا اخلاق، نیک اعمال اور اعلیٰ اطوار اُسے دُنیا میں بھی سرخرو کریں گے اور آخرت میں تو اُس کے لیے اجرِ عظیم ہو گا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اختیار کرنے کی بار بار تاکید فرمائی ہے۔

اہل کتاب اور تقویٰ

جیسا کہ اِس آیت کریمہ سے واضح ہے، اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو بھی ویسے ہی تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، جس طرح اس امت محمدیہ کو دیا گیا ہے۔ مگر انہوں نے اللہ کے حکم کی تعمیل کی بجائے اپنے عقائد ہی بگاڑ لیے ہیں۔ قرآن پاک کہتا ہے۔ کہ مدار فلاح تقویٰ ہے مگر عیسائی کہتے ہیں کہ کامیابی کا مدار محبت پر ہے۔ وہ اِس زعم میں مبتلا ہیں کہ چونکہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے بے حد محبت کرتا ہے اس لیے وہ سب کچھ خود ہی معاف کر دیگا۔ لہٰذا انہیں کسی محنت کی ضرورت نہیں ہے۔ برخلاف اس کے انجیل کی اصلی تعلیم قرآن پاک سے ہی مطابقت رکھتی ہے۔ وہاں پر آج بھی ایسی آیات موجود ہیں جن میں انسان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اے ابن آدم! تم اس ذات سے ڈرو جو روح اور جسم دونوں کو جہنم میں ڈال سکتی ہے، مگر عیسائیوں نے تقویٰ کا عقیدہ پس پشت ڈال کر ابنیت اور کفارے کا عقیدہ وضع کر لیا اور عمل اور تقویٰ کو فراموش کر بیٹھے۔

فرمایا ہم نے اہل کتاب اور اہل ایمان سب کو حکم دیا کہ تقویٰ کی راہ اختیار کریں۔ اور ساتھ یہ بھی فرما دیا وَاِنْ تَكْفُرُوْا اگر تم انکار کرو گے، کفر کے

راستے پر چل نکلو گے تو سن لو فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ پس بے شک اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ ہر چیز کا خالق، مالک اور متصرف وہی ہے۔ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا اللہ تعالیٰ بے پرواہ ہے۔ اور ہر حالت میں تعریفوں والا ہے۔

بادشاہی اللہ کی ہے

پھر تاکیداً فرمایا وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط یاد رکھو! اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا اور کافی ہے اللہ تعالیٰ کارساز۔ ان آیات میں لِلّٰهِ .... فِی الْاَرْضِ تین دفعہ دہرایا گیا ہے۔ شاہ عبدالقادر محدثؒ فرماتے ہیں، کہ پہلی بار نازل ہونے والے اس کلمہ کا تعلق اللہ تعالیٰ کی صفت وسعت کے ساتھ ہے۔ اس سے گذشتہ آیت کے آخری الفاظ تھے وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا تو اسی صفتِ وسعت کے ساتھ ہی آج کی پہلی آیت کی ابتدا وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ سے ہوئی ہے فرمایا چونکہ زمین و آسمان کی ہر چیز کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ لہٰذا کائنات جیسی وسیع تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی صفت وسعت ہی کارفرما ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ آیت کے اگلے حصے میں مذکورہ جملے کا تعلق تَكْفُرُوْا کے ساتھ کہ اس سے فوراً پہلے یہی لفظ آیا ہے۔ اور اس سے مقصود یہ یاد دلانا ہے کہ دیکھو! دنیا جہاں کی ہر چیز پر تصرف فقط اللہ تعالیٰ کو ہے اور وہ ہر چیز پہ قدرت رکھتا ہے۔ تو ان حالات میں تم اُس کا کفر یعنی انکار کر کے کہاں جا سکتے ہو، بادشاہی تو اسی کی ہے، اُس کی سلطنت سے بھاگ کر کہاں جائے پناہ تلاش کرو گے، لہٰذا کفر کر کے تم اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔
وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا اللہ ہر چیز سے مستغنی ہے۔ کوئی اس کی تعریف کرے یا نہ کرے، وہ بہر حال سب تعریفوں کا مالک ہے۔

اس جملے کی تیسری آیت کے متعلق شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی صفت کارسازی سے ہے جیسا کہ آج کے درس کی دوسری آیت میں پھر آیا ہے وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ چنانچہ اس آیت میں یہ جملہ دہرانے کے بعد فرمایا وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا مقصد یہ ہے کہ پوری کائنات یعنی زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، سیارے غرضیکہ ہر چیز کا مالک وہی مالک الملک ہے۔ اور اس میں بسنے والے ہر انسان، جن، فرشتے، چرند، پرند، کیڑے مکوڑے وغیرہ کا کام بنانے والا بھی وہی ہے۔ لہٰذا جو شخص اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجا لائے گا، اللہ تعالیٰ اُس کے کام دنیا میں بھی ٹھیک بنا دیگا، اور آخرت میں بھی اُسے بے شمار انعامات سے نوازے گا۔ کیونکہ کارساز وہی ہے۔ اسی لیے سورۃ مزمل میں اُسی کو کارساز پکڑنے کا حکم ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا " اس کے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا کارساز بھی اسی کو سمجھو اور اسی پر بھروسہ رکھو، کام بنانے والا صرف وہی ہے۔

معبود برحق صرف اللہ ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنی اِن صفات کا تذکرہ فرما کر معبودان باطلہ کی نفی کر دی ہے جب مالک و مختار، قادر مطلق، کارساز اور علیم کل اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ تو پھر اس کے علاوہ معبود بھی کوئی نہیں ہو سکتا مگر سب کچھ جاننے کے باوجود غیر اللہ کی پوجا کرنے والے لوگ موجود ہیں۔ کوئی زمین کی پرستش کر رہا ہے کوئی آسمانی کرّوں چاند سورج کا پرستار ہے اور کوئی حقیر سے حقیر چیز کا پجاری بنا بیٹھا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ایک بڑا عجیب فقرہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ انسانی فکر و ذہن بھی عجیب چیز ہے، جب وہ ماننے پر آتا ہے۔ تو گوبر جیسی ناپاک چیز کو پوجنے لگتا ہے۔ اور جب انکار کرنے پر آئے تو اللہ کے برگزیدہ پیغمبر نوح علیہ السلام پر پتھر برسانے لگے۔ ہندو اسی ذہنیت کے مالک ہیں۔ وہ گائے کے گوبر کو پوتر (پاک) سمجھتے ہیں اور ناپاک چیز کو اسی کے ذریعہ پاک کرتے ہیں۔ وہ اپنے باورچی خانے میں گوبر اور پیشاب

کاچوکا دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ الہ صرف وہی ہے، باقی تمام مخلوق اس کے سامنے عاجز و بے وبس ہے۔ سورۃ فاطر میں صاف موجود ہے "یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ" غنی صرف خدا کی ذات ہے باقی سب اس کے محتاج ہیں۔ صمد وہی ہے وہ بے نیاز ہے، جو چاہے کرتا ہے، حاجت روا اور مشکل کشا بھی وہی ہے۔ کوئی فرشتہ نبی، جن یا کوئی قبر والا حاجت روا اور مشکل کشا نہیں ہوسکتا۔ وہ تو مخلوق ہیں اور اللہ کے سامنے محتاج ہیں۔ اس کے باوجود جو لوگ امداد کے لیے غیروں کو پکارتے ہیں۔ اُن کی بے وقوفی کا اظہار بھی اسی آیت سے ہوتا ہے وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ اللہ تعالیٰ تو سورۃ الرحمٰن میں فرماتا ہے "یَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ" زمین و آسمان کا ہر فرد اُسی کے دروازے کا سوالی ہے کائنات کی ہر چیز زبان حال یا زبان قال سے اللہ تعالیٰ ہی سے مانگنے والی ہے۔ درختوں کے پتے اُسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں۔ تمام نباتات کی جڑیں اپنی ضروریات کی چیزیں اُسی سے طلب کرتی ہیں۔ اللہ کے مقرب فرشتے اور اس کے مقربین بندے اُسی کے سوالی ہیں، اُسی کا تقرب اور اُسی کے انعامات کے طلبگار ہیں۔ مگر مشرک انسان ستاروں اور سیاروں کے علاوہ مکھی مچھر تک کی پوجا کر رہے ہیں اور اپنی حاجات اُن کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ اس آیت سے صاف سمجھ آرہی ہے کہ جب زمین و آسمان کی ہر چیز اُسی کی ملکیت ہے تو پھر سوالوں کو پورا کرنے والا بھی وہی ہے، اس کے علاوہ نہ کوئی حاجت روا ہے اور نہ مشکل کشا۔

مخلوق کی تبدیلی

اللہ تعالیٰ نے اپنی مذکورہ صفات کے اظہار کے بعد فرمایا کہ جو ذات خالق، مالک اور مختار کل ہے اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ اَیُّهَا النَّاسُ اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے، اٹھالے، اِس دنیا سے نیست و نابود

کر دے وَیَاْتِ بِاٰخَرِیْنَ اور دوسروں کو لے آئے۔ اگر سب لوگ اُس وحدہ لاشریک ہستی کا انکار کرنے لگیں تو اس کو اختیار حاصل ہے کہ اس مخلوق کو صفحہ ہستی سے مٹا کر کوئی دوسری مخلوق لے آئے یا کسی خاص علاقے کے منکرین کی جگہ متبعین کو کھڑا کر دے۔ چنانچہ جب عربوں نے نبی آخر الزمان کا انکار کیا تو اللہ نے ان کی جگہ عجمی ایمان والوں کو لا کھڑا کیا۔ اور جب مشرکینِ مکہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے انصار مدینہ کو آپ پر ایمان لانے والے بنا دیا۔ جب عباسیوں نے انکار کیا تو اللہ نے اُن کی جگہ مغلوں کو کھڑا کر دیا کہ دین کے پاسبان تم بن جاؤ۔ اگر پاکستانی دین پر عمل پیرا نہیں ہوں گے تو خدا تعالیٰ اُن کی جگہ کسی دوسری مخلوق کو لے آئے گا اور موقع ملنے کے باوجود اور وسائل کے ہوتے ہوئے دین سے اعراض کی وجہ سے یہ لوگ لعنت کے مستحق بن جائیں گے۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا اور خدا تعالیٰ ایسا کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہے، جو چاہے سو کرے، اس کی مشیت کے سامنے سب عاجز ہیں۔ لہٰذا اگر اہلِ وطن ملک و ملت کی کوئی خدمت کر سکیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ اس نے توفیق بخشی اور اگر اس کی نافرمانی کریں گے تو وہ بے نیاز ہے، اُسے کسی کی کچھ پروا نہیں، وہ جب چاہے ایک جماعت کی جگہ دوسری جماعت کو لے آئے۔

طلبِ دنیا

آگے اللہ تعالیٰ نے مخصوص انداز میں دنیا اور آخرت کا موازنہ کیا ہے اور اشارتاً یہ بات سمجھائی ہے۔ کہ اس دنیا کی زندگی محدود ہے اور اصل دائمی زندگی آخرت کی زندگی ہے، لہٰذا اس دنیا کی بجائے آخرت کی بہتری کے لیے کوشش اور محنت کرنی چاہیئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا جو لوگ دنیا کی زندگی پسند کرتے ہیں اور اس عارضی زندگی کی نعمتوں تک ہی محدود رہنا چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں، وہ دنیا کی ہر نعمت عطا کرنے پر قادر ہے مگر یاد رکھو! فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ

اللہ کے پاس تو دنیا و آخرت دونوں جگہ کی نعمتیں موجود ہیں۔ ہر طالب کو اس کی مطلوبہ
چیز ہی ملتی ہے۔ سورۃ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں "رَبَّنَآ اٰتِنَا
فِي الدُّنْيَا" اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس دنیا میں ہی عطا کر دے۔ اور پھر
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہیں ہوگا۔ پھر
دوسرے گروہ کا تذکرہ فرمایا جو کہتے ہیں "رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً
وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ" اے مولا کریم!
ہمیں اس دنیا میں بھی بہتری عطا فرما اور آخرت میں بھی اور ہمیں دوزخ کے عذاب
سے بچا لے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسے لوگوں کا حصہ اُن کی طلب کے مطابق
ہی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ دہر میں فرمایا کہ انسان جلد باز ہے، وہ اسی دنیا
میں سب کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے "اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ
وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا" اور قیامت کے
کے بھاری دن کو پیچھے چھوڑ دیتے یعنی اس کی کچھ فکر نہیں کرتے جو لوگ اس دُنیا
کے مال و اسباب، عیش و راحت کے طلبگار رہتے ہیں وہ اگلی دنیا میں
کچھ حصہ نہیں پاتے۔ اور جو لوگ دنیا اور آخرت دونوں جگہ بہتری چاہتے ہیں۔
انہیں دونوں جگہوں کے انعامات سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو یقیناً
ان کی سعی کا بدلہ ملیگا۔ دنیا اور عاقبت کے لیے دو مختلف قانون ہیں۔ یہاں پر صرف
اتنی بات سمجھا دی ہے کہ اللہ کے پاس دنیا کی زندگی کا بدلہ بھی ہے اور آخرت
کی زندگی کا بھی۔ لہٰذا صرف دنیا کے مال و اسباب میں اُلجھ کر نہ رہ جاؤ بلکہ
آخرت کی دائمی زندگی کا بھی سامان پیدا کرو۔

ظاہر ہے، کہ ایمان، تقویٰ اور نیکی کا اصل ثمرہ اور محل آخرت ہے، لہٰذا دائمی چیز کو چھوڑ
کر عارضی چیز کے پیچھے نہ پڑو یہ عقلمندی کی بات نہیں۔ یہ ترغیب بھی ہوگئی، اور
ترہیب بھی۔ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا اور
بیشک اللہ تعالیٰ ہر دُعا کو سنتا ہے۔ اور تمہاری حرکات و سکنات

کو دیکھ رہا ہے۔ لہٰذا تقویٰ کی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ کفر، شرک اور معاصی سے بچنا چاہیئے اور اُسی سے اُمید وابستہ رکھنی چاہیئے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ
لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ج اِنْ
يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا قف فَلَا
تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ج وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا
فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾

ترجمہ: اے ایمان والو ہو جاؤ قائم رہنے والے انصاف پر گواہی دینے والے ہو اللہ تعالیٰ کے لیے اگرچہ تمہارے نفسوں کے خلاف ہو یا ماں باپ یا قرابت داروں کے خلاف ہو (جس پر گواہی دی گئی ہے) اگر وہ مالدار ہے یا محتاج ہے، پس اللہ زیادہ بہتر ہے ان دونوں کے ساتھ۔ پس نہ پیروی کرو خواہش کی اس بات سے کہ تم انصاف کرنا چھوڑ دو اور اگر تم زبان کو پھیرو گے یا اعراض کرو گے، پس بیشک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کام کرتے ہو اسکی پوری طرح خبر رکھنے والا ہے ﴿۱۳۵﴾

ربط آیات

گذشتہ آیات میں میاں بیوی کے درمیان تنازعہ کا ذکر تھا اور اس ضمن میں انصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے صلح کرنے کی ترغیب دی گئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا تھا، پھر فرمایا کہ اگر زوجین کے درمیان علیحدگی کی نوبت آجائے تو بھی رنجیدہ خاطر نہیں ہونا چاہیئے، اللہ تعالیٰ ان میں سے ہر ایک کی کفایت کریگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تقویٰ اختیار کرنے کا حکم تم سے پہلے لوگوں کو بھی دیا گیا تھا اور تمہیں بھی یہی حکم دیا ہے

رہا ہے ۔ دراصل تقویٰ ہی مدارِ فلاح ہے ۔ اب آج کی آیت میں انصاف ہی سے
متعلق شہادت کا مسئلہ بیان فرمایا گیا ہے اور عدل و انصاف کے قیام کے لیے
ٹھیک ٹھیک گواہی دینے کی تلقین کی گئی ہے ۔

حق کی گواہی

ارشاد ہوتا ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے ایمان والو! کُوْنُوْا
قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ ہو جاؤ قائم رہنے والے انصاف پہ ۔ قوامین قوام
کی جمع ہے جس کا معنیٰ قائم رہنے والا ، نگرانی کرنیوالا یا حفاظت کرنے والا ہوتا
ہے ۔ اس سورۃ میں یہ لفظ پہلے بھی آ چکا ہے اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی
النِّسَآءِ تو فرمایا قائم رہنے والے بن جاؤ انصاف پر ۔ قسط اور عدل دونوں
انصاف کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے انصاف کے قانون
کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے ۔ اور انصاف کا زیادہ تر دارومدار شہادت پہ
ہوتا ہے ۔ اس لیے فرمایا شُھَدَآءَ لِلّٰہِ اللہ کے لیے گواہی دینے والے بن جاؤ ۔
مالک الملک ، قادرِ مطلق ، علیم کل اور معبودِ برحق چونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہے لہٰذا اس کی رضا جوئی
کے لیے سچی اور ٹھیک گواہی دو ۔ اور اس معاملے میں کسی اپنے یا بیگانے کی رُو رعایت
نہ رکھو ۔ گواہی صحیح دو وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اگرچہ یہ تمہارے نفسوں کے خلاف ہی
کیوں نہ ہو ، یعنی ایسا کرنے میں تمہارا ذاتی نقصان ہی کیوں نہ ہو ۔ اَوِ الْوَالِدَیْنِ
یا تمہارے والدین کے خلاف ہی کیوں نہ ہو وَالْاَقْرَبِیْنَ یا تمہارے قرابتداروں اور
رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو گواہی ہر حال سچی دو اور حق و انصاف کے دامن کو نہ
چھوڑو ۔ پھر فرمایا کہ مشہود علیہ (جس کے خلاف گواہی دی جا رہی ہے) کی حیثیت کو بھی
خاطر میں نہ لاؤ ۔ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا وہ خواہ غنی ہے ، صاحبِ حیثیت
ہے یا فقیر اور محتاج ، گواہی کے معاملہ میں کسی قسم کی رعایت کی اجازت نہیں
مقصد یہ ہے کہ اگر مشہود علیہ صاحبِ
ثروت ہے ، کوئی بڑا آدمی ہے تو اس سے مرعوب ہو کر اس کی رعایت نہ کرو
اور اگر مشہود علیہ غریب اور کمزور ہے تو اس پہ ترس کھا کر اس کی رعایت نہ کرو

بلکہ جہاں تک شہادت کا تعلق ہے اُسے ٹھیک ٹھیک من وعن ادا کرو۔ کیونکہ فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا تمہاری نسبت خدا اُن دونوں فریقین کے ساتھ زیادہ مہربان ہے۔ وہ کسی کو جائز حق سے محروم نہیں رکھتا۔ اگر ان میں سے کسی فریق کی امداد کی ضرورت ہوگی تو اللہ تعالیٰ خود اس کے اسباب پیدا فرما دیگا۔ تم ان کی ہمدردی کی وجہ سے گواہی میں کمی بیشی نہ کرو۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے قانون شہادت اس سورۃ کے علاوہ سورۃ مائدہ اور سورۃ حدید میں بھی بیان فرمایا ہے۔

اسلام میں قانونِ شہادت کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اسی پر فیصلے کا دارومدار ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ" گواہی کو مت چھپاؤ۔ شہادت کو چھپانے والا سخت گنہگار ہے۔ کسی شخص پر ظلم ہوتا دیکھ کر دوسرا شخص خاموش رہے تو وہ خود مجرم بن جائے گا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا بہترین گواہ وہ ہے، جو بغیر مطالبہ کے ٹھیک ٹھیک گواہی دے دے، اور بدترین گواہ وہ ہے جس سے شہادت دینے کا مطالبہ کیا جائے تو وہ جھوٹی گواہی دے دے۔ اسی لیے سچی شہادت دینے کی ترغیب دی گئی ہے اور جھوٹی گواہی کی مذمت بیان کی گئی ہے۔

رفع التظالم

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی مشہور زمانہ کتاب[1] حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد رفع التظالم من بین الناس بھی ہے۔ یعنی لوگوں کے درمیان سے ظلم کو مٹانا سارے نبیوں کا دستور العمل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو لوگوں کی اصلاح کے لیے مبعوث فرمایا اور سب سے اولین اصلاح عقیدے کی اصلاح ہے۔ چنانچہ تمام انبیائے کرام اصلاح عقیدہ کو اولیت دیتے رہے۔ لوگوں کو کفر، شرک اور معاصی سے پاک کر کے انہیں توحید، ایمان اور اخلاص کی دعوت دیتے رہے۔ اس کے بعد انبیاء کے مشن میں یہ بات رہی کہ ظلم کو مٹا کر عدل و انصاف کی فضا قائم کریں۔ حضور خاتم النبیین علیہ السلام

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۵۱ ج ۱ (فیاض)

کے زمانہ میں مشرق و مغرب میں ظلم کا دور دورہ تھا، اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے اسے ختم کیا اور انصاف کا بول بالا ہونے لگا۔ ایک مومن کے دوسرے مومن پر کچھ حقوق و فرائض ہیں لَا یَظْلِمُہٗ وَلَا یَخْذُلُہٗ ایک مومن دوسرے مومن پر نہ خود ظلم کرتا ہے اور نہ اس پر ظلم کو برداشت کرتا ہے بخاری شریف میں حدیث قدسی میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، اے بنی آدم! اِنِّی حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰی نَفْسِی میں نے اپنی ذات پر ظلم کرنا حرام قرار دیا ہے۔ وَجَعَلْتُہٗ حَرَامًا بَیْنَکُمْ اور تمہارا آپس کا ایک دوسرے پر ظلم بھی حرام کر دیا ہے فَلَا تَظَالَمُوا پس کسی پر زیادتی نہ کیا کرو۔ قرآن پاک میں اللہ کا فرمان ہے۔ "وَمَا رَبُّکَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ" اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ دوسرے مقام پر فرمایا "اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ" اللہ تعالیٰ ذرہ بھر بھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا۔ بہرحال یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے عدل و انصاف کی دعوت دی ہے۔ اور ظلم و زیادتی سے روکا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان بھی ہے اُنْصُرْ اَخَاکَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ لوگوں نے عرض کیا، حضور! مظلوم کی مدد کرنا تو سمجھ میں آتا ہے مگر ظالم کی مدد کیسے ہو سکتی ہے، فرمایا تَکُفُّوْا عَنِ الظُّلْمِ اسے ظلم کرنے سے روک دو یہی اس کی مدد ہے۔ غرضیکہ ظلم سے روکنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا خود ظلم سے اجتناب کرنا۔ اگر لَا یَظْلِمُ کی روح معاشرے میں زندہ ہو تو پھر کسی سے زیادتی نہیں ہو سکتی۔ ہر ظالم ہاتھ کو مظلوم کی طرف بڑھنے سے روکنا ہوگا۔ اور یہ جذبہ اس وقت پیدا ہوگا جب انسان میں ایمان اور تقویٰ کا عنصر موجود ہوگا۔ جب تک یہ جذبہ موجود رہا، مسلمان آدھی دنیا پر حکمران رہے مگر جب یہ روح ختم ہو گئی تو اپنے ملک بھی چھن گئے، غلامی آ گئی اور لوگوں کے اخلاق بگڑ گئے وَقَاتِلُوا الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ کا یہی مطلب ہے کہ جہاں کہیں ظلم ہوتا

ہو، قریب والا فوراً مداخلت کرے اور ظلم کی بیخ کنی کرے مگر آج مسلمان سے یہ جذبہ ختم ہو چکا ہے جس کی وجہ سے ہر جگہ ذلت و ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔

قیامِ عدل

عدل و انصاف کی ذمہ داری محض حکام عدلیہ پر ہی عاید نہیں ہوتی بلکہ تمام مومنین کا بھی فرض ہے۔ کہ انصاف کی ترویج میں معاونت کریں۔ شہادت کے معاملہ میں بھی جب تک گواہ ٹھیک ٹھیک گواہی دینے میں اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں کریں گے اس وقت تک انصاف کا قیام مشکل ہے۔ سورۃ حجرات میں موجود ہے "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ" یعنی تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ اگر دو مومن بھائیوں کے درمیان جھگڑا ہو جائے "فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ" تو ان کے درمیان عدل انصاف کی رو سے مصالحت کرا دیا کرو۔

ام سلمہؓ کی روایت میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ حاکم کا فرض ہے کہ فریقین مقدمہ کے درمیان برابری کا سلوک کرے، اور کسی کے ساتھ ترجیح نہ برتے اور نہ کسی کے ساتھ رو رعایت کرے حتیٰ کہ کسی ایک فریق کی طرف آنکھ یا ہاتھ کا اشارہ بھی نہ کرے۔ امام ابوبکر جصاصؒ نے حضرت علیؓ کی روایت نقل کی ہے۔ اور صاحب تفسیر مظہریؒ نے امام اسحاق ابن راہویہؒ کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ کہ حضرت علیؓ نے کہا کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ فریقین میں سے کسی ایک کی دعوت نہ کریں کیونکہ ایسا کرنے سے ترجیح لازم آئے گی جو کہ روا نہیں۔ فرماتے ہیں کہ دونوں فریقوں کے درمیان بیٹھے حتیٰ کہ آواز بلند کرنے میں بھی مساوات قائم رکھیں۔ اگر ایک کے ساتھ درشتی سے بات کی ہے اور دوسرے کے ساتھ نرمی سے، تو اس کی بھی اجازت نہیں کیونکہ اس قسم کے افعال روحِ عدل کے منافی ہیں۔ بہرحال حق و انصاف کے تقاضے کے پیش نظر فرمایا "فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا" انصاف کے مقابلہ میں اپنی خواہش کی پیروی نہ کرو بلکہ

ہمیشہ انصاف کو ملحوظِ خاطر رکھو تاکہ کسی فریق کے ساتھ ظلم و زیادتی نہ ہونے پائے۔

صحیح شہادت صحیح فیصلہ

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے فیصلے کا مدار شہادت پر ہے۔ اگر شہادت درست ہوگی تو فیصلہ بھی درست ہوگا۔ اور اگر گواہی ہی غلط اور جھوٹی ہوگی، تو معاشرے میں انصاف کیسے قائم کیا جا سکتا ہے۔ سورۃ مائدہ میں آیا ہے وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى یعنی کسی قوم کی عداوت تمہیں خلافِ عدل کرنے پر آمادہ نہ کر دے۔ بلکہ عدل کرتے رہو کہ یہی تقویٰ کی شان کے قریب تر ہے کسی کے ساتھ تعلق، محبت اور قرابت داری کی بنا پر بھی غلط فیصلے ہوتے ہیں اور کسی کے ساتھ دشمنی، اور عداوت غلط فیصلوں پر منتج ہوتی ہے۔ لہٰذا ایسی چیزوں سے پرہیز کرو اور فیصلہ حق و انصاف کے مطابق کرو۔ اسلام کے قوانین سخت ضرور ہیں مگر اسکے نتائج اچھے نکلتے ہیں۔ صحیح فیصلہ معاشرے میں امن و امان کی ضمانت بنتے ہیں جب کہ غلط فیصلہ امن و سکون کو تباہ کر دیتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ اٰوٰى مُحْدِثًا جس نے مجرم کو پناہ دی اس پر اللہ کی لعنت ہے، اُس نے مجرم کو پناہ دیکر پوری انسانیت پر ظلم کیا ہے کیونکہ یہ چیز تقاضائے عدل کے منافی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ انصاف کے معاملہ میں نہ ذاتی خواہش کی پیروی کرو اور نہ کسی کے حق میں محبت یا کسی کے خلاف نفرت کو انصاف کی بنیاد بناؤ یہ دونوں چیزیں ناانصافی کو جنم دیتی ہیں۔

قانون پر عملدرآمد

انصاف کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ قانون پر عملدرآمد کا فقدان ہے قانون تو بنتے رہتے ہیں۔ گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے انگریزی قانون دیکھ رہے ہیں کئی قسم کی پولیس بھی موجود رہے کہیں سول پولیس ہے۔ کہیں ملٹری پولیس، کہیں سیکورٹی پولیس ہے اور کہیں خفیہ پولیس، مگر قانون پر عمل درآمد کہاں تک ہو رہا ہے ہر طرف رشوت اور اقربا پروری کا دور دورہ ہے، انصاف کہاں نصیب ہوگا اور دنیا کو چین کب حاصل ہوگا۔ صریح قتل ہو رہے ہیں، ڈاکے پڑ رہے ہیں، چوری

کی وارداتیں ہیں مگر مجرموں کو کیفر کردار تک کیوں نہیں پہنچایا جا رہا۔ لاکھ دو لاکھ روپے رشوت دیکر قاتل کو چھڑا لو۔ چور کو بری کرا لو۔ عدالتوں میں صحیح شہادت پیش نہیں ہوتی اور جج صحیح فیصلہ نہیں کر پاتے۔ اور اگر کوئی مقدمہ پایۂ تکمیل تک پہنچ ہی جاتا ہے تو اسپر عمل درآمد کہاں تک ہوتا ہے یہ سب ناانصافی کی باتیں ہیں ایک عدالت کا فیصلہ دوسری عدالت بدل دیتی ہے اور دوسری کا فیصلہ تیسری عدالت میں منسوخ ہو جاتا ہے تو مظلوم کو انصاف کہاں ملے گا، ایسی مشکلات کا حل کہاں سے میسر ہو گا اور دنیا امن کا گہوارہ کیسے بنے گی؟

فرمایا شہادت کے معاملہ میں نہایت احتیاط سے کام لو وَاِنْ تَلْوٗا اگر تم زبان کو موڑو گے اَوْ تُعْرِضُوْا یا اعراض کرو گے، مطلب یہ کہ شہادت کو توڑنے موڑنے کے لیے اپنی زبان کو اس طرح مت حرکت دو کہ اس سے معانی تبدیل ہونے کا احتمال ہو اور شہادت ہی غلط ہو جائے نیز یہ کہ شہادت کی ادائیگی سے گریز بھی نہ کرو۔ اگر شہادت مکمل نہیں ہو گی جج کسی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکیگا۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر تم شہادت کے معاملہ میں زبان کو پھیرو گے یا اعراض کرو گے فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا۔ بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے ہر کام سے باخبر ہے اگر تم گواہی دیتے وقت کج زبان استعمال کرو گے یا جان بوجھ کر شہادت کو چھپاؤ گے، یا گواہی دینے سے اعراض کرو گے تو خود مجرم بن جاؤ گے۔ سچی گواہی نہ دینا بذاتِ خود ظلم کی حمایت کرنا ہے۔ اگر ایسا کرو گے تو خدا تعالیٰ تو بہر حال تمہاری نیتوں اور ارادوں تک کو جانتا ہے۔ وہ خود تم سے نمٹ لے گا۔

درس شصت وہشت ۶۸ | آیت ۱۳۶ تا ۱۳۷

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ ءَامِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَٱلْكِتَٰبِ ٱلَّذِى نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ وَٱلْكِتَٰبِ ٱلَّذِىٓ أَنزَلَ مِن قَبْلُ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِٱللَّهِ وَمَلَٰٓئِكَتِهِۦ وَكُتُبِهِۦ وَرُسُلِهِۦ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَٰلًۢا بَعِيدًا ﴿١٣٦﴾ إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ثُمَّ كَفَرُوا۟ ثُمَّ ءَامَنُوا۟ ثُمَّ كَفَرُوا۟ ثُمَّ ٱزْدَادُوا۟ كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ ٱللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًۢا ﴿١٣٧﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر۔ اور اس کتاب پر جس کو اس نے نازل کیا ہے اپنے رسول پر اور ہر اس کتاب پر جس کو نازل کیا ہے اس نے اس سے پہلے۔ اور جو شخص کفر کریگا اللہ کے ساتھ، اس کے فرشتوں کے ساتھ۔ اسکی کتابوں کے ساتھ، اس کے رسولوں کے ساتھ۔ اور قیامت کے دن کے ساتھ، پس بیشک وہ گمراہ ہوا، اور گمراہی میں دور جا پڑا (۱۳۶) بیشک جو لوگ ایمان لائے اور پھر انہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا، پھر ایمان لائے، پھر انہوں نے کفر کیا، پھر کفر میں بڑھتے گئے، نہیں ہے اللہ تعالیٰ ایسا کہ ان کو بخش دے۔ اور نہ ان کی راہنمائی کریگا (سیدھے) راستے کی طرف (۱۳۷)

ربط آیات

گذشتہ درس میں انصاف پر قائم رہنے کی تلقین کی گئی تھی کیونکہ یہ ایک اہم اصول ہے پھر اللہ نے فرمایا کہ گواہی اللہ کیلئے دو خواہ وہ خود تمہاری ذات کے خلاف ہو یا تمہارے

والدین یا اقربا کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ پھر فرمایا کہ اپنی خواہش کی پیروی نہ کرو اور زبان کو توڑ موڑ کر شہادت کو بگاڑنے کی کوشش نہ کرو اور نہ ہی گواہی دینے سے اعراض کرو، بلکہ ہر حالت میں عدل و انصاف کو قائم رکھو۔ انصاف کے بغیر دنیا میں امن و چین نصیب نہیں ہو سکتا۔ اگر عدل نہیں ہوگا تو ظلم و زیادتی کی حکمرانی ہوگی اور انسان خرابی اور بربادی میں مبتلا رہیں گے۔ انصاف ایک بنیادی اصول ہے جسے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔ اب آج کی آیات میں وہ اصل الاصول بیان کیے گئے ہیں جن پر دین، شریعت اور اخلاق کی بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان بنیادی اصولوں پر کاربند ہونے کی تلقین کی ہے۔

مومنین سے خطاب

ارشاد ہوتا ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ اے ایمان والو اللہ پر ایمان لاؤ۔ یہاں پہ اٰمَنُوْا اور اٰمِنُوْا دو لفظ اکٹھے ہیں۔ اور یہ اشکال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ایمان والوں کو خطاب کر کے پھر انہی سے ایمان لانے کا مطالبہ کیسے کیا جا رہا ہے۔ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اٰمَنُوْا سے عام مومنین مراد ہیں، خواہ وہ مخلص ہوں یا غیر مخلص اور اٰمِنُوْا کا حکم صرف غیر مخلص مومنوں سے ہے جو ابھی تک اپنے ایمان میں خلوص پیدا نہیں کر سکے بلکہ ڈانواں ڈول ہیں۔ کبھی ایمان کی طرف مائل ہوتے ہیں اور کبھی کفر کی طرف۔ منافقین جو محض زبان سے ایمان کے دعویدار ہیں اور دل میں ایمان کیخلاف بغاوت ہے اور جس کے نتیجے میں اسلام کے خلاف ظاہری اور باطنی تدبیریں کرتے رہتے ہیں، وہ بھی اس خطاب کے مخاطبین ہیں اور انہیں حکم دیا جا رہا ہے۔ کہ گومگو کی کیفیت کو چھوڑ کر ایمان کو مکمل طور پر اختیار کر لو۔ اور اس خطاب کی دوسری توجیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ خطاب عہد الست کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ازل میں پورے عالم ارواح سے دریافت کیا تھا "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں، تو سب نے بیک زبان جواب دیا تھا "قَالُوْا بَلٰی" مولا کریم! کیوں نہیں، تو ہی ہمارا رب ہے۔ تو اب اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں

کو یہ عہد یاد دلایا ہے کہ جب ازل میں تم مجھ پر ایمان لا چکے ہو تو اب اس مادی جہان میں پہنچ کر بھی مجھ پر دل و جان سے ایمان لاؤ تاکہ اس ایمان کا صحیح نتیجہ مرتب ہو سکے۔

ایمان پر مداومت

تاہم عام مفسرین کا خیال یہ ہے۔ کہ اس خطاب کے مخاطبین میں تمام اہل ایمان شامل ہیں۔ اور اٰمِنُوْا کا مطلب یہ ہے۔ کہ اے لوگو جو ایمان لا چکے ہو، اس ایمان پر مداومت اختیار کرو۔ اور اس میں کسی قسم کا خلل نہ آنے دو۔ ظاہر ہے کہ ایمان لانے کے بعد جب کوئی شخص، کفر، شرک، نفاق یا الحاد کی کوئی بات کرتا ہے تو اس کے ایمان میں خلل آتا ہے۔ اسی خلل کو دور کرنے کے سلسلہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا امت کے نام فرمان ہے جَدِّدُوْا اِیْمَانَكُمْ بِقَوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی کلمہ طیبہ کا اعادہ کر کے اپنے ایمان کی تجدید کر لیا کرو۔ اسی کلمہ کو حضور علیہ السلام نے افضل الذکر بھی فرمایا ہے کہ یہ تجدید ایمان کا ذریعہ ہے۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو شخص غیر اللہ کے نام کی قسم اٹھائے فَلْيَقُلْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اسے فوراً لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہہ کر اپنی غلطی کا تدارک اور ایمان کی تجدید کر لینی چاہیئے۔ ایمان میں اکثر خرابی آتی رہتی ہے کافر مشرک تو ویسے ہی ایمان سے خالی ہیں مگر ایمان کے دعویداروں میں سے بھی ایک قلیل تعداد ایسی ہے جو ایمان کے ساتھ صحیح طور پر متصف ہے، وگرنہ اکثریت کے ایمان میں خلل موجود ہے اس لیے اللہ تعالےٰ نے تاکیداً فرمایا کہ اے ایمان والو، ایمان لاؤ یعنی اپنے ایمان میں اخلاص پیدا کرو اس سے خلل کو دور کرو اور اس پر مداومت اختیار کرو۔

ایمان باللہ

انسانوں کی اصلاح کے بنیادی اصولوں میں سے سب سے اہم اصول ایمان ہے اور پھر ایمان کی جزئیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کی تشریح بیان کی ہے۔ سب سے پہلے فرمایا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ اللہ پر ایمان لاؤ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لاؤ۔ اور ذات کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی صفات بھی

ہیں۔ صفات پر ایمان لانا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا ذات پر ایمان لانا چنانچہ ایمان کے متعلق بچوں بڑوں سب کو پڑھایا جاتا ہے اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ یعنی میں ایمان لایا اللہ کے ساتھ جیسا کہ اُس کے اسمائے پاک ہیں اور جن صفات کے ساتھ وہ متصف ہے، میں اُن سب پر ایمان لایا۔ اسی لیے حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ کہ جب شیطان تمہارے دل میں وسوسہ اندازی کرے اور تمہارے ایمان میں خلل اندازی کا خطرہ ہو، تو فوراً کہہ دیا کرو اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ یعنی میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کی ذات کو تو مانتا ہے مگر اُسے صفات سے عاری تسلیم کرتا ہے جیسے فرقہ معتزلہ میں سے معطلہ فرقہ۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کا منکر بھی اُسی طرح کافر ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کا منکر۔ اللہ تعالیٰ کمال صفات کا مالک ہے، وہ تمام صفات حسنہ کے ساتھ متصف ہے۔ اللہ کا ذاتی نام تو ایک ہی ہے اور رحمان، رحیم کریم، قدوس، جبار، وہاب وغیرہ اس کے صفاتی نام ہیں جو اُس کی صفات کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور ہر صفت کسی نہ کسی تجلی کی مظہر ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرح اُس کی صفات پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔

ایمان بالرسول

فرمایا ایمان لاؤ اللہ پر وَرَسُوْلِہٖ اور اس کے رسول پر علم عقاید میں رسول کی تعریف یہ کی گئی ہے بَعَثَہُ اللّٰہُ لِتَبْلِیْغِ الْاَحْکَامِ اِلَی النَّاسِ یعنی رسول وہ انسان ہوتا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ شریعت کے احکام پہنچانے کے لیے لوگوں کی طرف مبعوث کرتا ہے۔ رسول ایک لحاظ سے عام ہے اور ایک لحاظ سے خاص۔ عام اس طرح کہ انسانوں کے علاوہ فرشتے بھی رسول ہوتے ہیں جیسے فرمایا اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (سورۃ حج) اللہ تعالیٰ فرشتوں اور انسانوں میں سے رسول منتخب فرماتا ہے۔ رسول کی خصوصیت اس لحاظ سے ہے کہ وہ نبی کے مقابلہ میں خاص

ہوتا ہے۔ ہر انسان جس پر اللہ کی جانب سے وحی نازل ہوتی ہے، وہ نبی ہوتا ہے اور معصوم ہوتا ہے۔ البتہ رسول وہ ہوتا ہے۔ جس پر وحی تو بہرحال نازل ہوتی ہے مگر اس کے ساتھ اُسے کتاب یا مستقل شریعت بھی دی جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت ابُوذر غفاریؓ کی روایت اگرچہ کچھ کمزور ہے تاہم قابل لحاظ ہے آپ نے حضور نبی کریم علیہ السلام سے پوچھا حضور! پہلا نبی کون تھا۔ تو آپ نے فرمایا۔ پہلے نبی آدم علیہ السلام تھے۔ پھر عرض کیا، کیا آدم علیہ السلام نبی تھے، آپ نے فرمایا نَبِيٌّ مُكَلَّمٌ ہاں نبی تھے۔ اللہ نے ان سے کلام کیا، اُن پر وحی نازل فرمائی اور سب سے آخری نبی اور رسول حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے متعلق فرمایا وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ یعنی آپ اللہ کے رسول اور سلسلہ نبوت کی آخری کڑی ہیں۔ کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ۱۲۴ ہزار نبی اور رسول دنیا میں آئے، جن میں سے تین سو پندرہ ۳۱۵ رسول اور باقی سب نبی تھے۔ جیسا کہ عرض کیا نبی کے لیے مستقل شریعت کا ہونا ضروری نہیں بلکہ وہ پہلے سے نازل شدہ شریعت کی ہی تبلیغ کرتا ہے۔ انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہزاروں ایسے گزرے ہیں جو صرف تورات کی تبلیغ کرتے رہے، وہ کوئی نئی شریعت نہیں لائے تھے۔ جسے نئی شریعت، کتاب یا صحیفہ ملتا ہے، وہ رسول کہلاتا ہے۔

ایمان بالکتاب

فرمایا ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول پر وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ اور اس کتاب پر بھی ایمان لاؤ جسے اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا۔ الْكِتٰبِ سے مراد جنسِ کتاب ہے اور مقصد یہ ہے کہ جتنی بھی کتابیں نازل ہوئی ہیں سب پر ایمان لاؤ۔ مفسرین کرام امام شافعیؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالے نے ایک سو چار ۱۰۴ کتابیں اور صحیفے نازل فرمائے جن میں سے چار عظیم کتابیں تورات، زبور، انجیل اور قرآن ہیں اور باقی صحیفے ہیں، ان میں سے انتالیس ۳۹ صحیفے موجودہ بائیبل میں شامل ہیں۔ بہرحال صحائف میں حضرت یونس علیہ السلام حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام وغیرہم کے صحیفے ہیں۔ جن میں کچھ صحیح اور کچھ غلط ہیں

کیونکہ اہلِ کتاب کہلانے والوں نے ان میں تغیر و تبدل کر دیا ہے۔ غرضیکہ کتاب پر ایمان لانے سے مراد تمام کتب سماویہ پر ایمان لانا ہے۔ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ سے مراد قرآن پاک سے پہلے نازل ہونے والی تمام کتب اور صحائف ہیں۔

کفر اور اس کا صلہ

اب آگے ایمان کے مقابلہ میں کفر کی جزئیات اور اس کے صلہ کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاللّٰهِ جو انکار کرتا ہے اللہ کا۔ یعنی جو شخص اللہ کی ذات اور اس کی صفات پر ایمان نہیں لاتا اس کا صلہ اور نتیجہ آخر میں بیان ہوگا۔ اللہ کی صفت میں اس کی مقرر کی ہوئی تقدیر بھی ہے۔ "اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی" تقدیر کو مقرر کرنے والا خود اللہ تعالیٰ ہے اور اس کا معنیٰ یہ ہے۔ کہ کائنات میں جو کچھ ہو چکا ہے ہو رہا ہے اور آئندہ ہوگا سب اللہ تعالیٰ کے حکم، ارادے اور مشیت سے ہو رہا ہے۔ جو تقدیر کا منکر ہے وہ مومن نہیں ہو سکتا۔ پرویز جیسا منکر تقدیر ایمان سے خالی ہے کیونکہ اس نے اللہ کی صفت کا انکار کیا ہے۔

انکار ملائکہ

فرمایا جو انکار کرتا ہے اللہ کا وَمَلٰٓئِكَتِهٖ اور اس کے فرشتوں کا فرشتوں کا انکار کرنا بھی ایمان کے منافی ہے۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی پیدائش سے لاکھوں، کروڑوں سال پہلے اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو پیدا کیا۔ یہ ایک لطیف مخلوق ہے اور بنی نوع انسان کی مصلحت فرشتوں پر موقوف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات حد درجہ بلند و بالا ہے اُس نے اپنا فیض انسانوں تک پہنچانے کے لیے فرشتوں کو مقرر کیا ہے۔ اللہ کا پیغام فرشتے ہی بنی نوع انسان تک پہنچاتے رہے ہیں۔ جو شخص فرشتوں کے وجود کا انکار کرتا ہے۔ وہ بھی ایماندار نہیں۔ پرویز اور مشرقی وغیرہ منکرین ملائکہ میں سے ہیں۔ اُن کا نظریہ ہے کہ انسان کی اچھی صفت کا نام ملائکہ اور غضبی قوت کا نام شیطان ہے۔ اس قسم کی ملحدانہ تاویلیں انکار ملائکہ پر مبنی ہیں اور

ایسے شخص کے کفر پر دلالت کرتی ہیں۔ فرشتے اللہ کی لطیف مخلوق ہیں، ان کے اجسام ہیں جن میں روحیں ہیں، ان میں ادراک کا مادہ پایا جاتا ہے۔ اور ان کو بالفعل کمال حاصل ہے۔ اسی طرح شیطان کا بھی وجود ہے ان میں سے ہر ایک کا جسم اور روح ہے، وہ بھی ادراک و شعور رکھتے ہیں۔ ان کا ذکر قرآن پاک میں صراحتاً موجود ہے۔ لہٰذا ان کے انکار پر مبنی تاویلیں کرنے والا ملحد اور کافر شمار ہوگا۔

انکارِ کتب

فرمایا جو انکار کرتا ہے اللہ کا، اس کے فرشتوں کا وَكُتُبِهٖ اور اس کی کتابوں کا۔ ایمان کے سلسلے میں کتاب واحد کا صیغہ استعمال کیا گیا تھا، اب کتب میں جمع کا صیغہ ہے۔ اور مقصد یہ ہے۔ کہ جتنی بھی آسمانی کتابیں ہیں ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے، ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی انسان پر کفر لازم آنے کے لیے کافی ہے۔ سورۃ بقرہ میں آچکا ہے "وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَّبِّهِمْ" ہر اس کتاب پر ایمان لانا ضروری ہے جو نبی آخر الزمان پر نازل ہوئی اور جو اس سے پہلے دیگر انبیائے کرام لے کر آئے تمام کتب سماویہ برحق ہیں، اللہ نے انسانوں کی راہنمائی کے لیے نازل فرمائیں اور ہمارا ان سب پر ایمان ہے۔ اور ایمان صرف اس چیز پر ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات اور انجیل کی صورت میں نازل فرمایا یا دوسرے انبیا پر جو کچھ نازل کیا۔ بعد میں اہل کتاب نے جو تحریف کر دی ہے، اس پر ہمارا ایمان نہیں۔ تحریف کو خود عیسائیوں نے ان الفاظ میں تسلیم کیا ہے۔ کہ انجیل میں ہزاروں غلطیاں موجود ہیں۔ انہوں نے قرآن پاک کا انکار کر کے کفر کا ارتکاب کیا بعض کافر اور مشرک بھی کہتے تھے "مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ" اللہ نے کسی انسان پر کوئی چیز نازل نہیں کی۔ وہ لوگ تمام کتب سماویہ کا انکار کرتے تھے، تو فرمایا جس نے کتابوں کا انکار کیا۔

انکارِ رسل

فرمایا وَرُسُلِهٖ جس نے اللہ کے رسولوں کا انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ انبیا اور رسل کو انسانوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے مبعوث فرماتا ہے۔ ان کی تصدیق

کرنا اور ان پہ ایمان ضروری ہے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ان میں سے کسی ایک رسول کا انکار تمام کے انکار کے برابر ہے۔ اللہ کے نبی اور رسول اس کے منتخب اور برگزیدہ انسان ہیں۔ اُس نے وحی نازل فرمائی اور انہیں انسانوں کی راہنمائی پہ مامور کیا۔ اُن سب پہ ایمان لانا ضروری ہے۔ نصاریٰ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا انکار کر کے کافر ہوئے اور یہودی حضرت عیسٰی علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پہ ایمان نہ لانے کی وجہ سے کفر کے مرتکب ہوئے۔ وہ تو صرف اُن انبیاء پہ ایمان رکھتے ہیں۔ جن کا ذکر تورات میں موجود ہے، لہٰذا وہ بھی منکرین کی صف میں شامل ہوئے۔

انکار قیامت

پانچویں نمبر پہ فرمایا وَالْيَوْمِ الْآخِرِ جس نے آخرت کے دن یعنی قیامت کا انکار کیا، وہ بھی منکرین کے گروہ میں شامل ہو گیا آخرت پہ ایمان لانا بھی جزوِ ایمان ہے۔ اس کے بغیر انسان مومن نہیں ہو سکتا بلکہ کافر ہی رہے گا اگرچہ وہ باقی چیزوں پہ ایمان لے آئے۔ قیامت کا دن جزائے عمل کا دن ہے۔ اس دنیا میں کیے گئے ہر کام کی جزا یا سزا کے لیے ایک دن مقرر ہے۔ اگر اُس کا انکار کر دیا جائے تو دین کی ساری عمارت ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ جزا و سزا کا تصور ہی انسان کو احکامِ الٰہی پہ عمل کی ترغیب دیتا ہے۔ جب اسی پہ ایمان ختم ہو گیا تو اوامر و نواہی کا تمام تصور ختم ہو گیا، لہٰذا قیامت پہ ایمان لانا بھی ضروری ٹھہرا۔

الغرض یہاں پہ تمام اجزائے ایمان کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا جس نے کفر کیا اللہ کے ساتھ، اس کے فرشتوں کے ساتھ اس کی کتابوں اور رسولوں کے ساتھ اور جس نے قیامت کے دن کا انکار کیا فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا وہ شخص گمراہ ہو گیا اور گمراہی میں دور جا پڑا۔ مطلب یہ کہ ایمانیات کا انکار کرنے والے کا صلہ یہ نکلا کہ وہ اصل راستے سے بھٹک کر دور چلا گیا۔

مرتدین کا کردار

اگلی آیت میں بار بار ایمان لانے اور بار بار کفر کرنے کا بیان ہے۔ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ آیت اعتقادی منافقوں کے متعلق ہے اور بعض

دوسرے فرماتے ہیں کہ یہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی تاہم بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت عام ہے اور اس مرتد پہ صادق آتی ہے جو ایک دفعہ ایمان لانے کے بعد ہمیشہ کے لیے مرتد ہو جائے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے ثُمَّ کَفَرُوْا پھر انہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا، جیسا کہ منافقین یا اہل کتاب کا شیوہ ہے۔ اہل کتاب حضرات عیسیٰ اور موسیٰ علیہما السلام پہ ایمان لائے مگر جب حضور خاتم النبیین علیہ السلام کا زمانہ پایا تو صاف انکار کر گئے۔ یہ لوگ کافر ہی رہیں گے فرمایا ثُمَّ اٰمَنُوْا پھر ایمان لائے ثُمَّ کَفَرُوْا پھر انکار کر گئے یعنی ایک دفعہ ایمان لانے کے بعد کسی نے کفر کیا مگر پھر ایمان لے آیا تو اس کی توبہ قبول ہے۔ لیکن جو مستقل طور پہ مرتد ہو گیا ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا پھر وہ کفر میں بڑھتے چلے گئے۔ وہ خذلان کا شکار ہو گئے۔ ایسے لوگ ایمان سے کھیلتے رہتے ہیں اور آخر کار ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتے ہیں۔

ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا لَمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو معاف نہیں فرماتا کیونکہ وہ کفر پہ پختہ ہو جاتے ہیں۔ تَوْبَۃُ الْعَبْدِ مَا لَمْ یُغَرْغِرْ یعنی توبہ تو نزع کی حالت سے پہلے پہلے قبول ہے، اور معاف فرما دیتا ہے۔ مگر جو لوگ کفر میں اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ ان کی واپسی کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا، ان کے متعلق فرمایا کہ ان کی معافی کی کوئی صورت باقی نہیں رہی وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ سَبِیْلًا اور نہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت دیتا ہے وہ ہدایت کے طالب ہی نہیں ہوتے۔ وہ کسی خود غرضی یا کسی کے ساتھ دشمنی کی وجہ سے ایمان لاتے ہیں مگر جب اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر کفر کا راستہ پکڑ لیتے ہیں اور اس طرح دائمی محرومی کا شکار ہو جاتے ہیں اب اگلی آیت میں اعتقادی منافقوں کے متعلق بعض تفصیلات بیان ہوں گی۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِأَنَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٣٨﴾ الَّذِينَ
يَتَّخِذُونَ الْكٰفِرِينَ أَوْلِيَآءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ؕ
أَيَبْتَغُونَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا ﴿١٣٩﴾ؕ
وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ
اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا
مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۚۖ إِنَّكُمْ
إِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ إِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِينَ وَالْكٰفِرِينَ
فِي جَهَنَّمَ جَمِيعًا ﴿١٤٠﴾ الَّذِينَ يَتَرَبَّصُونَ بِكُمْ ۚ
فَإِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوا أَلَمْ
نَكُنْ مَّعَكُمْ ۚۖ وَإِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِينَ نَصِيبٌ ۙ
قَالُوا أَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ
مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ؕ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ ؕ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِينَ عَلَى
الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا ﴿١٤١﴾ ع ۲۰/۱۷

ترجمہ: آپ منافقوں کو خوشخبری سنا دیں کہ بیشک
اُن کے لیے درد ناک عذاب ہے ﴿۱۳۸﴾ وہ (منافق) جو بناتے

ہیں کافروں کو اپنا ساتھی مومنوں کے سوا ، کیا یہ تلاش کرتے ہیں
ان کے پاس عزت ، پس بیشک عزت اللہ ہی کے لیے ہے سب
کی سب (۱۳۹) اور تحقیق اُتارا ہے اُس نے تم پر کتاب میں
(یہ حکم) کہ جب تم سُنو کہ اللہ کی آیتوں کے ساتھ کفر کیا جاتا ہے
اور ٹھٹا کیا جاتا ہے ، پس نہ بیٹھو اُن کے ساتھ یہاں تک
کہ وہ گھس جائیں ، اس کے علاوہ کسی دوسری بات میں ، بیشک
تم اُس وقت اُن جیسے ہو گے تحقیق اللہ تعالیٰ اکٹھا کرنیوالا ہے
منافقوں اور کافروں کو جہنم میں سب کو (۱۴۰) وہ جو انتظار کرتے
ہیں تمہارے بارے میں اور اگر تم کو فتح نصیب ہو اللہ کی
جانب سے تو کہتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھی نہیں تھے ؟
اور اگر کافروں کا حصہ ہو ، تو کہتے ہیں کیا ہم نہیں غالب
آگئے تھے تم پر اور کیا ہم نے نہیں حفاظت کی تمہاری مومنوں
سے پس اللہ تعالیٰ ہی فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت
کے دن اور ہرگز نہیں بنایا اللہ نے کافروں کے لیے مومنوں
پر کوئی راستہ (۱۴۱)

ربطِ آیات

گذشتہ درس میں ایمان کی تفصیلات بیان ہوئی تھیں۔ اللہ نے ان اجزائے ایمان کا ذکر کیا جن پر ایمان لانا اور دِل سے ان کی تصدیق کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مرتدین کا ذکر کیا ، جو ایمان لانے کے بعد پھر کفر اختیار کر لیتے ہیں۔ بعض لوگ بار بار ایمان لاتے اور بار بار پھر جاتے ہیں ، ایسے لوگ اکثر محروم رہتے ہیں اُن کی لغزشیں معاف نہیں ہوتیں۔ اور نہ ہی صحیح راستہ ملتا ہے ویسے اسلامی حکومت میں مرتد کے لیے حکم یہ ہے۔ کہ اُس پر اسلام پیش کیا جائے ، علماء کو جمع کر کے اگر کوئی غلط فہمی ہے تو اُسے دُور کیا جائے ، اگر وہ مان جائے تو اس سے توبہ کرا کے دوبارہ

اسلام میں داخل کیا جائے۔ اور اگر اس کے باوجود ایمان لانے پر آمادہ نہ ہو، تو ایسے غدارِ ملت کے لیے سزائے موت واجب ہو جاتی ہے۔ صحابہ کرام رضؓ کے زمانہ میں ایسے کئی کیس آئے جن میں سزائے موت دی گئی۔

مرتدین کے بعد آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کا تذکرہ فرمایا ہے۔ منافقوں کی دو قسمیں ہیں یعنی اعتقادی منافق اور عملی منافق۔ اعتقادی منافق وہ ہوتا ہے جو زبان سے ایمان کا اقرار کرے مگر دلِ کفر سے لبریز ہو، اعتقادی منافق کافروں کی بدترین قسم ہے۔ حقیقت میں یہ کافر ہی ہوتے ہیں مگر انہیں منافق اس لیے کہتے ہیں کہ یہ زبان سے اقرارِ ایمان کرتے ہیں۔ منافقوں کے ساتھ سلوک بھی کفار سے مختلف ہوتا ہے۔ کفار کے ساتھ تو علی الاعلان جہاد کا حکم ہے مگر منافق چونکہ بظاہر کلمہ گو ہوتے ہیں۔ لہٰذا اُن کے متعلق حکم ہے وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ یعنی اُن پر زبانی طور پر سختی کی جائے تاکہ لوگ اُن سے محتاط ہو جائیں، یہ لوگ ریشہ دوانیاں کرتے ہیں اور دین کو نقصان پہنچاتے ہیں، بہر حال آج کے درس میں اللہ نے انہی منافقوں کا ذکر کیا ہے۔ اُن کی کارگزاری بیان کر کے اُن کی مذمت بیان فرمائی ہے اور پھر اُن کے انجام کا تذکرہ کیا ہے۔

منافقوں کے لیے بشارت

ارشاد ہوتا ہے۔ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ منافقوں کو بشارت سنا دیجئے۔ بشارت کا معنی عام طور پر خوشخبری ہوتا ہے اور یہ خوشی کے موقع پر دی جاتی ہے مگر یہاں پر تو عذابِ الیم کی خبر دی جا رہی ہے۔ بشارت کا لفظ یہاں خاص طور پر منافقوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اس مقام پر بشارت کا لفظ بطور تحکم استعمال ہوا ہے۔ چونکہ منافق بدترین قسم کے لوگ ہوتے ہیں انہیں استہزاء کی شکل میں خطاب کیا گیا ہے۔ کہ ذرا انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سُنا دیجئے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں بشارت کا معنی روایتی خوشخبری نہیں بلکہ محض خبر ہے۔ اور مراد یہ ہے۔ کہ ان منافقین کو

خبردار کر دیا جائے کہ وہ بدترین انجام سے دوچار ہونے والے ہیں۔ چنانچہ فرمایا، کہ منافقین کو خوشخبری دے دیجئے۔ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيمًا کہ ان کیلئے دردناک عذاب تیار ہے، انہیں ان کے نفاق کا بدلہ مل کر رہے گا۔

کفار کی دوستی

فرمایا منافقین وہ لوگ ہیں اَلَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ جو مومنوں کے علاوہ کافروں کو اپنا دوست بناتے ہیں منافقوں کا کام یہی ہوتا ہے کہ کبھی ادھر سازباز کی کبھی اُدھر، کبھی ایک رُخ اختیار کیا کبھی دوسرا رُخ، ادھر کی بات ادھر چلا دی۔ انکی کارگزاری ایسی ہی ہے۔ حالانکہ دوستی تو ہمیشہ مومنوں کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ ایک مومن کی دوستی کافر اور منافق کے ساتھ نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ دونوں کا نصب العین مختلف ہے، ان کی منزل مقصود جُدا جُدا ہے۔ اس مسئلے کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اہل ایمان منافقوں کے ساتھ خوش اخلاقی اور رواداری سے تو پیش آسکتے ہیں مگر ان کے ساتھ دلی دوستی نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا کریں گے تو ان کے اپنے ایمان میں خلل واقع ہونے کا خدشہ ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ مومنوں کے علاوہ منافقوں کو دوست نہ بناؤ۔

عزت کی تلاش

فرمایا اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ اے گروہِ منافقین! کیا تم کفار کے پاس عزت کی تلاش میں جاتے ہو، عزت کا معنیٰ قوت اور غلبہ ہوتا ہے۔ عزیز اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، جس کا معنیٰ قوت والا اور کمال قدرت کا مالک ہے۔ عربی مقولہ ہے مَنْ عَزَّ بَزَّ جو غالب ہوتا ہے وہ دوسرے پر چھا جاتا ہے۔ الغرض! منافقوں کو فرمایا کیا تم کافروں کے ہاں عزت چاہتے ہو، بلکہ حقیقت حال یہ ہے فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ساری کی ساری عزت تو اللہ کے پاس ہے۔ اَلْعَزِيْزُ تو خدا تعالیٰ ہے۔ تم عزت کی تلاش میں کہاں مارے مارے پھرتے ہو، اللہ تعالیٰ خود بندے کی زبان سے کہلاتے ہیں وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ

اے مولا کریم! تو ہی جسے چاہے عزت دے دے اور جسے چاہے ذلیل و خوار کر دے۔ اَلْمُعِزُّ وَالْمُذِلُّ بھی اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ وہ جسے چاہے غلبہ عطا کر دے اور جسے چاہے مغلوب کر کے رسوا کر دے۔ تو فرمایا عزت حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے لیے اس کے رسول کے لیے اور پھر اہلِ ایمان کے لیے ہے۔ عزت ایمان اور نیکی کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے مگر منافق اس کی تلاش میں کافروں سے دوستی کرتے ہیں، انہیں کچھ حاصل نہیں ہو گا۔

اہلِ باطل کی مجلس

فرمایا منافقین اپنے مذموم مقصد کے حصول کے لیے اہل باطل کی مجلس میں جاتے ہیں اور ان کی خوشامد کرتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ ہے۔ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ کہ اس نے کتاب یعنی قرآن پاک میں تمہارے لیے یہ حکم نازل فرمایا ہے۔ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا کہ جب تم اللہ کی آیات کے ساتھ کفر اور استہزا کو سنو فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ تو ان لوگوں کے پاس مت بیٹھو۔ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں۔ مقصد یہ ہے کہ جب کفار کی مجلس میں آیات الٰہی اور شعائرِ دین کا انکار کیا جا رہا ہو اور ان کے ساتھ ٹھٹا کیا جا رہا ہو تو ایسی مجلس میں ہرگز نہ بیٹھو کہ یہ غیرتِ اسلامی کے خلاف ہے اور اگر وہاں دین پر طعن و تشنیع کرنے کی بجائے کوئی دوسری بات ہو رہی ہو تو پھر تمہیں وہاں بیٹھنے کی اجازت ہے۔

حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اہل باطل کی مجلس میں جانے کی مختلف صورتیں ہیں۔ اگر ایسی مجلس میں احکام الٰہی اور آیات اللہ کے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہو اور وہاں بیٹھنے والا اس کو پسند کر رہا ہے تو وہ بھی کافر ہو گیا۔ اور اگر وہ شخص دین کی توہین کو دل سے تو پسند نہیں کرتا مگر وہاں پر بلا وجہ بیٹھا بھی رہتا ہے تو وہ فاسق ہے۔ البتہ اگر وہ کسی مقصد کی خاطر وہاں

بیٹھا ہے۔ مجبور ہے مگر دل سے توہین آمیز باتوں کو برا سمجھتا ہے تو ایسی صورت میں اس کا بیٹھنا مباح ہے اور چوتھی صورت یہ ہے کہ بیٹھنے والا شخص اس نیت سے ایسی مجلس میں بیٹھتا ہے کہ دین کے حق میں تبلیغ کرے تو پھر اس کا بیٹھنا عبادت میں شمار ہوگا۔ بہرحال فرمایا کہ کافروں کے پاس بلاوجہ مت بیٹھو، کیونکہ اگر ایسا کرو گے۔ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ تو تم بھی انہی کی طرح ہو جاؤ گے۔ وہ قرآن پاک اور اللہ کے نبی کا استہزا کرتے ہیں اور تم ان کی مجلس میں شریک ہوتے ہو، تو تم بھی اُن کی طرح سخت گنہگار ہو گے، حالانکہ مومن کیلیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يَجْلِسُ عَلٰى مَائِدَةٍ يُدَارُ عَلَيْهَا الْخَمْرُ جو شخص اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اُسے ایسی جگہ بیٹھنا درست نہیں جہاں شراب کا دور چل رہا ہے۔ اگرچہ یہ خود نہیں پیتا مگر شرابیوں کی مجلس میں بیٹھنے سے بھی منع فرما دیا۔ مقصد یہ کہ جہاں برائی کا کام ہو رہا ہو، اس کے قریب نہیں جانا چاہیئے اس لیے اہل باطل کی مجالس میں بلاوجہ جانے کا حکم نہیں ہے۔

اسلام کے ساتھ استہزاء

باطل قوتیں اسلام کے ساتھ استہزاء کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں۔ جہاں اللہ کی آیتوں کے ساتھ ٹھٹھا ہو رہا ہو، مومن کی شان نہیں ہے کہ وہاں جائے مگر اب تو ایسی مجلسوں میں جانا فیشن بن چکا ہے۔ کفار خصوصاً یہود، ہنود اور نصاریٰ نے اسلام کی تذلیل کے لیے کئی طریقے نکالے ہیں۔ خاص طور پر یہودی اس معاملہ میں بہت آگے ہیں۔ تقریباً پانچ سال پہلے اخبارات میں یہ خبر چھپی تھی کہ یورپ کی منڈیوں میں عورتوں کے ایسے انڈرویئر (زیر جامہ) موجود ہیں جن پر کلمہ طیبہ لکھا ہوا ہے۔ بعض خبیثوں نے ایسی قمیصیں تیار کیں جن کے پچھلے حصے پر آیت الکرسی لکھی ہوئی ہے اور جب آدمی بیٹھتا ہے تو آیت الکرسی والا حصہ نیچے آجاتا ہے یہ یہودیوں کی سازش ہے تاکہ اہل ایمان کو اذیت پہنچے۔ گذشتہ دنوں ایسی ماچس تیار کی گئی جس پر کلمہ طبع تھا۔ لوگ ماچس

استعمال کر کے ڈبیہ پھینک دیتے اور اس طرح کلمہ طیبہ کی توہین ہوتی۔ شکیب ارسلان مرحوم نے اپنی کتاب حاضر العالم الاسلامی میں لکھا ہے کہ گزشتہ صدیوں کے دوران انگریزوں اور امریکیوں نے اسلام کے خلاف چھ لاکھ کتابیں شائع کیں۔ شکیب ارسلان جرمن میں مقیم تھا، وہ یورپ کے حالات سے واقف تھا، اور ان کے خلاف لکھتا رہتا تھا۔ انگریز کا سخت مخالف تھا، جلاوطن بھی رہا، ترکوں کے زمانے میں ہسپتالوں کا انچارج تھا۔ جنگ عظیم میں شکست کے بعد یورپ میں پھرتا رہا، بڑا جاگیردار تھا مگر مسلمان ہونے کی وجہ سے مشکلات کا شکار رہا۔

مسلمانوں کی ایذا رسانی کے لیے ایک انگریز نے اپنے کتے کا نام احمد رکھا۔ دنیا بھر میں احتجاج ہوا تو اس نے معذرت کر لی کہ اُسے علم نہیں تھا غلطی سے ایسا ہوا۔ اسی طرح ایک یہودی نے حضرت علیؓ کے متعلق (العیاذ باللہ) لنگور کا لفظ استعمال کیا تھا۔ یہ سب اسلام اور مسلمانوں کے استہزا کے طریقے ہیں جو اغیار استعمال کرتے رہتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا، یاد رکھو! اِنَّ اللّٰہَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْکٰفِرِیْنَ فِیْ جَهَنَّمَ جَمِیْعًا اللہ تعالیٰ ان منافقوں اور کافروں سب کو جہنم میں اکٹھا کرنے والا ہے۔ اعتقادی منافقوں کا ٹھکانا لازماً جہنم ہے۔ ان کے دل ایمان سے خالی ہیں اور ان کا گٹھ جوڑ کفار کے ساتھ ہے۔

دوعملی پالیسی

ان منافقین کی خباثتوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے فرمایا اَلَّذِیْنَ یَتَرَبَّصُوْنَ بِکُمْ یہ لوگ تمہارے بارے میں گردشوں کا انتظار کرتے ہیں فَاِنْ کَانَ لَکُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْۤا اَلَمْ نَکُنْ مَّعَکُمْ اگر تمہیں فتح حاصل ہو جائے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو فوراً بول اٹھتے ہیں، کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے۔ یعنی ہم تو تمہاری ہی پارٹی کے آدمی ہیں۔ وَاِنْ کَانَ لِلْکٰفِرِیْنَ نَصِیْبٌ اور اگر کافروں کو کچھ حصہ مل جائے، ان کو کہیں غلبہ حاصل ہو جائے۔ قَالُوْۤا تو کہتے ہیں۔

اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ کیا ہم تم پر غالب نہیں آگئے تھے؟ کافروں سے کہتے ہیں کہ ہم نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر تمہیں زیر کر لیا تھا پھر ہم نے چکر چلایا وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اور مسلمانوں سے بچایا ورنہ تمہیں سخت نقصان پہنچتا۔ دیکھو! ہم نے تمہارے اوپر احسان کیا کہ مسلمانوں سے تمہاری جان چھڑائی۔ اس طرح وہ کافروں کی ہمدردی حاصل کرتے ہیں۔ فرمایا منافقوں کی یہ سازشیں اِدھر ہی رہ جائینگی فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا۔ اُس دن پتہ چلیگا کہ منافقین کیسی کیسی سازشیں کرتے تھے اور اہل ایمان کا طرز عمل کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اصول کے طور پر سمجھا دیا وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے مومنوں پر کوئی راستہ نہیں بنایا۔ مطلب یہ ہے کہ مومن اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہیں اور کفار انہیں زک نہیں پہنچا سکیں گے بلکہ وہ خود ہی ذلیل و خوار ہو کر رہ جائیں گے اور اسلام ہی غالب رہیگا۔

غلبۂ اسلام

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس غلبے سے مراد دلیل کے اعتبار سے غلبہ ہے۔ اللہ نے اہل ایمان کو دلائل کے لحاظ سے کفر پر ہمیشہ غالب رکھا ہے بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ دلیل کے اعتبار سے تو اسلام ہمیشہ کفر پر غالب ہے مگر یہاں پر پولٹیکل غلبہ ہی مراد ہے۔ اور اس سے مقصود یہ ہے کہ ایمان والوں کو چاہیئے کہ وہ کافروں کو غلبہ کا کبھی موقع نہ دیں، کیونکہ اگر کفار کو غلبہ حاصل ہو گیا تو اسلام کو سخت نقصان پہنچے گا۔ مگر افسوس کا مقام ہے، کہ آج مسلمان اِن احکام سے غافل ہو کر اغیار کا مغلوب ہو چکا ہے۔ اس میں حُبِ مال اور حُبِ جاہ جیسی بیماری پیدا ہو گئی ہے جس کی وجہ سے اس میں ضعف آ گیا۔ دنیا طلبی نے مسلمان کو کفار کا مغلوب کر دیا۔ اس وقت دنیا کی سیاست پر یہودیوں، عیسائیوں اور دہریوں کا قبضہ ہے اور مسلمان ہر طرف

ذلیل وخوار ہو رہے ہیں۔ بزرگانِ دین کا مقولہ ہے اَلدُّنیَا جِیفَۃٌ وَطَالِبُھَا کِلَابٌ یعنی دنیا ایک مردار ہے اور اس کے طالب کتے ہیں۔ جو لوگ دنیا کے پیچھے بھاگتے ہیں اُن کی حیثیت کتوں جیسی ہے اللہ تعالیٰ کا حکم تو یہ ہے کہ دنیا میں اسلام کا غلبہ ہو مگر ہم نے اس سبق کو فراموش کر دیا ہے۔ آج مسلمان عیاشی اور فحاشی میں مبتلا ہو کر قرآن کا پروگرام فراموش کر چکا ہے جس کی وجہ سے کفار کا دست نگر بن گیا ہے۔ مسلمانوں کی یہ حالت تاتاریوں کے زمانہ سے شروع ہوئی اور اب بحیثیت مجموعی اہلِ اسلام کا قدم پھسل چکا ہے اب مشرق والے مغرب والوں کی خوشامد پر امید لگائے بیٹھے ہیں۔ اُن کی طرف سے امداد کے منتظر رہتے ہیں۔ مگر جب تک اللہ تعالیٰ خود امداد نہ کرے، نہ کوئی مدد کر سکتا ہے اور نہ عزت دے سکتا ہے۔ عزت و ذلت تو اس مالک الملک کے ہاتھ میں ہے۔ تمہاری عزت تو دین میں تھی جسے تم نے خود اپنے ہاتھوں سے گنوا دیا۔

مرتد اور نکاح

"اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ" کے مصداق مرد عورتوں کے نگران، محافظ اور سرکردہ ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے خاوند غالب اور بیوی مغلوب یا ماتحت ہوتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔ کہ اگر خاوند مرتد ہو جائے، تو بیوی اس کے نکاح میں نہیں رہ سکتی۔ اصول یہ ہے کہ مسلمان کافر کا مغلوب نہیں ہو سکتا۔ بیوی چونکہ مسلمان ہے لہٰذا وہ مرتد یعنی کافر آدمی کی مغلوب یعنی بطور بیوی نہیں رہ سکتی۔ یہ الگ بات ہے۔ کہ مرتد پر دوبارہ اسلام پیش کیا جائے گا۔ اگر وہ ایمان لے آئے تو ٹھیک ہے ورنہ عورت جدا ہو جائیگی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنین پر کافروں کے لیے کوئی راستہ نہیں بنایا۔ بہر حال اہلِ ایمان کو کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ غیر مسلموں کے مغلوب نہ ہوں۔ یہ مقصد قربانی اور آخرت طلبی سے حاصل ہو گا۔ مگر افسوس کہ آج مسلمان دنیا کے طالب ہو کر آخرت کو بھول چکے ہیں۔ آخرت کا طالب

کوئی خال خال ہی نظر آتا ہے، وگرنہ سب کھیل تماشے اور لہو ولعب میں مشغول ہیں۔ آج جو چند لوگ دین کی تعلیم حاصل بھی کرتے ہیں وہ بھی دنیا کے پیچھے بھاگتے ہیں اور نوکری کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں دین کو غالب کرنے کی تڑپ ختم ہو چکی ہے۔ اسلام کو سیاسی غلبہ جنگ صفین تک حاصل رہا مگر اس کے بعد اہل اسلام کا زوال شروع ہو گیا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے منافقین کا راستہ اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اب اگلی آیات میں منافقین کی مزید مذمت اور ان کے انجام کا ذکر ہے اور اہل ایمان کے لیے مزید تبلیغ ہے۔

إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَإِذَا
قَامُوْٓا إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ
وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا ﴿١٤٢﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ
ذٰلِكَ ۖ لَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۗ وَمَنْ يُّضْلِلِ
اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿١٤٣﴾ يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ أَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ
الْمُؤْمِنِيْنَ ۗ أَتُرِيْدُوْنَ أَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ
سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿١٤٤﴾ إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ
الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿١٤٥﴾
إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَأَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَأَخْلَصُوْا
دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَأُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۗ وَسَوْفَ
يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ أَجْرًا عَظِيْمًا ﴿١٤٦﴾ مَا يَفْعَلُ
اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۗ وَكَانَ
اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿١٤٧﴾

ترجمہ : بیشک منافق دغابازی کرتے ہیں اللہ کے ساتھ
اور وہ اُن کو اُن کی دغابازی کا بدلہ دیتا ہے اور جب یہ

منافق کھڑے ہوتے ہیں نماز کی طرف، تو کھڑے ہوتے ہیں سست دکھاوا کرتے ہیں لوگوں کے سامنے، اور نہیں یاد کرتے اللہ تعالیٰ کو مگر بہت تھوڑا ﴿۱۴۲﴾ یہ اس کے درمیان متردد ہیں، نہ ان کی طرف اور نہ اُن کی طرف، اور جس شخص کو اللہ بہکا دے، پس ہرگز نہ پائیگا تو اُس کے لیے کوئی راستہ ﴿۱۴۳﴾ اے ایمان والو! نہ بناؤ کافروں کو اپنا دوست مومنوں کو چھوڑ کر، کیا تم چاہتے ہو کہ بنالو اللہ کے لیے تمہارے اوپر صریح الزام ﴿۱۴۴﴾ بیشک منافق لوگ دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے اور تو اُن کے لیے ہرگز نہ پائے گا کوئی مدد گار ﴿۱۴۵﴾ مگر وہ لوگ جنہوں نے توبہ کر لی اور اصلاح کرلی اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور انہوں نے اپنے دین کو خالص بنایا اللہ تعالیٰ کے لیے، یہی لوگ ہیں ایمان والوں کے ساتھ اور عنقریب اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو بہت بڑا اجر دے گا ﴿۱۴۶﴾ کیا کرے گا اللہ تعالیٰ تمہیں سزا دے کر اگر تم شکر گزاری کرو گے اور ایمان لاؤ گے اور اللہ تعالیٰ بڑا قدردان ہے اور سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۴۷﴾

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی سزا کا ذکر کیا تھا کہ کافروں اور منافقوں سب کو جہنم میں اکٹھا کیا جائے گا، منافق لوگ کافروں کے ساتھ تعلق جوڑتے ہیں اور اُن کو اپنا دوست اور رفیق بناتے ہیں ان کے ہاں عزت تلاش کرتے ہیں تاکہ گردش آنے کی صورت میں ذلیل نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا بھی ردّ فرمایا، اور صاف حکم دیا کہ جب اللہ کی آیتوں کے ساتھ ٹھٹا کیا جا رہا ہو، تو ایسی مجلس میں کسی مومن کو بیٹھنے کی اجازت نہیں۔ ان منافقوں کا حال یہ ہے کہ کافروں کی مجلس میں جا کر اُن کی خوشامد کرتے ہیں اور مومنوں کے پاس آکر ان کی چاپلوسی کرتے ہیں تاکہ اُن دونوں گروہوں میں سے

جن کا پہلو غالب ہو، اسی کے ساتھ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی دوغلی پالیسی کی مذمت بیان فرمائی۔ اب آج کے درس میں منافقین کی مزید کارگزاریوں اور اُن کے انجام کا ذکر فرمایا ہے۔

دھوکہ دہی

ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ بیشک منافق لوگ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دیتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کو کیسے دھوکہ دیا جا سکتا ہے جب کہ وہ ہر چیز سے واقف ہے۔ دھوکہ تو ناواقف آدمی کھاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کی ذات تو اعلیٰ وارفع اور اُن چیزوں سے پاک ہے، پھر اللہ کو دھوکہ دہی کا کیا مطلب؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ سے ایسا معاملہ کرتے ہیں جیسا کہ کوئی دھوکے باز کسی دوسرے آدمی کے ساتھ ہیرا پھیری کرتا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ بظاہر اسلام ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، کلمہ پڑھتے ہیں، نمازیں ادا کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں مگر دل میں کفر بھرا ہوا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس دوغلی پالیسی سے وہ اہل ایمان اور خود اللہ کو دھوکہ دے رہے ہیں مگر وہ فرماتا ہے وَھُوَ خَادِعُھُمْ کہ اللہ بھی اُن کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرتا ہے۔ جیسا وہ اللہ کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس مقام پر خَادِعُھُمْ مشاکلت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ کہ جس طرح وہ دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ بھی اُن کو ویسا ہی بدلہ دیتا ہے۔ اور یہ اس صورت میں ہے۔ کہ منافقوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ اُن کے نفاق کو ظاہر فرما دیتا ہے اور وہ خود بھی اپنے اعمال سے اس کا ثبوت پیش کر دیتے ہیں۔ مگر اُن کے ساتھ کفار کا سا سلوک کرنے کا حکم نہیں۔ کفار کے ساتھ ہمیشہ حالتِ جنگ کا معاملہ ہوتا ہے، مگر منافقوں کے ساتھ مسلمانوں جیسا سلوک ہی کیا جاتا ہے۔ جس طرح مخلص مسلمانوں کی مال، جان، عزت، آبرو محفوظ ہوتی ہے، اسی طرح منافقوں کو بھی امان حاصل ہوتی ہے۔ تو اُن کو اُن کے نفاق کے حال پر ہی چھوڑ

دینا اُن کے ساتھ دھوکہ ہے کہ وہ اس خیال میں رہتے ہیں کہ مسلمان ان کے اصل حال سے واقف نہیں اور وہ کفار کے ساتھ بھی گٹھ جوڑ رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ناکام و نامراد ہیں اور یہی اُن کے ساتھ بہت بڑا دھوکہ ہے جسے وہ سمجھنے سے عاری ہیں۔

نماز میں سستی

آگے منافقوں کی کچھ غلط کارگزاری بیان ہو رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ان کی حالت یہ ہے وَإِذَا قَامُوٓا إِلَى ٱلصَّلَوٰةِ قَامُوا كُسَالَىٰ جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو بددلی اور سستی کے ساتھ۔ وجہ ظاہر ہے کہ اُن کا ایمان پختہ ہے اور نہ انہیں نماز کی افادیت پر یقین ہے وہ تو محض مسلمانوں کو دکھانے کے لیے مسجد میں آجاتے ہیں، تاکہ اُن کا نفاق نہ ظاہر ہونے پائے۔ حضور علیہ السلام نے منافق کی نماز کے متعلق فرمایا کہ انتظار کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ جب مکروہ وقت آجاتا ہے تو اُٹھ کر چار ٹھونگے مار لیتا ہے، فرمایا تِلْكَ صَلٰوةُ الْمُنَافِقِ یہ ہے منافق کی نماز۔ ایک مخلص مومن کے لیے نماز اہم ترین عبادت اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے اس میں اللہ تعالیٰ سے مناجات کی جاتی ہے، یہ گناہوں کو مٹانے والی چیز ہے۔ مگر منافق اپنی بدعقیدگی کی وجہ سے اُسے ضائع کر دیتا ہے۔ حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں جن منافقین کا ذکر کیا گیا ہے، وہ اعتقادی منافق ہیں اور نماز میں سستی کرتے ہیں۔ وگرنہ سستی تو بعض اوقات مخلص مومن سے بھی ہو جاتی ہے کوئی بیمار ہو یا بھاری جسم والا آدمی ہو، تو اُسے اُٹھنے بیٹھنے میں دقت پیش آتی ہے، فرمایا یہاں پر ایسا شخص مراد نہیں بلکہ وہ اعتقادی منافق مراد ہے جو دیدہ دانستہ نماز میں سستی کا اظہار کرتا ہے۔

فرمایا منافق کی نماز محض یہ ہے کہ يُرَآءُونَ ٱلنَّاسَ وہ لوگوں کے سامنے دکھلاوا کرتے ہیں کہ دیکھ لو ہم نمازی ہیں لہٰذا ہمارے ایمان پر شبہ نہ کیا جائے۔ حالانکہ نماز جیسی عظیم عبادت پر تو اُن کا اعتقاد ہی نہیں ہے یہ تو

اُن پر بوجھ ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے ریاکاری کی مذمت بھی بیان فرما دی۔ اور ساتھ یہ بھی اشارہ فرما دیا کہ ایک مومن کے لیے ذکرِ الٰہی کا بہترین ذریعہ نماز ہے۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ" میرے ذکر کے لیے نماز قائم کرو، مگر منافقین کا حال یہ ہے وَلَا یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیۡلًا اور نہیں ذکر کرتے اللہ کا مگر بہت تھوڑا، برائے نام، بات وہی ہے کہ محض ریاکاری کے لیے نماز پڑھتے ہیں تاکہ لوگ انہیں مومن سمجھیں اور اُن کی مال و جان مسلمانوں کے ہاتھوں محفوظ رہے۔ قرآن و سنت میں ذکرِ الٰہی کی بہت بڑی فضیلت آئی ہے۔ گذشتہ آیات میں بھی گزر چکا ہے۔ فَاذۡکُرُوا اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِکُمۡ" یعنی اللہ کا ذکر کرو قیام کی حالت میں، بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے، اللہ نے یہ بھی فرمایا "وَاذۡکُرُوا اللّٰہَ ذِکۡرًا کَثِیۡرًا لَّعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ" اللہ کو کثرت سے یاد کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ بہرحال فرمایا کہ یہ لوگ اللہ کو یاد بھی کرتے ہیں۔ تو برائے نام، اِن میں خلوص و محبت کا کوئی عنصر نہیں پایا جاتا۔

تذبذب کی حالت

فرمایا اِن منافقین کا حال یہ ہے مُّذَبۡذَبِیۡنَ بَیۡنَ ذٰلِکَ اس کے درمیان متردد ہیں۔ کبھی اُن کا جھکاؤ مومنوں کی طرف ہوتا ہے اور کبھی کافروں کی طرف۔ جو نسا پلہ بھاری نظر آتا ہے، فوراً اُدھر ہو جاتے ہیں۔ یہ بدبخت اس زعم میں مبتلا ہیں کہ وہ دونوں گروہوں میں یکساں مقبول ہیں اور بوقت ضرورت دونوں طرف سے مفاد حاصل کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَاۤ اِلٰی ہٰۤؤُلَآءِ وَلَاۤ اِلٰی ہٰۤؤُلَآءِ درحقیقت یہ لوگ نہ اِس طرف ہیں اور نہ اُس طرف اور دونوں اطراف سے محروم ہیں، یہ اِن کی مزید بدقسمتی ہے، کہ بوقت ضرورت انہیں کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کے متعلق فرمایا یَّعۡبُدُ اللّٰہَ عَلٰی حَرۡفٍ" (سورۃ حج) یعنی ایک کنارے پر عبادت کرتے ہیں۔ اگر کہیں سے مفاد حاصل ہو گیا تو وہاں ٹک

گئے، ورنہ دوسری طرف چلے گئے۔ اس لیے منافق کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے
یَاْتِیْ هٰٓؤُلَآءِ بِوَجْهٍ وَهٰٓؤُلَآءِ بِوَجْهٍ یعنی یہ دورُخی پالیسی اختیار کرنے
والے لوگ ہیں۔ کبھی ان کا رُخ ایک طرف ہوتا ہے اور کبھی دوسری طرف۔ فرمایا
وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا جس کو خدا تعالیٰ گمراہ کر دے
تم اس کے لیے ہرگز کوئی راہ نہیں پاؤ گے۔ جب کوئی شخص کفر کا راستہ یا نفاق کا
راستہ اختیار کر لیتا ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ اُسے اسی راستہ پر قائم رہنے کی توفیق دے
دیتا ہے جیسے پہلے گزر چکا ہے نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى ہم اُسے اُدھر ہی پھیر
دیتے ہیں جس طرف وہ جانا چاہتا ہے۔ جب کفر پر جم گیا تو اللہ نے کہا، اچھا ایسا
ہی کرتے رہو۔ تو فرمایا جسے اللہ گمراہ کر دے پھر کون اُسے راہِ راست پر لا سکتا
ہے۔ اور اللہ کے گمراہ کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی کو بلا وجہ گمراہی کے
لیے راستہ پر چلنے کی توفیق دیتا ہے بلکہ وہ تو علیم کل ہے۔ ہر ایک کی باطنی کیفیت
سے واقف ہے، وہ ہر شخص کی صلاحیت اور فساد کو بھی جانتا ہے، اس لیے
وہ ہر شخص کی اصلیت کے مطابق اس کو اپنے پسندیدہ راستہ پر چلنے کی توفیق
دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو جبراً گمراہی کی طرف نہیں لے جاتا بلکہ وہ خود
اس طرف رُخ کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اُسے غلط راستہ پر پختہ ہونے کی توفیق
عطا کرتا ہے۔

اغیار سے دوستی

منافقین کی مذمت بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو خبردار
کیا ہے کہ وہ کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں۔ فرمایا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ
اے ایمان والو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ، منافق تو مفاد
حاصل کرنے کے لیے کفار سے دوستی کرتے ہیں تاکہ انہیں عزت حاصل ہو سکے
مگر تم اُن کے ساتھ بالکل دوستی نہ کرو۔ کافروں کے ساتھ دوستی سے تمہارا
کیا مقصد ہے اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا

کیا تم خود پر اللہ کا صریح الزام ثابت کرنا چاہتے ہو اگر تم بھی منافقوں کی طرح کافروں کو دوست بناؤ گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر حجت قائم ہو جائے گی اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کے مجرم ٹھہرو گے لہذا کافروں کے ساتھ دلی دوستانہ ہرگز نہ رکھو۔

منافقین کا ٹھکانا

آگے پھر اللہ تعالیٰ نے منافقین کی سزا کا ذکر کیا ہے۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ بیشک اعتقادی منافق دوزخ کے سب سے نچلے گڑھے میں ہوں گے۔ جہنم کے سات طبقات میں سے سب سے نچلا گڑھا اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے لیے مقرر کر رکھا ہے یہ لوگ کفار سے بھی زیادہ خطرناک ہیں جو خفیہ طور پر اسلام کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے سزا بھی سخت مقرر کی ہے اور پھر ان کا قید خانہ بھی ایسا ہے وَلَنْ تَجِدَ لَھُمْ نَصِیْرًا تو اُن کے لیے ہرگز کوئی مددگار نہیں پائیگا۔ وہاں سے رہائی کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ جس قدر اُن کا جرم بڑا ہے۔ اُن کے لیے سزا بھی سخت مقرر کی گئی ہے۔

مومنین کے لیے بشارت

فرمایا اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مگر وہ لوگ جنہوں نے توبہ کر لی۔ نفاق کو چھوڑ کر ایمان اختیار کر لیا وَاَصْلَحُوْا اور پھر اپنی اصلاح بھی کر لی، ریاکاری سے باز آگئے کافروں کی دوستی کو ترک کر دیا۔ وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰہِ اللہ کو مضبوطی سے پکڑ لیا یعنی اللہ کی کتاب اور شریعت پر جم گئے۔ دوسری جگہ فرمایا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کریگا یہاں بھی اللہ کی مدد کرنے سے مراد اس کے دین کی مدد ہے۔ اگر اللہ کی مدد کرو گے وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ "وہ تمہارے قدم مضبوط کر دے گا۔ اعتصام باللہ کا بھی یہی معنیٰ ہے کہ جو لوگ ایمان اور توحید پر ثابت قدم ہو گئے وَاَخْلَصُوْا دِیْنَھُمْ لِلّٰہِ اور انہوں نے اللہ کے لیے اپنے دین کو خالص بنا لیا۔ کفر، شرک، نفاق اور ریاکاری سے پاک ہو کر اللہ تعالیٰ کی توحید

پر ایمان لے آئے۔ اخلاص فی الدین کے متعلق ابن ابی شیبہ کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے آپ سے پوچھا من المخلص حضرت یہ بتائیں کہ مخلص کون ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا مخلص وہ شخص ہے، جو نیکی کا کام کرتا ہے مگر اس پر لوگوں سے تعریف کا طالب نہیں ہوتا۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی بھی ہے اَخْلِصْ دِيْنَكَ يَكْفِيْكَ قَلِيْلٌ مِّنَ الْعَمَلِ دین میں اخلاص پیدا کرلو تو تھوڑا عمل بھی کفایت کر جائیگا، اخلاص اتنی اچھی چیز ہے۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ اگر خلوص ہو تو سَبَقَ مِائَةَ دِرْهَمٍ ایک درہم جو خرچ کیا جائے ایک سو درہم پر سبقت لے جاتا ہے۔ گویا خلوص کے ساتھ ایک درہم خرچ کرنا ریا کاری کے سو درہم سے بھاری ہے۔ ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے۔ کہ اخلاص انسان کو برائی سے روکتا ہے۔

بہرحال فرمایا کہ جنہوں نے توبہ کرلی، پھر اصلاح کی، اللہ کے دین کو مضبوطی سے تھام لیا اور پھر محض اللہ کی خوشنودی کی خاطر دین میں اخلاص پیدا کیا۔ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہوں گے مطلب یہ ہے کہ جب نفاق سے تائب ہو کر اللہ کے دین پر خلوص نیت سے ثابت قدم ہو گئے تو پھر ان کا حشر مخلص مومنوں کے ساتھ ہوگا۔ انہیں کامل الایمان مومنین کی رفاقت نصیب ہو جائیگی۔ پہلے اسی سورۃ میں گزر چکا ہے کہ جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی "فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ" وہ اللہ کے انعام یافتہ نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحین کے ساتھ ہوں گے۔ خود انبیاء علیہم السلام کے متعلق قرآن پاک میں آتا ہے کہ وہ نیک لوگوں کی رفاقت کی دعا کرتے رہے تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ۔ "اے اللہ! ہمیں اسلام کی حالت میں موت آئے

---

[1] فیض القدیر ص ۲۱۶ / ج ۱۷ بحوالہ مستدرک عن معاذ رض (فیاض)

اور ہمارا حشر نیکو کاروں کے ساتھ ہو۔ فرمایا ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہوں گے اور مومنوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا اللہ تعالیٰ انہیں بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہو گا کہ کسی کو مومنین کی معیت نصیب ہو جائے۔ ایسا شخص یقیناً مقبولِ خدا اور عظیم اجر کا مستحق ہو گا۔

اعمال کا بدلہ

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ کسی شخص کو جو سزا ملتی ہے، وہ اس کی اپنی بدعملی کی وجہ سے ملتی ہے۔ اگر انسان ایمان اور توحید پر قائم ہو اعمال صالحہ انجام دیتا ہو تو اللہ تعالیٰ کسی کو بلا وجہ عذاب میں مبتلا نہیں کرتا۔ ارشاد ہے مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ اگر تم نے اللہ کے انعامات کا شکر ادا کیا اور اس پر خلوص نیت سے ایمان لائے، تو اللہ تعالیٰ تمہیں سزا دے کر کیا کریگا۔ اپنے بندوں کو عذاب میں مبتلا کرنے سے اللہ کو خوشی نہیں ہوتی، بلکہ وہ تو اپنے بندوں سے محبت کرنے والا ہے۔ اگر بندے اس کی بغاوت نہ کریں، تو وہ ان کے ساتھ نہایت ہی مہربان اور بخشنے والا ہے وہ جو بھی تمہیں سزا دیتا ہے، وہ تمہارے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت اس طرح بنائی ہے کہ اعمال کا بیج اس کے اندر سے اٹھتا ہے اور پھر اعمال بھی پلٹ کر وہیں جاتے ہیں اور روح کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں اور پھر جزائے عمل کا سلسلہ قائم ہوتا ہے۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ کہ اس پر شریعت کا قانون نافذ ہو اور اگر وہ قانون کی خلاف ورزی کرے تو سزا کا مستوجب ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں ملکیت اور بہیمیت دونوں چیزیں رکھی ہیں۔ اور دونوں کی آپس میں کش مکش جاری رہتی ہے۔ لہٰذا اس کشمکش کا تقاضا ہے کہ انسان کے لیے جزائے عمل واقع ہو۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نماز کیوں فرض ہے اور زنا کیوں حرام ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ

درندے کے لیے گوشت کھانا کیوں ضروری اور گائے بکری کے لیے گھاس
چرنا کیسے لازم ہے۔ اللہ تعالی نے دونوں کی فطرت علیحدہ علیحدہ بنائی ہے
جس کے مطابق وہ اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں۔ اگر بکری گوشت کھانے لگے
تو وہ درندہ بن جائیگی۔ اسی طرح اللہ نے انسان میں خیر و شر کی دونوں قوتیں
رکھی ہیں، جب وہ حدود و قیود کو توڑتا ہے، تو سزا کا مستحق ہو جاتا ہے ورگرنہ
اللہ تعالی کو بلا وجہ سزا دینے میں کیا فائدہ ہے؟

فرمایا اگر تم شکر گزاری کروگے اور ایمان لاؤگے، تو اللہ تعالی یقیناً اچھا
بدلہ دیگا وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيمًا اللہ تعالی شکر گزاری کرنیوالا
اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ شکر گزاری کی نسبت جب اللہ تعالی کی طرف
کی جائے تو اس کا معنیٰ قدر دانی ہوتا ہے اور اگر اس کی نسبت بندے کی طرف
ہو تو معنیٰ یہ ہوگا کہ انسان اللہ کے احسان کو یاد کرکے دل میں اُس کی قدر کرتا ہے
اور زبان سے اُس کی تعریف کرتا ہے وہ اپنے اعضاء اور جوارح سے ایسا
عمل بجا لاتا ہے جس سے اُس کا منعم راضی ہو جائے۔ پھر جب بندہ اپنے آپ
کو خالصتاً اللہ کے سپرد کر دیتا ہے، اُس کا ہر حکم بجا لاتا ہے، تو اللہ تعالے
بھی اسکی حوصلہ افزائی کرتا ہے، اُس پر راضی ہوتا ہے اور اُس کی قدر کرتا
ہے۔ قرآن میں آتا ہے اِنْ تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ اگر تم ایمان لاؤگے تو خدا
راضی ہوگا وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ "اور کافروں سے راضی نہیں ہوتا
اللہ تعالی غنی ہے۔ وہ ہر حالت میں تعریفوں کا مستحق ہے۔ اگر تم اُس کا شکر کروگے
اور ایمان لاؤگے، تو وہ قدردان ہے وہ اور زیادہ انعام عطا فرمائیگا وہ ہر چیز
کو جانتا ہے۔ ہر شخص کی نیکی اور برائی اور اُن کے درجات تک سے واقف ہے
اور اُس کے مطابق جزا یا سزا کا سلوک کرتا ہے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا
مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنْ
تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ
اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ
وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ
وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ
اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ
الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا
مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ
يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ
اُجُوْرَهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾ ع ۲۱ / ۱۱ / ۱

ترجمہ: اللہ تعالیٰ بُری بات کو ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا مگر وہ شخص جس پر ظلم کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ سُننے والا ہے اور جاننے والا ہے (۱۴۸) اگر تم ظاہر کرو گے بھلائی یا نیکی کو یا اس کو چھپاؤ گے یا معاف کرو گے بُرائی کو پس بیشک اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والا اور قدرت رکھنے والا ہے (۱۴۹) بیشک وہ لوگ جو کفر کرتے ہیں اللہ کے ساتھ ـــــــ

اور اس کے رسولوں کے ساتھ اور وہ چاہتے ہیں کہ تفریق
کریں اللہ اور اُس کے رسُولوں کے درمیان اور وہ کہتے ہیں کہ
ہم ایمان رکھتے ہیں بعض پر اور انکار کرتے ہیں بعض کا، اور
وہ لوگ چاہتے ہیں کہ بنالیں اس کے درمیان ایک راستہ ﴿١٥٠﴾ یہی
لوگ کفر کرنے والے ہیں یقیناً اور ہم نے تیار کر رکھا ہے کفر
کرنے والوں کے لیے ذلّت ناک عذاب ﴿١٥١﴾ اور وہ لوگ جو ایمان
لائے اللہ پر اور اُس کے رسُولوں پر اور انہوں نے تفریق نہیں
کی اُن میں سے کسی ایک کے درمیان، یہی لوگ ہیں کہ عنقریب
دیا جائیگا اُن کو اُن کا بدلہ، اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا، اور
نہایت ہی مہربان ہے ﴿١٥٢﴾

ربطِ آیات

گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی بعض کارگزاریوں کا تذکرہ فرمایا تھا، خاص طور پر اُن کی کفار کے ساتھ دوستی کی مذمت بیان کی گئی تھی اور ساتھ ساتھ مومنوں کو یہ بات سمجھائی گئی تھی کہ وہ کافروں کو کسی صورت میں بھی اپنا دلی دوست نہ بنائیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح کیا کہ منافقوں کا کفار کے ساتھ دوستانہ حصولِ عزت کے لیے ہوتا ہے، مگر انہیں کبھی عزت حاصل نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ تو ساری کی ساری اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ جسے وہ عزت نہ دینا چاہے اُسے دُنیا میں کہیں عزت نصیب نہیں ہو سکتی۔ فرمایا عزت کا مالک تو اللہ ہے اور پھر دنیا میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ کا رسول ہے اور اس کے بعد کامل الایمان لوگ عزت والے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی سزا کا ذکر فرمایا کہ وہ جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے اور وہاں ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ فرمایا جہنم کے عذاب سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ یہ لوگ توبہ کرلیں، اپنی اصلاح کریں برائیوں کو ترک کر دیں کافروں سے میل جول بند کر دیں، اللہ کے دین کو مضبوطی سے تھام لیں۔ اور

اپنے اندر اخلاص پیدا کرلیں، تو انہیں بھی مومنوں کی معیت حاصل ہو جائیگی۔

اہل ایمان سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ کہ وہ بھی کافروں کے ساتھ دوستانہ نہ رکھیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کافر اور منافق دونوں مومنوں کے ساتھ دلی عداوت رکھتے ہیں۔ لہذا ان کا مسلمانوں کو ایذاء پہنچانا بھی بالکل واضح ہے۔ جب ایسی صورت ہوگی تو مومنین بھی کافروں اور منافقوں کا گلہ شکوہ کریں گے۔ اہل کتاب اور مشرکین کی طرف سے اہل اسلام کا تذکرہ پچھلی سورۃ میں بھی ہو چکا ہے "وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا" یعنی اے ایمان والو! تم ضرور اہل کتاب اور مشرکوں کی طرف سے تکلیف دہ باتیں سنو گے۔ پھر وہاں پر اللہ تعالیٰ نے اس کا علاج بھی بتایا کہ اگر صبر اور تقویٰ سے کام لوگے تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ تو یہاں پر بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر کفار اور منافقین کی طرف سے تمہیں اذیت پہنچے تو ایسی صورت میں تمہیں کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ تکلیف اٹھا کر تمہاری زبان پر گلہ شکوہ آئیگا تو یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اس ردِعمل کے کچھ حدود و قیود بیان فرمائے ہیں۔

مکارمِ اخلاق

ارشاد ہوتا ہے لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اللہ تعالیٰ بری بات کے اظہار کو پسند نہیں فرماتا۔ جب کسی شخص کو دوسرے کے خلاف شکایت پیدا ہوتی ہے تو وہ اس کا اظہار دوسروں کے سامنے کرتا ہے۔ اگر یہ شکوہ تکلیف دہندہ کی موجودگی میں کیا جائے تو طعن کہلاتا ہے اور اگر اس کے پس پشت ہو تو غیبت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں صورتوں میں گلہ شکوہ کو ناپسند فرمایا ہے کہ ایک دوسرے کی عیب جوئی کی جائے۔ ہاں اپنی تکلیف کے اظہار کی ایک صورت یہ ہے اِلَّا مَنْ ظُلِمَ

یعنی جو مظلوم ہے، وہ اپنی شکایت دوسرے کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ مثلاً مظلوم اپنی شکایت کسی با اختیار حاکم یا عدالت میں پیش کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ ظالم کی برائی کا بیان ہوگا جسے اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا مگر یہاں پر اِلاَّ کا استثنا لگا کر اس بات کی اجازت دے دی گئی ہے کہ مظلوم شخص اپنی شکایت حاکم مجاز کے روبرو پیش کر سکتا ہے، یہ چیز غیبت یا طعن کی تعریف میں نہیں آئے گی۔ اسی طرح اگر حاکمِ وقت بھی مظلوم کی بات سننے اور اس کی دادرسی کے لیے تیار نہیں تو مظلوم اپنی شکایت کا اظہار اپنی قوم اور جماعت کے سامنے برملا کر سکتا ہے اس کی بھی اجازت ہوگی۔ لہٰذا مفسرین اور محدثین کرام فرماتے ہیں کہ اگر کوئی یا اثر شخصیت برائی کا ارتکاب کرتی ہے اور سمجھانے بجھانے پر بھی اس مذموم حرکت سے باز نہیں آتی، تو ایسی برائی کو عوام کے سامنے ظاہر کرنا بھی جائز ہے، ورنہ عام قانون یہی ہے کہ کسی دشمن کی بھی سرِعام برائی نہ کرو خواہ وہ یہودی، کافر یا منافق ہی کیوں نہ ہو۔ تکلیف اٹھانے کے باوجود اس کے اظہار سے ممانعت مکارم اخلاق کی اعلیٰ تعلیم ہے۔ فرمایا وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيعًا عَلِيمًا اللہ تعالیٰ تمہاری شکایات کو سنتا ہے۔ اور جس جس طریقے سے ایذا پہنچائی جاتی ہے، وہ اس کو بھی جانتا ہے وہ ظالم کا خود محاسبہ کرے گا، تاہم تمہارے لیے قانون یہی ہے کہ کسی کی برائی بیان کرنے سے حتی الامکان گریز کرو۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ یہ پہلی آیت ضعفا کے حق میں ہے۔ کہ مظلوم اپنی فریاد متعلقہ فرد یا جماعت کے روبرو پیش کر سکتا ہے۔ البتہ اگلی آیت اصحابِ عزیمت کے متعلق ہے کہ وہ حرفِ شکایت زبان پر نہ لائیں بلکہ صبر و استقامت کے ذریعے مکارم اخلاق کی اعلیٰ مثال قائم کریں۔ یہ تعلیم قرآن پاک میں مختلف مقامات پر دی گئی ہے۔ سورۃ بقرہ میں فرمایا فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ جو تم پر زیادتی کرے، تم بھی اسی

قدر زیادتی کہ جس قدر اُس نے کی ہے۔ سورۃ نحل میں فرمایا وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ اگر صبر کرو گے تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ افضل بات یہ ہے۔ کہ کسی کی زیادتی کا اُس کے برابر بھی بدلہ نہ لو۔ اس سے تمہارے درجات بلند ہوں گے، دنیا میں بھی فائدہ ہوگا مگر عاقبت میں تو بہت زیادہ فائدہ حاصل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے صبر اور برداشت کو اعلیٰ درجے کی خصلت فرمایا ہے۔

البتہ تعدی یا زیادتی کی صورت میں بدلہ لینے کی اجازت ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے المستبان فعلی البادی مالم یعتد المظلوم جب دو آدمی آپس میں گالی گلوچ ہوتے ہیں تو اس کا سارا وبال ابتدا کرنے والے کے سر پر ہوتا ہے۔ جب تک کہ مظلوم تعدی نہ کرے۔ یعنی اگر مظلوم نے بھی آگے سے زیادتی کی، تو وہ بھی مبتدی کی طرح ہو گیا اور ظلم میں دونوں برابر ٹھہرے ایک شخص نے ایک گالی دی اور دوسرے نے دو گالیاں دیں، تو دوسرا آدمی ظالم بن گیا۔ اسی لیے فرمایا کہ جتنی کوئی زیادتی کرے، اُس کے ساتھ اتنی زیادتی کرنے کی اجازت ہے، اس سے زیادہ نہیں۔

نیکی کا اجر

پہلی بات تو یہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کو کسی کی برائی کرنا پسند نہیں، البتہ مظلوم کو شکایت پیش کرنے کی اجازت ہے۔ اب دوسری بات یہ فرمائی إِن تُبْدُوا خَيْرًا اگر تم نیکی کو ظاہر کرو گے۔ أَوْ تُخْفُوهُ یا پوشیدہ رکھو گے۔ أَوْ تَعْفُوا عَن سُوٓءٍ یا برائی سے درگزر کرو گے فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيرًا تو اللہ تعالیٰ بہت ہی معاف کرنیوالا اور قدرت رکھنے والا ہے۔ وہ تم پر بہت زیادہ مہربانی فرمائے گا۔

اس دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین باتوں کا ذکر کیا ہے۔ پہلی بات نیکی کو ظاہر کرنا ہے۔ نیکی کو سرعام کرنے میں بعض قباحتیں ہیں مثلاً اس میں ریاکاری کا عنصر پایا جاتا ہے مگر بعض اوقات ظاہر کرنے میں بھی حکمت ہوتی ہے اور اس سے دوسروں کو ترغیب دلانا مقصود ہوتا ہے تاکہ وہ بھی اس قسم کی نیکی کا کام

کریں یا کوئی اور مصلحت ہوتی ہے، وگرنہ عام طور پہ کھلے عام نیکی کرنے کا مقصد داد وصول کرنا یا اپنی تعریف کروانا ہوتا ہے، اور یہی چیز برائی میں داخل ہے۔ جب کسی نیکی میں ریاکاری پیدا ہو جائے، تو عنداللہ اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ بیان کی گئی کہ اگر تم نیکی کو پوشیدہ رکھو گے تو یہ بہت اچھی بات ہے۔ جیسے صدقہ کے متعلق فرمایا، اگر چھپا کر دو "نِعِمَّا هِيَ" تو یہ بڑی اچھی بات ہے۔ اگرچہ ظاہری طور پہ صدقہ خیرات کرنا بھی جائز ہے تاہم اگر پوشیدہ طور پہ مستحق تک پہنچا دیا جائے تو ریاکاری نہیں رہتی اور یہ ایک بہتر صورت ہے۔

برائی سے درگزر

اس آیت کریمہ میں تیسری چیز برائی سے درگزر کی تعلیم ہے۔ کسی نے قول یا فعل سے تمہاری برائی کی ہے، اگر تم اسے معاف کر دو تو یہ اعلیٰ درجے کی اخلاقی تعلیم ہے اور اگر یہ جذبہ پیدا ہو گیا تو پھر اللہ تعالیٰ خوش ہو کر تمہاری لغزشوں کو بھی معاف فرما دے گا۔ کسی نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے اور تم نے انتقام لینے کی بجائے کسی سے ذکر تک نہیں بلکہ اس پہ صبر کر کے خاموشی اختیار کر لی ہے، تو یہ تمہارے حق میں بہت ہی بہتر ہے، ایذر رسائی انسان پہ شاق گزرتی ہے۔ اس کے باوجود اگر انسان اس پہ صبر و استقامت کا دامن تھام لے اور برائی کرنے والے کی برائی کا جواب نہ دے، تو اس کے اعلیٰ مرتبت انسان ہونے کی دلیل ہو گا۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک بھی ہے کہ اگر تم برائی کا بدلہ نیکی کے ساتھ دو گے، تو اس سے دشمن کا دل بھی نرم ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ تمہارے درمیان عداوت کی جگہ محبت پیدا ہو جائے۔ البتہ فرمایا کہ یہ کام ہر آدمی نہیں کر سکتا بلکہ وہ لوگ کر سکتے ہیں "مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ" جو پختہ عزم رکھتے ہیں۔ درگزر کرنا اور معاف کر دینا صاحب عزیمت لوگوں کا کام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ قانون کے طور پہ بتا دیا ہے کہ کسی کی برائی نہ کرو حتیٰ کہ کافروں کے مقابلے میں صبر سے کام لو، کسی فرد یا جماعت کی غیبت نہ کرو۔ اگر کوئی مشرک دہریہ یا کوئی غیر مذہب بھی برائی کا ارتکاب کرتا ہے تو تم اس کی برائی بھی لوگوں

کے سامنے بیان نہ کرو مسلمان کی تربیت کا یہ اعلیٰ اصول ہے کہ اگر برائی کا جواب برائی سے دیا تو کچھ نتیجہ برآمد نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ نے معافی والے قانون کو ہی پسند فرمایا ہے۔ صرف کمزوروں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ اپنی شکایت پیش کرسکتے ہیں کیونکہ ان میں قوتِ برداشت نسبتاً کم ہوتی ہے۔

تفریق بین الرسل

آگے اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کی ایک اور بیماری تفریق بین الرسل کا ذکر فرمایا ارشاد ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ جو لوگ اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں، اس کی وحدانیت اور توحید کو نہیں مانتے۔ وَرُسُلِہٖ اور اللہ کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں۔ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ اور اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تفریق ایمان لانے کے اعتبار سے ہے کہ کچھ رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور کچھ پر نہیں لاتے۔ یہود و نصاریٰ یہی کہتے تھے وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ ہم بعض رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء و رسل پر ایمان لانا ضروری ہے اور کسی ایک کا انکار بھی مکمل انکار کے برابر ہے۔ عیسائی حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت کا انکار کرتے ہیں اور یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور نبی آخر الزمان دونوں کا انکار کرتے ہیں۔ یہی تفریق بین الرسل ہے اور اس کا مرتکب کافر ہے۔

یہود و نصاریٰ کے علاوہ بعض پہلی امتوں کے لوگ بھی اپنے انبیاء کا انکار کرتے رہے۔ اس کی گواہی قرآنِ پاک نے متعدد مقامات پر دی ہے "کَذَّبَتْ عَادُ نِ الْمُرْسَلِیْنَ" قوم عاد نے رسولوں کا انکار کر دیا۔ اسی طرح فرمایا "کَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ نِ الْمُرْسَلِیْنَ" قوم لوط نے بھی رسولوں کا انکار کیا، اسی طرح بہت سی دیگر قوموں کا بھی ذکر ملتا ہے، جنہوں نے اللہ کے رسولوں کو ماننے سے انکار کر دیا، یہی تفریق بین الرسل ہے۔ اور کسی ایک کا جھٹلانا سب کے جھٹلانے کے مترادف ہے کیونکہ سارے انبیاء کا دین، عقیدہ اور مشن ایک ہی ہے۔

فرمایا وَيُرِيدُونَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا اور یہ لوگ بعض رسولوں کو مان کر اور بعض کا انکار کر کے درمیانی راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ یہی چیز ایمان کے منافی ہے۔ ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا یہ لوگ پکے کافر ہیں۔ اِن کے کفر میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ انہوں نے اللہ کے رسولوں کے درمیان تفریق پیدا کی ہے شاہ ولی اللہؒ نے اس مسئلہ کو اس طرح سمجھایا ہے کہ ارسال رسل اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اور کسی ایک یا زیادہ رسولوں کا انکار خدا تعالیٰ کی صفت کا انکار ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کا انکار کرے وہ کافروں اور دہریوں میں شامل ہو جاتا ہے اسی لیے فرمایا کہ یہ لوگ پکے کافر ہیں۔ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا اور ہم نے کفار کے لیے ذلت ناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ خدا کے ہاں انہیں سخت سزا ملنے والی ہے۔

اہل ایمان کا بدلہ

کفار کی مذمت بیان کرنے کے بعد پھر ایمان لانے والوں کے اجر کا ذکر بھی کیا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے یعنی وہ تمام رسول جن کے نام سے ہم واقف ہیں یا نہیں ہیں سب پر ایمان لائے۔ اسی سورۃ میں آگے آرہا ہے کہ ہم نے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے رسول بھیجے تاکہ لوگوں پر حجت قائم ہو جائے۔ اور یہ بھی فرمایا رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ "ہم نے بعض رسولوں کا ذکر آپ سے کیا ہے "وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ" اور بعض کا تذکرہ نہیں کیا، بہرحال تمام رسولوں کی رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اور جو کچھ نبیوں کو دیا گیا ہے اس پر بھی ایمان لانا ضروری ہے وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اور انہوں نے تفریق نہیں کی ان میں سے کسی ایک کے درمیان فرمایا جو لوگ اس ایمان میں پختہ ہو جائیں گے اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ اللہ تعالیٰ اُن کو اُن کا صحیح صحیح بدلہ دے گا۔ فرمایا وَكَانَ اللّٰهُ

غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اہل ایمان سے جو چھوٹی موٹی لغزشیں ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اپنی رحمت سے معاف فرما دے گا۔ کیونکہ وہ اپنے بندوں پر نہایت ہی مہربان ہے۔

يَسْـَٔلُكَ أَهْلُ الْكِتٰبِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا
مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَأَلُوا مُوسٰىٓ أَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ
فَقَالُوٓا أَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ
بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ
مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا
مُوسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ
بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا
وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَأَخَذْنَا
مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾ فَبِمَا نَقْضِهِمْ
مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ
الْأَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۚ
بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا
يُؤْمِنُوْنَ إِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵۵﴾

ترجمہ : اے پیغمبر ! آپ سے اہل کتاب سوال کرتے ہیں کہ آپ اتاریں ان پر کتاب آسمان کی طرف سے ۔ بیشک حضرت موسیٰ علیہ السلام سے انہوں نے سوال کیا اس سے بھی بڑی چیز کا

پس انہوں نے کہا کہ دکھا ہمیں اللہ سامنے - پس پکڑا اُن کو بجلی نے اُن کے ظلم کی وجہ سے - پھر بنایا انہوں نے بچھڑے کو معبود بعد اس کے کہ اُن کے پاس واضح باتیں پہنچ چکی تھیں - پھر ہم نے معاف کیا اس سے اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کھلا غلبہ عطا کیا (۱۵۳) اور ہم نے اُٹھایا اُن کے اوپر طور پہاڑ کو اُن کے عہد کے وقت ، اور ہم نے اُن سے کہا داخل ہو دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے اور ہم نے اُن سے کہا تعدی نہ کرو ہفتے کے دِن اور ہم نے اُن سے پختہ عہد لیا (۱۵۴) پس بوجہ توڑنے اپنے پختہ عہد کو ، اور بوجہ اُن کے کفر کرنے کے اللہ کی آیتوں کے ساتھ ، اور بوجہ ان کے قتل کرنے کے اللہ کے نبیوں کو ناحق ، اور بوجہ اُن کے یہ کہنے کے کہ ہمارے دِل غلافوں میں بند ہیں (ایسا نہیں) ، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر مہر کر دی ہے اُن کے کفر کی وجہ سے ، پس نہیں ایمان لاتے مگر بہت تھوڑے (۱۵۵)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس کے نبیوں اور رسولوں کے درمیان تفریق کرنے والوں کی مذمت بیان فرمائی اور واضح کیا کہ اللہ کے بعض نبیوں پر ایمان لانا اور بعض پر نہ لانا خالص کفر ہے ، کیونکہ کسی ایک نبی کا انکار بھی پورے گروہ انبیاء کے انکار کے مترادف ہے ۔ مشرکین تو انبیاء کو ویسے ہی نہیں مانتے ، وہ تو مطلقاً انکار کی وجہ سے کافر ہیں ، انہوں نے توحید کا بھی انکار کیا اور خود خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بھی انکار کر گئے ، البتہ اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے اعتقادی منافقوں کا ذکر کیا ہے ، جو بظاہر زبان سے تو توحید و رسالت کا اقرار کرتے ہیں ، مگر اُن کے دل اُسی طرح کفر سے بھرے ہوئے ہیں ، بہرحال اللہ تعالیٰ نے منافقین کا تذکرہ کر کے انہیں بُرے انجام سے خبردار کیا ہے

نزولِ کتاب کا مطالبہ

مدینہ طیبہ میں یہودیوں کی اکثریت تھی اور وہی تفریق بین الرسل کے مرتکب ہوتے تھے۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد نہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو تسلیم کیا اور نہ پیغمبر آخر الزمان علیہ السلام پر ایمان لائے۔ چنانچہ ان میں سے بعض متعصب یہودی حضور نبی کریم علیہ السلام سے بعض بیہودہ قسم کے سوال بھی کرتے تھے۔ ان میں کعب ابن اشرف پیش پیش ہوتا تھا۔ یہ شخص مدینے کے قریب ایک گڑھی میں رہتا تھا، اس کا اپنا قلعہ تھا، بڑا ظالم اور سود خور تھا تو اس نے یہودیوں کی ایک جماعت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ ارشاد ہوتا ہے یَسۡـَٔلُكَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ اہل کتاب آپ سے سوال کرتے ہیں اَنۡ تُنَزِّلَ عَلَيۡهِمۡ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ کہ آپ ان پر آسمان سے لکھی ہوئی کتاب نازل کریں۔ یہودیوں کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ قرآن پاک کے سبقاً سبقاً نزول پر ایمان نہیں رکھتے بلکہ وہ اسے اللہ کی کتاب اس وقت تسلیم کریں گے جب کہ یہ پوری کی پوری تحریری صورت میں آسمان سے نازل ہو۔ وہ اپنے اس مطالبے کی حمایت میں وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثال پیش کرتے تھے کہ آپ نے کوہ طور پر اعتکاف کیا، روزے رکھے اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر تختیوں پر لکھی ہوئی تورات نازل فرمائی تورات کے علاوہ دیگر صحائف کے متعلق بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر صحیفہ وقت کے نبی پر مکمل صورت میں نازل ہوا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، اور دیگر انبیاء کے صحائف کا اسی طرح ذکر ملتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے حضور علیہ السلام سے بھی یہی مطالبہ کیا کہ اگر آپ اللہ کے سچے نبی ہیں تو آپ پر قرآن پاک مکمل اور یکبارگی نازل ہونا چاہیئے۔

یہودیوں کا یہ اعتراض محض ضد اور دشمنی کی وجہ سے تھا۔ ان کا خیال تھا، کہ حضور علیہ السلام ہمارے سوال کا جواب ہماری تسلی کے مطابق نہیں دے سکیں گے، اس لیے ہمیں آپ کے انکار کا جواز مل جائیگا اور ایمان لانے سے بچ جائیں گے۔

سورۃ بنی اسرائیل میں موجود ہے۔ کہ مشرکین مکہ نے بھی نبی علیہ السلام سے اسی قسم کے سوال کیے۔ انہوں نے چشموں اور باغات کا مطالبہ، آسمان پر چڑھ جانے کا مطالبہ اور اللہ اور فرشتے اُن کے سامنے لانے کا مطالبہ کیا حتیٰ کہ انہوں نے یہ بھی کہا، کہ تمہارے لیے سونے کا گھر ہونا چاہیئے اور یہ کہ آپ آسمان پر چڑھ جائیں۔ "وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ" ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ آپ آسمان سے کتاب نہ لے آئیں جسے ہم خود پڑھیں۔ وہ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ آپ دعویٰ کرتے ہیں آپ پر وحی نازل ہوتی ہے، یہ وحی یا کتاب ہم پر کیوں نہیں نازل ہوتی۔ اگر ہم پر کوئی فرشتہ اترے تو اس کی بات سُن کر ہم آپ کی تصدیق کر دیں گے۔ بہر حال مدینے کے یہودیوں نے آپ پر اس قسم کے بیہودہ سوال کیے تاکہ نہ آپ اُن کا جواب دے سکیں اور نہ وہ آپ پر ایمان لائیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہودیوں کے اس سوال کے جواب میں تسلی دی ہے۔ کہ اُن کا اعتراض ضد اور ہٹ دھرمی پر مبنی ہے۔ اگر کسی شخص کو کوئی غلط فہمی ہو، یا وہ واقعی کسی چیز کو سمجھنا چاہے تو اُسے مطلوبہ تعلیم دی جا سکتی ہے مگر جس شخص کا سوال ہی بر بنائے عناد ہو، وہ کبھی ایمان نہیں لا سکتا، وہ ہر بات کے جواب میں مزید اعتراضات کرتا چلا جائیگا، اس لیے اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ آپ سے کتاب کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مگر سوال کرنا تو ان کی عادتِ قدیمہ ہے فَقَدْ سَأَلُوا مُوسَىٰ أَكْبَرَ مِن ذَٰلِكَ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی بڑے بڑے سوال کیے تھے۔ یہ لوگ اپنی عادت سے مجبور ہیں۔ اِن کی ذہنیت ہی بگڑ چکی ہے۔

رؤیتِ الٰہی کا مطالبہ

فرمایا یہودیوں نے موسیٰ علیہ السلام سے بڑا سوال یہ کیا تھا فَقَالُوا أَرِنَا اللَّهَ جَهْرَةً ہمیں اللہ تعالیٰ سامنے دکھلا دے، اس کے بغیر ہم ایمان کے لیے تیار نہیں۔ یہ بڑی گستاخی کی بات تھی۔ یہ بدبخت اپنے آپ کو اس قابل سمجھتے

تھے کہ اس مادی دنیا میں ان آنکھوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکتے ہیں۔ حالانکہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں ہو سکتا، خود موسیٰ علیہ السلام نے بھی جب اللہ تعالیٰ سے سوال کیا تھا رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ اے اللہ! میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں تو اللہ تعالیٰ نے یہی جواب دیا تھا لَنْ تَرٰىنِیْ کہ تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ فرمایا کہ اس پہاڑ کی طرف دیکھو۔ اگر یہ پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہ سکا تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلی پہاڑ پر ڈالی تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو کر گر پڑے۔ پھر اللہ کے حضور توبہ کی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک بھی اس ضمن میں یہ ہے۔ اِنَّكُمْ لَنْ تَرَوْا رَبَّكُمْ حَتّٰى تَمُوْتُوْا یعنی تم مرنے سے پہلے اپنے رب تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتے۔ جب یہ دنیا ختم ہو جائے گی، نیا جہان پیدا ہو گا۔ نئی قوتیں اور صلاحیتیں پیدا ہونگی، تو وہاں عالم قدس میں اللہ تعالیٰ آنکھوں کو وہ قوت عطا کر دیگا جس سے وہ دیدار الٰہی کر سکیں۔ چنانچہ تمام اہل حق اس بات پر متفق ہیں کہ جنت میں پہنچنے والے اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ کی رؤیت نصیب ہو گی۔ اس مسئلہ میں صرف رافضی اور معتزلہ وغیرہ دیدار الٰہی کا انکار کرتے ہیں، باقی سب متفق ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے پیغمبر علیہ السلام! آپ سے تو یہ صرف کتاب لانے کا مطالبہ کر رہے ہیں، یہ بدبخت موسیٰ علیہ السلام سے دیدار الٰہی کا مطالبہ بھی کر چکے ہیں اور پھر اس مطالبے کے جواب میں فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ان کی اس زیادتی یعنی بیہودہ سوال کی وجہ سے ان پر بجلی گری۔ وہ سب مر گئے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اللہ نے انہیں دوبارہ زندگی بخشی۔

بچھڑے کی پوجا

فرمایا پھر یہودیوں نے ایک اور قبیح کام کیا ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھنے کے باوجود بچھڑے کی پوجا کی۔ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ پھر ہم نے ان کا یہ جرم بھی معاف کر دیا۔ اُن کی توبہ اس شرط کے ساتھ قبول

ہوئی "فَاقْتُلُوْا اَنْفُسَکُمْ" کہ تم ایک دوسرے کو قتل کرو۔ چنانچہ بچھڑے کی پوجا کرنے والے گنہگاروں کو بے گناہ لوگوں نے قتل کیا۔ اور پھر وَاٰتَیْنَا مُوْسٰی سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کھلا غلبہ عطا کیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بچھڑے کو توڑ پھوڑ کر جلا دیا اور جیسا کہ دوسری سورۃ میں موجود ہے راکھ کا کچھ حصہ پانی میں بہا دیا اور کچھ حصہ ہوا میں اڑا دیا۔ بچھڑا چونکہ شرک کا شعار تھا اسے مکمل طور پر نیست و نابود کر دیا گیا اور اس کے "ستر" ہزار پجاریوں کو بھی قتل کر دیا گیا۔

ارتفاع طور

یہودی تاریخ کے ایک اہم واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِیْثَاقِهِمْ ان سے عہد لیتے وقت ہم نے طور پہاڑ ان کے سروں پر معلق کر دیا تھا۔ بعض جدید مفسر رفعنا کی غلط تاویل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پہاڑ کو اٹھا کر بنی اسرائیل کے سروں پر نہیں کھڑا کیا گیا تھا۔ بلکہ ان لوگوں کو پہاڑ کے دامن میں اس طرح کھڑا کیا تھا کہ پہاڑ کا کچھ حصہ ان پر جھکا ہوا تھا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ سورۃ اعراف میں آتا ہے۔ "وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ" جب ہم نے پہاڑ ان کے سروں پر لا کھڑا کیا۔ نتق کا معنیٰ اکھاڑنا ہے اور مطلب صاف ظاہر ہے کہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے اکھاڑ کر بنی اسرائیل کے اوپر معلق کر دیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ اگر نہیں مانتے تو یہ پہاڑ تمہارے اوپر گرا دیا جائے گا اور تم چکنا چور ہو جاؤ گے۔

اِس مقام پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے۔ کہ دین میں جبر تو روا نہیں۔ اللہ کا حکم واضح ہے "لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ" مگر یہودیوں کو پہاڑ کے خوف سے زبردستی منایا گیا۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل کو فرعون سے آزادی ملی اور صحرائے سینا میں پہنچے تو انہوں نے خود موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ ہمارے لیے کوئی قانون کی کتاب لائیں جس پر ہم عمل کریں جو اللہ تعالیٰ نے تورات نازل فرمائی۔ تورات کا معنیٰ ہی قانون (LAW) ہے جب کتاب آ گئی تو کہنے لگے

اس کے احکام بڑے مشکل ہیں، ہم ان کی تعمیل نہیں کر سکیں گے۔ لہٰذا اللہ نے ان سے عہد لیا تھا "خُذُوا مَا اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّۃٍ" جو احکام ہم نے دیے ہیں انہیں مضبوطی سے پکڑو "وَاذْکُرُوا مَا فِیْہِ" اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد کرو۔ ان احکام پر عمل کرو۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں خوفزدہ اس لیے کیا تھا کہ ایک چیز انہوں نے خود مانگ کر لی ہے۔ اور اب اس پر عمل کرنے سے اعراض کر رہے ہیں۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ "لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ" کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو دین قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ کسی شخص کو جبراً اسلام میں داخل نہیں کیا جا سکتا، ہاں تبلیغ کرو، اگر کوئی مان جاتا ہے تو ٹھیک ہے "فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ" جس کا دل چاہے ایمان لائے اور نہ چاہے تو کفر پر اڑا رہے، اُسے اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کفر کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں سزا کا مستحق ہوگا، بہرحال اُسے زبردستی مسلمان نہیں بنایا جا سکتا۔ البتہ اگر اسلام لانے کے بعد کوئی شخص اس کے احکام کی خلاف ورزی کرے گا، تو وہ جبر کا مستحق ہوگا۔ اس پر حد جاری ہوگی یا تعزیر لگے گی، بہرحال دین میں لانے کے لیے جبر نہیں بلکہ دین کا قانون توڑنے پر ضرور جبر ہے۔

سجدے سے انکار

فرمایا دیکھو! یہ کیسے بدعہد اور بدطینت لوگ ہیں "وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا" ہم نے اُن سے کہا کہ دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہونا، مگر انہوں نے اس حکم کی بھی خلاف ورزی کی۔ جب یہودیوں نے کہا، "لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ" ہم ایک ہی کھانے یعنی من و سلویٰ پر صبر نہیں کر سکتے لہٰذا ہمارے لیے اپنے رب سے سبزیاں، پیاز اور دال وغیرہ کا مطالبہ کیجیے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا پر اللہ نے فرمایا کہ انہیں کہو کہ اس بستی (اریحا) میں داخل ہو جاؤ، وہاں تمہیں مطلوبہ اشیاء حاصل ہو جائیں گی۔ البتہ یہ ہے کہ شہر میں داخل ہوتے وقت دو رکعت نفل ادا کرنا۔ مفسرین نے "سُجَّدًا" کے دو معنی بیان کیے ہیں یعنی جھک کر یا سجدہ کر کے۔ مگر یہ ایسے بدطینت لوگ ہیں کہ اللہ

کے حکم کے خلاف جھکنے کی بجائے اکڑ کر داخل ہوئے۔ صحیحین کی روایت میں آتا ہے کہ چوتڑوں کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے تاکہ جھکنا نہ پڑے۔

سبت کی بے حرمتی

اللہ نے یہ بھی فرمایا وَقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوا فِي السَّبْتِ ہم نے انہیں کہا کہ دیکھو! ہفتے کے دن تجاوز نہ کرنا۔ انہیں حکم تھا کہ اس روز صرف عبادت کرنی ہے، کوئی کاروبار، تجارت، شکار وغیرہ بالکل نہیں کرنا حتیٰ کہ چولہے بھی نہیں جلانا مگر انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں وہ تجاوز شروع کر دیا جس کا ذکر سورۃ اعراف میں موجود ہے۔ "وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ" دریا کے کنارے اس بستی کا حال دیکھو کہ انہوں نے اللہ کے قانون کو توڑا تو پھر انہیں کیسی سزا ملی۔ ان کا کردار یہ تھا کہ ہفتے کے دن مچھلیوں کا شکار تو نہیں کرتے تھے مگر انہیں حوض میں بند کر لیتے تھے اور پھر اگلے دن جمع شدہ تمام مچھلیاں پکڑ لیتے تھے۔ بعض لوگ انہیں ایسا کرنے سے منع کرتے تھے مگر وہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک بھی ہے لَا تَرْتَكِبُوا مَا ارْتَكَبَتِ الْيَهُودُ تم اس جرم کا ارتکاب نہ کرنا جس کا یہودیوں نے کیا تھا فَتَسْتَحِلُّوا مَحَارِمَ اللّٰهِ بِأَدْنَى الْحِيَلِ کہ حیلے بہانے سے اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال بناتے پھرو۔ آپ نے یہ بھی فرمایا لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُودَ یہود پر اللہ کی لعنت ہو کہ ان پر حلال جانور کی چربی بھی حرام تھی مگر وہ لوگ اسے فروخت کر کے رقم کھا جاتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ہم حکم الٰہی کی تعمیل میں چربی نہیں کھاتے حالانکہ جو چیز بنفسہٖ حرام تھی اس کی قیمت بھی حرام تھی مگر انہوں نے حیلے بہانے سے حرام کو حلال بنا لیا۔ مچھلی کے شکار کے متعلق بھی انہوں نے ایسا ہی حیلہ کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ کا عذاب آیا اور ان کی شکلیں مسخ ہو گئیں۔ کچھ بندر بن گئے اور کچھ خنزیر۔ اللہ نے فرمایا یہ ایسی سزا تھی جو "نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا" موجود اور آئندہ آنے والے لوگوں کے لیے عبرت تھی۔

دلوں پر مہر

فرمایا وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ہم نے ان سے

پختہ عہد لیا تھا۔ کہ وہ اللہ کے احکام کی پابندی کریں گے۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيثَاقَهُمْ مگر اس عہد کو توڑ دینے کی وجہ سے وَكُفْرِهِمْ بِآيَاتِ اللَّهِ اور ان کے اللہ کی آیتوں کا انکار کرنے کی وجہ سے وَقَتْلِهِمُ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ اور اللہ کے نبیوں کے ناحق قتل کی وجہ سے وَقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ اور ان کے اس قول کی بنا پہ کہ ان کے دل بند ہو چکے ہیں اور اب ان میں کوئی چیز داخل نہیں ہو سکتی۔ فرمایا یہودیوں کی ان تمام حرکات کی وجہ سے نہیں۔ بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پہ مہریں لگا دی ہیں۔ نافرمانیاں کر کر کے ان کے دل سیاہ ہو چکے ہیں۔ ان پر زنگ چڑھ چکا ہے اور اب ان میں کوئی چیز نہیں اتر سکتی۔ وہ من مانی کرتے ہیں، برائی کو برائی نہیں سمجھتے۔ لہذا "خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ" اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پہ مہر لگا دی ہے۔ یہ کفر میں راسخ ہو چکے ہیں، اور راہ راست پہ آنے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھے ہیں۔ جس کی وجہ سے فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ان کی ایک قلیل تعداد ایمان لاتی ہے اور اکثریت کفر پہ ہی قائم رہتی ہے۔ چنانچہ مدینے کے اطراف میں آباد یہودیوں کے دس بڑے عالموں میں سے صرف حضرت عبداللہ بن سلامؓ ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے باقی سب بے ایمان ہی رہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا، اگر یہ دس علمائے یہود ایمان لے آتے تو دنیا میں کوئی یہودی باقی نہ رہتا۔ مگر یہ لوگ چودہ سو سال گزرنے کے باوجود ویسے کے ویسے ہی عنادی ہیں۔ قرآن کو اللہ کی کتاب نہیں مانتے اور نبی آخر الزماں کو نبی تسلیم نہیں کرتے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو تسلی دی ہے کہ یہ لوگ آپ سے طرح طرح کے مطالبات کرتے ہیں، آپ گھبرائیں نہیں، اس سے پہلے یہ موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی بڑے مطالبات کر چکے ہیں۔ ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے اور اب ان کی اکثریت ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔

وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا
عَظِيْمًا ۙ﴿۱۵۶﴾ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى
ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا
صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ
اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ
مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۙ﴿۱۵۷﴾
بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾
وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ
مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۚ﴿۱۵۹﴾

ترجمہ: اور بوجہ اُن (یہودیوں) کے کفر کرنے اور بوجہ
اُن کے کہنے کے حضرت مریمؓ پر بہتان عظیم ﴿۱۵۶﴾ اور اُن کے اس
قول کی وجہ سے کہ بیشک ہم نے قتل کیا ہے، مسیح ابن مریم کو
جو اللہ کا رسول ہے، حالانکہ انہوں نے نہیں قتل کیا اُس کو اور نہ
اُس کو سولی پر چڑھایا، بلکہ یہ بات اُن کے لیے مشتبہ کر دی گئی ہے
اور بیشک وہ لوگ جنہوں نے اس میں اختلاف کیا ہے البتہ
شک میں ہیں اس سے۔ ان کو اس کا کچھ علم نہیں سوائے گمان
کی پیروی کے، اور نہیں قتل کیا انہوں نے اُس مسیح کو یقیناً ﴿۱۵۷﴾

بلکہ اللہ نے اُس کو اُٹھا لیا اپنی طرف اور اللہ تعالیٰ عزیز (کمال قدرت کا مالک) اور حکیم (کمال حکمت کا مالک) ہے (۱۵۸) اور نہیں ہے اہل کتاب میں سے کوئی بھی مگر یہ کہ ضرور ایمان لائے گا اُس پر اُس کی موت سے پہلے۔ اور قیامت والے دن وہ ان پر گواہی دینے والا ہو گا (۱۵۹)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اہل کتاب کے عناد کا ذکر تھا، اللہ نے ان کے اعتراض کو بیان فرمایا، خصوصاً یہودی کہتے تھے کہ اگر آپ اللہ کے سچے نبی ہیں اور قرآن پاک اللہ کی کتاب ہے تو پھر یہ بیک وقت لکھی لکھائی آسمان سے کیوں نازل نہیں ہوتی، جس طرح کہ تورات موسیٰ علیہ السلام پر تختیوں کی صورت میں نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس اعتراض کا جواب دینے سے پہلے اُن کی بعض قباحتوں کا تذکرہ فرمایا تھا، اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بایں الفاظ تسلی دی تھی کہ یہ عنادی لوگ ہیں، انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی بڑے بڑے سوال کیے، لہٰذا آپ دِل برداشتہ نہ ہوں بلکہ صبر کریں۔ آج کے درس کی آیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کی دیگر خرابیوں کا ذکر کیا ہے۔ اور پھر فرمایا ہے کہ ان کی انہی خرابیوں کی وجہ سے یہ لوگ مستحق لعنت ٹھہرے ہیں، ان قباحتوں کے تذکرے کے بعد پھر آگے اُن کے اصل سوال کا جواب آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک یکبارگی کیوں نہیں نازل فرمایا۔

حضرت مریمؑ پر بہتان

آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی یہ قباحت بیان فرمائی ہے۔ وَبِکُفْرِهِمْ اور اُن کے کُفر کی وجہ سے۔ اس کفر کا تذکرہ گذشتہ آیات میں ہو چکا ہے کہ یہودیوں نے بچھڑے کی پوجا کی، نزول کتاب کا مطالبہ کیا، رؤیت الٰہی کی خواہش ظاہر کی، سجدے کا حکم ہُوا تو اکڑ گئے، ہفتے کے دن تعدی کی اور انبیاء کو ناحق قتل کیا یہ سب کفر کی باتیں تھیں تو فرمایا اُن کے کفر کی وجہ سے وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا اور اُن کے اس قول کی وجہ سے جس کے ذریعے انہوں نے

حضرت مریم پر عظیم افترا باندھا، حضرت مریم تو اللہ کی مقبول بندی اور صدیقہ تھیں جب وہ بچہ گود میں لیے آئیں تو کہنے لگے یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا تو یہ بری چیز کہاں سے لے آئی ہے انہوں نے حضرت مریم پہ زنا کا الزام لگاتے ہوئے عیسٰی علیہ السلام کو ولد الزنا قرار دیا۔ حالانکہ حقیقت حال یہ ہے۔ کہ اللہ جل شانہٗ نے اپنے بندے عیسٰی علیہ السلام کو بغیر باپ کے اپنی قدرت کاملہ سے پیدا فرمایا اور نبوت کا تاج ان کے سر پر رکھا۔ فرمایا ان سب خباثتوں کی وجہ سے ہم نے اہل کتاب کو لعنت کا مستحق ٹھہرایا۔

قتل انبیاء

فرمایا وَقَوْلِهِمْ ان کی اس بات کی وجہ سے کہ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ہم نے مسیح، عیسٰی ابن مریم کو قتل کر دیا رَسُوْلَ اللّٰهِ جو اللہ کا رسول کہلاتا تھا۔ یہودی حضرت مسیح کو خود تو اللہ کا رسول نہیں مانتے تھے۔ اس لیے وہ کہتے تھے کہ ہم نے اس مسیح کو قتل کر دیا ہے جو اللہ کا رسول کہلاتا ہے ان بدبختوں کا حال تو یہ ہے کہ جن کو اللہ کا رسول مانتے تھے، ان کو بھی قتل کیا، جیسے پہلے گزر چکا وَقَتْلِهِمُ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ انہوں نے اللہ کے نبیوں کو ناحق قتل کیا۔ قتل انبیا تو بہت ہی بری خصلت ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مغضوب ترین شخص وہ ہے جس کو اللہ کا نبی قتل کرتا ہے یا جو اللہ کے نبی کو قتل کرتا ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ اللہ کا نبی اسی بدبخت کو قتل کرے گا جو نہایت ہی سرکش ہو اور اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو گا جو اللہ کے نبی کو قتل کرتا ہے۔ اسی لیے انبیاء کے ناحق قتل کو بہت بڑا جرم قرار دیا گیا۔

قتلِ مسیح

بہر حال اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے لغو عقیدہ قتل مسیح کا رد کرتے ہوئے فرمایا وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ حقیقت یہ ہے کہ یہودیوں نے نہ تو مسیح علیہ السلام کو قتل کیا اور نہ انہیں سولی دی وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ بلکہ ان کے لیے بات مشتبہ کر دی گئی۔ انہوں نے اشتباہ میں پڑ کر غلط عقیدہ قائم کر لیا وَاِنَّ

اَلَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ اور جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ وہ شک اور تردد میں پڑے ہوئے ہیں۔ اُن پر حقیقت حال واضح نہیں ہو سکی مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ انہیں اس کے متعلق کچھ علم نہیں اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ سوائے گمان کی پیروی کرنے کے۔ یعنی وہ تو محض اپنے گمان سے اٹکل پچو باتوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، اصل حقیقت سے ہرگز واقف نہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پاکیزہ بندے کو اُن کے گندے ہاتھوں سے کیسے محفوظ رکھا۔ اس کا ذکر سورۃ آل عمران میں بھی آچکا ہے "اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا" یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ اس دنیا کی مدت پوری کرنے کے بعد میں تمہیں اپنی طرف اٹھالوں گا اور کفار کی صحبت سے پاک کردوں گا۔ اُن کے ناپاک ہاتھ تم تک نہیں پہنچیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ "یہودیوں نے آپ کو قتل کرنے کی تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو محفوظ رکھنے کا منصوبہ بنایا اور پھر "وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمَاكِرِیْنَ" کے مصداق اللہ کی تدبیر ہی کامیاب ہوئی۔ یہودی عیسےٰ علیہ السلام کو نہ قتل کر سکے اور نہ سولی پر چڑھا سکے اور ان کے منصوبے خاک میں مل گئے۔ فرمایا اب یہ اپنے گمان کی پیروی میں لایعنی باتیں کرتے ہیں۔ وَمَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًا یہ یقینی بات ہے کہ یہودی مسیح علیہ السلام کو قتل نہ کر سکے۔ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ بر خلاف اس کے اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کو اپنی طرف یعنی آسمان کی طرف اٹھالیا۔ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا اور اللہ تعالیٰ عزیز ہے۔ وہ کمال قدرت کا مالک ہے اور حکیم ہے کہ کمال حکمت کا مالک بھی وہی ہے۔

رفع مسیح پہلی روایت

ہمارے مفسرین میں سے عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد امام ضحاکؒ کا بیان تفسیروں میں موجود ہے جسے آپ حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں، کہ یہودی حضرت مسیح علیہ السلام کے دشمن تھے، کیونکہ وہ اُن کے تعصب، ضد اور ہٹ دھرمی کارد کرتے تھے۔ اُن کے علما نے شریعت کو بگاڑ دیا تھا اور اخلاقی لحاظ سے نہایت

پست ہو چکے تھے۔ جوں جوں مسیح علیہ السلام اللہ کے حکم سے صحیح دین کی تبلیغ کرتے توں توں یہودی آپ کے جانی دشمن بنتے چلے گئے۔ انجیل میں موجود ہے کہ عیسٰی علیہ السلام یہودیوں کی غلط باتیں دیکھ کر برداشت نہ کرتے اور سخت الفاظ میں اُن کی تردید کرتے۔ یہودیوں کے علما اور پیر غلط ملط تاویلوں کے ذریعے اپنے غلط عقائد کو سچا ثابت کرنے کی کوشش کرتے مگر اللہ کا نبی عیسٰی علیہ السلام اُن کی تمام کرتوتوں کو ظاہر کر دیتا چنانچہ یہودیوں نے فیصلہ کیا کہ مسیح علیہ السلام کو زندہ نہیں چھوڑیں گے اور اس کام کے لیے حکومت کی امداد حاصل کریں گے۔

اس زمانے میں شام و فلسطین رومیوں کے زیرنگیں تھے اور رومیوں کا گورنر اس علاقے میں تعینات تھا، جو وہاں کے معاملات نمٹاتا تھا۔ یہ بالکل اسی طرح کا انتظام تھا جس طرح انگریزوں کی حکومت کے زمانے میں ہندوستان میں انگریزوں کا وائسرائے یا نائب رہتا تھا۔ تو یہودی حضرت مسیح علیہ السلام کو حکومت وقت کی معرفت قتل کروانا چاہتے تھے اس واقعہ سے کچھ عرصہ پہلے یہ لوگ حضرت یحیٰی علیہ السلام کو بھی قتل کر چکے تھے۔ اور اب حضرت عیسٰی علیہ السلام کے پیچھے پڑے ہوئے تھے چنانچہ منصوبہ کے تحت چار ہزار یہودیوں نے اس مکان کا محاصرہ کر لیا جس میں مسیح علیہ السلام اپنے حواریوں سمیت مقیم تھے جب عیسٰی علیہ السلام کو اس محاصرہ کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے حواریوں سے فرمایا کہ یہ لوگ میری جان کے درپے ہیں، تم میں سے کون آدمی ہے جو میری جگہ باہر نکل کر قتل ہو جائے، ایسا شخص جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ اس پہ ایک حواری نے لبیک کہا۔ مسیح علیہ السلام نے اپنی پگڑی اور کرتہ اُسے پہنایا، اللہ تعالٰی نے اُس شخص پہ مسیح علیہ السلام کی شبیہ بھی ڈال دی، وہ شخص باہر نکلا تو یہودیوں نے اُسے مسیح سمجھ کر سولی پہ چڑھا دیا اور ادھر اللہ تعالٰی نے مسیح علیہ السلام کو اُس مکان کے روزن سے فرشتوں کے ذریعے آسمان پہ اٹھا لیا۔

دوسری روایت

دوسری روایت یہ ہے کہ محاصرین نے اپنے میں سے ایک آدمی کو اُس

مکان کے اندر بھیجا جس میں مسیح علیہ السلام مقیم تھے تاکہ آپ کو گرفتار کیا جا سکے۔
جب یہ شخص مکان میں پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے اُس پر مسیح علیہ السلام کی شبیہ ڈال دی اور اس کی شکل و صورت بالکل عیسیٰ علیہ السلام جیسی ہو گئی۔ اللہ نے مسیح علیہ السلام کو تو آسمان کی طرف اٹھا لیا، مگر جب وہ جاسوس باہر نکلا تو محاصرین نے اُسے مسیح سمجھ کر پکڑ لیا اور سولی پر چڑھا دیا۔ اس کے باوجود اُن لوگوں کو تسلی نہ ہوئی۔ اور وَلٰکِن شُبِّہَ لَہُمْ کے مطابق وہ اس شبہ میں مبتلا ہو گئے کہ مسیح علیہ السلام کو تو ہم نے قتل کر دیا مگر ہمارا وہ آدمی کہاں گیا جسے پتہ کرنے کے لیے ہم نے مکان کے اندر بھیجا تھا۔ اور اگر ہم نے اپنے ہی آدمی کو مسیح کے شبہ میں قتل کر دیا تو پھر مسیح علیہ السلام کہاں گئے۔ بہرحال وہ تردد میں پڑ گئے اور آج تک پڑے ہوئے ہیں۔ بعض کو اس قدر شبہ ہو گیا کہ وہ کہتے کہ جس شخص کو ہم نے سولی پر چڑھایا ہے، اُس کی شکل و صورت تو مسیح جیسی تھی اور باقی جسم اُن کے مشابہ نہیں تھا۔

تیسری روایت

تیسری روایت اناجیل کے بیان پر مشتمل ہے۔ مورخین نے انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنز (ENCYCLOPAEDIA OF RELIGIONS) میں لکھا ہے۔ کہ جب مسیح علیہ السلام کے خلاف شور و غوغا بہت بڑھ گیا تو رومی وائسرائے نے اپنے مرکز کو لکھا کہ یہاں کے لوگ ایک بے گناہ کے سخت خلاف ہو گئے ہیں، مجھے ان حالات میں کیا کرنا چاہیئے۔ وہاں سے حکم آیا کہ ایسے شخص کو کچھ نہ کہا جائے۔ وائسرائے نے دوبارہ مرکز سے رابطہ قائم کیا، تو پھر وہی جواب آیا۔ اس اثنا میں مخالفت حد سے بڑھ گئی اور بغاوت کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ تو مقامی حاکم نے تیسری دفعہ اپنی حکومت کو لکھا کہ اب تو حالات قابو سے باہر ہو رہے ہیں۔ اس پر ہیڈ کوارٹر سے یہ حکم آیا کہ شورش کو ختم کرو۔ خواہ اس شخص کو قتل کرنا پڑے۔ چنانچہ مسیح علیہ السلام کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور پھر اُن کے لیے سزائے موت کا حکم ہوا۔ اُس زمانے میں رواج یہ تھا۔ کہ سولی پانے والے شخص کو سولی کا شہتیر خود اٹھا کر سولی کے مقام تک پہنچانا ہوتا تھا چنانچہ یہ وزنی شہتیر حضرت مسیح علیہ السلام کو اٹھوایا گیا۔ اُن کے سر پر کانٹوں کا تاج

رکھا گیا اور (العیاذ باللہ) آپ کے منہ پر تھوکا گیا۔ لوگوں کا جم غفیر اور رومی پولیس آپ کے ہمراہ چل رہی تھی۔ بھاری شہتیر کا اٹھانا مسیح علیہ السلام کی طاقت سے باہر ہو رہا تھا چنانچہ یہ شہتیر ایک شخص شمعون قریني کے کندھے پر رکھ دیا گیا تاکہ سولی کے مقام تک پہنچایا جا سکے۔ اس دوران میں رومی پولیس کے آدمیوں کی ڈیوٹی بدل گئی اور نئی نفری آگئی۔ نئی پولیس نے رواج کے مطابق سولی اٹھانے والے شخص کو ہی مجرم سمجھا اور اُسے سولی پر لٹکا دیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بچانا تھا، وہ ہجوم میں اِدھر اُدھر ہو گئے۔ روایت ہے۔ کہ اس دوران شمعون کی شکل و صورت بھی حضرت مسیح جیسی اللہ نے بنا دی جس کی وجہ سے شمعون کو سزائے موت دے دی گئی۔ اور مسیح علیہ السلام کو اللہ نے بچا لیا۔ روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ اُس دِن جمعہ کا دِن تھا۔ آگے ہفتہ یہودیوں کی تعطیل کا دِن آ رہا تھا، جس دن انہیں کوئی کام نہ کرنے کا حکم تھا۔ لہٰذا انھوں نے کوشش کی کہ مسیح علیہ السلام کا کام آج ہی تمام کر دیا جائے تاکہ پھر اتوار تک انتظار نہ کرنا پڑے۔ یہ افراتفری بھی مسیح علیہ السلام کو بچانے اور شمعون قریني کو سولی پر لٹکانے کا باعث بنی۔ بہر حال اللہ نے فرمایا کہ یہودی نہ تو حضرت مسیح علیہ السلام کو قتل کر سکے اور نہ انہیں سولی پر لٹکا سکے، بلکہ اللہ تعالےٰ نے انہیں اپنی طرف اٹھا لیا۔

دیگر نظریات

اس ضمن میں قادیانیوں نے ایک نیا نظریہ قائم کیا ہے وہ کہتے ہیں۔ کہ قرآن پاک کے بیان کے مطابق عیسٰی علیہ السلام کو نہ تو قتل کیا گیا اور نہ سولی پر لٹکایا گیا، بلکہ آپ طبعی موت مرے اور آپکی روح کو اوپر اٹھا لیا گیا۔ اس طرح اس گروہ نے قربِ قیامت میں نزولِ مسیح کا بھی انکار کر دیا ہے۔

مولانا مودودی نے مسیح علیہ السلام کے رفع الی السماء کو متشبہات میں شمار کیا ہے۔ حالانکہ یہی آیت اس مسئلہ میں صریح نص ہے۔ مسیح علیہ السلام کی زندگی اور دوبارہ نزول کا ذکر قرآن پاک میں اجمالاً موجود ہے اور احادیثِ نبوی اس کی مکمل تصریح کرتی ہیں۔ اس آیت کے الفاظ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ

عِیسَی ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰہِ واضح کرتے ہیں کہ جس ہستی کو قتل کرنے کے یہودی دعویدار تھے، وہ مسیح، عیسٰی ابن مریم، اللہ کے رسول ہیں۔ ظاہر ہے کہ قتل کا دعویٰ محض روح کے لیے نہیں بلکہ جسم و روح دونوں کے لیے تھا۔ اور انہی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ نہ تو انہیں قتل کیا گیا اور نہ سولی دیا گیا بلکہ اُن (یہودیوں) پر شبہ ڈال دیا گیا۔ پھر اسی مسیح علیہ السلام کے متعلق فرمایا۔ بَلْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ یعنی ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھالیا۔ تو جب قتل کا تعلق جسم اور روح دونوں کے ساتھ ہے اور اللہ تعالیٰ اسی عمل کی تردید فرما رہے ہیں تو پھر رفع الی السماء کا تعلق بھی جسم و روح دونوں کے ساتھ ہے۔ نہ کہ صرف روح کے ساتھ۔ لہٰذا یہ آیت مسیح علیہ السلام کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کی صریح نص ہے۔

حضرت مولانا انور صاحب کشمیریؒ نے "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" عربی اور اردو میں کتاب لکھی ہے جو دمشق سے بھی شائع ہو چکی ہے۔ اس میں آپ نے ڈیڑھ سو کے قریب احادیث نقل کی ہیں جن میں مسیح علیہ السلام کی زندگی اور دوبارہ نزول کا ذکر ہے۔ صحیحین کی روایت میں یہ بھی موجود ہے لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم حکمًا عدلاً یعنی وہ وقت بھی آئیگا جب مسیح علیہ السلام تمہارے درمیان حاکم عادل بن کر اتریں گے، صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے اور جزیہ قبول نہیں کریں گے۔ آپ کے دور میں ملت اسلامیہ کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہیگا۔

قرآن پاک کی آیت "وَاِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَۃِ" سے مسیح علیہ السلام کا تذکرہ آپ کو قیامت کی نشانیوں میں سے ظاہر کرتا ہے جس سے ان کا قرب قیامت میں ظہور ثابت ہوتا ہے۔

اہل کتاب کا ایمان لانا

فرمایا وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اور اہل کتاب میں سے

کوئی نہیں ہے۔ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ مگر یہ کہ ایمان لائیگا حضرت مسیح پر آپ کی موت سے قبل۔ موتہ کی ضمیر حضرت عیسٰی علیہ السلام کی طرف بھی رُجوع ہوتی ہے اور ہر ہر فرد اہل کتاب کی طرف بھی۔ اور اگر اس سے کتابی مراد ہے یعنی ہر یہودی اور نصرانی مرنے سے پہلے عیسٰی علیہ السلام پر ایمان لے آئے گا تو اُس وقت کا ایمان لانا کچھ فائدہ نہیں دیگا۔ موت سے پہلے جب فرشتے نظر آنے لگتے ہیں اور پردہ غیب اٹھ جاتا ہے، تو اس وقت اگر انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ کہ انہوں نے مسیح علیہ السلام کو ولد الزنا اور دجال تک کے لقب دیے تھے، تو اُس وقت اُن کا ایمان کچھ مفید نہ ہو گا۔ عیسائیوں نے بھی عیسٰی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا اور تین خداؤں میں سے تیسرا کہا تھا حالانکہ آپ خدا کے برگزیدہ بندے تھے۔ اگر مرتے وقت اُن پر بھی حقیقت آشکارا ہو جائے اور انہیں اپنی غلطی کا احساس بھی ہو جائے تو اُس وقت کی توبہ قبول ہی نہیں ہو گی لہٰذا اُن کی موت بھی کفر پر ہی آئے گی۔

مسلم شریف کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قَبْلَ مَوْتِهٖ سے مراد یہ ہے۔ کہ مسیح علیہ السلام کی موت سے قبل ہر کتابی آپ پر ایمان لائے گا۔ تو حقیقی موت تو اُس وقت آئے گی جب آپ دوبارہ نازل ہو کر زندگی کے چالیس یا ساٹھ سال گزار چکیں گے۔ اُس وقت سے پہلے پہلے جو کتابی ایمان نہیں لائے گا، وہ موت کے گھاٹ اتار دیا جائیگا، نہ کوئی یہودی باقی رہے گا، اور نہ نصرانی۔ اس بارے میں بہت سے زیادہ حدیثیں موجود ہیں کہ مسیح علیہ السلام دوبارہ نازل ہوں گے۔ مسلم شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی موجود ہے کہ وہ وقت بھی آئے گا جب عیسٰی علیہ السلام فج روحاء کے مقام سے حج یا عمرہ کا احرام باندھیں گے۔ زمین پر حکومت کریں گے۔ انصاف قائم کریں گے اور پھر اُن کے زندہ رکھنے کی خاص مصلحت دجال کا مقابلہ ہے اُس کو اپنے ہاتھ سے قتل کریں گے، یاجوج ماجوج کا فتنہ برپا ہو گا، اُس کے لیے دُعا کریں گے تو وہ فتنہ بھی ختم ہو جائے گا۔ آپ شادی بھی کریں گے، زمین پر

چالیس یا ساٹھ سال کا عرصہ گزار کر وفات پائیں گے اور پھر دفن ہوں گے۔ یہ سب باتیں نزول کے بعد وارد ہونے والی ہیں اور آپ کے آسمان پر زندہ اٹھائے جانے کی طرف دلالت کرتی ہیں۔

عیسٰی علیہ السلام کے دوبارہ نزول کا عقیدہ بنیادی عقیدہ ہے۔ اہل حق میں سے اس بارے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ متواتر اور صحیح احادیث اس کثرت سے ہیں کہ ان کا انکار کفر ہے۔ ایسا شخص اسلام سے خارج سمجھا جائے گا۔ اس آیت میں یہی بات سمجھائی گئی ہے کہ اہل کتاب میں سے کوئی بھی نہیں ہوگا مگر وہ عیسٰی علیہ السلام کی موت سے قبل آپ پر ایمان لے آئے گا۔ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ اور قیامت والے دن يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مسیح علیہ السلام اہل کتاب پر گواہ ہوں گے۔ آپ اللہ کے ہاں گواہی دیں گے کہ یہود و نصاریٰ نے دنیا میں ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ ایک گروہ نے سرے سے تکذیب کر دی آپ کے مخالف ہو گئے حتیٰ کہ سزائے موت دلوانے کی کوشش کی، اور دوسرے گروہ نے انہیں خدا کا بیٹا بنا دیا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ سب باتیں ہوں گی۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَٰتٍ
أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَن سَبِيلِ اللَّهِ
كَثِيرًا ﴿١٦٠﴾ وَأَخْذِهِمُ الرِّبَوٰا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ
وَأَكْلِهِمْ أَمْوَٰلَ النَّاسِ بِالْبَٰطِلِ ۚ وَأَعْتَدْنَا
لِلْكَٰفِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٦١﴾ لَّٰكِنِ الرَّٰسِخُونَ
فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُونَ يُؤْمِنُونَ بِمَا
أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ ۚ وَالْمُقِيمِينَ الصَّلَوٰةَ
وَالْمُؤْتُونَ الزَّكَوٰةَ وَالْمُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
أُولَٰئِكَ سَنُؤْتِيهِمْ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١٦٢﴾

ترجمہ: پس بوجہ ظلم کرنے اُن لوگوں کے جو یہودی ہوئے ہم نے ان پر پاکیزہ چیزیں حرام قرار دیں جو حلال تھیں اور بوجہ ان کے اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنے کے بہت سے لوگوں کو (۱۶۰) اور بوجہ ان کے سود لینے کے حالانکہ انہیں منع کیا گیا تھا اس سے۔ اور بوجہ ان کے کھانے لوگوں کے مال باطل طریقے سے اور تیار کیا ہے ہم نے کفر کرنے والوں کے لیے دردناک عذاب (۱۶۱) لیکن ان میں سے علم میں پختہ لوگ اور ایمان لانے والے جو ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو آپ

کی طرف اُتاری گئی اور جو آپ سے پہلے اُتاری گئی ۔ اور (تعریف کے مستحق ہیں) وہ لوگ جو نماز قائم کرنے والے ہیں اور زکوٰۃ دینے والے ہیں اور جو ایمان رکھنے والے ہیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر ۔ یہی لوگ ہیں ۔ کہ اُن کو ہم بہت بڑا اجر دیں گے ﴿۱۶۲﴾

ربط آیات

گذشتہ کئی دروس سے اہل کتاب کی خرابیوں کا تذکرہ ہو رہا ہے اور یہ درس بھی اُسی سلسلہ کی کڑی ہے ۔ اہل کتاب نے عناد کی وجہ سے کہا کہ اگر آپ اللہ کے نبی ہیں تو کتاب یکبارگی کیوں نہیں لے آتے ، جیسا کہ پہلے نبی لائے ۔ اس اعتراض کا حقیقی جواب تو اگلے رکوع میں آئے گا ، تاہم گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ السلام کو تسلی دی کہ آپ اہل کتاب کے فضول اعتراضات سے دل برداشتہ نہ ہوں ، اس ضدی قوم نے آپ سے پہلے انبیاء پر اس سے بھی بڑے بڑے سوال کیے ۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے رؤیتِ الٰہی کا مطالبہ کیا ، اللہ تعالیٰ نے انہیں فوراً سزا دی اور ایک بجلی آئی جس نے انہیں جلا کر ہلاک کر دیا ، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دُعا کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دوبارہ زندگی عطا کی اللہ نے یہودیوں کی یہ خباثت بھی بیان فرمائی کہ واضح دلائل دیکھنے کے باوجود انہوں نے بچھڑے کی پوجا کی اور کفارے کے طور پر ستر ہزار آدمیوں کو قتل کیا گیا ۔ ان لوگوں نے اللہ کے نبیوں کو ناحق قتل کیا اور آخر میں حضرت مریم پر بہتان باندھا اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کو (العیاذ باللہ) ولد الزنا کہا ۔ انہوں نے فخریہ یہ دعویٰ بھی کیا کہ انہوں نے مسیح علیہ السلام کو قتل کر دیا ہے ، حالانکہ وہ نہ تو آپ کو قتل کر سکے اور نہ سولی پر چڑھا سکے ۔ بلکہ یہ معاملہ ان کے لیے مشتبہ ہو کر رہ گیا اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کو اپنی طرف اٹھا لیا ۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے دوبارہ نزول کی طرف بھی اشارہ کیا ۔ اور یہ بھی فرمایا کہ اُس زمانے میں یہود و نصاریٰ میں سے کوئی شخص بھی حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لائے بغیر نہیں رہے گا ، کیونکہ جو ایمان نہیں لائے گا ۔ وہ ہلاک ہو جائے گا ۔

حلال و حرام

آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو دی جانیوالی اُس سزا کا ذکر کیا ہے ۔

جس کے مطابق اُن پر بعض حلال چیزیں حرام قرار دے دی گئی تھیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔
فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا یہودیوں کے ظلم یعنی گناہوں کی پاداش میں حَرَّمْنَا
عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ ہم نے ان پر پاکیزہ چیزیں حرام
قرار دیدیں جو اُن کے لیے حلال تھیں۔ اور ظلم سے مراد اہل کتاب کی وہ خرابیاں
ہیں جن کا تذکرہ گذشتہ دروس سے چلا آرہا ہے۔

جسمانی نقصانات

کسی چیز کی حرمت دو وجوہات کی بنا پر ہوتی ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ حرام چیز میں
کوئی ایسی خرابی پائی جاتی ہے جو جسمانی یا روحانی لحاظ سے انسان کے لیے مضر ہوتی ہے
لہذا مصلحتاً اُسے حرام قرار دے دیا جاتا ہے۔ اور یا پھر کوئی حلال چیز محض سزا کے طور پر
کسی قوم پر حرام کر دی جاتی ہے۔ آج کے درس میں اس قسم کی حرمت ہی کا تذکرہ ہے
اگلی سورۃ مائدہ میں حلال و حرام کا تفصیل سے ذکر ہے۔ وہاں پر طیبات
کو حلال قرار دیا گیا ہے اور پھر بهيمة الانعام یعنی مویشیوں کو حلال قرار دیا ہے،
ان کا گوشت اور دودھ حلال ہیں کیونکہ اِن جانوروں یعنی گائے، بھینس، بھیڑ، بکری،
اونٹ وغیرہ کا مزاج انسانی مزاج کے مطابق ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے درندے
جو انسانی مزاج سے مطابقت نہیں رکھتے، انہیں حرام قرار دیا گیا ہے۔ ترمذی شریف
کی روایت میں آتا ہے نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم عَنِ
الدَّوَآءِ الْخَبِيْثِ یعنی حضور نبی کریم علیہ السلام نے خبیث دوا کے استعمال سے
منع فرمایا ہے۔ مثلاً سنکھیا یا کوئی دوسری زہر دوائے خبیث ہے۔ حضور نے اس
کے ذریعے علاج کرنے سے منع فرمادیا کہ اس کا استعمال انسانی مزاج کے بالکل
خلاف ہے۔ اس کی معمولی مقدار بھی انسان کے معدے، جگر اور مثانے کو زخمی کر
دیتی ہے۔ خون جاری ہو جاتا ہے۔ جسم میں ورم آجاتا ہے۔ اور پھر تمام جسمانی نظام
درہم برہم ہو کر مریض کی ہلاکت کا باعث بن جاتا ہے۔ چونکہ زہر انسانی جسم کے
لیے مضر ہے، لہذا اس کے استعمال سے منع فرما دیا گیا حضور علیہ السلام نے گھوڑے
کا گوشت کھانے کی اجازت دی مگر

گدھے

کے گوشت سے منع فرما دیا۔ گدھے کا گوشت انسانی جسم سے مطابقت نہیں رکھتا، جو شخص کھائیگا بلید الطبع ہو جائے گا۔ اس میں گدھے جیسی صفات پیدا ہوں گی۔ اسی طرح درندوں کا گوشت بھی حرام ہے۔ جو شخص شیر، چیتا، ریچھ، گیدڑ، بلی، کتا وغیرہ کا گوشت استعمال کرے گا، اس میں وہی صفات پیدا ہو جائیں گی جو قومیں درندوں کا گوشت کھاتی ہیں [illegible] جیسی صفات ہی پیدا ہوتی ہیں۔ ابوداؤد شریف کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چیتے کی کھال سے تیار کیے گئے مصلے پر بیٹھنے سے منع فرما دیا اگرچہ وہ دباغت شدہ ہو۔ وجہ یہ ہے۔ کہ ایسی کھال استعمال کرنے والے میں تکبر جیسی قبیح صفت پیدا ہو گی جو کہ ہمارے اخلاق کے لیے سخت مضر ہے۔ برخلاف اس کے اونٹ، گائے، بھیڑ بکری کی کھال کے مصلے پر بیٹھنا جائز ہے، کہ یہ جانور انسانی طبائع سے مطابقت رکھتے ہیں۔

روحانی نقصانات

اللہ تعالیٰ نے بعض چیزیں روحانی نقصانات کی وجہ سے حرام قرار دی ہیں جیسے مردار، دم مسفوح، خنزیر کا گوشت اور نذر لغیر اللہ۔ مردار کی حرمت میں یہ وجہ کار فرما ہے کہ اس کا گوشت کھانے سے انسان میں سستی اور کاہلی پیدا ہوتی ہے نیز نیکی کے کام اور عبادت میں نشاط پیدا نہیں ہوتا، یہ اس کا روحانی نقصان ہے اسی طرح رگوں سے نکلنے والے خون میں یہ خرابی ہے کہ اسے استعمال کرنے والے آدمی میں درندگی کے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں شیر، ریچھ وغیرہ جانور کا خون ہی پیتے ہیں جس کی وجہ سے ان میں اس قدر درندگی پائی جاتی ہے۔

خنزیر گندگی کھانے والا جانور ہے۔ اس کا گوشت کھانے والے آدمی میں بھی گندگی ہی پیدا ہو گی۔ اس کے علاوہ یہ جانور بے غیرت بھی ہے، لہٰذا اس کا گوشت کھانے والے بھی بے غیرتی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ انگریز اور سکھ خنزیر کا گوشت کھاتے ہیں لہٰذا یہ دونوں قومیں بے غیرتی میں ملوث ہیں۔ حضور علیہ السلام نے گندگی کھانے والے جانور (جلالہ) کا گوشت مکروہ تحریمی میں شمار کیا ہے جو گائے

یا بھیڑ وغیرہ گندگی کھانے لگے اُس کا حکم یہ ہے کہ اُسے دس دن تک باندھ کر گندگی سے حفاظت کی جائے تو پھر اس کا گوشت کھانے کے قابل ہو گا اس طرح اگر مرغ بھی گندگی کھانے لگے تو اُسے تین دن تک روک کر پھر اس کا گوشت کھایا جا سکتا ہے۔

چوتھی چیز غیر اللہ کے نام کی نذر بھی حرام ہے وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ۔ اس کے استعمال سے بھی روحانی نجاست پیدا ہوتی ہے جسے اعلیٰ روحانیت کے حامل لوگ بھی محسوس کرتے ہیں۔ نذر لغیر اللہ کی اشیاء کھانا، دودھ، گوشت وغیرہ اگرچہ بظاہر حلال ہیں مگر جب یہ پاکیزہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی بجائے کسی پیر فقیر جن یا فرشتے کی خوشنودی کے لیے موسوم کی جائیں تو ان کے کھانے سے انسان کی روح ناپاک ہو جاتی ہے گویا یہ روحانی طور پر مضر ہیں۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے جن محرمات کا ذکر کیا ہے وہ چیزیں یہودیوں پر بطور سزا حرام قرار دی گئی تھیں۔ ان ضدی اور شرارتی لوگوں نے بڑے بڑے جرائم کا ارتکاب کیا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُن پر احکام بھی سخت نازل فرمائے۔ بچھڑے کی پوجا اور پھر بنی اسرائیل کی توبہ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ انہوں نے شرک جیسے ظلم عظیم کا ارتکاب کیا تو اللہ تعالیٰ نے قبولیتِ توبہ کی یہ کڑی شرط لگا دی کہ تمام مشرکین کو تہ تیغ کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اسی طرح اللہ نے اُن کی قباحتوں کی وجہ سے ان پر بعض پاکیزہ چیزیں بھی حرام قرار دے دیں۔ اللہ تعالیٰ نے کثرت سے پائے جانے والے شتر مرغ ان کے لیے حرام کر دیئے۔ اونٹ اور دیگر حلال جانوروں کی چربی حرام قرار دے دی۔ وہ صرف ہڈیوں یا آنتوں کے ساتھ ملی ہوئی چربی تو استعمال کر سکتے تھے مگر گوشت کے ساتھ لگی ہوئی چربی اُن کے لیے حرام تھی۔ یہ اُن کے لیے بڑا دشوار حکم تھا مگر اللہ نے فرمایا کہ یہ اُن کے اپنے جرائم کی وجہ سے سزا کے طور پر کرنا پڑا۔ حرمت بطور سزا

فرمایا یہودیوں کے ظلم کی وجہ سے اُن کے لیے بعض پاکیزہ چیزیں حرام صراطِ مستقیم میں رکاوٹ

کر دی گئیں وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکنا بھی یہودیوں کے جرائم میں سے ہے اور ان کے لیے بعض حلال چیزوں کی حرمت کی ایک وجہ یہ بھی تھی حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک میں یہ لوگ ایڑی چوٹی کا زور لگاتے تھے کہ کسی طرح لوگ اسلام قبول نہ کریں بلکہ کفر و ضلالت کے دامِ فریب میں ہی پھنسے رہیں۔ آج تک یہودیوں کا یہی وطیرہ ہے۔ لوگوں کو صراطِ مستقیم سے روکنے میں یہ لوگ تمام اقوامِ عالم سے پیش پیش ہیں۔ انہوں نے دنیا بھر میں سازشوں کا جال پھیلا رکھا ہے۔ ہنود تو ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ یہ لوگ لٹریچر اور فلموں کے ذریعے دینِ حق کی قبولیت سے روکتے ہیں، مال خرچ کرتے ہیں، عورتوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ سکول اور ہسپتال بناتے ہیں۔ ان تمام سکیموں کا واحد مقصد یہ ہے کہ کسی طرح لوگ قرآن پاک کی تعلیم سے بہرور نہ ہوسکیں اور نہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن پہ گامزن ہوسکیں۔ اسی لیے فرمایا کہ یہودیوں کی سزا کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ لوگوں کی کثیر تعداد کو صراطِ مستقیم سے روکتے ہیں۔

سود خوری

فرمایا وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ اور سود لینے کی وجہ سے حالانکہ انہیں اس سے منع کیا گیا ہے۔ بنکنگ سسٹم کے موجد اور سود خوری کے امام بھی یہی لوگ ہیں۔ ان لوگوں نے سود کا طریقہ ایجاد کر کے ساری دنیا کو اس لعنت میں گرفتار کر دیا ہے۔ سود پہلی شریعتوں میں بھی حرام تھا اور آج بھی حرام ہے مگر یہ لوگ اسے مسلسل کھا رہے ہیں وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ اور لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھانے کی وجہ سے بھی یہ لوگ مستحق لعنت ٹھہرے۔ سود خوری بذاتِ خود مال ہڑپ کرنے کا باطل ترین ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ دھوکہ، فریب اور من مانے جواز کے ذریعے ناحق مال کھانا ان کی عادتِ قدیمہ ہے۔ سورۃ آلِ عمران میں گزر چکا ہے "لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ" یعنی امیوں کا مال ہمارے لیے ہر طرح مباح ہے اسے

ناجائز طریقے سے کھانے میں بھی کوئی گناہ نہیں۔ حالانکہ اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں، کسی کا مال ناحق کھانا اللہ کے دین اور شریعت میں قطعاً روا نہیں اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کا قطعی حکم موجود ہے "لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ" یعنی ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ۔ مگر لوگوں نے ناجائز طریقے سے مال ہڑپ کرنے کے کتنے طریقے ایجاد کر لیے ہیں۔ خوشی اور غمی کی رسومات، جھوٹے تعویذ گنڈے اور سحر سب مال کھانے کے باطل ذرائع ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ہم نے منکرین دین و شریعت کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ وہ اللہ کے ہاں پکڑے جائیں گے۔

حق پرست لوگ

مجرمین کا حال بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حق پرست مومنین کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ گذشتہ سورۃ میں بھی گزر چکا ہے "لَيْسُوْا سَوَآءً" سب لوگ برابر نہیں ہوتے۔ اہلِ کتاب میں بھی بعض حق پرست لوگ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ باطل پرستوں کی فہرست سے نکل جاتے ہیں اور حق کو قبول کر لیتے ہیں۔ فرمایا لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ مگر جو لوگ علم میں پختہ کار ہوتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کے زمانے میں بھی حضرت عبداللہ بن سلامؓ اور ان کے بعض رفقاء نے ایمان قبول کیا، وہ لوگ صحیح معنوں میں اہلِ علم تھے۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اور کچھ ایسے ایمان والے لوگ بھی ہوتے ہیں يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ جو اس چیز پر ایمان لاتے ہیں جو آپ پر نازل کی گئی یعنی قرآن پاک وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ اور اس چیز پر بھی ایمان لاتے ہیں جو آپ سے پہلے نازل کی گئی یعنی تمام کتب سماویہ۔ اور ایمان کی تکمیل جبھی ہوتی ہے جب تمام انبیاء اور تمام کتب پر ایمان لایا جائے۔ تمام شرائع الہیہ کو تسلیم کیا جائے، تاہم عمل صرف آخری شریعت اور کتاب ہی پر کیا جائے گا۔

فرمایا قابلِ تعریف ہیں وہ حق پرست لوگ جو علم میں پختہ اور تمام کتب سماویہ

پر ایمان لانے والے ہیں۔ ان کے علاوہ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ جو نماز قائم کرنے والے ہیں کیونکہ تعلق باللہ قائم کرنے کے لیے نماز ایک بہترین ذریعہ ہے۔ انسان نماز کے ذریعے خدا کی بارگاہ میں پیش ہوتا، مناجات کرتا ہے۔ اور اعضاء جوارح سے اس کی تعظیم بجا لاتا ہے۔ پھر فرمایا وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ اور زکوٰۃ ادا کرنے والے لوگ بھی قابل آفرین ہیں۔ نماز کے ساتھ تعلق باللہ قائم ہوتا ہے تو زکوٰۃ کے ذریعے مخلوق کے ساتھ تعلق اور ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ اللہ کے بندوں کی خیر خواہی کے لیے زکوٰۃ کی ادائیگی فرائض میں سے ہے اور سب سے مقدم ہے، اس کے بعد صدقات، خیرات وغیرہ کی نوبت آتی ہے کہ یہ بھی خدمت انسانی کا ذریعہ ہیں۔ انفاق فی سبیل اللہ میں اللہ نے بہت سی مصلحتیں رکھی ہیں۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کا بڑا فائدہ یہ ہے۔ کہ ایک طرف یہ عمل انسان کو بخل سے بچاتا ہے تو دوسری طرف بنی نوع انسان کی ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ سورۃ توبہ کی آیت "اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ"..... الخ انہی امور خیر کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

فرمایا وہ لوگ بھی قابل تعریف ہیں وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ جو اللہ پر ایمان لانے والے ہیں وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اور قیامت کے دن پر بھی ان کا ایمان ہے جزائے عمل کو تسلیم کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ایسے لوگوں کو ہم عنقریب اجر عظیم سے مالا مال کریں گے۔ یہ ایسے لوگ چاہے یہودیت سے آئے ہوں یا نصرانیت کی گود سے، اگر وہ علم میں پختہ کار ہیں۔ تمام کتب سماویہ پر ایمان لاتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں۔ روز آخرت پر ان کا ایمان ہے تو وہ لوگ لائق تعریف اور مستحق اجر ہیں۔

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَٱلنَّبِيِّـۧنَ
مِنۢ بَعْدِهِۦ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْمَٰعِيلَ
وَإِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ وَٱلْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ
وَيُونُسَ وَهَٰرُونَ وَسُلَيْمَٰنَ ۚ وَءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ
زَبُورًا ﴿١٦٣﴾ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَٰهُمْ عَلَيْكَ مِن
قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ
ٱللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ﴿١٦٤﴾ رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَ
مُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى ٱللَّهِ حُجَّةٌۢ
بَعْدَ ٱلرُّسُلِ ۚ وَكَانَ ٱللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿١٦٥﴾

ترجمہ:۔ بیشک ہم نے وحی نازل کی ہے آپ کی طرف جیساکہ

ہم نے وحی نازل کی تھی نوح علیہ السلام کی طرف اور اُن نبیوں کیطرف
جو نوح (علیہ السلام) کے بعد آئے اور ہم نے وحی نازل کی ابراہیم
(علیہ السلام) اسماعیل (علیہ السلام) اسحاق (علیہ السلام) یعقوب (علیہ السلام) اور اُن کی
اولاد کی طرف ۔ اور عیسٰی (علیہ السلام) ایوب (علیہ السلام) یونس (علیہ السلام)، ہارون
(علیہ السلام) اور سلیمان (علیہ السلام) پر، اور ہم نے داؤد (علیہ السلام) کو زبور عطا
کی ﴿١٦٣﴾ اور ہم نے ایسے رسول بھیجے جن کا حال ہم نے آپ
پر بیان کیا ہے ۔ اس سے پہلے، اور ایسے رسول بھی بھیجے جن کے

حالات ہم نے نہیں بیان کیے آپ پر ۔ اور اللہ تعالیٰ نے کلام
کیا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کلام کرنا ﴿١٦٤﴾ ہم نے رسول بھیجے خوشخبری
سنانے والے اور ڈرانے والے تاکہ نہ ہو لوگوں کے لیے اللہ کے
سامنے کوئی حجت رسولوں کے بھیجنے کے بعد ۔ اور اللہ تعالیٰ
زبردست ہے اور کمال حکمت کا مالک ہے ﴿١٦٥﴾

ربط آیات

اہل کتاب سے مراد مدینے کے اطراف میں رہنے والے یہودی ہیں اللہ تعالیٰ نے اُن کے اعتراض کا ذکر فرمایا "يَسْـَٔلُكَ أَهْلُ الْكِتٰبِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ" انہوں نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سوال کیا تھا کہ اگر آپ نبوّت کے دعویدار ہیں، تو پھر قرآن پاک تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں نازل ہوتا ہے آپ پوری کتاب ایک دفعہ کیوں نہیں آسمان سے لے آتے جیساکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پوری تورات تختیوں پر لکھی لکھائی یکبارگی مل گئی تھی، یہودیوں میں بعض ایسے بدبخت بھی تھے جو کہتے تھے "مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ" یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان پر کوئی چیز نازل نہیں کی۔ اور آپ کا دعویٰ باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سوال کے الزامی جواب دیے اور حضور علیہ السلام کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ معترضین ایسے بیہودہ لوگ ہیں کہ انہوں نے اس سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی بڑے سوال کیے ۔ اللہ تعالیٰ نے اُن سوالوں کو شمار کرتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا، کہ ہم تجھ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، جب تک کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں ان لوگوں نے واضح نشانیاں ملنے کے باوجود بچھڑے کی پوجا کی، عہد و پیمان کو توڑا، انبیاء کو ناحق قتل کیا، حضرت مریمؑ پر طوفان باندھا، حضرت عیسٰی علیہ السلام کے متعلق نہایت گندا عقیدہ وضع کیا، اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف سے تجاوز اور تعدی کی بنا پر اُن پر سخت احکام نازل فرمائے اور اُن کے لیے بعض حلال چیزیں حرام قرار دے دیں۔ انہیں سود سے اور لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھانے سے منع کیا، مگر انہوں نے ذرا پرہیز نہ کیا بلکہ زیادتی میں مزید

بڑھ گئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُن میں سے بعض لوگوں کی تعریف فرمائی جو علم میں پختہ کار تھے، جب انہوں نے قرآن پاک سنا اور پیغمبر علیہ السلام کی زیارت کی تو ایمان لے آئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اجر عظیم کی بشارت سنائی۔

صداقت کی دلیل

اب آج کے درس کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے اُس سوال کا حقیقی جواب دیا ہے جس میں وہ کہتے تھے کہ اگر آپ اللہ کے رسول ہیں تو آپ پر پوری کتاب اکٹھی کیوں نہیں نازل ہوتی۔ ارشاد ہوتا ہے اِنَّآ اَوۡحَيۡنَآ اِلَيۡكَ بیشک ہم نے آپ کی طرف وحی نازل کی كَمَآ اَوۡحَيۡنَآ اِلٰى نُوۡحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ جس طرح ہم نے وحی نازل کی حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے بعد آنے والے انبیا کی طرف۔ اللہ تعالیٰ نے چند انبیاء کے نام بھی گنوائے ہیں جن کی طرف وحی آتی رہی۔ فرمایا وَاَوۡحَيۡنَآ اِلٰٓى اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ اور ہم نے وحی بھیجی ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام اور اُنکی اولاد پر۔ اس کے علاوہ وَعِيۡسٰى وَاَيُّوۡبَ وَيُوۡنُسَ وَهٰرُوۡنَ وَسُلَيۡمٰنَ ہم نے حضرات عیسیٰ علیہ السلام، ایوب علیہ السلام، یونس علیہ السلام، ہارون علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کی طرف بھی وحی بھیجی۔ وَاٰتَيۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا اور ہم نے حضرت داؤد علیہ السلام کو زبور عطا کی۔ جواب کی نوعیت یہ ہے کہ اہل کتاب جب سابقہ انبیاء علیہم السلام کی نبوت پر ایمان لاتے ہیں تو نبی آخر الزمان پر ایمان کیوں نہیں لاتے جب کہ اللہ کے آخری نبی پر بھی اسی طرح وحی نازل ہوتی ہے جس طرح انبیاء سابقہ پر ہوتی رہی تو اب اس نبی اور اس کتاب کو تسلیم کرنے میں کونسا امر مانع ہے۔ ان حقائق کے باوجود اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے، تو یہ اُن کی ضد اور ہٹ دھرمی ہے اور یہ کفر کے مرتکب ہو رہے ہیں یہاں یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ وحی صرف نبی پر آتی ہے، غیر نبی پر نہیں۔ البتہ کشف یا الہام غیر نبی کو بھی ہو سکتا ہے مگر اسے وہ قطعی اور یقینی حیثیت حاصل نہیں ہوتی، جو وحی الٰہی کو حاصل ہوتی ہے۔

پھر یہ بھی ہے۔ کہ تمام انبیاء پہ وحی تو نازل ہوتی رہی ہے مگر سب کو کتابیں نہیں دی گیئں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ جن کو کتابیں دی گئی ہیں وہ سب کی سب اکٹھی نہیں دی گیئں بعض انبیاء کو یکبارگی کتاب سے دی گئی مگر بعض پہ آیات کی صورت میں تھوڑی تھوڑی وحی نازل ہوتی رہی، لہٰذا انبیاء کے واسطے پوری کتاب کا اکٹھا نازل ہونا ضروری نہیں جس کا یہ اہلِ کتاب مطالبہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی حکمتِ کاملہ کے تحت جس نبی پر جس وقت جتنی وحی چاہتا ہے، نازل فرماتا ہے اگر یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ باقی انبیاء کی نبوت کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو بھی مان لینا چاہیئے۔

رسول اور کتابیں،

اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء کو مکمل کتابیں دیں اور بعض کو چھوٹے چھوٹے صحیفے چنانچہ حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے دریافت کیا کہ اللہ نے کل کتنے نبی اور رسول مبعوث فرمائے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ کل انبیاء اور رسل کی تعداد کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار ١٢٤ ہے۔ پھر عرض کیا کہ ان میں رسول کتنے تھے۔ فرمایا تین سو پندرہ ٣١٥ رسول تھے اور باقی سب انبیاءؑ وحی تمام انبیاء و رسل پہ نازل ہوئی مگر کتاب اور شریعت صرف رسولوں کو ملی۔ اسی روایت میں کتابوں کا ذکر بھی آتا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے عرض کیا حضور! اللہ نے کتنی کتابیں نازل فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کل ایک سو چار ١٠٤، جن میں چار بڑی کتابیں اور ایک سو چھوٹے چھوٹے صحیفے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے انبیاء پہ بھی اللہ نے بعض صحیفے نازل فرمائے۔ اسی حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام تھے اور آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پھر عرض کیا، کیا آدم علیہ السلام نبی تھے؟ فرمایا، ہاں! وہ نبی تھے کَلَّمَهُ اللّٰهُ اللہ تعالیٰ نے اُن سے کلام کیا، لہٰذا وہ نبی اور مکلم تھے۔

آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے اُن کے صلبی بیٹے حضرت شیث علیہ السلام بھی اللہ کے نبی تھے۔ اور اُن کے بیٹے یا پوتے حضرت ادریس علیہ السلام بھی

نبی تھے، آپ کو اخنوخ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ادریس علیہ السلام ہی ہیں جنہوں نے سب سے پہلے قلم سے لکھنا شروع کیا۔ کپڑے سینے کی سوئی اور دیگر لوازمات روزمرہ زندگی آپ ہی نے ایجاد کیے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر جو صحیفے نازل فرمائے، وہ لوگوں کی بود و باش سے متعلق احکام پر مشتمل تھے، چونکہ دنیا کی آبادی اُس وقت بڑھنے لگی تھی ــــــــــــــــــ لہذا اس قسم کے احکام کی ضرورت تھی، جسے اللہ نے ادریس علیہ السلام پر پورا فرمایا۔ آپ کے زمانہ کے متعلق مفسرین کا ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہیں، تاہم اول الذکر زمانہ بعثت زیادہ معتبر ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ

حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے تک دنیا کا ابتدائی دور تھا۔ آپ سے پہلے تک کے دَور کو زمانہ طالب علمی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ پھر جب آپ کا دَور شروع ہُوا، تو یہ گویا تکمیل تعلیم کے بعد امتحان کا وقت تھا۔ امتحان کا نتیجہ پاس یا فیل ہونے کی صورت میں نکلتا ہے کامیاب ہونے والوں کو انعام ملتا ہے اور ناکام ہونے والوں کی تادیب ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں مخلوق کا امتحان لیا گیا جس میں اکثر لوگ ناکام ہوئے، اور انہیں طوفان کی صورت میں سزا ملی۔ صحیحین کی روایت میں آتا ہے کہ قیامت کے دن لوگ نوح علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور آپ سے عرض کریں گے۔ اِنَّكَ اَوَّلُ الرُّسُلِ اِلَى اَهْلِ الْاَرْضِ آپ اہل زمین کی طرف سب سے پہلے عظیم المرتبت رسول ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے مستقل شریعت عطا فرمائی، لہذا آپ اللہ کے ہاں سفارش کریں کہ وہ حساب کتاب شروع کرے مگر آپ جواب دیں گے کہ میں اس کام کا اہل نہیں ہوں اِذْهَبُوْا اِلٰى غَيْرِیْ تم دوسروں کے پاس جاؤ۔ بہرحال حضرت نوح علیہ السلام اور آپ کے بعد آنے والے انبیاء پر اللہ تعالیٰ نے جس طرح چاہا، جب چاہا اور جتنی مناسب سمجھی وحی نازل فرمائی۔ لہذا پوری کتاب کے یکبارگی نزول کا مطالبہ کوئی معقول مطالبہ نہیں تھا۔

معروف اور غیر معروف انبیاء

آگے ارشاد ہوتا ہے وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ آپ سے پہلے ہم نے بہت سے رسول بھیجے جن کا ذکر ہم نے قرآن پاک میں کر دیا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں چھبیس یا ستائیس انبیائے کرام کے اسماء یا ان کے لقب کا تذکرہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ایسے رسول اور انبیاء بھی ہیں جن کا ذکر ہم نے نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان بالرسل کے لیے تمام انبیاء کے اسمائے گرامی یا اُن کے کارہائے نمایاں کا جاننا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ سب پر اجمالی طور پر ایمان لانا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اور جہاں بھی کوئی نبی مبعوث فرمایا ہے، ہمارا ان سب پر ایمان ہے، وہ سب اللہ کے سچے نبی تھے۔ جو لوگوں کی ہدایت کے لیے تشریف لائے۔ سورۃ بقرہ میں گزر چکا ہے کہ یوں کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر، اور اس چیز پر جو ہماری طرف نازل کی گئی اور اس چیز پر بھی جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد پر اتاری گئی "وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ" اور اس چیز پر بھی ایمان لائے جو تمام انبیاء کو اُن کے رب کی طرف سے عطا کی گئی۔ ہر زمانے میں ہر قوم کی طرف رسول آئے ہیں لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ" اللہ نے ہر قوم کے لیے ہادی اور راہنما بھیجے، ہم انہیں جانتے ہیں یا نہیں، سب پر ہمارا ایمان ہے۔

برصغیر کی بعض شخصیتیں

برصغیر کی بعض شخصیتوں کے متعلق لوگ خیال کرتے ہیں کہ شاید وہ نبی ہوں کیونکہ اللہ نے تمام انبیاء کا ذکر تو کیا نہیں بلکہ اُن کی اکثریت غیر معروف ہے۔ چنانچہ برصغیر کے کرشن جی مہاراج، رام چندر اور بدھ کے متعلق اللہ کے نبی ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ ایران میں زرتشت ہوا ہے۔ جس کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ کے قریب ہے۔ کرشن جی مہاراج آج سے تقریباً تین ہزار سال پہلے ہوئے ہیں۔ تاریخ میں ان کے صحیح صحیح واقعات نہیں ملتے اور نہ اُن کی تعلیم کے متعلق کوئی بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے۔ ہندوؤں نے جو چیزیں اُن کی طرف منسوب کی ہیں، اُن میں تو کفر اور شرک پایا جاتا ہے، جو ایک نبی کے ساتھ

قطعاً مطابقت نہیں رکھتیں مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُن کی اصل تعلیم صحیح ہو۔ مگر بعد میں یہاں کے لوگوں نے اُسے اُسی طرح بگاڑ دیا ہو، جس طرح یہود و نصاریٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کو بگاڑ کر کچھ سے کچھ کر دیا ہے۔ بدھ کے نظریات کے متعلق جو کچھ ہم تک پہنچا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ منکرِ خدا تھا۔ وہ مسیح علیہ السلام سے بھی پانچ سو سال پہلے گزرا ہے، ہو سکتا ہے، وہ اللہ کا نبی ہو مگر بعد میں اس کی تعلیم کو بگاڑ دیا گیا ہو۔ بہر حال ان لوگوں کے اقرار یا انکار کے لیے ہمارے پاس کوئی قطعی دلیل نہیں ہے۔ ہمارا ایمان اس حد تک ہے۔ کہ اللہ کے تمام انبیاء و رسل برحق تھے۔

ذی الکفل کا نام قرآن پاک میں موجود ہے مگر اُن کے متعلق مزید تفصیلات کا علم نہیں۔ بعض مفسرین نے کفل کو کپل کی بستی سے منسوب کیا ہے جو کہ ہندوستان کے صوبہ بہار میں واقع ہے۔ مہاتما بدھ یہیں پیدا ہوا تھا مگر یہ محض گمان ہی ہے یقینی بات نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ذی الکفل سے مراد وہ کفالت والے نبی ہیں جنہوں نے ایک شخص کی ضمانت دی تھی اور پھر اس ضمانت کی پاداش میں چودہ سال تک قید کاٹی اور اس واقعہ کی نسبت سے اُن کا لقب ذی الکفل مشہور ہو گیا۔ واللہ اعلم۔

خدا تعالیٰ سے ہم کلامی

بہر حال انبیاء پر ایمان لانے کے لیے اُن کی تفصیلات جاننا ضروری نہیں اُن پر اجمالاً ایمان لانا ہی کافی ہے۔ آگے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی ایک خصوصیت کا ذکر کیا ہے وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا اور موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے متعدد بار کلام کیا۔ چنانچہ کوہ طور پر آپ کی اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کی بہت سی روایات موجود ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء کو خصوصیت عطا فرمائی، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے تکلم کی خصوصیت ہے۔ اسی طرح یہ

خصوصیت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی عطا کی گئی۔ کہ آپ کو معراج کے موقع پہ عالمِ بالا میں اللہ تعالیٰ کی رُویت نصیب ہوئی۔ تو یہ موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت بیان فرمائی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کلام کیا۔

انذار و تبشیر

اللہ تعالیٰ نے فرمایا رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ ہم نے خوشخبری دینے والے رسول مبعوث فرمائے۔ اور خوشخبری ایمان اور نیکی کی بنا پہ حاصل ہوتی ہے فرمایا "اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ" ان کے لیے ان کے رب کے ہاں سچائی کا پایہ ہے تمہارے نیک اعمال کا بدلہ یقیناً تمہیں ملیگا، اللہ تعالیٰ تم پہ راضی ہو گا، تمہیں درجات ملیں گے اور نجات حاصل ہوگی۔ وَمُنْذِرِیْنَ اللہ تے نبی بھیجے جو ڈرانے والے بھی ہیں۔ گویا انذار و تبشیر ہر نبی کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو یہ حکم دیا کہ اہل ایمان کو خوشخبری دے دو اور نافرمانوں کو بُرے انجام سے خبردار کرو۔ سورۃ مدثر میں حکم ہے اے نبی علیہ السلام! "قُمْ فَاَنْذِرْ" آپ لوگوں کو ڈرائیں، انہیں بتائیں کہ کفر، شرک کا انجام کیا ہوگا۔ چنانچہ حضور علیہ السلام نے اہل مکہ کو صفا پہاڑی پہ جمع کیا، اور ان سے تصدیق کرائی کہ آپ بالکل سچے ہیں۔ پھر فرمایا اگر یہ بات ہے تو انی لکم نذیر بین یدی عذاب شدید میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ ایک بڑا عذاب آنے والا ہے، اس سے بچ جاؤ۔ اگر ایمان نہیں لاؤ گے۔ تو یقیناً بڑے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ یہ سُن کر مشرکین سخت سیخ پا ہوئے اور گالیاں دیتے ہوئے چلے گئے۔

فرمایا اللہ کے نبی لوگوں کو خوشخبری سناتے ہیں اور ڈراتے ہیں لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ تاکہ رسول بھیجنے کے بعد اللہ کے سامنے لوگوں کے لیے کوئی حجت باقی نہ رہے۔ کل کو کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہمیں تو اللہ کے احکام کا علم نہیں ہوا، اور جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا کہ کوئی یہ نہ کہے "مَا جَآءَنَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ" ہمارے پاس کوئی خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا نہ آیا۔ بلکہ "فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ" تمہارے

پاس تبشیر و انذار کرنے والے آ چکے۔ انہیں بھیج کر اللہ نے اپنی حجت پوری کر دی ہے اب تمہارے پاس لاعلمی کا کوئی بہانہ باقی نہیں رہا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اس کے رسولوں اور کتابوں پر ایمان لے آؤ۔ اسی میں تمہاری نجات ہے۔

سامانِ ہدایت

مفسر قرآن امام بیضاویؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے تمام سامان اپنی مخلوق کو مہیا کر کے اپنی حجت تمام کر دی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حواس خمسہ دیئے، عقل و شعور کی دولت دی۔ پھر رسول بھیجے جو لوگوں کے لیے عملی نمونہ تھے۔ اس کے ساتھ اللہ نے مخلوق کی ہدایت کے لیے کتابیں نازل فرمائیں۔ اس طرح اللہ نے ہدایت کے تمام سامان مہیا کر دیئے تاکہ کل کو کوئی یہ نہ کہہ سکے، کہ مجھے پتہ نہیں چلا، ورنہ میں ایمان لے آتا، میں نے کوئی نشانی نہیں دیکھی یا میرے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں پہنچا۔ ان تمام ذرائع ہدایت کے باوجود جو لوگ گمراہی کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزًا حَكِيمًا اللہ تعالیٰ کمال قدرت کا مالک وہ سزا اور جزا دینے پہ قادر ہے۔ اور وہ حکیم ہے کہ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ لہٰذا اس کے احکام پر عمل کرنے سے فلاح حاصل ہو گی۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ
بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ
شَهِيْدًا ؕ ﴿١٦٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿١٦٧﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ
وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ﴿١٦٨﴾ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿١٦٩﴾
يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ
مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا
فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ
اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿١٧٠﴾

ترجمہ: لیکن اللہ گواہی دیتا ہے اس چیز کی جس کو اس نے اُتارا آپ کی طرف ۔ اس کو اپنے علم کے ساتھ اتارا ہے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں ، اور کافی ہے اللہ تعالیٰ گواہی کے اعتبار سے ﴿١٦٦﴾ بیشک وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا ، تحقیق وہ گمراہ ہو گئے اور گمراہی میں دُور جا پڑے ﴿١٦٧﴾ بیشک وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور ظلم

کیا اللہ اُن کو نہیں بخشے گا، اور نہ اُن کی راہنمائی کرے گا
سیدھے راستے کی طرف (۱۶۸) سوائے جہنم کے راستے کے جس میں
وہ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، اور یہ بات اللہ تعالیٰ پر آسان
ہے (۱۶۹) اے لوگو! بیشک آگیا ہے تمہارے پاس رسول حق بات
لے کر تمہارے رب کی طرف سے۔ پس ایمان لاؤ، تمہارے
لیے بہتر ہے اور اگر کفر کرو گے، پس آسمانوں اور زمین میں جو
کچھ ہے سب اللہ تعالیٰ کا ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے
والا اور حکمت والا ہے (۱۷۰)

ربط آیات

گذشتہ دروس میں گذر چکا ہے کہ "یَسْئَلُكَ أَهْلُ الْكِتٰبِ" ..... الخ
یعنی یہودی آپ پر سوال کرتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مکمل کتاب کیوں نہیں لاتے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام لائے۔ اس اعتراض کے اللہ تعالیٰ نے دو طریقوں سے جواب دیے ہیں۔ پہلا جواب الزامی تھا اور حضور علیہ السلام کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا تھا، کہ یہ لوگ ضدی اور عنادی ہیں، ان کا مقصود ہر حالت میں یہ ہے کہ پیغمبر آخر الزماں اور قرآن پاک پر ایمان نہ لایا جائے یہ ان کی قومی عادت ہے انہوں نے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی سوال کیا تھا کہ ہم ایمان نہیں لائیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بدسلوکی کا تذکرہ بھی کیا اُن کی والدہ پر زنا کا الزام لگایا اور خود انہیں قتل کرنے کی سازش کی۔

یہودیوں کے اعتراض کا دوسرا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا "اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ" ... الخ یعنی ہم نے آپ پر بھی اسی طرح وحی نازل فرمائی ہے۔ جس طرح آپ سے پہلے نوح علیہ السلام اور اُن کے بعد آنے والے انبیاء علیہم السلام پر وحی نازل کی گئی اس استدلال سے مقصود یہ تھا کہ تمام انبیاء و رسل پر نزول وحی کی نوعیت یکساں ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ پہلے انبیاء کو تو تسلیم کرتے ہیں مگر آپ کی نبوت کا انکار کر رہے ہیں اور پھر یہ بھی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام

کی طرح تمام انبیاء کو اُن کی کتابیں یک مشت نہیں دی گئیں۔ بعض پیغمبروں پر وقتاً فوقتاً وحی نازل ہوتی رہی اور تھوڑی تھوڑی کر کے کتابیں نازل ہوئیں۔ اسی طرح نبی آخرالزمان پر بھی وقفے وقفے سے وحی نازل ہو کر کتاب کی تکمیل ہوتی رہی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو یکمشت نازل نہ کرنے کی حکمت بھی سورۃ فرقان میں بیان فرمائی کَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا" قرآن پاک کا تدریجاً نزول آپ کے دل کی پختگی کے لیے ہے۔ جو شخص سبقاً سبقاً تعلیم حاصل کرتا ہے اس میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور وہ بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیتا ہے، سب کچھ یکدم پڑھنے سے اچھی طرح یاد نہیں ہو سکتا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو تھوڑا تھوڑا کر کے نازل فرمایا تاکہ یہ اچھی طرح ذہن نشین ہو کر قیامت تک کے لیے مشعلِ راہ بن سکے۔ تھوڑا تھوڑا پڑھنے میں یہ سہولت بھی ہوتی ہے کہ اس دوران پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کی تشریح بھی ہوتی رہتی ہے اور اس طرح انسانی ذہن اُسے مکمل طور پر قبول کر لیتا ہے۔ قرآن پاک کے نزول کا یہ تدریجی عمل تیئیس ۲۳ سال میں مکمل ہوا۔

باقی انبیا علیہم السلام پر بھی وقتاً فوقتاً وحی نازل ہوتی رہی ہے ان میں سے بعض انبیاء کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کر دیا ہے۔ اور بعض کا نہیں کیا اُن کی تفصیلات بھی گزشتہ درس میں بیان ہو چکی ہیں۔ بہر حال تمام انبیاء و رسل پر اجمالی طور پہ ایمان لانا ضروری ہے اگرچہ قابلِ عمل شریعت آخری نبی کی آخری شریعت اور اللہ کی آخری کتاب ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح فرما دیا کہ سارے نبی مبشر اور منذر ہوتے ہیں۔ لوگوں کو نیکی پہ خوشخبری سنانا اور بُرائی کے انجام سے ڈرانا اُن کے فرائضِ منصبی میں شامل ہوتا ہے تاکہ کل قیامت کو کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ اُسے اللہ تعالیٰ کے احکام کا علم نہیں ہو سکا، بلکہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم اور بستی کی طرف انبیا بھیج کر ان پر اپنی حجت تمام کر دی۔

لُغت نبی آخرالزمان

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہودیوں کا ایک گروہ آپ کی خدمت میں

حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا، مجھے یقین ہے کہ تم مجھے اللہ کا رسول تسلیم کرتے ہو مگر اس کا اظہار کیوں نہیں کرتے؟ یہودی اپنے پرانے تعصب اور عناد کی وجہ سے کہنے لگے، بخدا! ہم نہیں جانتے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، ہم آپ میں رسولوں والی کوئی علامت نہیں پاتے۔ اسی طرح ایک موقع پر مشرکین نے بھی یہودیوں سے کہا کہ تم لوگ اہلِ علم ہو۔ بھلا بتاؤ کیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دعوٰی نبوت میں سچے ہیں؟ وہاں پر بھی انہوں نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا اور آپ میں پائی جانے والی علاماتِ نبوت کا صاف انکار کر گئے اللہ تعالٰی نے یہودیوں کی اس ضد کا تذکرہ مختلف مقامات پر کیا ہے کہ یہ لوگ نبی آخرالزمان کو اچھی طرح پہچاننے کے باوجود آپ کی رسالت کا مسلسل انکار کر رہے ہیں۔ حالانکہ آپ کی علامات ان کی اپنی کتابوں میں ابھی تک موجود ہیں اگرچہ اُن کتابوں میں بہت سی تحریف ہو چکی ہے۔ اِن میں حسد کی بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ اللہ کا آخری نبی بنی اسرائیل کی بجائے بنی اسماعیل میں کیوں آیا ہے۔ اس اعتراض کا جواب بھی قرآن کے مختلف مقامات پر آیا ہے کہ اللہ تعالٰی نے یہودیوں کے ساتھ کوئی معاہدہ تو قائم نہیں کر رکھا تھا کہ تمام کے تمام انبیاء انہی کے خاندان سے آئیں گے۔ یہ تو اللہ تعالٰی کی رحمت ہے۔ "یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ" وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے مخصوص کر لیتا ہے اس میں کسی کی خواہش اور آرزو کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اللہ تعالٰی کی حکمت میں یہ بات ازل سے طے ہو چکی تھی کہ نبی آخرالزماں بنی اسماعیل میں سے آئے گا اور اس کا تذکرہ خود تورات میں موجود ہے۔ اللہ تعالٰی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ میں تیرے بھائی بندوں میں ایک رسول برپا کروں گا جس کے منہ میں اپنا کلام ڈالونگا۔ اللہ تعالٰی نے یہی بات نزولِ قرآن کی ابتدائی سورتوں میں بھی بیان فرمادی "اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا" ہم نے تمہاری طرف اسی طرح رسول مبعوث فرمایا

جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف بھیجا یہی چیز تورات میں بھی بیان کی گئی ہے مگر یہودی اس کو بھی چھپا جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ اعراف میں ان کے کتمانِ حق کی قلعی اس طرح کھولی ہے۔ "اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ" یہ لوگ نبی آخر الزمان کا لقب "امی" اور آپ کی نشانیاں اپنی کتابوں میں موجود پاتے ہیں، اس کے باوجود ایمان نہیں لاتے بلکہ مسلسل انکار کر رہے ہیں۔ ایک موقع پر مشرکین مکہ نے یہودیوں سے پوچھا تھا کہ یہ بتاؤ، ہمارا دین اچھا ہے یا وہ دین جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کرتے ہیں، تو انہوں نے اس وقت بھی اپنی دیرینہ خباثت کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا تھا کہ تمہارا دین بہتر ہے۔ پہلے سورۃ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے "يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ" یعنی یہ لوگ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی اولاد کی طرح پہچانتے تھے مگر یہ لوگ عناد اور ضد کی وجہ سے آپ پر ایمان نہ لائے۔

قرآن کی حقانیت

اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا ہے۔ کہ اے پیغمبر علیہ السلام! یہ لوگ قرآن پاک کی حقانیت تسلیم کریں یا نہ کریں لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ مگر اللہ تعالیٰ اس چیز کی گواہی ضرور دیتا ہے جو آپ پر نازل ہوئی ہے قرآن پاک کی سچائی کی ایک دلیل یہ بھی ہے اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے علم کے ساتھ اتارا ہے۔ علم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کہ وہ علیم کل ہے۔ ابو عبدالرحمٰن سلمیؒ حدیث کے راوی اور بڑے بزرگ آدمی ہوئے ہیں۔ ان کے متعلق امام ابن کثیرؒ نے نقل کیا ہے۔ کہ جب ان کے سامنے کوئی شخص قرآن پاک کی تلاوت کرتا تو کہتے اَخَذْتَ بِعِلْمِ اللّٰهِ تم نے اللہ تعالیٰ کا علم حاصل کر لیا ہے۔ اب تم سے افضل دنیا میں کوئی نہیں اِلَّا بِعَمَلٍ ہاں جو اس پر عمل کرے گا، وہ تجھ سے بہتر ہوگا۔ مقصد یہ کہ قرآن پاک اللہ کا علم ہے

جس نے اسے حاصل کر کے اس پر عمل کیا وہ افضل ترین آدمی ہے۔ گویا قرآن ایک ایسی چیز ہے جبکی صداقت کی گواہی خود اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان مبارک بھی ہے کہ جس شخص کے پاس چھوٹی سے چھوٹی سورت بھی ہو اُسے اپنے آپ کو فقیر یا حقیر نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ اُس کے پاس قرآن پاک ہے جو سب سے زیادہ عزت اور شرافت والی چیز ہے۔ اس عظیم کتاب کے مطابق اللہ نے فرمایا "ص ۚ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ" (سورہ ص) قسم ہے اس عزت والے قرآن کی نیز یہ بھی فرمایا "وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ" (سورۃ الزخرف) اے پیغمبر! بیشک یہ کتاب آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے باعث شرف ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے اللہ نے اپنے علم کے ساتھ نازل کیا۔

آگے فرمایا وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ اللہ کے فرشتے بھی اس کی حقانیت کی گواہی دیتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وہ مقدس مخلوق ہے جس کی تعداد خود اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اس کے متعلق بھی اُس کا اپنا ارشاد ہے "وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ" تیرے رب کے اس لشکر کو اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ فرمایا اگر اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کوئی بھی اِس کتاب کی گواہی نہ دے، تو وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا اللہ تعالیٰ کی گواہی ہی کافی ہے۔ خدا خود اپنی کتاب کی صداقت اور حقانیت کا گواہ ہے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ اللہ کی گواہی سے بڑھ کر کس کی گواہی ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ موجود ہے "قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ" سب سے بڑی گواہی تو خدا تعالیٰ کی ہے۔ خدا تعالیٰ شہادت دیتا ہے کہ یہ سچی کتاب ہے۔ توحید کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ کی گواہی کا ذکر آتا ہے "شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًاۢ بِالْقِسْطِ" یعنی اللہ اس کے فرشتے اور انصاف پر قائم رہنے والے صاحب عقل لوگ بھی گواہی دیں گے کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں۔ اسی طرح قرآن پاک کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ کی گواہی

...اپ کو قربت حاصل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ آخری کتاب اپنے آخری نبی پر اپنے علم سے اتاری۔ اس کے علوم معارف اور حقائق کا ذخیرہ اتنا وسیع ہے کہ بڑے سے بڑا انسان بھی اس کی کسی چیز پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی سے فرمایا وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ "وحی کے مکمل ہونے سے پہلے آپ جلد بازی نہ کریں۔" وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (طٰہٰ) بلکہ یوں کہیں کہ پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما۔

کفار کی گمراہی

قرآن پاک کی حقانیت کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا ذرا کفار کا حال بھی سن لیجئے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا جن لوگوں نے کفر کیا اور کفر کا معنی انکار ہے جو کہ بدترین چیز ہے۔ جس نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کی کتاب، اس کے ملائکہ، اس کے انبیاء، اس کی صفت یا قیامت کا انکار کیا۔ اور اس سے مراد یہودی ہیں جو صاف کہتے ہیں کہ ہم نبی آخر الزمان کو نہیں پہچانتے گویا آخری نبی اور آخری شریعت کا نہ صرف خود انکار کرتے ہیں بلکہ وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ دوسروں کو بھی اللہ کے راستے سے روکتے ہیں مختلف قسم کی سازشیں کرتے ہیں۔ کہ کس طرح لوگ اسلام قبول نہ کریں۔ ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا فَقَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا کہ گمراہ ہو گئے اور دور کی گمراہی میں جا پڑے۔ اللہ کے راستے سے دور ہٹ جانے والے لوگوں کے متعلق اللہ نے فرمایا "ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ" کہ یہ لوگ مخلوق کے بدترین لوگ ہوتے ہیں۔ "اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" البتہ صاحب ایمان اور اعمال صالحہ کے انجام دینے والوں کے لیے لامحدود اجر ہو گا۔ انسان ایمان اور نیکی کے ذریعے ہی اعلیٰ مقام حاصل کرتا ہے۔ بہرحال فرمایا کہ خود کفر کرنے والے اور دوسروں کو بھی قبول حق سے روکنے والے دور کی گمراہی میں جا پڑے۔

راستے کا پتھر

اس آیت کریمہ میں یہودیوں کی طرف اشارہ ہے۔ کہ وہ خود بھی گمراہ ہیں اور

دوسروں کو بھی قبولیتِ حق سے روکتے ہیں مگر آج جب ہم اپنے گردوپیش پر نظر ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ آج خود مسلمان اسلام کے راستے میں سب سے بڑا پتھر ہے۔ انگریز نو مسلم محمد پکھتالؒ نے مدراس میں اپنی تقریر کے دوران کہا تھا کہ میرا دنیا بھر کا مشاہدہ ہے کہ خود مسلمان اسلام کے راستے کا سنگِ گراں ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مسلمان توحید کے بجائے شرک اور سنت کے بجائے بدعت پر عمل پیرا ہونگے، کفر کے شعار کو اپنائیں گے تو لوگ اسلام سے متنفر نہیں ہوں گے تو کیا ہوگا مسلمان کے لیے تو لازم تھا کہ وہ اسلام کی حفاظت کرتا۔ اپنے قول و فعل سے اس کی آبیاری کرتا، اور ہمیشہ محتاط رہتا کہ ہمارے کسی عمل کی وجہ سے اغیار کو اسلام پر طعن کرنے کا موقع نہ ملے۔ مگر آج مسلمان دنیا میں اپنا جو کردار پیش کر رہا ہے اس نے اسلام کے راستے میں دیوار کھڑی کر دی ہے جاپان کے ایک نو مسلم پروفیسر ہشام سے دریافت کیا گیا کہ تمہارے اسلام لانے کی کیا وجہ بنی، تو کہنے لگا، میں مسلمانوں کے کردار کو دیکھ کر مسلمان نہیں ہوا، بلکہ خوش قسمتی سے مجھے قرآن پاک کا نسخہ میسر آگیا جسے پڑھ کر مجھے یقین آگیا کہ اسلام سچا مذہب ہے۔ البتہ مسلمان خود جھوٹے ہیں۔

سید جمال الدین افغانیؒ کے قیام مصر کے دوران اُن کی ملاقات جہاز پر سوار مسلمانوں کی ایک جماعت سے ہوئی۔ پوچھا کہاں جا رہے ہو، کہنے لگے یورپ میں تبلیغ اسلام کے لیے جا رہے ہیں۔ سید صاحب نیک دِل مسلمان اور پائے کے سیاست دان تھے، ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے کہ یورپ میں تبلیغ کے دوران مہینے میں انتیس ۲۹ دِن یہ کہنا کہ ہم جھوٹے ہیں اور ایک دِن کہنا کہ اسلام سچا ہے۔ تمہاری کامیابی کی یہی ایک صورت ہے، ورنہ تمہارے افعال و کردار کی بنیاد پر کوئی شخص اسلام لانے کے لیے تیار نہ ہوگا مطلب یہ ہے کہ خود مسلمان اپنے کردار کی وجہ سے اسلام کی ترقی میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ دنیا کے کسی شعبے میں مسلمانوں نے حق و صداقت کا دامن نہیں پکڑا، عبادات کا معاملہ ہو یا سیاست اور تجارت کا

رسومات شادی کی ہوں یا غمی کی مسلمان شرکیہ رسومات میں مبتلا ہیں، بدعات کی بھرمار ہے قبر پرستی ہو رہی ہے، یہ اسلام کا کونسا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے، اگر آج بھی ہم اسلام کا صحیح نمونہ پیش کر سکیں تو لوگ جوق در جوق اسلام کی آغوش میں آنا شروع ہو جائیں، مگر افسوس کہ ہم خود سدِ راہ بنے ہوئے ہیں۔

منکرین کے لیے سزا

فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا جن لوگوں نے انکار کیا اور زیادتی کی۔ کفر و شرک کا راستہ اختیار کیا لَمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ اللہ تعالیٰ اُن کو معاف نہیں کرے گا وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ طَرِیْقًا اور نہ اُن کو راستہ بتلائے گا۔ جب تک کوئی شخص فسق و فجور میں مبتلا ہو، باطل طریقے پر اڑا ہوا ہو۔ اسے صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی حاصل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اِلَّا طَرِیْقَ جَھَنَّمَ اُسے تو جہنم کا راستہ ہی میسر آئے گا۔ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا اس جہنم میں انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ہوگا۔ وَ کَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرًا اور جہنم کے راستے پر چلانا اور جہنم میں ڈالنا اللہ تعالیٰ پر نہایت آسان ہے۔ اُسے کسی لمبی چوڑی منصوبہ بندی کی ضرورت نہیں نہ کوئی مشقت برداشت کرنا پڑے گی، وہ تو قادر مطلق ہے۔ جب چاہے کسی کو سزا دے دے۔

ایمان بالرسول

یہودیوں کا کردار بیان کرنے کے بعد اگلی آیات میں نصاریٰ کا ذکر بھی آ رہا ہے۔ البتہ درمیان میں اللہ تعالیٰ نے پوری بنی نوع انسان کو خطاب کیا ہے خواہ اس کا تعلق کسی مذہب اور عقیدے سے ہو۔ ارشاد ہوتا ہے یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَکُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّکُمْ اے لوگو! تمہارے پاس اللہ کا رسول حق بات لے کر آگیا ہے تمہارے رب کی طرف سے۔ فَاٰمِنُوْا خَیْرًا لَّکُمْ پس ایمان لے آؤ کہ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ اللہ کا آخری رسول تمہارے پاس اللہ کا آخری پیغام (قرآن پاک) لے کر آیا ہے۔ جو تمہاری فلاح کا حتمی پروگرام ہے۔ اگر اس پروگرام پر عمل پیرا ہو جاؤ گے تو دنیا میں بھی کامیابی نصیب ہوگی اور آخرت کی فلاح تو بہرحال تمہارے مقدر میں ہے۔

فرمایا وَاِنۡ تَكۡفُرُوۡا اگر انکار کرو گے۔ نبی آخر الزمان اور اس کے لائے ہوئے پروگرام سے منحرف ہو جاؤ گے تو یاد رکھو فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ زمین و آسمان کی ہر چیز کا مالک تو اللہ ہے۔ اس کے بھیجے ہوئے رسول اور اس کی نازل کردہ کتاب کو چھوڑ کر کہاں چلے جاؤ گے۔ اس کی سلطنت سے باہر کیسے نکل سکو گے۔ تم کس چیز پہ مغرور ہو۔ تمہاری ذاتی ملکیت میں کیا ہے جس پہ اکڑتے ہو۔ لہٰذا اس کی گرفت سے کسی طرح بچ نہیں سکتے۔ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا اللہ تعالیٰ علیم کل ہے وہ تمہارے اخلاص، نفاق اور کفر و شرک کو خوب جانتا ہے۔ وہ کمال حکمت کا مالک بھی ہے اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ وہ انسانوں کو موقع دیتا ہے۔ اور پھر وہ وقت بھی آئے گا جب سب کو جمع کریگا اور کسی عنادی کو سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑے گا۔ مولانا شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے صاف ظاہر ہے۔ کہ پیغمبر علیہ السلام پہ نازل ہونے والی چیز کا ماننا فرض ہے اور اس کا انکار کفر ہے۔

درس ہفتاد و ہفت ٧٧ — آیت ١٧١

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا
عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ
مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ
وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا
ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ
وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِى
السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿١٧١﴾ ع

ع ۲۴

ترجمہ :- اے اہل کتاب ! نہ غلو کرو اپنے دین میں ، اور نہ کہو اللہ پر سوائے حق کے ۔ بیشک مسیح عیسیٰ ابن مریم اللہ کا رسول اور اس کا کلمہ (حکم) ہے جس کو ڈالا اُس نے مریم کی طرف ، اور روح اُس کی طرف سے پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسولوں پر ، اور نہ کہو تین خدا ، باز آجاؤ ، یہ تمہارے لیے بہتر ہو گا ، بیشک اللہ تعالیٰ ایک ہی معبود ہے ، اُس کی ذات پاک ہے اس بات سے کہ اس کی اولاد ہو ۔ اُسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کافی ہے کارساز ﴿١٧١﴾

ربط آیات

گذشتہ کئی دروس سے اہل کتاب میں سے یہود کا ذکر آرہا ہے انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا کہ اگر آپ اللہ کے سچے رسول ہیں تو پھر اللہ کی کتاب آپ پر یکمشت کیوں نہیں نازل ہوئی ، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی ۔ اللہ تعالیٰ

نے پہلے الزامی جوابات دیے پھر فرمایا کہ جس طرح باقی انبیاء پہ وحی نازل ہوتی رہی ہے اسی طرح نبی آخر الزمان پر ہوتی ہے۔ اور تمام انبیاء پہ اکھٹی کتاب نازل نہیں ہوئی جب تم ان تمام انبیاء پہ ایمان لاتے ہو تو پھر اس آخری نبی پر کیوں ایمان نہیں لاتے۔ جو شخص وحی الٰہی کا انکار کرتا ہے، وہ کفر کا مرتکب ہوتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی یہ صفت بیان فرمائی کہ وہ سارے کے سارے مبشر اور منذر ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بعض انبیاء و رسل کا ذکر کیا ہے اور بعض کا نہیں کیا۔ مگر اہل ایمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام انبیاء پر اجمالی طور پہ ایمان لائیں، تمام انبیاء کی تصدیق کرنا لازمی ہے پھر اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو تسلی دی کہ اگر یہ لوگ آپ کی نبوت اور قرآن پاک کا انکار کرتے ہیں، تو کوئی بات نہیں، اللہ تعالیٰ خود آپ کی صداقت اور قرآن کی حقانیت کا گواہ ہے۔ اور خدا کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کفر کا نتیجہ بھی بیان فرمایا کہ جو کوئی کفر کریگا، وہ گمراہی میں دُور جا پڑے گا، ایسے شخص کو دنیا میں راہِ راست میسر نہیں آئیگا، اُسے صرف جہنم کا راستہ ہی ملے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان سے خطاب فرمایا کہ اللہ کا رسول تمہارے لیے فلاح و کامیابی کا پروگرام لے کر آیا ہے، اُس پہ ایمان لانے میں ہی تمہاری بہتری ہے۔ اور انکار کی صورت میں وہ جب چاہے گا اپنی حکمت کے مطابق سزا دے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور یہودی

اس کا ذکر بھی ہو چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہودیوں کا کیا عقیدہ تھا اور انہوں نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ سب سے پہلی بات تو یہ تھی کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول ماننے سے انکار کر دیا، بلکہ اُلٹا آپ کی والدہ پہ زنا کا الزام لگایا (العیاذ باللہ) اور آپ کو ولد الزنا کہا گیا۔ پھر جب عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں اللہ کا پیغام پہنچانا شروع کیا، تو وہ لوگ آپ کے جانی دشمن بن گئے اُنہوں نے آپ کو طرح طرح کی اذیتیں دیں اور آخر میں

سولی پہ لٹکانے کی کوشش بھی کی مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکے، اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرمادی کہ یہ لوگ نہ تو عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر سکے اور نہ سولی پر لٹکا سکے، بلکہ اللہ تعالے نے خاص مہربانی فرمائی اور آپ کو اُن کے درمیان سے اٹھا لیا۔ مگر یہودی اس بات پر بضد ہیں۔ "اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ" کہ ہم نے مسیح علیہ السلام کو قتل کر دیا ہے۔ مگر اللہ نے فرمایا کہ یہ معاملہ اُن کے درمیان مشتبہ کر دیا گیا۔ "وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا" اور وہ مسیح علیہ السلام کو قتل کرنے میں یقیناً کامیاب نہ ہو سکے حقیقت یہ ہے "بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ" اللہ تعالیٰ نے انہیں بحفاظت اپنی طرف اٹھا لیا۔ یہودی ایسے اُلٹی کھوپڑی والے لوگ ہیں۔ کہ انہوں نے زندگی میں تو مسیح علیہ السلام کو تسلیم نہ کیا مگر جب قربِ قیامت میں دجال کا ظہور ہو گا تو ستر ہزار یہودی چغے پہنے اُس کے پیچھے پیچھے چلیں گے اور اُسے مسیح سمجھیں گے۔ بہرحال یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا، اُن کو دجال کہا، اور اس طرح کفر کا ارتکاب کیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور نصاریٰ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اہل کتاب کا دوسرا گروہ یعنی نصاریٰ بھی گمراہ ہو گئے۔ پہلے گروہ نے تو آپ کا بالکل انکار ہی کر دیا تھا۔ اس دوسرے گروہ نے آپ کی حیثیت کے بارے میں غلو کیا جس کی وجہ سے عیسائیوں کے کئی فرقے وجود میں آئے۔ ان میں سے صرف ایک فرقہ حق پر تھا جس نے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بندہ اور رسول مانا، باقی سب نے گمراہی کا راستہ اختیار کیا۔ عیسائیوں کے مختلف فرقے حضرت مسیح علیہ السلام کے اٹھائے جانے کے بعد ستر سے سو سال کے عرصہ میں پیدا ہوئے۔ ایک فرقے نے یہ اعتقاد بنا لیا کہ عیسیٰ علیہ السلام بعینہٖ خدا ہیں۔ آپ انسانی روپ میں دنیا پہ آئے اور پھر واپس چلے گئے۔ اُن کے اس عقیدہ کی شہادت اللہ تعالیٰ نے اگلی سورۃ مائدہ میں یوں دی ہے۔ "لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ" یعنی اُن لوگوں نے کفر کا ارتکاب کیا جنہوں نے کہا کہ مسیح ابن مریم خود خدا ہے

اور عیسائیوں کا دوسرا فرقہ وہ ہے جس نے عیسٰی علیہ السلام کو خدا تو نہیں مانا، مگر انہیں خدا کا بیٹا تسلیم کر لیا۔ بیٹے کا تصور ابتدا میں محبوب اور پیارے کے معنوں میں آیا یعنی ایسا محبوب جس کی بات کو اللہ تعالیٰ ردّ نہیں کرتا، مگر بعد میں یہ تصور حقیقی بیٹے کے معنوں میں منتقل ہو گیا۔ اور پھر اگلا عقیدہ یہ وضع ہوا کہ عیسٰی علیہ السلام اللہ کے صلبی بیٹے تو نہیں مگر وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا اللہ نے انہیں اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ بعض اوقات کوئی بے اولاد شخص کسی دوسرے شخص کا بیٹا حاصل کر کے اُسے منہ بولا بیٹا بنا لیتا ہے۔ مگر یہ دونوں عقیدے باطل ہیں۔ اگر عیسٰی علیہ السلام کو اللہ کا حقیقی بیٹا تسلیم کیا جائے تو یہ مقامِ الوہیت کے منافی ہے کیونکہ سلسلہ توالد و تناسل تو انسانوں، جانوروں یا دیگر مخلوق میں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا اسکی الوہیت کو باطل قرار دینے کے مترادف ہے۔ کیونکہ وہ اس چیز سے پاک ہے تناسل ایک ایسی صفت ہے جو مخلوق کے لیے خاص ہے۔ اور مخلوق کی صفت کو خدا میں ماننا، یہ بھی کفر ہو گیا۔ جب اللہ کے لیے بیٹا ثابت کر دیا تو وہ منزہ نہ رہا بلکہ مرکب بن گیا اور وہ بسیط نہ رہا حالانکہ وہ ہر چیز سے وراء الوراء ہے۔

اور اگر عقیدہ یہ ہے کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے، تو اُس کا احتیاج ثابت ہو گا۔ لاولد ہونے کی صورت میں بیٹا لینے کی ضرورت اس لیے پڑتی ہے کہ بڑھاپے کا سہارا بنے گا، مگر اللہ تعالیٰ تو غنی ہے۔ وہ صمد ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں مگر بیٹا بنا لینے میں خدا کا احتیاج ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ بھی کفریہ عقیدہ ہے۔

عقیدہ تثلیث

عیسائیوں کا ایک تیسرا فرقہ ہے جو تین خدا مانتے ہیں یعنی باپ، بیٹا اور روح القدس۔ پھر ان سب کو ازلی تسلیم کرتے ہیں۔ مزید برآں اُن کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ جب یہ تینوں خدا اکٹھے ہوتے ہیں تو تین کی بجائے ایک ہو جاتے ہیں اور مقدس بن جاتے ہیں گویا کبھی تین ہو جاتے ہیں اور کبھی ایک۔ اقانیم ثلاثہ کا یہ عقیدہ عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے چنانچہ بہت سے یورپین لوگ اس عقیدے سے بیزار

نظر آتے ہیں مگر متعصب عیسائی اس عقیدہ پر راسخ ہیں، اس کی طرح طرح سے توجیہہ کرتے ہیں اور اسپر مناظرے بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو۔ غلو کا معنی تجاوز کرنا یا حد سے بڑھنا ہے خدا کے بندے کو الوہیت کے مقام تک پہنچا دینا ہی غلو ہے۔ نبی آخر الزماں نے بھی غلو سے منع فرمایا لَا تُطْرُوْنِیْ اے لوگو! میری تعریف میں مبالغہ نہ کرنا جیسا کہ عیسائیوں نے مسیح علیہ السلام کے متعلق کیا اَنَّمَآ اَنَا عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ میں تو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ مجھے اللہ کا بندہ اور رسول ہی کہو۔ عیسیٰ علیہ السلام نے بھی یہی کہا تھا قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ قف اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا میں اللہ کا بندہ ہوں، مجھے اس نے کتاب دی ہے اور نبی بنایا گیا ہوں۔ یہ مبالغہ آرائی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کبھی خدا، کبھی خدا کا بیٹا اور کبھی بنایا ہوا بیٹا کہا جائے۔ فرمایا ایسی باتیں مت کہو وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الْحَقَّ اور اللہ کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہو حد سے بڑھنا یا حد سے زیادہ کوتاہی کرنا دونوں باتیں یکساں غلط ہیں۔

غیر تدریجی ولادت

اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق حقیقت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ بیشک مسیح، عیسیٰ ابن مریم اللہ کے رسول ہیں۔ وَکَلِمَتُہٗ اور اللہ کا کلمہ ہیں۔ اَلْقٰھَآ اِلٰی مَرْیَمَ جس کلمے کو اللہ نے مریم کی طرف ڈالا۔ اسکی تفصیل سورۃ مریم میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "فَاَرْسَلْنَآ اِلَیْھَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَھَا بَشَرًا سَوِیًّا" ہم نے انسانی شکل میں اپنا فرشتہ بھیجا۔ سورۃ انبیاء میں فرمایا "فَنَفَخْنَا فِیْھَا مِنْ رُّوْحِنَا" پھر اس میں ہم نے اپنی روح پھونکی۔ فرشتے کے حضرت مریم کے آستین میں پھونک مارنے سے آپ کو حمل ٹھہر گیا۔ اگرچہ یہ پھونک فرشتے نے ماری تھی مگر چونکہ یہ

لے ترمذی مع شمائل ص۵۹۴ (فیاض)

اللہ کے حکم سے تھی اس لیے اللہ نے اسے اپنی طرف منسوب کیا کہ ہم نے پھونک ماری۔ اور پھر یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی ولادت کے لیے نو ماہ کا عرصہ نہیں گذرا تھا، بلکہ پیٹ میں فوراً بچہ بن گیا تھا۔ امام جزریؒ نے المثل السائر میں لکھا ہے۔ فَحَمَلَتْهُ بِهٖ حضرت مریم پھونک مارنے سے حاملہ ہو گئیں، فوراً بچہ بن گیا، اُنہیں دردِ زہ محسوس ہوا اور مکانِ شرقیہ میں چلی گئیں اور اُسی وقت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہو گئی۔ کلمۃ سے مراد اللہ کا کلام یا اُس کا حکم ہے، کیونکہ اللہ کے حکم سے فرشتے نے پھونک ماری تھی وَرُوحٌ مِّنْهُ کلمہ ہی کا دوسرا نام روح بھی ہے۔ اور اس کا اطلاق بھی نفخہ جبرائیلہ پر ہی ہوتا ہے۔ روح کا لفظ اس واقعہ کی شرافت کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ کہ یہ پیدائش معمول کے خلاف غیر تدریجی طریقے سے عمل میں آئی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی منشاء ہے، وہ جس طرح چاہے کوئی کام کرے إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، تو اس کے کُن کہنے سے مطلوبہ کام ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت بھی اللہ تعالیٰ کے خاص حکم کے ذریعے تدریجی عمل کی بجائے غیر تدریجی طریقے سے ہوئی۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے ظاہری اسباب کو ایک طرف کر دیا۔

اس طرح کے غیر معمولی نوعیت کے بعض دوسرے واقعات بھی ملتے ہیں عام حالات میں کسی انسان یا جانور کی پیدائش جوڑے کے ملاپ کے بعد تدریجی عمل کے ذریعے ہوتی ہے مگر حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کی پیدائش بھی غیر معمولی طریقہ سے ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے اونٹنی کو پتھر میں سے نکالا اور اس شرافت کی وجہ سے اُسے ناقۃ اللہ یعنی اللہ کی اونٹنی کا خطاب دیا گیا۔ اونٹنیاں بلکہ ہر چیز کا خالق تو اللہ ہی ہے مگر اس خصوصی پیدائش کی وجہ سے اسے ناقۃ اللہ کا لقب دیا گیا بعض اوقات کسی چیز کی نسبت اُس کے خصوصی لگاؤ کی بنا پر کی جاتی ہے جیسے کعبۃ اللہ یعنی اللہ کا گھر۔ مکان تو سارے کے سارے اللہ ہی کے لیے

ہیں مگر اس گھر کو اللہ تعالیٰ سے خاص نسبت ہے کہ وہاں پر خصوصی رحمتیں نازل ہوتی رہتی ہیں، لہٰذا اُسے اللہ کا گھر (بیت اللہ) کہا گیا ہے اسی طرح حضرت مسیح کی ولادت کے سلسلہ میں کلمۃ اللہ اور روح اللہ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

کلمہ اور روح کے الفاظ صحیحین کی حدیث میں بھی آتے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ گرامی ہے مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاَنَّ عِيْسٰى عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ وَابْنُ اَمَتِهٖ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ وَالْجَنَّةُ وَالنَّارُ حَقٌّ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ عَلٰى مَا كَانَ مِنَ الْعَمَلِ یعنی جو شخص یہ گواہی دے ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ لاشریک ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اُس کی بندی کے بیٹے ہیں اور اللہ کا کلمہ اور روح ہیں جسے حضرت مریم کی طرف ڈالا گیا۔ جنت اور دوزخ برحق ہیں، جو شخص یہ گواہی دے گا۔ اللہ تعالیٰ اُسے جنت میں داخل کریگا، اُس کا عمل خواہ کچھ بھی ہو۔ مقصد یہ ہے کہ صحیح عقیدہ یہ ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام اللہ کے بندے اور اُس کے رسول ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا کلمہ اور روح ہیں جسے مریمؑ کی طرف ڈالا گیا آپ نہ خود خدا ہیں اور نہ خدا کے بیٹے۔ یہ کلمہ کفر ہے۔ انسان کی فکر تبھی پاک ہو گی جب وہ اللہ کی وحدانیت اور تمام رسولوں کی رسالت کا صحیح عقیدہ رکھتا ہو ایسا شخص ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ خواہ اس کا عمل کیسا بھی ہو۔

ایمان باللہ و بالرسل

فرمایا جب حقیقت یہی ہے فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ تو اللہ اور اس کے رسولوں پر ٹھیک ٹھیک ایمان لاؤ۔ اللہ اور اس کے رسولوں کی تصدیق جزائے ایمان میں سے ہے اور ان کا انکار کفر ہے۔ فرمایا اے اہل کتاب! وَلَا تَقُوْلُوْا

ثَلٰثَۃٌ اور تین خدا مت کہو۔ عیسائیوں کا ایک فرقہ تین خداؤں باپ، بیٹا اور روح القدس کا قائل ہے۔ یہ جھوٹا اور باطل عقیدہ ہے اللہ نے فرمایا قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائے، زمین پھٹ جائے، پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں "اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا" کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد ہونے کا دعویٰ کیا، یہ اتنا بڑا اور غلیظ عقیدہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے لیے بھی اولاد ثابت کی جائے تو اُسے مخلوق کی صفت سے متصف کرنے کے مترادف ہے جو کہ کفر ہے۔ اور اس سے اللہ تعالیٰ کا احتیاج ثابت ہوتا ہے گویا کہ وہ اولاد کا محتاج ہے۔

حدیث قدسی میں آتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ فرماتا ہے انسان میری تکذیب کرتا ہے، حالانکہ ایسا کرنا اُس کے لائق نہیں، پھر فرمایا انسان مجھے گالی دیتا ہے، حالانکہ اس کے لیے یہ بھی روا نہیں۔ فرمایا میری تکذیب یہ ہے کہ انسان کا عقیدہ یہ ہو۔ کہ اللہ مجھے دوبارہ پیدا نہیں کریگا۔ جیسا کہ اُس نے مجھے پہلی دفعہ پیدا کیا۔ لَنْ یُّعِیْدَنِیْ کَمَا بَدَأَ گویا قیامت کا انکار کرنا اللہ تعالیٰ کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ اسی طرح کسی انسان کا یہ عقیدہ کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے، یہ بھی گالی ہے۔ اس سے اللہ کا احتیاج ثابت ہوتا ہے۔

اللہ نے فرمایا اِنْتَھُوْا اس غلط اور باطل عقیدے سے باز آجاؤ، خَیْرًا لَّکُمْ تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔ اللہ اور اس کے انبیاء اور اس کی کتابوں پہ ایمان لانا ہی صحیح عقیدہ ہے اور اسی میں تمہارے لیے بہتری اور کامیابی ہے۔

فرمایا یاد رکھو! اِنَّمَا اللّٰہُ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ اللہ ہی واحد اور اکیلا معبود ہے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ خالق اور بے نیاز ہے، باقی سب اس کے محتاج ہیں "اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ ۚ وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ" نافع، ضار، مختار کل، کارساز، موت و حیات کا سر رشتہ بھی اسی ذات کے ہاتھ میں ہے۔ تم کیوں مسیح کو الوہیت میں شریک کرکے گمراہ ہوتے ہیں۔ فرمایا سُبْحٰنَہٗ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ وَلَدٌ اللہ تعالیٰ تو اس چیز سے پاک ہے کہ اس کی

اولاد ہو۔ فرمایا یاد رکھو! لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ
آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک وہی ہے، ہر چیز اسی کی پیدا کردہ ہے، اُسی کا
تصرف چلتا ہے، تو پھر اُسے اولاد کی کیا ضرورت ہے وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا
کارساز بھی اللہ ہی کافی ہے۔ اُس کے علاوہ کوئی بگڑی بنانے والا نہیں ہے۔
مسیح علیہ السلام بھی اُس کے بندے اور رسول ہیں، کارساز وہ نہیں ہیں۔ وہ تو تمہاری
اصلاح کے لیے اللہ کا پیغام لے کر آئے تھے، تم نے انہیں الوہیت کے درجے
پر کیسے پہنچا دیا۔ سورۃ مزمل میں حکم دیا گیا "فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا" کارساز صرف
اللہ کو پکڑو۔ اس کے علاوہ کسی پہ یہ اعتقاد نہ رکھو کہ وہ بھی کوئی کام بنا سکتا
ہے۔ ایسا اعتقاد مشرکانہ اعتقاد ہے۔

مسلمانوں کا غلو

عیسائیوں کے تجاوز کا ذکر ہو گیا، اس کی روشنی میں جب ہم اپنے آپ پر
نظر مارتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آج مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد اسی غلو کا شکار
ہو چکی ہے۔ اولیاء اور اماموں کو نبیوں کے منصب تک پہنچانے والے کون لوگ ہیں
اور انبیا کو الوہیت کا مرتبہ دینے والے بھی مسلمان ہی ہیں۔ قبروں پر بڑے بڑے گنبد بنانا اور
پھر ان قبروں پہ چادریں اور چڑھاوے چڑھانا اسی غلو کا نتیجہ ہے میلاد کی جھنڈیاں اور جلوس
تعزیے اور ذوالجناح دین کی حدود سے تجاوز کا نتیجہ ہیں۔ یہ پیری مریدی اور پھر حاجت روائی
اور مشکل کشائی سب مشرکانہ عقائد ہیں اور خدا تعالیٰ کی حدوں کو توڑنے کی وجہ سے
ہیں۔ پیر وہ ہے جو اللہ کا راستہ بتائے، انسانوں کی تربیت کرے۔ تمام اولیاء
اللہ کے سچے بندے اور مصلح تھے۔ انہیں دنیا کی کوئی طلب نہ تھی، مگر اب جو گدیاں
بنا رکھی ہیں، مزار بنائے ہوئے ہیں۔ یہاں پہ کیا ہوتا ہے۔ وہی مشرکانہ اعمال انجام
دیے جا رہے ہیں اور اس میں نچلی سطح سے لے کر وزرا تک سب شامل ہیں خواجہ اجمیریؒ
کی قبر پہ چڑھانے کے لیے دو لاکھ روپے خرچ کر کے چادر تیار کی گئی، حالانکہ اس
خدا کے بندے نے زندگی میں اپنے لیے جھونپڑی بنانا بھی پسند نہ کیا۔ اب اس کی قبر
پہ عالیشان گنبد بنا دیا گیا ہے وہاں پہ سجدے ہوتے ہیں اور نذریں مانی جاتی ہیں۔

بھائی! بزرگان دین کی تعظیم بھی کرنی ہے تو حد سے نہ بڑھو، یہی غلو فی الدین ہے یہی چیز ہے جس سے اللہ اور اس کے رسول نے منع فرمایا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر کفر شرک میں مبتلا ہو جاؤ گے، بدعت جاری کر دو گے۔ خود فرقہ بندی دین میں غلو کا نتیجہ ہے۔ نصاریٰ غلو فی الدین کی وجہ سے گمراہ ہوئے اور یہودی اپنی ضد اور عناد کی وجہ سے راہِ راست سے بھٹک کر کفر میں مبتلا ہو گئے۔ آگے مسیح علیہ السلام کے متعلق مزید بیان آ رہا ہے۔

درس ہفتاد و ہشت ٧٨ آیت ١٧٢ تا ١٧٦

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا
الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ
وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿١٧٢﴾ فَاَمَّا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ
وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا
وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿١٧٣﴾ ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ
لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿١٧٤﴾ يٰٓاَيُّهَا
النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ
اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿١٧٥﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ
وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ
وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿١٧٦﴾ ۭ

ترجمہ: مسیح علیہ السلام اس بات میں ہرگز عار نہیں سمجھتے کہ وہ اللہ کے بندے ہوں اور نہ مقرب فرشتے اس میں عار سمجھتے ہیں اور جو شخص عار سمجھے گا، اس کی عبادت سے اور تکبر کریگا پس اللہ تعالیٰ اُن سب کو اپنی طرف اکٹھا کریگا ﴿١٧٢﴾ پس بہرحال وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کیے، پس پورا پورا دے گا اُن کو اُن کا بدلہ، اور زیادہ دیگا اُن کو اپنے فضل سے

اور بہرحال وہ لوگ جنہوں نے عار سمجھا اور تکبر کیا (اسکی عبادت سے) پس ان کو سزا دیگا ، دردناک سزا (۱۷۳) اور نہ پائیں گے وہ اپنے لیے اللہ کے سوا کسی کو حمایتی اور نہ مددگار (۱۷۴) اے لوگو! بیشک آگیا ہے تمہارے پاس برہان تمہارے رب کی طرف سے ، اور اُتارا ہے ہم نے تمہاری طرف واضح نور (۱۷۵) پس بہر حال وہ لوگ جو ایمان لائے اللہ پر اور انہوں نے اس کو مضبوطی سے پکڑا پس عنقریب داخل کریگا اُن کو اپنی رحمت میں اور اپنے فضل میں ، اور راہنمائی کریگا اُن کی اپنی طرف سیدھے راستے کی (۱۷۶)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے کفر کا تذکرہ کیا خصوصاً یہودیوں نے انبیاء کی نبوت کا انکار کیا اور دیگر بڑے بڑے جرائم کا ارتکاب بھی کیا ، عیسائیوں نے دین میں تجاوز کیا اور اللہ کے بندے مسیح علیہ السلام کو معبود مانا پھر ان کے کئی فرقے بن گئے ، کوئی ابنیت کے عقیدے کا قائل ہوا ، کسی نے تثلیث کو اپنا لیا اور کوئی انسانوں میں اللہ کے حلول کو تسلیم کر بیٹھا ۔ اللہ نے فرمایا یہ سب باطل عقیدے ہیں ۔ اللہ کی ذات اولاد سے پاک ہے اس کے لیے بیٹا ہونا عیب کی بات ہے ۔ اولاد ہونا مخلوق کی صفت ہے اگر یہی صفت اللہ تعالیٰ میں مانی جائے تو وہ بھی مرکب اور حادث بن جائے گا حالانکہ خدا قدیم اور ازلی ہے اس نے کسی کو بیٹا بنایا بھی نہیں کیونکہ یہ احتیاج کی دلیل ہے ، اللہ غنی اور صمد ہے ، وہ کسی کا محتاج نہیں ، سب اُس کے محتاج ہیں ۔

مقام عبدیت

اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ کے عقیدے کا رد کرتے ہوئے مقام عبدیت کا تذکرہ فرمایا ہے ۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو الوہیت کے مقام تک پہنچا دیا ، چنانچہ مسیح علیہ السلام کو کسی نے الٰہ مانا ، کسی نے تین میں تیسرا الٰہ یا خدا تسلیم کیا اور کسی نے خدا کا بیٹا کہا ۔ مشرکین بھی ملائکہ کو بنات اللہ (اللہ کی بیٹیاں) کہتے تھے ۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہاں اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ جن انبیاء یا ملائکہ کی تم پوجا کرتے ہو ، وہ تو خود اللہ تعالیٰ

کی عبادت کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور اس سے ذرہ برابر سرتابی نہیں کرتے مخلوق کے لیے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے احکام کی تعمیل عزت کا مقام اور شرافت کا اعلیٰ درجہ ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام اور ملائکہ اس نعمت عبدیت کی قدر کرتے ہیں اور ہر وقت خدا کی بندگی میں مصروف رہتے ہیں۔ مسیح علیہ السلام یا ملائکہ کو معبود بنانا تو الٹی بات ہو گئی، وہ تو خود اللہ کے سامنے جبین نیاز جھکانے میں ذرہ بھر عار محسوس نہیں کرتے، چہ جائیکہ خود ان کی پرستش شروع کر دی جائے، ان کے لیے تو بندہ ہونا ہی بہت بڑا شرف ہے۔ اسی لیے فرمایا لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ یعنی مسیح علیہ السلام اللہ کا بندہ ہونے میں کچھ عار محسوس نہیں کرتے۔ استنکاف نکف کے مادہ سے ہے اور اسی کا معنی مڑنا، ملول کرنا، ناک کے کنارے سے آنسو پونچھنا، اور مراد ہے ناک چڑھانا ہے عار سمجھنا کہ یہ کام اچھا نہیں ہے، کسی چیز سے کنی کترانا، اعراض کرنا۔ تو فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا بندہ ہونے میں کمتری محسوس نہیں کرتے بلکہ یہ ان کے لیے باعث فخر ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام سب سے زیادہ عابد اور عبدیت کا اعلیٰ مقام حاصل کرنے والے ہیں۔ فرمایا وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ اور اللہ کے فرشتے بھی عبدیت کی وجہ سے کسی احساس کمتری کا شکار نہیں اللہ کی عبادت کرنا ان کے لیے بھی بہت بڑا شرف ہے۔ اور عبادت کرنا ہی ان کا کام ہے وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے رہتے ہیں۔ اور پھر عام قانون بھی یہ ہے۔ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ جو کوئی اللہ کی عبادت سے عار محسوس کریگا، ناک چڑھائے گا۔ اسے کمتر خیال کرے گا، وَيَسْتَكْبِرْ اور تکبر کا اظہار کریگا، گویا اللہ تعالیٰ کی عبادت سے منہ موڑنا تکبر کی نشانی ہے دوسری جگہ دعا کے متعلق فرمایا وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اللہ نے فرمایا مجھ سے دعائیں کیا کرو، میں قبول کروں گا "اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ" جن لوگوں نے میری عبادت سے تکبر کیا "سَيَدْخُلُوْنَ

جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ" انہیں رسوا کر کے جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ اللہ تعالےٰ اس بات سے ناراض ہوتا ہے کہ کوئی شخص اس کا بندہ ہو کر اس کی عبادت نہ کرے تو فرمایا جو شخص میری عبادت کرنے میں عار سمجھے گا اور تکبر کرے گا فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا اللہ تعالیٰ ایسے تمام لوگوں کو اپنی طرف اکٹھا کریگا۔ اور پھر محاسبے کا عمل شروع ہو جائیگا۔

بہر حال فرمایا کہ بندے کا شرف و مجد اسی بات میں ہے کہ وہ ہر وقت عجز و انکساری میں رہے، اللہ تعالیٰ کے حضور خشوع و خضوع کا اظہار کرے اور اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کا مصداق بن جائے۔ بندے کا فرض ہے کہ وہ عبادت بھی اسی الہ العالمین کی کرے اور ہاتھ بھی صرف اسی کے سامنے پھیلائے، یہی اظہار عجز و بندگی ہے اور یہی مقام عبدیت ہے، اللہ کی عبادت اور اس کی نیاز مندی سے روگردانی کرنے والا متکبر ہے، اسے اپنے برے انجام کی فکر کرنی چاہیئے۔

اہل ایمان کے لیے جزا

فرمایا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا پس بہر حال وہ لوگ جو ایمان لائے۔ انہوں نے خدا تعالیٰ کی وحدانیت کو صحیح طور پر مانا۔ انبیا، ملائکہ، کتب سماویہ، وحی الٰہی اور خدا کے دین کو سچا سمجھا، قیامت کے دن کو برحق جانا۔ ایمان کی حقیقت کے متعلق مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے مَا جِئْتُ بِهٖ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں جو کچھ خدا کی جانب سے لایا ہوں، اس ہر چیز کی تصدیق کرنا تکمیل ایمان ہے۔ تو فرمایا جو لوگ ایمان لائے وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور انہوں نے اچھے اعمال انجام دیے۔ اچھے اعمال میں سرفہرست نماز، روزہ، حج زکوٰۃ اور جہاد ہیں۔ یہ پانچ اعمال اسلام میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، تو جنہوں نے ایمان لانے کے بعد اچھے کام بھی کیے فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیگا۔ کسی عمل کی جزا میں کمی نہیں کی جائیگی اللہ تعالیٰ عادل ہے وہ نہ صرف عدل کرے گا بلکہ وَيَزِيْدُهُمْ

مِّنْ فَضْلِهٖ انہیں اپنے فضل سے اور زیادہ دے گا عام قانون بھی یہ ہے "مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا" (انعام) جو کوئی نیکی کا کام کرے گا آخرت میں اُس کا بدلہ کم از کم دس گنا دیا جائے گا۔ اور اس سے زیادہ اللہ تعالےٰ کی مرضی اور مشیت پر موقوف ہے۔ ہر عمل کا بدلہ اس کے حالات اور عزائم کے مطابق دیا جائیگا۔ یہ اُس کا فضل، احسان اور مہربانی ہے۔

عبادت سے اعراض

فرمایا وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا اور بہرحال جن لوگوں نے خدا تعالیٰ کی عبادت کو عار سمجھا وَاسْتَكْبَرُوْا اور تکبر کیا۔ خدا کی بڑائی بیان کرنے، اس کے سامنے نیازمندی کرنے اور اسکی عبادت کرنے سے تکبر کیا اور اکڑ دکھائی، اور اس کی بجائے غیروں کی پوجا کرتے رہے، مخلوق کو الوہیت کے منصب پر بٹھایا ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وہ عذاب الیم کے مستحق ہوں گے۔ کفر اور شرک کرنے والوں کا انجام یہی ہے کہ وہ نہ ختم ہونے والی سزا میں مبتلا ہوں دوسرے مقام پر فرمایا "بِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ" تکبر کرنے والوں کو بہت بُرا ٹھکانا میسّر آئے گا۔

ایک صحابیؓ نے سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام سے دریافت کیا حضرت! ہم اچھا لباس یا اچھا جوتا پہن لیتے ہیں یا اچھی سواری پر سوار ہوتے ہیں، تو کیا یہ بھی تکبر میں آتا ہے۔ آپ نے فرمایا، ایسا نہیں ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُّحِبُّ الْجَمَالَ اللہ تعالیٰ خود جمیل ہے اور وہ اچھی وضع قطع اور خوبصورتی کو پسند فرماتا ہے۔ لہٰذا یہ تکبر میں شامل نہیں ہے۔ فرمایا تکبر یہ ہے اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ کہ حق بات کو ٹھکرا دے۔ اور لوگوں کو حقیر جانے کسی معمولی آدمی کی اچھی بات کو ٹھکرا دینا تکبر کی نشانی ہے۔ اس قسم کے لوگوں کے متعلق فرمایا وَلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا کہ وہ اللہ کے علاوہ کوئی دوست، کارساز اور مددگار نہیں پائیں گے۔ اِن کے خود ساختہ معبود بھی اِن کے کسی کام نہ آئیں گے۔ کوئی فرشتہ

لہ ابن کثیر ص۴۰۲ ج۳ (فیاض)

کوئی نبی، کوئی جن، کوئی ولی حمایت کے لیے آگے نہیں بڑھے گا اور یہ لوگ اللہ کے شکنجے میں جکڑے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ کو خاص طور پر تنبیہ فرمائی ہے۔ کہ مسیح علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا مان کر اُن کو الوہیت کے درجے پر پہنچانا قیامت کو کچھ کام نہ آئے گا، بلکہ اس قسم کا گندہ عقیدہ رکھنے والے عذاب الیم کے مستحق ہوں اور پھر وہاں اُن کا کوئی حامی اور مددگار نہیں ہو گا۔

قرآن بطور برہان

اہل کتاب سے تخاطب کے بعد اب پوری بنی نوع انسان کو خطاب کیا جارہا ہے يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے برہان آچکا ہے۔ برہان کی جمع براہین ہے اور براہ کا معنی کاٹنا ہوتا ہے۔ اس کو برہان یا دلیل اسلیے کہتے ہیں کہ اس کی وجہ سے شکوک و شبہات کٹ جاتے ہیں۔ اور انسان کو اطمینان حاصل ہو جاتا ہے، کیونکہ جو بات دلیل اور برہان کے ساتھ کی جاتی ہے، وہ سچی ہوتی ہے فرمایا تمہارے پاس برہان آچکا ہے وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا اور ہم نے تمہاری طرف نور مبین نازل کیا ہے بعض مفسرین نے وَأَنْزَلْنَا کو عطف تفسیر بنایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ برہان اور نور مبین ایک ہی چیز ہے اور اس سے مراد قرآن حکیم ہے۔ یعنی یہی وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر قطعی دلیل اور ہدایت کی طرف راہنمائی کرنے والی واضح روشنی ہے۔ تمام حق و باطل میں امتیاز پیدا کرنے اور شکوک و شبہات کو رفع کرنے کے لیے اور منشائے الٰہی کو واضح کرنے کے لیے قرآن سے بڑھ کر کوئی دلیل نہیں۔ برہان، قرآن پاک کے ناموں میں ایک نام بھی ہے۔

پیغمبر بطور برہان

بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ برہان اور نور مبین دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اُن کے مطابق برہان سے مراد پیغمبر علیہ السلام کی ذات مبارکہ، چہرہ انور، سیرت حسنہ اور تعلیم ہے۔ یہ وہ ذات بابرکات ہے جسے دیکھ کر انسان کے تمام شکوک و شبہات دور ہو جاتے ہیں۔ مولانا رومیؒ بھی کہتے ہیں: "روئے و آوازِ پیغمبر معجز است" اور

نور مبین سے مراد قرآن پاک ہی ہے۔ یہ ایسا واضح نور ہے جو تمام چیزوں کی وضاحت کرتا ہے۔ اس کو "هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ" بھی کہا گیا ہے۔ انسانی آنکھ سے بصارت پیدا ہوتی ہے مگر قرآن پاک بصیرت پیدا کرتا ہے۔ اس کا ایک ایک جملہ انسان کے دل میں روشنی پیدا کرتا ہے۔ جس سے حق و باطل میں امتیاز کیا جاتا ہے۔

صراطِ مستقیم

آگے فرمایا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا پس بہر حال جو لوگ ایمان لائے وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ اور اس کو مضبوطی سے پکڑا۔ اس سے مراد اللہ کے دین کو مضبوطی سے پکڑنا ہے جیسے فرمایا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کریگا۔ اللہ کی مدد سے مراد اس کے دین کی مدد ہے۔ اسی طرح یہاں بھی فرمایا کہ جو کوئی خدا کے دین کو مضبوطی سے پکڑے گا، اللہ کی وحدانیت پر مضبوطی سے قائم رہے گا۔

فرمایا فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ وہ لوگ خدا کی مہربانی کے مستحق ہونگے۔

فرمایا وَيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا اللہ تعالیٰ اُن کی صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی فرمائے گا۔ وہ راستہ جو خدا کا قرب دلاتا ہے۔ بالآخر ایمان والے لوگ اللہ کے فضل اور اسکی رحمت کے مقام میں پہنچیں گے اور یہ سب سے بڑی کامیابی ہے۔

يَسْتَفْتُونَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ؕ إِنِ امْرُؤٌا
هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا
تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَا إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ
فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا
تَرَكَ ؕ وَإِنْ كَانُوْا إِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ
مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ؕ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ أَنْ
تَضِلُّوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۱۷۶﴾ ع ۲۴ ۵ ۴

ترجمہ: یہ لوگ آپ سے فتویٰ پوچھتے ہیں، آپ کہ دیجئے اللہ تعالیٰ تمہیں فتویٰ دیتا ہے کلالہ کے بارے میں اگر کوئی شخص ہلاک ہوگیا اور اُسکا کوئی بیٹا نہیں ہے اور اس کی بہن ہے، تو اُسے اُس کے ترکہ میں سے نصف ملیگا۔ اور وہ بھائی وارث ہوگا اُس بہن کا اگر اس کی اولاد نہیں ہے اور اگر یہ دو بہنیں ہوں تو اُن کو دو تہائی ملے گا اس میں سے جو اُس نے چھوڑا۔ اور اگر وہ بھائی۔ مرد اور عورتیں ہوں (بہت سے) پس مرد کے لیے دو عورتوں کے برابر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے بیان کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو۔ اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے ﴿۱۷۶﴾

ربط آیات

سورۃ نساء جن مضامین پر مشتمل ہے، اُن میں انسانی حقوق کو اولیت حاصل ہے، خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے کمزور طبقات یعنی یتیم بچوں اور عورتوں کے حقوق کا تذکرہ کیا

ہے۔ اس میں معاشرتی حقوق اور نکاح کے مسائل بیان ہوئے ہیں۔ محرمات نکاح کا ذکر ہے۔ اور پھر حقوق ہی کے ضمن میں وراثت جیسا اہم مسئلہ تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ سورۃ کی ابتدا میں بھی وراثت کے احکام آئے ہیں اور یہ آخری آیت بھی اسی مسئلہ سے تعلق رکھتی ہے مسئلہ وراثت کا یہ اہم جزو پہلے حصے میں بیان ہونے سے رہ گیا تھا، جو اس آخری حصے میں سمجھا دیا گیا ہے۔ سورۃ کے درمیانی حصہ میں بعض دیگر مسائل بھی آ گئے ہیں۔ ان میں توحید، کفر اور شرک کی تردید، اہلِ کتاب کی ضد اور عناد، اُن کے اعتراضات اور جوابات بھی بیان ہو گئے ہیں۔ آج کی آخری آیت مسئلہ وراثت ہی کا تتمہ ہے۔ بعض صحابہ کرام رضؓ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کلالہ کی وراثت کا مسئلہ دریافت کیا تھا، جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اصحابِ رسول اور سوالات

گذشتہ دروس میں اہلِ کتاب کے سوالات اور اُن کے جوابات کا ذکر آچکا ہے۔ یہ لوگ ضد اور عناد کی وجہ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کرتے تھے مگر اہلِ ایمان سوال کرنے سے اکثر گریز کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر کوئی جماعت نہیں، کہ وہ آپ سے زیادہ سوال نہیں کرتے تھے، ہاں کسی معاملہ میں الجھن ہو تو سوال کی ممانعت بھی نہ تھی، مگر صحابہ کرامؓ عام قسم کے بے معنی سوال نہیں کیا کرتے تھے، بلکہ اس معاملہ میں بڑے محتاط تھے۔ وراثت کے سلسلے میں کلالہ کا مسئلہ حل طلب تھا۔ چنانچہ اس کے متعلق خود صحابہ کرامؓ نے حضور علیہ السلام سے دریافت کیا، چنانچہ یہ آیت اس ضمنی سوال کا جواب ہے۔

کلالہ کی تعریف

لفظِ کلالہ دو مادوں سے مشتق ہو سکتا ہے۔ پہلی تحقیق یہ ہے کہ کلالہ کا مادہ اکلیل ہے اور اکلیل تاج کو کہتے ہیں۔ تاج کا زیادہ تر نقش و نگار درمیانی حصے کی بجائے کناسے پر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے کلالہ سے مراد وہ شخص ہے جس کے نہ اصول (یا باپ دادا) ہوں اور نہ فروع (بیٹا، پوتا) بلکہ دائیں بائیں کنارے کے

رشتہ دار بھائی بہن وغیرہ ہوں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ کلال کے مادہ سے مشتق ہے، جس کا معنیٰ تھک جانا، کمزور ہو جانا ہوتا ہے۔ اور اس لحاظ سے کلالہ اُس شخص کو کہا جائے گا، جس کے قوی وارث موجود نہ ہوں، بلکہ اِدھر اُدھر کے کمزور ورثا موجود ہوں۔ بہر حال حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے منقول یہی بات ہے۔ کہ کلالہ وہ شخص ہے، جس کی نہ اولاد ہو اور نہ والدین۔

کلالہ مرد بھی ہو سکتا ہے اور عورت بھی۔ اِس سورۃ کے دوسرے رکوع میں جس کلالہ کا ذکر ہے، اُس سے مرد اور عورت دونوں مراد ہیں "وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ" یعنی اگر مرد اور عورت میں سے بطور کلالہ وراثت حاصل کی گئی ہو اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہو، تو اُسے کل مال کا چھٹا حصہ ملیگا، اور اگر ایک سے زیادہ بہن بھائی ہوں تو وہ ایک تہائی حصے میں شریک ہوں گے۔ مفسرین کرام اِس بات پر متفق ہیں کہ یہاں بھائی اور بہن سے مراد اخیافی بھائی بہن ہیں۔ جو حقیقی نہ ہوں بلکہ صرف ماں کی طرف سے ہوں۔ البتہ اس آخری آیت میں جس بھائی بہن کا ذکر ہے۔ اس سے مراد حقیقی (ماں اور باپ دونوں کی طرف سے) یا علاتی (صرف باپ کی طرف سے) بھائی، بہن ہیں۔ یہ بھی عصبات میں داخل ہیں۔ اس لیے وراثت کے معاملہ میں اِن کا بھی وہی حکم ہے جو حقیقی بیٹے اور بیٹی کا ہوتا ہے۔

مرد کلالہ کی وراثت

جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے۔ کلالہ کے اخیافی بہن بھائیوں کی صورت میں وراثت کے حصوں میں کوئی فرق نہیں پڑتا، کلالہ خواہ مرد ہو یا عورت۔ مگر جب تقسیم کلالہ کے حقیقی یا علاتی بہن بھائیوں کے درمیان مقصود ہو، تو مرد کلالہ اور عورت کلالہ کے مسائل مختلف ہیں۔ اِس آیت کریمہ میں مؤخر الذکر حصص بیان کیے گئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے يَسْتَفْتُونَكَ اے پیغمبر علیہ السلام آپ سے فتویٰ طلب کرتے ہیں۔ اس حصۂ آیت میں فتویٰ کی نوعیت کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس کا ذکر جواب میں بیان کر دیا گیا ہے، چنانچہ اُس جواب کی روشنی میں يَسْتَفْتُونَكَ کا معنیٰ یہ ہوگا کہ

یہ لوگ آپ سے کلالہ کی وراثت کا مسئلہ دریافت کرتے ہیں۔ جواباً فرمایا قُلِ اللّٰہُ یُفۡتِیۡکُمۡ فِی الۡکَلٰلَۃِ آپ کہ دیجئے، اللہ تم کو فتویٰ دیتا ہے کلالہ کے بارے میں۔ اور وہ یوں ہے اِنِ امۡرُؤٌا ہَلَکَ لَیۡسَ لَہٗ وَلَدٌ اگر ایسا آدمی فوت ہو جائے جسکی اولاد نہ ہو، اور اُس کے اصول یعنی باپ دادا وغیرہ بھی موجود نہ ہوں، بلکہ وَّ لَہٗۤ اُخۡتٌ مرنے والے کی صرف ایک بہن ہو، خواہ حقیقی ہو یا علاتی فَلَہَا نِصۡفُ مَا تَرَکَ تو اس کے لیے کل وراثت کا نصف حصہ ہے۔ رہا باقی نصف مال، تو اس کے لیے دیگر رشتہ دار شلاً چچا، تایا یا چچازاد بھائی کو تلاش کیا جائیگا۔ مگر بعض فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ ساری کی ساری جائداد اُس ایک بہن کو ملیگی، نصف حصہ تو اللہ نے مقرر کر دیا ہے لہذا یہ اُسے صاحبِ فرض ہونے کی حیثیت سے ملیگا اور باقی نصف حصہ بطور عصبہ لے جائیگی، کیونکہ میت کی عصبہ بھی وہی بہن ہے۔

عورت کلالہ کی وراثت

اور اگر مرنے والی عورت ہے جسکی نہ اولاد ہے اور نہ ماں باپ، اور اس کا صرف ایک بھائی ہے۔ تو فرمایا وَہُوَ یَرِثُہَاۤ اِنۡ لَّمۡ یَکُنۡ لَّہَا وَلَدٌ وہ بھائی ساری جائداد کا واحد وارث ہوگا۔ ایسی وراثت میں مزید کسی رشتہ دار کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

اور اگر کلالہ (مرد یا عورت) کی دو یا دو سے زیادہ بہنیں ہوں فَاِنۡ کَانَتَا اثۡنَتَیۡنِ فَلَہُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَکَ تو کل ترکہ میں سے اُن کا دو تہائی حصہ ہوگا۔ یہ حصے بالکل حقیقی بیٹوں کی طرح ہیں کہ اگر مرنے والے کی ایک بیٹی ہو تو وہ آدھے حصے کی مالک ہوتی ہے اور اگر دو یا دو سے زیادہ ہوں تو اُن کو دو تہائی مال تقسیم ہو جاتا ہے۔

فرمایا وَاِنۡ کَانُوۡۤا اِخۡوَۃً رِّجَالًا وَّ نِسَآءً اور اگر کلالہ کے بہن بھائی ملے جلے ہوں تو حقیقی بیٹے بیٹیوں کی طرح فَلِلذَّکَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَیَیۡنِ کی رو سے ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملیگا یعنی بھائی کا حصہ بہن سے دوگنا ہوگا۔ ایک بہن کو ایک روپیہ ملا ہے تو بھائی کو دو روپے ملیں گے۔

یہ مسئلہ بیان کرنے کے بعد فرمایا یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمۡ اَنۡ تَضِلُّوۡا

اللہ تعالیٰ واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ تم احکام الٰہی کو اچھی طرح سمجھ جاؤ اور کوئی غلطی کر کے گمراہ نہ ہو جاؤ۔ اَنْ تَضِلُّوْا میں لا محذوف ہے۔ اللہ تعالیٰ مسائل کی وضاحت اس لیے فرماتا ہے کہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ۔ بلکہ تم ہدایت کے راستے پر چلتے رہو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں کَرَاهَةً محذوف ہے اور پورا جملہ یوں بنتا ہے کَرَاهَةَ اَنْ تَضِلُّوْا یعنی اللہ تعالیٰ اس چیز کو ناپسند فرماتا ہے کہ تم گمراہ ہو جاؤ۔ فرمایا وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ وہ تمہارے ناقص علم سے بھی واقف ہے۔ اس لیے اس نے تمام مسائل کی وضاحت فرما دی ہے۔

قدرت اور علم خداوندی

سورۃ ہذا کے ابتدائی حصے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال قدرت کا تذکرہ فرمایا تھا۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ یعنی اس اللہ سے ڈر جاؤ جو کمال قدرت کا مالک ہے۔ یہ اس قدرت کا شاہکار ہے کہ اس نے ایک جان سے تم کو پیدا کیا اور پھر کروڑوں بلکہ اربوں مرد و زن دنیا میں پھیلا دیے۔ اور اب سورۃ کے آخری حصے میں وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ فرما کر اپنے علیم کل ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ کمال قدرت کا مالک بھی وہی ہے اور کمال علم کا مالک بھی وہی خداوند قدوس ہے۔ اس نے انسان کو گمراہی سے بچنے کے لیے تمام سامان مہیا کر دیے ہیں۔ وہ ہر شخص کے خیر و شر سے واقف ہے۔ وہ کسی نیکوکار کے اچھے اجر میں کوئی کمی نہیں کریگا اور نہ اپنے سرکش کے محاسبے میں کوئی کسر چھوڑے گا۔ محاسبے کا عمل شروع ہونے والا ہے، اسی لیے فرمایا "وَاتَّقُوا اللّٰهَ" اللہ سے ڈر جاؤ۔ "الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ" کہ تم اس کے واسطے سے سوال کرتے ہو۔ اور قرابتداروں سے خبردار رہو۔ ان کے حقوق کا خیال رکھو اگر کسی کے حقوق کو پامال کیا تو اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آ جاؤ گے۔

واللہ اعلم بالصواب وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا محمد والہ واصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین